عالم میں انتخاب ـ دِلّی

FIROZE



مہیشور دیال



عالم میں انتخاب — دِلّی



سلسلۂ مطبوعاتِ اردو اکادمی ـــــــ ۹

تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین:

سنہِ اشاعت فروری ۱۹۸۷ء
قیمت : ۵۳/- روپے
بہ اہتمام: محمد عارفین (ڈپٹی سکریٹری)
معاون : ڈاکٹر انتظار مرزا
طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، دہلی
ناشر : اردو اکادمی، دہلی

اُن تمام لوگوں کے نام جنھیں دلی سے پیار رہے!

مہیشور دیال

پیش لفظ

جناب مہیشور دیال صاحب نے "عالم میں انتخاب — دلّی" لکھ کر نہ صرف ان لوگوں کو ممنونِ احسان کیا ہے جنھیں دلّی سے پیار ہے بلکہ ان تمام لوگوں کو بھی زیرِ احسان کیا ہے جنھیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر ناز ہے اور جو قومی یک جہتی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں. مہیشور دیال صاحب کے اس قول سے چاہے پوری طرح کوئی متفق نہ ہو کہ یہ چیزیں دِلّی کی دین ہیں. لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان خصوصیتوں کو بڑھاوا دینے میں جو ہاتھ دلی کا ہے وہ شاید کسی اور شہر کا نہیں!

دلّی کی تہذیبی تاریخ دسویں صدی عیسوی سے تو مسلسل میسّر ہے اگرچہ آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں بھی یہاں آبادی تھی. تیرھویں صدی کی ابتدا میں دہلی ترکوں کی سلطنت کا پایۂ تخت بنا اور ایک کے بعد دوسری جگہ آبادی کے ہٹنے کے باوجود دہلی کی رونق قائم رہی. مہیشور دیال صاحب نے لال کوٹ، کلوکھڑی، تغلق آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، دین پناہ اور پرانا قلعہ، شیر گڑھ اور شاہجہاں آباد کا ذکر کیا ہے. سب سے زیادہ تفصیلی ذکر شاہجہاں آباد کا ہے! عام لوگوں کے اِس خیال کی مہیشور دیال صاحب نے تائید فرمائی ہے کہ اٹھارویں صدی دلّی کی تباہی کا دور تھا. آخر میرؔ صاحب نے بھی دلّی کو "اجڑا دیار" کہا۔

انیسویں صدی میں انگریزوں کا غلبہ ہوا جس کے خلاف ۱۸۵۷ میں دلّی نے بغاوت کا علم اُٹھایا۔ بہرحال ۱۹۴۷ میں ہندوستان کے آزاد ہونے پر دلّی نے اپنے خواب سے پھر انگڑائی لی اور زندگی کی ایک نئی لہر شہر میں دوڑ گئی۔ نئی پود کو دہلی کی قدیمی تہذیب سے واقف کرانے اور اس کے پرانے رنگ و روپ کی جھلک دکھانے کا اہم کام اس کتاب کے ذریعے مہیشور دیال صاحب نے انجام دیا ہے۔

لوگ کیسے مکانوں میں رہتے تھے کیا اُن کے شغل اور مشغلے تھے، پھیری والے کیا آوازیں لگاتے تھے، بچوں کے کھیل کود کیا تھے، کھانا پینا، دسترخوان، پان اور حُقّہ اور اِن سے متعلق کہاوتیں، دلّی کے لوک گیت، تہذیب اور وضع داری، داستان گوئی، تعلیمی ادارے، فنِ خطاطی، تشبیہیں اور استعارے، میلے اور تہوار غرض کہ ہر وہ چیز جو طرزِ زندگی کی تصویر کھینچتی ہے، مہیشور دیال صاحب نے پیش کی ہے!

اس بیش قیمت کتاب کے ایک چھوٹے سے حصّے کو اس لیے پیش کرتا ہوں کہ اس میں پوری کتاب کا رنگ جھلک رہا ہے:

"اگر دلّی کی مشترکہ تہذیب، میل جول اور آپسی بھائی چارے کو کسی تہوار یا میلے کی صورت میں دیکھنا ہو تو ذہن میں بے ساختہ "پھول والوں کی سیر" کا میلہ اُبھرتا ہے! ہمارے ملک میں سب ہی مذہبوں کے ماننے والے رہتے ہیں۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی بھی اور جین بودھ اور یہودی بھی — یہ سب اس ملک میں سینکڑوں ہزاروں برسوں سے مِل جُل کر رہتے آئے ہیں۔ ہمارے آج کے جمہوری نظام میں بھی ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے اگرچہ حکومت مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کی نیتی اپنائے ہوئے ہے۔ یہاں کے باشندوں کو اپنی مذہبی رسوم، تیج تہوار اور میلے ٹھیلے منانے کی مکمل آزادی ہے۔ دلّی کے بیشتر تہوار اور میلے مذہبی اور موسمی ہیں۔ مگر "پھول والوں کی سیر" دلّی والوں کی باہمی محبت کی اُپج ہے۔"

مہیشور دیال صاحب کا طرزِ تحریر اتنا موثر ہے کہ بہت سے مٹے ہوئے نقوش اُبھر آتے ہیں اور پُرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں، میری طرح سے بہت سے لوگ ہندوستان کے کونوں کونوں سے آکر یہاں بس گئے اور اب "دلّی کی گلیاں چھوڑ کر" باہر جانے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دلّی کے شاندار ماضی کو سمجھیں تاکہ اِس کے مستقبل کو اور زیادہ روشن کرنے کی کوشش میں شریک ہو سکیں۔ ہم جیسوں کے لیے مہیشور دیال صاحب کی یہ کتاب ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

(پروفیسر) سید نورالحسن
(سابق وزیر تعلیم حکومت ہند اور سفیر ہند برائے سوویت یونین۔ حالیہ گورنر مغربی بنگال)

دہلی۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۶ء

عرضِ احوال

دلّی حقیقت میں ایک حسین، دلفریب، دلکش اور دل رُبا ہستی کا نام ہے! ہندوؤں نے اسے بسایا، سجایا، مسلمانوں نے اس کے رنگ روپ کو نکھارا، سنوارا، انگریزوں نے اِسے 'نئی نویلی دلہن' کہہ کر پکارا۔ دلی میں اتنی کشش اور جاذبیت ہے کہ جو یہاں آیا، بس یہیں کا ہو رہا۔ دِل لے لیتی ہے ہر کسی کا، جبھی تو اس کا نام 'دِل لی' ہے۔

اِس کے حسن کے جلووں، اِس کی امارت اور شان و شوکت اور اس کی تہذیب و تمدن کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلی۔ ہزاروں سال سے نہ صرف اپنے ملک کے باشندے بلکہ غیر ممالک کے لوگ بھی اِس کے دلدادہ اور شیدائی رہے ہیں۔ انقلابات آتے رہے لیکن دلی مٹ مٹ کر ابھرتی رہی اور ہر بار اس کے نقش و نگار میں ایک نیا اور انوکھا نکھار پیدا ہوا۔ اس اعتبار سے دلی 'شہر جاوداں' کہلائی۔

مجھے اور میرے بزرگوں کو دلی سے بے پناہ پیار ہے۔ میرے خاندان کے لوگ دلی کو تین سو برس سے دیکھتے آئے ہیں۔ کانوں سُنی، آنکھوں دیکھی اور دانشوروں اور ادیبوں کی تحریروں نے میرے دِل و ذہن کو بے حد متاثر کیا۔ دلی میری نس نس میں بسی ہے۔ آپسی بھائی چارہ، رواداری اور قومی یک جہتی میرے چند راسخ اعتقادات ہیں۔

یہ قدرتی نتیجہ ہے اس مشترکہ تہذیب کا جو دلی کی دین ہے۔

دلی کا ذکر ایک مفصل کتاب میں کرنے کی تمنا عرصے سے دل میں تھی، ۱۸۵۷ کی دلی، کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے اور شاہجہاں آباد کی تاریخی اہمیت کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دیگر اخبارات اور رسائل میں اجاگر کرنے کی کوشش مسلسل طور پر کرتا رہا ہوں۔ لیکن زیرِ نظر کتاب میں دلی کی سماجی زندگی اور اس کے تمدن پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کا حوصلہ کیا ہے۔ دو سال کی کاوش اور محنت کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ میں اپنی اس تصنیف کو بصد عجز و انکسار پیش کرتا ہوں۔

آخر میں میں ان تمام احباب کا صدقِ دلی سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازا۔ میں خاص طور پر م۔م۔ راجندر صاحب کا ممنون ہوں جن کی بیش قیمت مدد کے بغیر یہ منصوبہ مکمل نہ ہو پاتا۔

اگرچہ میں اس کتاب پر کافی وقت سے کام کر رہا تھا، تاہم پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ممنون ہوں کہ اُن کی تحریک پر اردو اکادمی دلی نے اِس کتاب کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا، اور ان کے نیز شریف الحسن نقوی صاحب کے پیہم تقاضوں پر یہ کام جلد پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

مہیشور دیال

۹۶، بابر روڈ، نئی دلی۔ ۱

حرفِ آغاز

اردو اکادمی، دہلی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ دہلی کی تہذیبی، ادبی اور سماجی زندگی پر مختلف حضرات سے مسودات تیار کرائے جائیں کیونکہ عرصہ سے اس طرح کی کتب کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی پیش نظر کتاب ہے۔

ہم محترم مہیشور دیال صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر یہ بیش بہا تحفہ عنایت فرمایا۔

اکادمی کی کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی اس طرح کی کتب قارئین کے لیے پیش کرتی رہے۔

سید شریف الحسن نقوی
سکریٹری

مندرجات



اندرپرستھ (پرانا قلعہ) میں آثارِ قدیمہ کی جھلک



پرانے قلعے کی کھدائی میں چینی ساخت کے ظروف کی دریافت

دلّی کا تاریخی پس منظر

دلی شہر کی تاریخ، جہاں تک کھوج کی جا چکی ہے، تین ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ اس طویل عرصے میں دلی بار بار اجڑی اور پھر آباد ہوئی۔ سلطنتیں قایم ہوئیں اور نیست ونابود ہو گئیں۔ بڑے بڑے طاقتور اور پُر جلال بادشاہوں نے اس پر حکومت کی مگر ان کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔ بڑی بڑی جنگیں دلی کی سرزمین پر اور اس کے گرد ونواح میں لڑی گئیں۔ بڑا کشت وخون اِس دھرتی پر بار بار ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دلی کی تاریخی داستان اتار چڑھاؤ اور تغیر و تبدل سے عبارت ہے۔ دلی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ اجڑنے کے بعد یہ پھر بسی تو نئی شان اور نئے نکھار اور حسن کے ساتھ اور اس کا سب کچھ مٹ گیا مگر اس کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کا رکھ رکھاؤ اور اس کی وضعداری نہیں مٹی۔

بیشتر مورخ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ موجودہ دلی کے مقام پر پہلے مختلف اوقات میں سات پرانے شہر آباد ہو چکے ہیں۔ کئی مورخوں کا کہنا ہے کہ ایسے شہر سات نہیں پندرہ تھے اگر گرد ونواح کی بستیوں اور قلعے بندیوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ہوتا یہ آیا کہ شہر برباد ہوا تو عمارتوں کے ملبے اور ساز و سامان کو نئے شہر کی تعمیر میں استعمال کر لیا گیا اور اس طرح سے قدیم شہروں کا کچھ بھی باقی نہ بچا اور جو بچا اسے وقت کے تھپیڑوں نے فنا کر دیا۔ اب صرف دو شہر ہیں اور دونوں زندہ، ایک شاہجہاں آباد اور دوسرا نئی دہلی۔ دونوں شہروں میں تاریخی عمارتیں اور ان کے کھنڈر موجود ہیں۔ یہ دونوں شہر موجودہ دلّی کے دو پہلو،

دو رُخ ہیں۔ ایک میں سترھویں صدی سے شروع ہوئی تہذیب اور مشرقی تمدن کی پوری جھلک ہے اور دوسرے میں جدیدیت اور مغربی تہذیب کے بھرپور عناصر ہیں۔ نئی دہلی دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی ہے۔

۱۱۹۲ میں، دلّی میں راجپوتوں کی حکومت ختم ہوتے ہی، بیرونی طاقتوں کی توجہ دلّی کی طرف کھنچ گئی۔ دلی کی طاقت اور اہمیت کو دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں نے محسوس کیا اور سترھویں صدی کے نصف میں جب شاہجہاں آباد کی بنیاد رکھی گئی تو دلّی اور دارالسلطنت کے طور پر اس کے دربار کی شان وشوکت کی دھوم مچ گئی۔ اسے "ایشیا کا روم" "ایشیا کا دارالحکومت" اور "ہر فاتح کی محبوبہ" کہا جانے لگا۔

اندر پرستھ

کالکا پران کے مطالعے سے پتہ لگتا ہے کہ اندر پرستھ نام کی نگری کے آباد ہونے سے پہلے یہاں ایک گھنا جنگل تھا جو کھانڈو وَن یا اندرؤن کہلاتا تھا۔ چندر ونشی راجہ سدرشن نے اس جنگل کو صاف کرواکے ایک سندر شہر بسایا۔ یہ یسوع مسیح کی پیدائش سے لگ بھگ ۱۴۵۰ سال پہلے کی بات ہے۔ اس شہر کا نام کھانڈو پرستھ رکھا گیا۔ اُن دنوں جمنا شمال جنوبی سمت میں بہتی تھی اور کھانڈو پرستھ کے مشرق میں پڑتی تھی۔ اب جمنا نے اپنا راستہ تقریباً ڈیڑھ میل مشرق کی طرف بدل لیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا شمشان گھاٹ جسے نگم بودھ گھاٹ کہا جاتا ہے، پانڈوؤں کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ کھانڈو پرستھ کا رقبہ پانچ گاؤں پر مشتمل تھا اور پانڈوؤں نے اپنی راجدھانی اندر پرستھ اسی مقام پر قایم کی تھی۔ نگم بودھ، راج گھاٹ اور نیلی چھتری پانڈوؤں نے ہی تعمیر کرائے تھے۔ پانڈوؤں کے سب سے بڑے بھائی یدھشٹر کو شہر کو سندر بنانے اور نئی عمارتوں کی تعمیر کا شوق تھا۔

اندر پرستھ کی تعمیر کی تفصیلات اور اِس کے عروج و زوال کے بارے میں مستند تاریخی کتابوں میں کچھ نہیں ملتا۔ مگر بعد کی کھدائیوں سے یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کئی ہزار سال پہلے بھی اسی مقام پر شہری زندگی تھی اور شاید یہ شہر ہمایوں کے مقبرے اور

فیروز شاہ کوٹلہ کے درمیان والے علاقے پر بسا ہوا تھا۔ بعد کے بہت سے مورخین نے جن میں ابولفضل بھی شامل ہے اندر پرستھ کی موجودگی کو تسلیم کیا ہے لیکن اندر پرستھ کا تاریخی بیان معہ اس کے عروج وزوال کے کہیں نہیں ملتا۔ "بھگوت پران" میں اندر پرستھ کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ پانڈووں کی راجدھانی ہستناپور تبدیل ہو جانے کے بعد ارجن کی اولاد نے بھی اندر پرستھ پر حکومت کی تھی۔ بہر حال ایسی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی جس سے پتہ چلے کہ ہستناپور کوئی بڑا شہر تھا۔ ہاں مختلف اندازوں اور جو کچھ بیانات ملتے ہیں ان سے یہ پتہ ضرور لگتا ہے کہ اس کا رقبہ خاصہ وسیع تھا۔

دہلی

حضرت عیسٰی کے دور سے پہلے کے یونانی سیاحوں جیسے میگستھنیز نے اپنے سفر ناموں میں اندر پرستھ یا دہلی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بعد کے چینی سیاح بھی جن میں فاہیان اور ہیون سانگ شامل ہیں ان شہروں کے بارے میں خاموش ہیں۔ ہیون سانگ تو دہلی کے آس پاس کے کئی شہروں میں گھوما مگر دہلی کو نظر انداز کر گیا۔ البتہ سکندر کے جغرافیہ دان پتولیمی نے اندر پرستھ کے بالکل پاس کسی "داتیدلا" کا ذکر کیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید یہی دہلی یا دلّی ہو جسے راجہ دیلو نے جو قنوج کا راجہ تھا، حضرت عیسٰی کی پیدائش سے ۷۰ سال پہلے قطب اور تغلق آباد کے درمیان کسی مقام پر بسایا تھا۔ یہ جگہ اندر پرستھ کے جنوب میں کوئی چھ میل کے فاصلے پر تھی۔ لیکن اس وقت کی 'دائیدلا' یا دہلی کے کھنڈرات نہیں ملتے' نہ ہی بعد کے کسی مؤرخ نے راجہ دیلو کا ذکر کیا۔ لیکن یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ دہلی راجپوتوں کی فتح سے پہلے ایک چھوٹا سا شہر رہی ہوگی۔ بعد کی کھدائی میں غیاث الدین بلبن کے زمانے کی بنی ایک باؤلی میں ایک پتھر ملا ہے جس میں دہلی کا نام "ڈھیلیکا" اور اس کو "ہریانیکا" کا حصّہ بتایا گیا ہے۔ یہ پتھر ہمارے نیشنل میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔

پرانی دلی یا قلعہ رائے پتھورا

تومار راجپوتوں نے اس علاقے پر ۷۳۶ء میں قبضہ کر لیا تھا اور دلی کو اپنی راجدھانی

بنالیا تھا۔ ان راجپوتوں نے نئی نئی عمارتیں بنوائیں جن کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔ دسویں صدی میں تومار راجہ سورج مل نے اس شہر کے دو تین میل جنوب میں ایک گول پانی کے ذخیرے کا تالاب بنوایا اور اس کے پاس ایک مندر بھی تعمیر کرایا۔ اسی جگہ کو آج سورج کنڈ کہتے ہیں۔

۱۰۶۰ میں شہر میں ایک نئی عمارت کا اضافہ ہوا جسے لال کوٹ کہتے ہیں۔ اس قلعے نما عمارت میں اگلی صدی میں مشہور قوت الاسلام مسجد کی تعمیر کی گئی۔ لال کوٹ کو تومار راجہ اننگ پال نے بنوایا تھا اور قطب مینار کے پاس اس کے کھنڈرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی مقام پر ڈھلے ہوئے لوہے کا وہ ستون بھی ہے جو چندر گپت کی شجاعت کے کارناموں کی یاد میں بنوایا گیا تھا۔ یہ ستون ۴۰۰ء میں ڈھلوایا گیا تھا مگر اس کو اس جگہ پر بہت بعد میں اننگ پال نے ہی نصب کروایا تھا۔

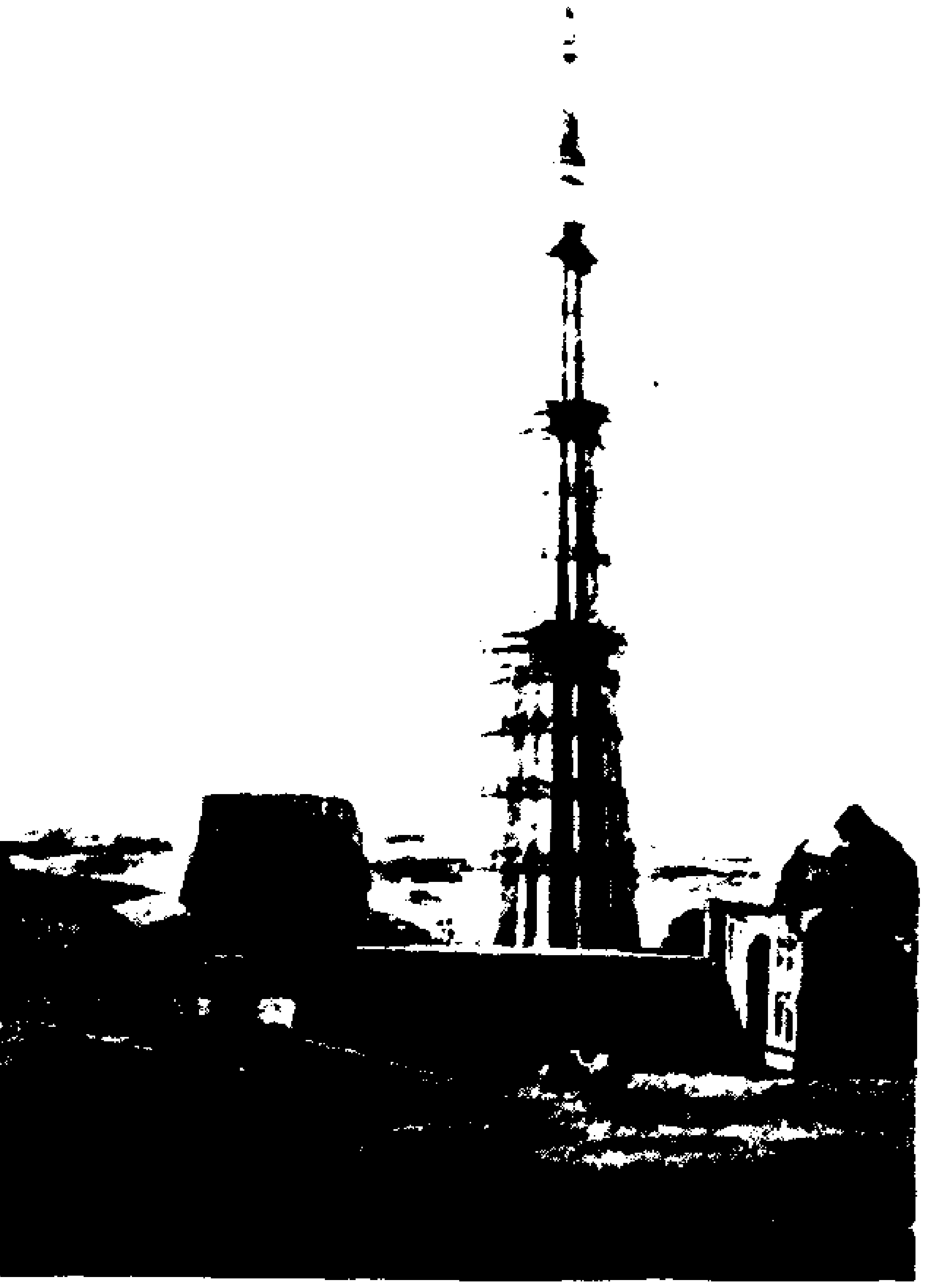
تومار راجپوتوں کے بعد چوہان آئے اور ان کے مشہور راجہ رائے پتھورا نے جس کا ذکر لوک گیتوں اور کہانیوں میں آتا ہے لال کوٹ کی قلعہ بندی کو اور وسیع کیا اور اس کا نام قلعہ رائے پتھورا رکھ دیا۔ یہ بڑا شاندار قلعہ تھا اور اس کے عظیم کھنڈر ابھی تک اس گزری ہوئی شان و شوکت کا پتہ دیتے ہیں۔ اب اس کے اردگرد کئی جدید رہائشی کالونیاں بن گئی ہیں۔

جب دلّی کو ۱۱۹۲ میں ترکی حکمران محمد شہاب الدین غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے فتح کیا، تو دلّی کا رنگ روپ اور نقشہ تیزی سے بدلنے لگا۔ ایک نیا دور شروع ہوا جو سات صدیوں تک قایم رہا۔ اس نے دلّی کو جنوبی ایشیا کا اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز بنا دیا۔ قطب الدین ایبک کو اُس وقت کی دلّی ہر لحاظ سے اجنبی نظر آئی اور اس نے اس شہر کو اپنے نقطۂ نظر سے بدلنا چاہا۔ اُس نے سب سے پہلے مشہور مسجد قوت الاسلام بنوائی۔ ۱۲۰۰ میں اُس نے غزنی کے مشہور مینار فتح کے نمونے پر قطب مینار بنوانے کا کام شروع کر دیا۔ اس مینار کو ۱۲۲۰ میں التمش نے مکمل کیا جو قطب الدین کا جانشین اور اس کا داماد تھا۔ قطب مینار آج دلّی کی مشہور ترین قدیم عمارتوں میں سے ایک ہے جسے دنیا بھر کے سیّاح آ کر دیکھتے ہیں۔

التمش نہ صرف ایک بلند پایہ منتظم اور سپہ سالار تھا بلکہ علم و فن کا پرستار بھی تھا اور اس نے دلّی کی تہذیبی زندگی کو بڑا سنوارا اور آگے بڑھایا۔ اس نے مدرسہ معزی قایم کیا اور اس



مسجد قوت الاسلام کے ستون



قطب مینار

کی مشہور بیٹی رضیہ سلطان نے، جو دلّی کی پہلی خاتون حکمران تھی، ناصریہ درسگاہ قایم کی جس کے صدر اور مہتمم المنہاج بن سراج تھے۔ دلّی ایک طاقتور حکومت کا مشہور اور اہم مرکز بن گئی اور ایک نیا فنِ تعمیر وجود میں آیا جس میں ہندوستانی اور اسلامی فن کا ایک خوشگوار سنگم تھا۔ اس عہد کے سلطان بلبن نے بھی دلّی میں کئی شاندار عمارتوں کا اضافہ کیا مگر افسوس کہ زمانے کی چیرہ دستیوں سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔

التمش کے زمانے کا ایک واقعہ مشہور ہے۔ ایک دفعہ ایک سوداگر اس کے دربار میں سو غلام فروخت کے لیے لایا۔ سلطان نے سوائے ایک کے سب غلام خرید لیے۔ بچا ہوا غلام ایک چھوٹی عمر کا مسکین اور نہایت بدصورت لڑکا تھا۔ اس لڑکے نے بادشاہ سے پوچھا ——— "آپ یہ غلام کس کے لیے خرید رہے ہیں؟" "اپنے لیے" بادشاہ نے جواب دیا۔ "پھر اللہ کے نام پر مجھے بھی خرید لیجئے" اس لڑکے نے التجا کی۔ بادشاہ نے رحم کھا کر اُسے بھی خرید لیا اور اسے بہشتیوں کے ساتھ لگا دیا جو محل میں پانی لاتے تھے۔ اس لڑکے کا باپ کسی وقت ترکی فوج میں دس ہزار گھڑسواروں کا سردار تھا مگر پھر بُرے دنوں کا شکار ہو گیا۔ التمش کے محل میں اس لڑکے کا نام بلبن رکھ دیا گیا۔ وہ خوبصورت نہ سہی مگر بلا کا ذہین اور ہوشیار تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے میر شکار کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اس نے اور ترقی کی اور آخر کار یہی غلام لڑکا بلبن دلی کے تخت پر بیٹھا۔

کلوکڑی اور سیری

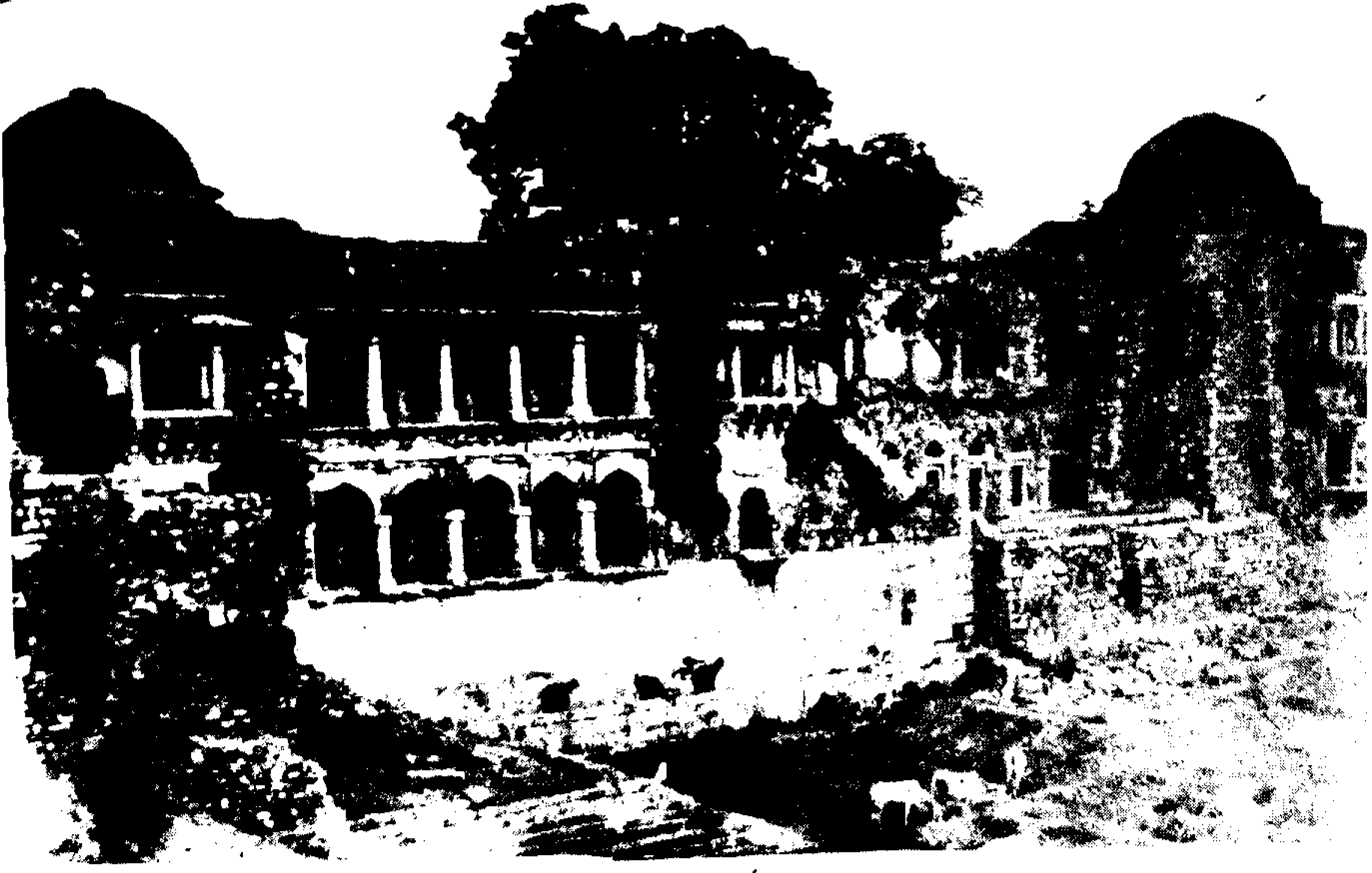
بلبن کا پوتا کیقباد، ۱۲۸۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ وہ اس وقت صرف اٹھارہ سال کا تھا اور سلطنت کی مزید توسیع میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک عیّاش اور نکمّا بادشاہ تھا۔ اس نے موجودہ دلّی سے پانچ میل مشرق میں ایک محل بنایا اور اس میں رہنے لگا۔ یہ جگہ کلوکڑی کہلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس محل کے گرد ایک نئی راجدھانی بس گئی۔ ۱۲۹۰ء میں جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا۔ اسے شک تھا کہ پرانے شہر کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے، اسی لیے وہ شروع میں کلوکڑی میں ہی ٹھہرا اور محل کو نئے طریقے سے ٹھیک ٹھیک کرنے اور سجانے لگا۔ اس نے وہاں بسے شہر میں بھی صفائی کرانی شروع کر دی۔ بہت سی نئی عمارتیں بھی بنوائیں جو رہائشی تھیں اور ایک

بڑے قلعے کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا۔ لیکن جونہی اُس نے اپنے آپ کو مستحکم محسوس کیا اور رعایا کا اعتماد حاصل کیا، اس نے کلوکڑی کو چھوڑ دیا اور پرانے شہر میں اپنے بزرگوں کی بنائی راجدھانی میں رہنے لگا۔

جلال الدّین کے جانشین علاؤالدّین خلجی کے عہد میں ۱۳۰۲ کے لگ بھگ منگولوں نے لگاتار کئی حملے کیے۔ ان حملوں نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ ملک کے دوسرے حصوں میں اپنی فوجی سرگرمیوں کو چھوڑ کر دلی واپس آجائے۔ ۱۳۰۴ میں اس نے گاؤں شاہ پور کے نزدیک سیری کے میدان کا انتخاب کیا اور وہاں اپنا قلعہ اور دارالحکومت بنوانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی پرانے شہر کے حفاظتی انتظامات کو بھی زیادہ مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ سیری جلد ہی ایک پورا آباد شہر بن گیا اور اس میں علاؤالدّین کے حکم سے نئے نئے بازار اور مکان بن گئے۔ بادشاہ کا قلعہ بھی تیار ہو گیا۔ جب تیمور ۱۳۹۸ میں اس جگہ آیا تو اس نے دیکھا کہ سیری کے سات دروازے تھے، تین اندر جہاں پناہ کی طرف اور چار باہر کی طرف۔

علاؤالدّین خلجی نے سیری کے باہر بھی اپنا تعمیری کام جاری رکھا۔ ۱۳۱۱ میں اس نے شاندار علائی دروازہ بنوایا، قوت الاسلام کا جنوبی دروازہ تعمیر کروایا اور ادھورے علائی مینار پر پھر کام شروع کروا دیا۔ اس نے سیری سے ایک ڈیڑھ میل پر حوضِ علائی یا حوضِ خاص بھی تعمیر کرایا۔ جب فیروز شاہ تغلق نے حوض کے پاس ہی ایک بڑا مدرسہ بھی بنوا دیا تو اس علاقے کو اور بھی فروغ ملا۔ ان تمام عمارتوں کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں اور ایک پبلک پارک کا حصّہ بن گئے ہیں۔

علاؤالدّین اور پدمنی کا قصّہ بڑا مشہور ہے مگر اس کے لیے کوئی مستند تاریخی حوالہ نہیں ملتا۔ سب سے پہلے اس کا ذکر ملک محمد جائسی نے اپنی مشہور تصنیف "پدماوت" میں کیا یعنی علاؤالدّین کی چتوڑ کی فتح کے ۲۲۵ سال بعد! اگر آپ کا چتوڑ جانا ہو تو آپ کو وہاں کے گائڈ وہ جگہ دکھائیں گے جہاں ایک آئینے میں مہاراجہ رتن سنگھ کی مدد سے علاؤالدّین نے پدمنی کا چہرہ دیکھا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر اس قصّے میں کوئی صداقت ہوتی تو ان شاعروں اور سیّاحوں نے جنھوں نے علاؤالدین کے دورِ حکومت کا تفصیلی بیان لکھا ہے،



سیکری کا حوض خاص

اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ ان سیّاحوں اور شاعروں میں برنی، ابن بطوطہ، امیر خسرو اور تاریخ محمّدی اور تاریخِ مبارک شاہی کے مصنف بھی شامل ہیں۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک محمد جائسی کے بعد فرشتہ اور دیگر سیّاحوں نے بھی اس کا ذکر کیا مگر شاید ملک محمد جائسی سے متاثر ہو کر۔ اس قصے کا ذکر سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جانے والی متعدد تاریخی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ قصّہ یوں ہے کہ رانی پدمنی حسن و جمال میں یکتا تھی اور اس کے حسن کی شہرت چتوڑ سے باہر بھی دور دراز تک پہنچ گئی تھی۔ نوجوانی میں وہ لنکا کی ایک شہزادی تھی اور چتوڑ کے راجہ رتن سنگھ کو ایک طوطے نے اس کے بے مثال حسن اور رعنائیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ رتن سنگھ بارہ سال کی کوشش کے بعد شہزادی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور اسے اپنی رانی بنا کر چتوڑ لے آیا۔ ایک سادھو نے جسے پدمنی نے بھکشا دی تھی اور جو پدمنی کے حسن کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا دربار میں حاضر ہو کر علاؤالدّین کو پدمنی کی خبر دی اور علاؤالدّین کے دل میں پدمنی کو حاصل کرنے کی خواہش جاگ اٹھی۔ اس نے چتوڑ کے رانا کو کہلا بھیجا کہ پدمنی کو دہلی بھیجا جائے۔ جب رتن سنگھ نے اس کی پر زور مخالفت کی تو علاؤالدّین نے ایک بڑی فوج کے ساتھ چتوڑ پر دھاوا بول دیا۔ رتن سنگھ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور آٹھ سال کے محاصرے کے بعد بھی علاؤالدّین کو کوئی کامیابی نہیں ملی۔ علاؤالدّین نے رانا سے بات چیت شروع کی اور اسے بتایا کہ اگر اسے حسین رانی کے چہرے اور جسم پر ایک نظر بھی ڈالنے کو مل جائے تو وہ چتوڑ کا محاصرا اٹھا لے گا اور دلّی واپس چلا جائے گا۔ رانا اس بات کو مان گیا اور اس نے ایک بڑے آئینے میں کمرے کے دروازے میں کھڑی پدمنی کی جھلک دکھا دی۔ اس کے بعد رتن سنگھ از راہِ اخلاق علاؤالدّین کو محل کے باہر کچھ دور تک چھوڑنے کے لیے آیا لیکن اچانک علاؤالدّین کے فوجی اس پر ٹوٹ پڑے اور زخمی رانا کو قیدی بنا کر دلی لے جایا گیا۔ علاؤالدین نے پیغامات بھیجے کہ پدمنی دلّی آ کر سلطان کے حرم میں شامل ہو جائے۔ بڑی ترغیب کے بعد وہ مان گئی اور اس کا جلوس جس میں پردے دار پالکیوں میں اس کی ۱۶۰۰ باندیاں بھی تھیں دلّی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جونہی وہ سلطان کے محل پر پہنچی پالکیوں میں سے ۱۶۰۰ ہتھیار بند فوجی سپاہی باہر کود پڑے اور محل کے پہرے داروں اور سپاہیوں کو ہلاک کر کے راجہ رتن سنگھ کو چھڑا لیا اور رانی پدمنی

واپس چتوڑ پہنچ گئی۔ ایک ایسے موقعے پر جب راجہ رتن سنگھ چتوڑ سے باہر گیا ہوا تھا تو بھیلنا (کمبھل گڑھ) کے دیوپال نے پدمنی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ رتن سنگھ نے لوٹ کر دیوپال سے بدلہ لینے کے لیے اس پر چڑھائی کردی۔ دیوپال لڑائی میں مارا گیا مگر رتن سنگھ بھی بری طرح زخمی ہوگیا اور چند دن کے بعد مرگیا۔ اس پر رانی پدمنی ایک اور رانی کے ساتھ ستی ہوگئی۔ اس کے جلد بعد ہی سلطان علاؤالدین نے چتوڑ پر حملہ بول دیا اور قلعے پر قبضہ کرلیا۔

تغلق آباد

غیاث الدین تغلق نے ایک اور راجدھانی بنائی جو تغلق آباد کا قلعہ بند شہر تھا۔ اس نے موجودہ دلّی سے تین چار میل مشرق کی طرف ایک وسیع اور اونچی سطح پر واقع میدان کا انتخاب کیا اور ۱۳۲۱ سے ۱۳۲۲ کے درمیان وہاں ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کروایا۔ اس قلعے کے تیرہ دروازے تھے اور اس کے نیچے زمین دوز کمرے اور دالان تھے اور ایک سرنگ کے ذریعے یہ دلی کے پرانے شہر سے جڑا ہوا تھا۔ تغلق آباد اگرچہ ایک بڑے خطۂ زمین پر تھا مگر اس میں اتنی گنجائش ہرگز نہیں تھی کہ پرانے شہر کے تمام لوگ اس میں سما جائیں۔

حضرت نظام الدین جن کا دلی کے صوفیائے کرام میں بہت اونچا مقام تھا اور جنھیں دلّی والے سلطان جی کہا کرتے تھے، غیاث الدین تغلق کے زمانے میں ہی رہتے تھے۔ لافانی شاعر اور صوفی امیر خسرو ان کے ہی مرید تھے۔ اسی وقت میں، بادشاہ کے ساتھ ساتھ حضرت نظام الدین کی باؤلی بھی بن رہی تھی جس پر اُن کے اور بادشاہ کے درمیان تنازعہ ہوگیا تھا اور انھوں نے اسے بددعا دی تھی۔ قلعے میں رہائش شروع کرنے کے پانچ سال بعد ہی غیاث الدین اپنے بیٹے محمد تغلق کے ہاتھوں مارا گیا۔ محمد تغلق نے قلعے اور تغلق آباد کو چھوڑ کر دلّی کے پرانے شہر میں سکونت اختیار کرلی اور اس کے بعد تغلق آباد اجڑ گیا۔

جہاں پناہ

محمد شاہ تغلق نے ۱۳۲۵ میں اپنے باپ کا مقبرہ اور حضرت نظام الدین کی درگاہ



کوٹلہ فیروز شاہ معہ اشوک کی لاٹھ

تعمیر کرائی۔ اسی سال اس نے ایک نئے شہر کی تعمیر بھی شروع کر دی جس کا نام جہاں پناہ تجویز ہوا تھا۔ اس میں دلّی کی اب تک کی قلعہ بندیاں، پرانی دلی، تغلق آباد اور سیری بھی شامل کر لیے گئے۔ اس کا ذکر مشہور سیاح ابن بطوطہ نے جو دلی میں آٹھ سال ٹھہرا تھا، کیا ہے۔ اس نے سلطان محمد کی حکومت کا بیان بھی کیا ہے۔ اس نے سلطان کو "جھکّی" سنکی اور ضدی بتایا اور لکھا ہے کہ کچھ گمنام خطوں سے ڈر کر بادشاہ نے اپنا دارالحکومت دلی سے بدل کر دولت آباد دکن کر دیا۔ محمد تغلق نہ صرف اپنے سازو سامان، فوجوں اور اہلکاروں کو دولت آباد لے گیا بلکہ اس نے اپنی رعیت کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی اس شہر میں جا کر بسیں۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا قافلہ جب ناقابل برداشت صعوبتیں سہتا ہوا دکن پہنچا اور ابھی یہ لوگ وہاں بس بھی نہ پائے تھے کہ محمد تغلق نے پھر سے دلّی کو راجدھانی بنانے کا فیصلہ کر لیا اور لوگ طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا کر پھر لوٹے۔ بہت سے وہیں بس گئے۔ اس طرح سے دلی ایک قسم سے پھر بسی اور لوگوں کی زندگی پھر سے شروع ہوئی۔

محمد تغلق نے ۱۳۲۶ میں کھڑکی مسجد کے پاس ایک دو منزلہ پل بھی بنوایا تھا اور تغلق آباد کے جنوب میں ایک چھوٹا قلعہ عادل آباد بھی تعمیر کرایا تھا۔ دونوں کے کھنڈر ابھی تک موجود ہیں۔

فیروز آباد

تیسرے بادشاہ تغلق نے ۱۳۵۴ میں جمنا کے دائیں کنارے پر، اندرپرستھ کے چھ میل شمال میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام فیروز آباد رکھا گیا۔ اس میں ایک قلعہ اور تین محل تھے۔ اب ان کی یادگار فیروز شاہ کوٹلے کی صورت میں ہے۔ فیروز شاہ مسجد کے کھنڈرات قلعے کے اندر ہی ہیں۔ فیروز شاہ کو تاریخی اشیا اور تعمیرات میں بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود انبالے اور میرٹھ سے دو اشوک کے ستون لایا تھا۔ ان میں ایک فیروز شاہ کوٹلے میں نصب کیا گیا اور دوسرا پرانی سبزی منڈی سے پرے باڑا ہندو راؤ کی پہاڑی پر۔ یہ دونوں ستون ابھی تک موجود ہیں اگرچہ فرخ سیر کے عہد میں پہاڑی والے ستون کو نقصان پہنچا تھا۔

۱۳۷۳ اور ۱۳۷۴ میں فیروز شاہ نے درگاہ روشن چراغ اور قدم شریف کی تعمیر کرائی۔

۱۳۸۷ میں فیروز شاہ نے کھڑکی اور بیگم پور کی مسجدیں تعمیر کرائیں۔ فیروز شاہ کے جلد ہی بعد ۱۳۹۸ میں تیمور نے دلّی کو تہس نہس کیا۔ پچاس ہزار سے زیادہ شہریوں کو لوٹا گیا اور تہہ تیغ کر دیا گیا۔ اس وقت کے بادشاہ کو بھی نہیں بخشا گیا اور اس کی بڑی بے عزتی کی گئی۔ اس کے خزانوں کو لوٹ لیا گیا اور دلّی کے باشندوں پر بڑے مظالم توڑے گئے۔ جب دلّی میں تغلقوں کے بعد سیدوں کی حکومت شروع ہوئی تو پہلے حکمران خضر خاں نے (۱۴۱۴ - ۱۴۲۱) تیمور کے نام پر ہی حکومت کی۔ لیکن اس نے اور اس کے تین جانشینوں نے ایک تباہ و برباد چھوٹی سی دلی پر حکومت کی۔ جب لودھیوں کا دور شروع ہوا تو دوسرے لودھی حکمران سکندر نے دارالسلطنت دلّی سے بدل کر آگرے کے قریب ایک مقام کو بنا لیا لیکن اس کے جانشین سلطان ابراہیم لودھی نے پھر دلی کو دارالحکومت بنالیا اور دلی واپس آگیا۔ بابر نے ۱۵۲۶ میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر مغلیہ خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ نئی دلّی کا لودھی گارڈن اور مسجد موٹھ لودھیوں کے عہد کی یادگاریں ہیں۔

دین پناہ اور پرانا قلعہ

۲۷ اپریل ۱۵۲۶ کو دلی میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بابر ۱۵۳۰ میں فوت ہو گیا مگر دلی میں اس نے بہت کم وقت گزارا۔ اس کے بیٹے ہمایوں نے ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا جس کا نام دین پناہ تجویز ہوا۔ اس کے لیے پرانے شہر اندر پرستھ کی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ ۱۵۳۳ میں قلعے اور نئے شہر کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ قلعے کی تکمیل ۱۵۳۸ میں ہو گئی مگر ۱۵۴۰ میں ہمایوں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ پندرہ سال بعد جب فتحیاب ہو کر وہ دلی لوٹا تو اس نے پھر دین پناہ میں رہنا شروع کر دیا اور شیر منڈل کو اپنی لائبریری بنا لیا۔ اسی لائبریری کی سیڑھیوں سے گر کر ہمایوں ۱۵۵۷ میں فوت ہو گیا۔ ۱۵۶۵ میں حمیدہ بانو نے ہمایوں کے مقبرے کی تعمیر شروع کی جو دلی میں مغل فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

شیر گڑھ یا دلی شیر شاہی

شیر شاہ سوری بڑا قابل حکمران تھا جس نے فنِ تعمیر میں بھی بڑی دلچسپی لی۔ اس نے


شاہجہاں آباد

دین پناہ کے قلعے میں باقی ماندہ کام کو مکمل کیا اور اندر کئی اور عمارتیں بھی بنوائیں جن میں مسجد اور شیر منڈل بھی شامل ہیں۔ اس نے شیر گڈھ بھی تعمیر کرایا جو اس کے شہر دلّی شیر شاہی کا قلعہ تھا۔ پرانے قلعے کے نزدیک لال دروازہ اور کابلی دروازہ، جو شیر گڈھ کا شمالی دروازہ تھا، دلّی شیر شاہی کی پرانے قلعے کے باہر کچھ یادگاریں ہیں۔ ۱۵۴۱ میں شیر شاہ نے صوفی بختیار کاکی کا قطب کے پاس مقبرہ بھی بنوایا۔ اس کے بیٹے اسلام شاہ نے لال قلعے کے پاس سلیم گڈھ کا قلعہ بنوایا۔ اکبر اور جہانگیر بھی دلی میں بہت کم ٹھہرے اور زیادہ تر آگرے میں رہے، یا فتح پور سیکری اور لاہور میں۔ لیکن اکبر کے زمانے کی کچھ عمارتیں دلی میں ہیں جیسے قطب کے پاس ادھم خاں کا مقبرہ اور اس کی دودھ پلانے والی ماں ماہم انگا کی بنائی ہوئی مسجد جو پرانے قلعے کے صدر دروازے کے سامنے ہے۔

شاہجہاں آباد

شاہجہاں آگرے میں ۱۶۲۷ میں تخت پر بیٹھا۔ ۱۶۳۹ میں اس نے دلّی کو دارالحکومت بنانے اور فیروز آباد کے پاس جمنا کے کنارے ایک نیا شہر بنانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶۳۹ میں قلعے اور شہر کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا اور دس سال میں لال قلعے اور محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ آگرے سے تختِ طاؤس کو دلی لایا گیا۔ ۱۸ اپریل ۱۶۴۸ کو قلعے اور شہر کی رسم اِجرا کی گئی۔ اعلیٰ عمارتیں بنوانے میں جو دلچسپی شاہجہاں نے لی، وہ اور کسی مغل بادشاہ نے نہیں لی۔ اس اعتبار سے شاہجہاں عظیم ترین مغل بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۶۵۰ اور ۱۶۵۶ کے درمیان جامع مسجد بنوائی۔ شاہجہاں کی لڑکیوں، جہاں آرا اور روشن آرا، اور بیگموں نے بھی مسجدوں، باغات اور بازاروں کی تعمیر میں بڑی دلچسپی لی۔ جہاں آرا بیگم نے بیگم کی سرائے بیگم کا باغ اور خواص پورہ بنوائے اور روشن آرا نے اپنے نام پر سبزی منڈی کے پاس روشن آرا باغ بنوایا۔ فتح پوری کی مسجد شاہجہاں کی ایک بیوی بیگم فتح پوری نے بنوائی تھی۔

شاہجہاں آباد کا نیا شہر ایک کمان کی شکل میں بنا تھا اور دریا کمان کے دونوں سروں کو جوڑتا تھا۔ شاہجہاں نے اس شہر کی تعمیر میں ہندو فنِ تعمیر کے ماہروں سے بھی کام لیا اور شہر

کو وسیع اور فراخ مسجدوں، خوبصورت باغات اور فواروں سے سجا دیا۔ جامع مسجد کے گرد ایک نیم دائرے کی شکل میں دارالبقا اور دارالشفا کی عمارتیں تھیں۔ شاہجہاں نے اپنے نئے شہر کی چار دیواری میں پرانے شہر کے کچھ حصے بھی شامل کر لیے تھے جیسا کہ بلبلی خانہ، کلاں مسجد جو بعد میں کالی مسجد کہلائی، بلی ماران اور کچھ محلے۔ شہر کے ایک دروازے کا نام شاہ ترکمان بیابانی کے نام پر رکھا گیا جن کا اصلی نام شمس العارفین تھا۔

یہ نیا شہر سات میل کے دائرے میں پھیلا ہوا تھا اور اس کے تین اطراف میں موٹی اور مضبوط دیوار تھی۔ شاہجہاں آباد کی اصلی دیوار ۱۶۵۰ میں پتھر اور مٹی کی بنائی گئی تھی جس پر اس زمانے میں پچاس ہزار روپے کی لاگت آئی تھی۔ مگر یہ دیوار بارشوں میں زیادہ دیر نہ ٹکی اور پھر سات سال کے عرصے میں چار لاکھ روپے کی یہ مضبوط دیوار بنائی گئی۔ یہ ۶۶۶۴ گز چوڑی اور نو گز اونچی تھی اور اس میں تیس فٹ اونچے ۲۷ برج تھے۔ دیوار کے کئی نقطوں پر بڑے بڑے مضبوط دروازے بنائے گئے۔ آثارالصنادید میں تیرہ دروازوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے دلی گیٹ، نگم بودھ گیٹ، کشمیری گیٹ، اجمیری گیٹ اور ترکمان گیٹ شاہجہاں نے بنوائے تھے اور ابھی تک موجود ہیں، اگرچہ وہ عالیشان تاریخی دیوار کئی مقامات پر توڑ دی گئی ہے۔ راج گھاٹ گیٹ، کیلا گھاٹ گیٹ، موری گیٹ، کابلی گیٹ، پتھر گھاٹی گیٹ اور لاہوری گیٹ، اب نہیں رہے۔ زینت المساجد گیٹ یا گھٹا مسجد گیٹ بھی (دریا گنج میں)، جو اورنگ زیب کے زمانے میں بنا تھا، اب نہیں رہا۔ ایک چھوٹا گیٹ، کلکتہ دروازہ مغلوں کے زمانے میں، انگریزوں نے بنوایا تھا مگر اسے ایک ریل کے پل کی توسیع میں گرا دیا گیا تھا۔ رات کو یہ سب دروازے بند کر دئے جاتے تھے اور ہر ایک دروازے پر سپاہی تعینات ہوتے تھے۔ مئی ۱۸۵۷ میں میرٹھ کے سپاہی راج گھاٹ کے دروازے سے قلعے میں کیسے داخل ہوئے تھے، یہ عقدہ آج بھی نہیں کھلا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہرے دار سپاہیوں سے مل گئے تھے۔

اس جگہ پر جہاں آج پرانا ریل کا پل ہے۔ ایک کشتیوں کا پل بنایا گیا تھا جو شاہجہاں آباد کو اس طرف کے علاقوں سے جوڑتا تھا۔

فیض بازار کا پہلا نام عزیزالنساء (اکبرآبادی) بازار تھا لیکن یہ نام جلد ہی فیض بازار میں

بدل گیا کیونکہ اس کے بیچوں بیچ فیض نہر بہتی تھی۔ اسی سڑک پر اکبر آبادی مسجد تھی جسے ۱۸۵۷ کی فتح کے بعد انگریزوں نے مسمار کر دیا تھا۔ اسی جگہ پر بعد میں ایڈورڈ پارک بنا جواب سبھاش پارک کہلاتا ہے۔

اس وقت کا چاندنی چوک بازار لال قلعے کے لاہوری دروازے سے شروع ہو کر فتح پوری مسجد تک تھا۔ اس کے بیچوں بیچ بھی نہر بہتی تھی اور دونوں طرف سایہ دار درخت تھے۔ اس نہر کا پانی صاف شفاف ہوتا تھا اور گرمیوں میں اس سے چاروں طرف ٹھنڈک رہتی تھی۔ فیض بازار اور چاندنی چوک کے ارد گرد کئی محلے اور کٹڑے آباد ہو گئے۔ دو بڑے بازار بھی وجود میں آ گئے ایک خاص بازار جو لال قلعے کے دلی دروازے سے جامع مسجد تک تھا اور دوسرا خانم کا بازار جو پریڈ گراؤنڈ پر گنجان آبادی کے لیے خرید و فروخت کا مرکز تھا۔ ۱۸۵۷ میں ان دونوں بازاروں کے آس پاس بنی حویلیوں اور عمارتوں کو انگریزوں نے پوری طرح مسمار کر دیا تھا۔

شاہجہاں آباد کے کئی محلے، بازار اور علاقے پیشے کی نسبت سے بٹے ہوئے تھے جیسا کہ بید واڑہ، دائی واڑہ، نائی واڑہ، دھوبی واڑہ اور مالی واڑہ۔ اسی طرح پیشوں کے مطابق کٹڑے تھے۔ دوراہوں اور چوراہوں پر چوک تھے جو شہر کے لیے "پھیپھڑوں" کا کام کرتے تھے۔ ان چوکوں میں بھیڑ رہتی تھی۔ بچے کھیلتے تھے، عورتیں ملتی اور باتیں کرتی تھیں اور بزرگ حقہ لیے کسی کونے پر بیٹھ کر سستاتے اور ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔

شاہجہاں آباد میں چھتیس محلے تھے۔ ہر محلے میں بڑے بڑے امرا کی حویلیاں تھیں۔ اس وقت کے چند محلوں کے نام تھے۔ کلاں محل، کوچہ رگھناتھ داس، کوچہ گھاسی رام، کوچہ استاد حامد، کوچہ استاد ہیرا، کوچہ جلال بخاری اور کوچہ چیلان۔ جب شاہجہاں آباد کی تعمیر ہوئی تو اس کی آبادی ۶۰۰۰۰ تھی مگر اورنگ زیب کے دور تک پہنچتے پہنچتے دو لاکھ تک ہو گئی۔ اس کے بعد یہ آبادی پھر کم ہوتی گئی کیونکہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی جانشینی لے لیے جنگیں ہوئیں اور بدامنی کا دور آیا۔ پھر محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں دلی کی آبادی بڑھنے لگی۔ لیکن نادر شاہ کے حملے اور قتلِ عام نے اور افغانوں کے حملے نے دلی کو پھر تہس نہس کر دیا۔ ۱۸۵۷ کی تباہی کے بعد دلی کی آبادی بہت کم ہو گئی۔

اورنگ زیب اور دوسرے مُغل بادشاہوں کے زمانے میں جن محلوں کا شاہجہاں آباد میں اضافہ ہوا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

کوچہ روح اللہ خاں، کوچہ بقااللہ، کوچہ قابل عطار، کٹڑہ سپہدار خاں (اورنگ زیب کے دور میں)

بازار سیتارام، کٹڑہ نواب، کوچہ سربلند خاں (فرخ سیر کے زمانے میں)

کوچہ رشیدی قاسم، محلہ رودگراں، کٹڑہ ارادت مند خاں، کٹڑہ سعادت خاں اور امیر خاں کا بازار (محمد شاہ کے زمانے میں)

کوچہ میر قاسم، چھتہ شاہ جی (شاہ عالم ثانی کے زمانے میں)

احاطہ کالے صاحب، محلہ گڑھیا (اکبر شاہ ثانی کے دور میں)

مغلیہ خاندان میں انیس بادشاہ ہوئے لیکن ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد حکومت کا ایسا زوال شروع ہوا جو روکے نہ رکا۔ اگرچہ ۱۷۰۷ سے ۱۸۳۷ کے درمیان تیرہ مغل بادشاہ تخت پر بیٹھے مگر صرف پانچ یا چھ ہی تاریخی اعتبار سے کم یا زیادہ اہمیت کے مالک ہیں۔ اورنگ زیب کے فوری جانشینوں میں بہادر شاہ اوّل (۱۷۰۷ سے ۱۷۱۲ تک) جہاں دار شاہ جس نے صرف ایک سال حکومت کی، فرخ سیر (۱۷۱۳ سے ۱۷۱۸ ایک) اور محمد شاہ رنگیلا (۱۷۱۸ سے ۱۷۴۸ تک) تھے۔ محمد شاہ رنگیلا نے اپنی تیس سال کی حکومت میں کئی مسجدیں اور عمارتیں بنوائیں اور اس کے ہی زمانے میں راجہ سوائی جے سنگھ نے نئی دلّی میں مشہور جنتر منتر تعمیر کرایا تھا۔ اسی کے زمانے میں نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا اور اپنے قتلِ عام اور غارت گری سے تیمور کے حملے کو بھی مات کر دیا۔ نادر شاہ اپنے ساتھ مغلوں کا مشہور تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا بھی لے گیا۔ یہ دلی کی تباہی کا دور تھا اور ۱۷۵۷ میں احمد شاہ ابدالی نے ایک دفعہ اور دہلی کے باشندوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور لوٹ مار اور غارت گری کی۔ ایرانیوں اور افغانوں کے بعد دلی کو مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں نے لوٹا اور مغلیہ حکومت کی طاقت صرف تاج و تخت تک محدود رہ گئی۔

انگریزی دور کی ابتدا

۱۸۰۳ میں کمزور بادشاہ شاہ عالم نے مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں کی مدد مانگی۔ پٹ پڑ گنج کی لڑائی میں انگریزوں کی فتح ہوئی اور انھوں نے دلّی میں ایک ریذیڈنسی قایم کردی اور شاہ عالم صرف نام کا بادشاہ رہ گیا۔ لوگ کہا کرتے تھے حکومتِ شاہ عالم از دلّی تا پالم۔ انگریزوں نے شاہجہاں آباد کی حدود میں کشمیری گیٹ کے پاس دریا گنج میں اور شہر کی دیواروں کے باہر اپنے ڈھنگ اور ضرورت کی عمارتیں بنوانا شروع کردیں۔ شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ۱۸۰۶ میں تخت پر بیٹھا اور ۱۸۲۷ تک ایسا بادشاہ بنا رہا جس کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی۔ اس اثنا میں انگریزوں کا دخل بڑھتا رہا اور بادشاہ بے بس رہا۔ انگریزوں نے ۱۸۰۹ میں دہلی کو ایک صوبہ قرار دیدیا۔

پہلی جنگِ آزادی

۱۸۵۷ میں جب میرٹھ کے سپاہیوں نے بغاوت کردی اور ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کا اعلان ہوا تو دلی ایک مرتبہ پھر تباہ ہوگئی۔ سپاہی اگلے دن دلّی پہنچ گئے اور دریا گنج کے پاس راج گھاٹ کے دروازے سے شہر میں داخل ہوگئے اور پھر لال قلعے میں گئے۔ انھوں نے بوڑھے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہنما بنایا اور شہر کی چار دیواری کے اندر انگریزوں پر حملہ کردیا۔ دلی میں ہندوستانی سپاہیوں اور انگریزوں کے درمیان یہ لڑائی چار مہینے تک چلتی رہی اور آخر کار فتح انگریزوں کی ہوئی۔ فاتح انگریزی فوج نے دلی اور ہندوستان کے دیگر مقامات پر اپنا پورا قبضہ جمالیا۔ بہادر شاہ ظفر کو ان کی بیگم اور بچے کھچے افراد کے ساتھ برما جلاوطن کردیا گیا جہاں ۷ نومبر ۱۸۶۲ کو وہ راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ انگریزوں نے فتح کے بعد دلی کو لوٹا اور ہزاروں شہریوں کو گولی سے اڑادیا یا تہہ تیغ کردیا۔ گھروں کی تلاشی لی گئی اور بوڑھوں اور عورتوں پر بھی عتاب کیا گیا۔ انگریزوں نے دلی کے سیاسی اقتدار اور اہمیت کو ختم کرنے کے لیے کلکتہ کو راجدھانی بنادیا۔

لیکن دلی کی عظمت اور اس کی سج دھج کو انگریز بھی نہ ختم کر سکے۔ انگریزوں نے اپنے تین دربار دلی میں ہی کیے، اگرچہ دلی اس وقت ہندوستان کی راجدھانی نہیں تھی۔ جارج پنجم نے دسمبر ۱۹۱۱ میں کیے گئے تیسرے دربار میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ دلی کو پھر انگریزی حکومت کی راجدھانی بنایا جائے گا۔ لارڈ ہارڈنگ نے اس فیصلے کی وجہ اِن لفظوں میں بیان کی تھی:۔

"دلی کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہندوؤں کے لیے یہ پانڈوؤں کی راجدھانی رہی ہے، مسلمانوں کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو گی کہ مغلوں کے پرانے دارالسلطنت کی شان و شوکت کو اسے انگریزی حکومت کا صدر مقام بنا کر لوٹا دیا جائے۔ دلی اتنی مشہور ہے کہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں جہاں مغل گئے ایک دلی دروازہ ہے۔ عوام تو کلکتے کی بجائے دلی کو ہی راجدھانی سمجھتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اس فیصلے سے ہندوستانیوں میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔"

جدید دَور

دلی کی عظمت اور تاریخی اہمیت سے فاتح انگریز بھی انکار نہ کر سکے۔ اس شہر کی بے مثال خوبصورتی اور اس کی شاندار تہذیب اور اس کے تمدن کے وہ بھی قائل رہے ہیں۔ اس کے بعد کی دلی کی تاریخ جدید دَور کی تاریخ ہے، نئی دلی کی تعمیر کی ہے۔ پرانے دَور کے مٹنے اور نئے دَور کے آنے کی ہے۔ جنگِ آزادی کی ہے، کانگریس کی ہے، گاندھی اور نہرو کی ہے، مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، انصاری، آصف علی، اور دوسرے سینکڑوں قومی لیڈروں کی ہے۔ دلی کا اور دلی والوں کا آزادی کی لڑائی میں حصہ بڑا بیش قیمت رہا ہے۔ یہ ہے دلی کے بننے، مٹنے اور مٹ مٹ کر ابھرنے کی مختصر داستان، اس کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر۔ دلی ایک شہر تو ہے ہی لیکن مخصوص تہذیب اور تمدن کا نام بھی ہے۔ یہ تہذیب سینکڑوں، بلکہ ہزاروں سال سے ہمارا قیمتی سرمایہ رہی ہے۔ نئے دور کے تھپیڑوں اور مغربی تہذیب کی آندھی نے اب تو اسے تقریباً مٹا سا دیا ہے۔ مگر کہیں کسی کونے کھدرے میں یہ جوں کی توں موجود ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ پھر ایک دفعہ ایک کروٹ لے اور وہ پرانی دل پذیر تہذیب، شائستگی اور اخلاقی اقدار پھر لوٹ آئیں۔

دلّی کی ایک حویلی

حویلی فارسی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا یا ایک کھلی جگہ جو لشکر یعنی فوج کے لیے مخصوص کر دی گئی ہو۔ ایسی زمینوں کی آمدنی سے فوج کا خرچ چلایا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمین کے کسی بھی وسیع ٹکڑے کو جس پر چار دیواری کھنچی ہوئی ہو اور چند کمرے یا کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہوں حویلی کہنے لگے۔ اپنے نئے معنوں میں حویلی ایک عالی شان لمبی چوڑی عمارت کو کہتے ہیں جو یک منزلہ اور کئی منزلہ ہو سکتی ہے۔ قدیم دلی میں حویلی لوگوں کی روزمرہ کی زندگی تہذیب اور معاشرے کا ایک اٹوٹ حصّہ تھی اور اس کے بغیر اس وقت کی سماجی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دلی کی حویلی کیا تھی، مغل عمارتوں کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی۔ لال پتھر کا سنگین اونچا دروازہ لوہے کی کیلوں جڑے دو پھاٹک جو ہاتھیوں کی ٹکروں سے بھی نہ ٹوٹیں، دروازے کے دونوں طرف پتھر کی دو چوکیاں پہرے کے لیے بنی ہوئیں۔ دروازے کے اندر لمبی، پیچدار ڈیوڑھی، لاج پردے کی خاطر۔ ڈیوڑھی سے تین سیڑھیاں اتر کر ایک لمبا چوڑا آنگن۔ آنگن کے بیچوں بیچ ایک اٹھ پہلو حوض اور اس میں فوارہ جس کے چاروں طرف پھولوں کے گملے رکھے رہتے تھے۔

آنگن میں ہی حوض کے پاس دو تین لکڑ ندے، انار اور کھٹے کے پیڑ ہوتے تھے۔ ہندوؤں کی حویلی میں، آنگن کے ایک کونے میں، تلسی جی کا تھانولا بھی رکھا رہتا تھا۔ ہر روز سویرے منھ اندھیرے گھر کی عورتیں نہا دھو کر تلسی جی کی پوجا کرتیں اور جل چڑھاتی تھیں۔ کاتک کے مہینے میں تلسی جی کو

چنری چڑھائی جاتی تھی۔ جب گھر کی بہو بیٹیاں کہتیں۔ جو میں پونو پڑوا نہائی۔ جانو سارا کاتک نہائی۔ تو بڑی بوڑھیاں کہتیں۔ جو میں جانتی ایسا پُن۔ کاتک نہاتی تیسوں دن۔

تلسی پنج مہا پیا پیاری
کر پر تگیا بکٹ سنواری
تلسی جی کا برلا تھلا سلائے
تین بیر نارائن آئے
آپ پھریں اوروں کو تاریں
مات پتا کو وہی نستاریں
تلسی ماتا ارگھ تمہارا۔۔۔۔ دھرم تمہارا

گھر کی عورتیں تلسی ماتا کی کہانی بھی سنایا کرتی تھیں۔

آنگن کے ایک طرف محراب دار دالان در دالان تھے اور دالانوں کے پہلوؤں پر دو طرفہ کوٹھے کوٹھڑیاں بھی تھیں۔ دالانوں میں پردے پڑے رہتے تھے۔ پردے بہت موٹے اور بھاری ہوتے تھے۔ جاڑوں میں پردے گرا دو تو سردی نام کو بھی نہ آئے۔ گرمیوں میں پردے ہٹا دو تو کھلے صحن کا مزہ آئے۔ پردوں کا یہ کمال تھا کہ جاڑوں میں سخت سردی میں باہر نکلو تو بتیسی بجنے لگے لیکن اندر آ جاؤ تو ٹھنڈ اور ہوا کا نام نہیں۔ اسی طرح گرمیوں میں پردے ہٹائے نہیں کہ حدت اور تمازت ختم۔ کوٹھے کوٹھڑیوں کے اوپر تین در کے جھروکے بنے ہوئے تھے اور ان جھروکوں کے آگے کٹہرے لگے تھے۔ شادی بیاہ، تیج تہوار میں، عورتیں جھروکوں میں چلمن کے پیچھے بیٹھ کر نیچے دالان میں ناچ مجرے اور رسموں کا اچھی طرح لطف اٹھاتی تھیں۔ شادی بیاہ میں جب کوئی ناچنے گانے والی نوشے کا سہرا گاتی اور بنّے اور گھر والوں کی تعریف کے پل باندھتی تو عورتیں اپنے دوپٹّے کے پلّو میں روپے باندھ کر نیچے لٹکا کر ناچنے گانے والی کو بیل دیتیں۔ گانے والی جھک جھک کر آداب بجا لاتی اور بی نائیکہ کھڑی ہو کر پلو میں سے روپے کھول کر سازندوں کو دیتی جاتی۔

ان جھروکوں میں جانے کے لیے کوٹھڑی کے اندر سے ہی زینہ ہوتا تھا اور عورتوں کو مردانے میں سے ہو کر اوپر جانا نہیں پڑتا تھا۔ دالان در دالان اور جھرو کے سب ایک ہی چھت کے نیچے ہوتے تھے۔ گرمیوں میں تو کھلے آنگن میں ہی بیاہ شادی، تیج تہوار اور رسمیں ہو جاتی تھیں لیکن جاڑوں میں دالانوں کو خوب سجادیا جاتا تھا اور سجے ہوئے دالان محل سے لگتے تھے۔ سفید براق چاندنی کا فرش ہوتا۔ اس پر قالین بچھ جاتے اور گاؤ تکیئے لگ جاتے۔ اگالدان، پاندان چاندی کی طشتریاں اور عطردان قرینے سے رکھ دئے جاتے تھے۔ صدر نشین کے لیے فرش کے اوپر ایک چھوٹا سا قالین مسند کی طرح بچھا رہتا اور گاؤ تکیئے لگے رہتے۔ ان پر ہر روز کے استعمال کے لیے تو سفید غلاف رہتے مگر خاص خاص موقعوں پر ریشمی اور کارچوبی کام کے غلاف چڑھا دئے جاتے تھے۔ چاندنی کے چاروں کونوں پر لوہے یا سنگِ مرمر کے گنبد نما میر فرش کونوں کو دبائے رکھتے تاکہ وہ مڑ نہ جائیں اور شکن نہ پڑیں۔ مسند کے اوپر دیوار میں ایک طاق بنا ہوتا جس میں آئینہ لگا رہتا اور طاق کے حاشیے پر ابھرواں گل بوٹے بنے ہوتے تھے۔ دالانوں اور کمروں کی دیواروں پر سفیدی کی پتائی سے خوب چاندنا رہتا تھا۔ دالان در دالان کی بیچ کی دیوار میں دو پاکھوں میں ایک چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ راستہ نوکروں کے آنے جانے کے لیے بنا تھا۔ اس سے نوکر چاکر غلام گردش (پرکما کی طرح بنی گیلری) سے آکر نہایت ادب اور خاموشی سے کھڑے رہتے تھے اور میزبان کے اشاروں پر کام کرتے رہتے تھے۔

آنگن کے ایک کونے میں چوڑی چوڑی سیڑھیوں کا ایک گھیر دار زینہ اوپر کی منزل اور تکھنے پر جانے کے لیے تھا۔ اوپر کی منزل میں کئی کمرے تھے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے چھجہ تھا۔ چھجے میں رسی سے باندھ کر رسی یا تار کے چھینکے آنگن میں لٹکا دئے جاتے تھے۔ ان چھینکوں میں کھانے پینے کی اشیا اور گلاس کٹوری رکھ دی جاتی تھیں تاکہ اوپر نیچے کے چکر بچ جائیں۔ رات برات کو کسی کو بھوک لگتی تو وہ چھینکے میں رکھا برتن کھینچ کر کوئی چیز لے لیتا تھا نوکروں یا گھر والوں کو آواز دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ چھینکوں کا ایک یہ فائدہ بھی تھا کہ چوہے بلی منھ نہیں ڈال سکتے تھے۔

رہنے کے کمروں میں جگہ جگہ طاق بنے ہوئے تھے۔ ان میں سب طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزیں

رکھ دی جاتی تھیں۔ لیکن نشست کے کمروں میں بھی دیوار کے بیچوں بیچ ایک بہت عمدہ بڑا طاق بنا ہوا تھا۔ اس میں ایک آیئنہ بھی لگا ہوتا تھا۔ طاق کے حاشیوں پر عمدہ نقش و نگار بنے ہوتے تھے جن پر کافی لاگت آتی تھی۔ کمروں میں دیواروں پر سفیدی کی پُتائی ہوتی اور ان کی چھتوں پر اجلی سفید چھت گیری کھنچی ہوتی تھی۔ اس کے چاروں طرف چُنٹ دی ہوئی جھالر لٹکی رہتی۔ جب کبھی چھت کی چادر کسی طرف سے ادھڑ جاتی تھی تو چڑیوں کے لیے گھونسلہ بنانے کی ایک اچھی جگہ نکل آتی تھی۔ دن بھر چڑیاں منھ میں تنکے لے کر کارنس اور ادھڑی ہوئی چھت گیری میں آ رجا رکھتی تھیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں' دونوں کی حویلیاں ساخت کے اعتبار سے ایک سی ہوتی تھیں۔ کمروں کی آرائش بھی لگ بھگ ایک سی ہوتی تھی۔ دیواروں پر قلمی تصویریں اور شیشوں میں جڑے قطعات اور اشعار لٹکائے جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کسی خوشنویس نے موتی جڑ دیے ہیں چھت میں جھاڑ فانوس اور ہانڈیاں لٹکی ہوئی ہوتیں۔ دیواروں پر دیوار گیریاں ہوتی تھیں۔ جب کسی جھاڑ کے شیشے کی قلم ٹوٹ جاتی تو بچے ان شیشے کی قلموں کو سورج کی روشنی میں گھما گھما کر طرح طرح کے رنگوں کی کرنیں دیکھتے تھے اور خوب مزے لیتے تھے۔ چھت پر چڑھ جاتے اور چپ چاپ سورج کی روشنی میں گھما گھما کر بڑی دیر تک دیکھتے رہتے۔

کوٹھے کوٹھڑیوں میں بھاری بھاری صندوقوں میں کپڑے رکھے رہتے تھے اور زیورات اور قیمتی چیزوں کے لیے گولکیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ گولکیں ایسے بنائی جاتی تھیں کہ سوائے گھر کے بڑوں کے اور کسی کو ان کا پتہ نہ لگے۔ کھانے کے برتن بہت قرینے سے چوکے میں ہی رکھے رہتے تھے۔ ایندھن رکھنے کے لیے جو ان دنوں عموماً چری ہوئی لکڑیوں اور اپلوں پر مشتمل ہوتا تھا، چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہوا کرتی تھیں۔

یوں تو دلی کے بہت سے مکانوں اور حویلیوں میں ڈیوڑھی میں گھستے ہی پیخانے ہوتے تھے تاکہ بھنگن کو سارے گھر میں نہ گھومنا پڑے لیکن کئی مکانوں اور حویلیوں میں آنگن کے ایک کونے میں ڈیوڑھی کے پاس غسل خانے اور پیخانے بنے ہوئے تھے۔ پیخانوں میں اینٹ اور پتھر کے قدمچوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ وہاں ٹین کے ہتھے دار ڈونگے اور ہاتھ صاف

کرنے کے لیے پیلی مٹی رکھی رہتی تھی۔ غسل خانوں میں پیتل کی گنگال، پیتل کی کونڈ جس کے دو کنڈے یا دستے لگے رہتے اور بالٹی اور لوٹا رکھا رہتا تھا۔ نہانے کے لیے پٹڑے بچھے ہوئے تھے۔ میل صاف کرنے کے لیے جھانوے ہوتے تھے۔

دلی کی بہت سی حویلیوں میں صدر دروازے میں ایک چھوٹی کھڑکی یا چھوٹا سا دروازہ بنا ہوتا تھا جس میں سے کھڑے ہو کر آتے جاتے تھے۔ یا اگر صدر دروازہ پورا لمبا چوڑا مضبوط پھاٹک، بغیر کسی چھوٹے راستے کے، ہوتا تو وہ عموماً بند ہی رہتا اور اس کے اغل بغل میں ایک چھوٹا دروازہ اور ہوتا جس میں سے گھر کے لوگ جھک کر نکلتے اور اندر آتے رہتے تھے۔ مغل فنِ تعمیر میں یہ اثر عراق سے آیا تھا جہاں سولھویں اور سترھویں صدی میں بیرونی حملوں سے ڈر کر لوگ ایسے مکان بناتے تھے جو چھوٹے چھوٹے قلعے ہوتے تھے اور جن کے آنے جانے کے دروازے اتنے چھوٹے بنائے جاتے تھے کہ بغیر جھکے نہ کوئی اندر آسکتا نہ باہر جا سکتا۔ دلی کی حویلیوں میں اندرونی محافظت کچھ عراق کے مکانوں کے نمونے پر ہی تھی یعنی دالان در دالان، ڈیوڑھیاں، تہ خانے، دوہری دیواریں لیکن دروازے نہایت بلند اور شاندار ہوتے تھے۔

کمروں کی چھتوں میں فرشی پنکھے لٹکے رہتے تھے۔ انھیں دو تین کڑیوں سے لٹکایا جاتا تھا۔ ان پنکھوں میں کپڑے یا چٹائی کی جھالر لگی ہوتی تھی۔ پنکھوں کی رسیوں کو کھینچنے والا نوکر یا چھوکرا اپنے پیر کے انگوٹھے میں گرہ دے کر اٹکا لیتا تھا اور دن بھر لیٹے لیٹے کھینچتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو کھینچتے کھینچتے وہ خود بھی اونگھ جاتا تھا تو بھی پیر کا انگوٹھا کام کرتا رہتا۔ گھر کے ہر کمرے میں نواڑ کے نفیس اور عمدہ پلنگ بچھے رہتے تھے۔ پلنگوں کے اوپر چادریں بچھی رہتی تھیں اور سرہانے کی طرف نرم نرم تکیے رکھے رہتے تھے۔ ان تکیوں پر تنزیب یا نین سکھ کے کڑھے ہوئے غلاف چڑھے رہتے تھے۔

حویلی میں شاگرد پیشہ کے رہنے کے لیے بھی کوٹھریاں ہوتی تھیں۔ گھر کے نوکر چاکر ان میں ہی رہتے تھے۔ شاگرد پیشے کے سامنے اندر کی طرف اور ایک پہلو میں اونچی دیوار بنی ہوتی تھی جن سے پردہ اور اوٹ ہو جاتی تھی۔ اس زمانے کے نوکر اتنے وفادار ہوتے تھے کہ مر کر ہی نکلتے تھے۔ بچے ان کی عزت گھر کے بڑوں کی طرح کرتے تھے اور وہ بھی بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔

صحن، ڈیوڑھی اور دروازے کے باہر کی نشست کے لیے مونڈھے بچھے رہتے تھے۔ یہ مونڈھے سینٹھے اور بانوں سے بنائے جاتے تھے اور مضبوطی کے لیے ان مونڈھوں کے کناروں پر چمڑا چڑھوا لیتے تھے۔

حویلی کے دروازے کی ڈیوڑھی کے ایک ہاتھ پر مردانہ نشست گاہ ہوتی تھی جسے دیوان خانہ اور بیٹھک بھی کہتے تھے۔ اس میں مردوں اور بچّوں کے سوا اور کوئی نہیں آتا تھا۔ مردوں کے دوست اور ملنے جلنے والے اسی میں آکر بیٹھتے تھے۔ عورتیں اندر محلسرا میں ہی رہتی تھیں۔

حویلی کے اندر، دالانوں کے نیچے تہ خانے ہوتے تھے۔ ان میں تخت بچھے رہتے تھے۔ گرمیوں میں آندھی، لو اور تپش سے بچنے کے لیے سارا کنبہ ان تہ خانوں میں آرام کرتا تھا۔ ان تہ خانوں کے روشندان گلی میں کھلتے تھے جس کی وجہ سے کافی چاندنا رہتا تھا۔ تہ خانوں کے فرش اور دیواریں کوڑیوں سے گھٹی رہتی تھیں۔ سیل کا ڈر نہیں ہوتا تھا۔ اتنی ٹھنڈک ہوتی تھی کہ سرد خانوں کو بھی مات کرتے تھے۔

حویلی کے ڈھر اوپر لمبی چوڑی کھلی چھتیں ہوتی تھیں۔ ان میں برساتیاں بھی بنی ہوتی تھیں بارش کے پانی کے نکلنے کے لیے چھتوں کی منڈیروں کے ساتھ موریاں بنائی جاتی تھیں اور پانی نیچے گلی میں بنی نالیوں میں گر کر بہہ جاتا تھا۔ برسات شروع ہونے سے پہلے اور برسات کے بعد کے گرمیوں کے دن تو تہ خانے میں بیت جاتے مگر رات کو کھلی چھتوں پر بان کی چارپائیاں ڈال لیتے۔ چارپائیوں پر بچھی چاندنیوں پر تکیوں کے سرہانے مولسری اور چمپا چمیلی کے پھول رکھ دئے جاتے جن کی مہک سے دماغوں میں تراوٹ رہتی تھی۔ جب امس اور گھٹن ہوتی تھی اور اوپر سے آگ برستی تو ان مونجھ کی چارپائیوں پر پانی چھڑک دیتے تھے اور کبھی کبھی گلاب یا کیوڑا بھی چھڑک دیا جاتا تھا۔ جب کبھی مینھ برسنے لگتا تو چارپائیوں کو کھینچ کر برساتیوں کے اندر کر لیتے۔ حویلیوں کی چھتیں اتنی وسیع ہوتی تھیں کہ گھر میں جب کوئی تقریب ہوتی یا ضیافت ہوتی تو کئی کئی پنگتیں ایک ساتھ جیم لیتی تھیں۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے جو چھجہ ہوتا تھا، اس کی چھت میں طوطے،

13 4 1 5 0

مینا، لال اور پدڑیوں کے پنجرے ٹنگے رہتے تھے۔ ان پرندوں کی بولیاں سن کر سب کو بڑا لطف آتا تھا۔ طوطے لٹوتیاں بھی ہوتے تھے اور پہاڑی بھی۔ پہاڑی طوطا بہت جلدی سیکھ جاتا تھا۔ کاکتوا بھی خوب بولتا اور سیٹی تو بہت زور سے بجاتا تھا۔ طوطا بولتا رہتا۔ "مٹھو رام رام کہو۔ مٹھو بھوکے ہیں۔" کئی طوطے تو یہاں تک بول لیتے۔ "سیتا پت کی کوٹھڑی چندن جڑے کواڑ، تالی لاگی پریم کی، کھولو کرشن مرار۔" عام طور پر طوطے سبھی دلّی والوں کی حویلیوں میں پالے جاتے تھے۔ کلکتے کی مینا، جو بنگالی مینا اور آغا مینا بھی کہلاتی تھی، طوطے سے بھی صاف بولتی تھی۔ چھوٹی بچیاں جب پیاری پیاری باتیں کرتیں تو عورتیں پیار سے "میری آغا مینا" کہہ کر ان کا منہ چوم لیتیں۔

آنگن کے اوپر اور چھجے کے نیچے کبوتروں کی کابکیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ جس گھر میں کبوتر ہوں اس گھر میں بیماری نہیں آتی۔ حویلی میں بنی کابکوں میں لقا اور شیرازی کے جوڑے بھی ہوتے اور کابلی بھی۔ یہ کبوتر کبھی کابکوں سے نکل کر آنگن میں دانا چگتے اور کبھی چھت پر بنی چھتری پر جا بیٹھتے۔

بہت سی حویلیوں کے اندر یا اُن سے لگا ایک کنواں بھی ہوتا تھا۔ کنویں پر دن رات کھنچائی رہتی تھی۔ دُور دور سے پنہارے آکر بہنگیوں میں دھرے کلسے پانی سے بھر کر کندھوں پر لے جاتے تھے۔ سقّے اور بہشتی بھی مشکوں کو کنویں کے پانی سے بھر کر گلی کی موریاں دھلوایا کرتے تھے۔ کنویں کی سوت کے پانی پر سب کا حق ہوتا تھا۔ کسی کے چھپر میں آگ لگ جاتی تو سارے محلے والے کنویں سے پانی بھر بھر کر آگ بجھاتے۔ کبھی چرخی کی خرابی سے یا رسی کے ٹوٹ جانے سے ڈول کنویں میں گر جاتا تو لوہے کا بڑا کانٹا ڈال کر نکال لیتے۔ مگر ڈول کے گرنے کی آواز دور دور تک جاتی اور ایک شور سا مچ جاتا اور بچے اور بڑے بھاگ بھاگ کر کنویں پر آتے۔

ہندوؤں کی حویلی میں کنویں کے پاس ہی، ایک چھپر کے نیچے گائے بندھی رہتی تھی۔ کنویں کی طرح یہ چھپر بھی حویلی کا حصّہ ہوتا تھا۔ صبح سویرے گوالا آتا، دودھ بھی دوہتا، سانی بھی کرتا اور دن میں گائے کو چرانے کے لیے جنگل بھی لے جاتا۔ گھر والے باہر جاتے وقت گئو ماتا کے آگے ہاتھ جوڑتے اور پرارتھنا کرتے کہ سب کام سدھ ہوں اور دن آرام سے کٹے۔

پرندوں کے پانی پینے کے لیے بھی حویلی میں کئی جگہ، آنگن میں، چھت پر اور چھجے پر مٹی کے برتن پانی سے بھر کر رکھ دئے جاتے تھے۔ ان میں سے دن بھر، باہر کے پرندے آکر پانی پیتے اور پھر اڑ جاتے تھے۔ پرندوں کے لیے حویلی کے احاطے کی دیواروں میں بہت خوشنما اور نہایت عمدہ وضع قطع کے چھوٹے چھوٹے گھر بھی بنوا لیتے تھے۔ ان موکھلوں میں طرح طرح کے پرندے نہایت اطمینان سے اپنے گھونسلے بناتے رہتے تھے۔ یہ موکھلے بلّی کی زد سے محفوظ رہتے تھے کیونکہ کافی اونچائی پر بنائے جاتے تھے۔ گھر کے لوگ ان پرندوں کی بھی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے اور اگر کوئی پرندہ سخت گرمی میں بے ہوش ہو جاتا یا کسی وجہ سے زخمی ہو جاتا تو اسے جین مندر والے پرندوں کے ہسپتال میں لے جاتے جہاں انہیں ٹھیک ہونے پر آزاد کر دیا جاتا۔

حویلی کے احاطے کی دیواریں عام طور پر دوہری ہوتی تھیں۔ مغلوں کے آخری ٹمٹماتے دور میں ہر وقت لٹس کا ڈبکا لگا رہتا تھا۔ ان دنوں جب کبھی ایسی آفت آتی تو قیمتی زیور اور نایاب اشیا، روپیہ پیسہ گلکوں اور زمین میں بنے چو بچوں میں سے نکال کر ان ہی دوہری دیواروں کے بیچ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ حفاظتی پہلو سے حویلی کیا، ایک جڑاؤ پتھروں کا صندوق تھا!

حویلی کا رہن سہن

حویلی کی زندگی بھی کیا خوب تھی۔ جہاں تنڑ کا ہوا، ساری حویلی میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ باہر جانے والے کثرت کے شوقین لڑکے پھاٹک سے نکل کر گلی میں آ چکے ہیں۔ چھت پر کسرت کرنے والے لڑکے چھت پر پہنچنے والے ہیں۔ ہندو حویلی میں عورتیں کبھی کی جاگ کر کنوئیں کے پانی سے اشنان کر چکی ہیں اور پوجا کر رہی ہیں۔ مسلم حویلی میں بھی بڑے بوڑھے اور بڑی عورتیں جاگ گئی ہیں اور دادی اماں اپنے کمرے میں ہی جا نماز بچھا رہی ہیں۔ پل کے پل میں بچے جاگنے والے ہیں اور بچے جاگ گئے تو ان کی مائیں بھی اگر نہیں جاگی ہیں تو جاگ جائیں گی۔ بچوں کے منہ دھلنے شروع ہو جائیں گے۔ پھر ان کی دھما چوکڑی ایسی ہو گی کہ رات تک بھی ختم نہیں ہو گی۔ سکول جانے والے بچوں کی تیاری پہلے کرانی ہے۔ ان کے جانے سے غل غپاڑے میں کمی ہو گی۔ مگر جو بچے سکول نہیں جاتے وہ تو بہت ہی آفت مچاتے ہیں۔ ایک نے دوسرے کو دھکا دیا، کسی نے کسی کی چوٹی کھینچی، کوئی کسی کا کھلونے لے کر دوڑ گیا، بس دن بھر یہی ہوتا رہیگا۔ بس جب دو گھڑی گلی میں نکل جائیں گے تو چین پڑے گا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کا ایک قدم گلی میں ہوتا ہے تو دوسرا حویلی میں۔

اب گلی میں سویرے سے ہی سودے والے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ سودے والے بھی جانتے تھے کہ گھر میں کیسا بھی عمدہ ناشتہ تیار کیوں نہ ہو گھر والے ان کی آواز پر ضرور نکلیں گے اور ان سے چیزیں لیں گے۔ ویسے بھی دلی والے چٹورے مشہور تھے اور جب تک ناشتے میں یا

کھانے میں ایک آدھ چیز بازار کی نہ ہوتی' مزہ نہ آتا۔ بھاڑ کے بھنے چنے بیچنے والا' تلنگنی وچوں والی دولت کی چاٹ والا' اور مکھن کی گولیاں بیچنے والا بہت سویرے آنے والوں میں تھے۔ بچے تو اپنی من پسند چیز خریدتے ہی تھے مگر بڑے بھی ہر خوانچے والے کو بٹھا لیتے اور چیزوں کے دونے بھر بھر کر اندر لے جاتے۔ بچے بڑے سب چیزیں بانٹ کر کھاتے تھے۔ چٹ پٹی اور بڑھیا چیزوں کے کھانے میں دلی والوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ان دنوں لوگوں کی زندگی اپنے کنبوں کے گرد گھومتی تھی۔ کسی قسم کا الگ پن انہیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ اگر کوئی آدمی کوئی خاص مرتبہ یا اعزاز حاصل کر لیتا تھا تو اس کا سرچشمہ اس کے کنبے کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ لوگ زیادہ تر اپنا وقت اپنے کنبے میں ہی صرف کرتے تھے۔ کنبے کا بڑا' دادا یا پڑ دادا ہوتا تھا اور سارا کنبہ مل جل کر رہتا تھا۔ یہ نہیں کہ کسی کی شادی ہوئی اور وہ علیحدہ ہو گیا۔ اس لیے کنبے میں دادی اور پڑ دادی کے علاوہ ڈھیر سارے چاچا' چاچیاں' چچازاد بھائی اور بہنیں' بچے اور پوتے اور پوتیاں ہوتی تھیں۔ بڑوں کی نہ آج کی سی سرگرمی اور رفتار ہوتی اور نہ ہر گھنٹے دنیا بھر کی خبریں سننے سنانے کا سوال۔

کنبے میں جو بھی کچھ ہر روز ہوتا اسی پر بات چیت ہوتی اور اسی پر تجویزیں بنتی اور بنائی جاتیں۔ ان ہی سے مسرت' جوش اور ولولہ حاصل کرتے۔ دوسرے لفظوں میں آدمی اپنے کنبے کے لیے جیتا اور مرتا تھا۔ حویلی کی زندگی اس اعتبار سے ایک طلسماتی اور حفاظتی چھوٹی سی دنیا تھی جو پیار اور شفقت کے مضبوط اور اٹوٹ رشتوں سے بندھی ہوئی تھی۔ کنبے کا ہر فرد یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ کنبے کا ہے اور کنبہ اس کا ہے۔ اس میں اپنے کنبے کے لیے صحیح بات کہنے اور کرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا تھا۔

کنبے کے سب سے بڑے بزرگ کے دل میں اپنے کنبے کے لیے بے حد پیار ہوتا تھا۔ وہ بڑا رحم دل ہوتا تھا لیکن جہاں چلن اور اصول کا سوال آئے گا وہاں وہ سخت بھی ہو جائیگا۔ کنبے کے لیے اس کے فرمان پر عمل کرنا لازمی ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ گھر کا یہ بزرگ کنبے کے دکھ درد اور اس کی بھلائی برائی کو ہمیشہ دھیان میں رکھتا اور جو بھی وہ فیصلہ کرتا وہ اپنے عزیزوں کی بہتری اور کنبے کی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے ہوتا تھا۔ چھوٹے نہ صرف بڑوں کی عزت

کرتے تھے بلکہ ان سے ڈرتے بھی تھے اس لیے بزرگوں کا حکم ماننا اوران کی ہدایت پر عمل کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بڑے بھی بچوں سے کبھی سختی سے نہ بولتے۔ بڑوں کی دیکھ ریکھ میں بچے وہ سب کچھ سیکھ لیتے تھے جن سے ان کی تہذیب اور شائستگی کا پتہ چلتا تھا۔ہندوستان کی بہترین روایت یہی رہی ہے کہ بچے بڑے شائستہ اور تمیزدار ہوں۔

گھر کے تمام بزرگ نہ صرف اپنے سے چھوٹوں کی پوری نگہبانی اور دیکھ بھال کرتے تھے بلکہ ان کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ اگر کوئی بچہ یا کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی بیمار پڑ جاتی تو وہ اس کی پوری تیمارداری کرتے اوران کی ساری توجہ اس طرف لگ جاتی کہ اسے پورا آرام اور جلدازجلد شفا ملے۔ اس لیے وہ ہر بے آرامی اور تکلیف کو خندہ پیشانی سے سہتے اور اکثر اپنا دن کا آرام اور رات کی نیند قربان کردیتے۔ وہ بار بار مریض یا مریضہ کے بارے میں دریافت کرتے اور اس کے پاس جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ بیمار سے زیادہ ان کی بے چینی بڑھ جاتی۔ اگر گھر میں کسی کو کوئی پریشانی ہوتی یا مشکل آن پڑتی تو گھر کے بزرگ جب تک کہ اس کی وجہ نہ جان لیتے، چین سے نہیں بیٹھتے۔ اس کا حل ڈھونڈنے میں لگ جاتے اور جبتک کوئی راستہ نہ نکل آتا، ساری پریشانی ان کے سر پر ہی ہوتی۔ مگر جب ان کی خود کوئی پریشانی یا بیماری ہوجاتی تو وہ گھر میں کسی سے اس کا ذکر نہ کرتے اور اپنا روزمرہ کا کام کرتے رہتے۔ وہ خاموشی سے تکلیف برداشت کرتے رہتے اس ڈر سے کہ ان کی وجہ سے گھروالوں کا سکھ چین جاتا رہے گا۔

ان دنوں کنبے میں کمانے والے صرف چند ہوتے تھے اور کھانے والوں کی کوئی گنتی نہ ہوتی۔ ہر کمانے والا آدمی اپنی پوری تنخواہ یا آمدنی کنبے کے سب سے بڑے بزرگ کو جوں کی توں تھمادیتا تھا۔ یہ بزرگ گھر کے ہر فرد کی ضرورت کا بے غرضی سے پورا خیال رکھتا تھا۔ اگر کوئی بچہ کسی خواہش کا اظہار کرتا تو اسے دوسری ضرورتوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ لیکن گھر میں کسی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاتا تھا۔ مثلاً اگر نئے کپڑے سلنے ہیں تو سب کے سلیں گے۔ جہاں تک ممکن ہوتا سب کی جائز ضرورتوں کو پورا کیا جاتا۔ اسی وجہ سے سارے گھر والے بھی اپنے بزرگوں کی بے حد عزت کرتے تھے۔

مشترکہ کنبوں کے فائدے بھی تھے، نقصان بھی۔ مجموعی طور پر فائدے زیادہ تھے، اگر اس وقت کے رہن سہن اور طور طریقوں کو دیکھا جائے۔ شادی بیاہ کے بھی اپنے سکھ اور جھنجھٹ ہوتے تھے۔ دلّی کی ایک مثل تھی ”منگنی ہوئی کتاب سے گئے“۔ بہت سے گھروں میں پڑھتے ہوئے لڑکا کا ہی رشتہ طے ہو جاتا تھا مگر اس لڑکے کا پھر پڑھائی لکھائی میں جی نہ لگتا۔ پھر شادی ہو جاتی تو لڑکا اپنی بیوی میں اتنا مست ہو جاتا کہ ماں باپ کا خیال بھی نہ کرتا۔ اسی موقعے کے لیے یہ کہاوت تھی ”شادی ہوئی ماں باپ سے گئے“۔ اولاد کے ہوتے ہی لڑکے کو اپنی سُدھ نہ رہتی اور اس کے لیے کہا جاتا تھا ”اولاد ہوئی اپنے آپ سے گئے“۔ بچے کا پالنا بھی عورت کی تندرستی اور حسن پر اثر انداز ہوتا تھا اور اس کے لیے یہ کہاوت تھی ”ایک لال پالے، سارا جوبن گھالے“۔

عورتوں کی شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ گھر کی کوئی عورت چاہے اس کی شادی ہوئے کئی سال ہو گئے ہوں اور وہ کئی بچوں کی ماں ہو اپنے شوہر سے گھر کے بزرگ کے سامنے بات نہ کرتی۔ گھر کے کام کی ذمے داریاں بھی سب مل کر نبھاتے تھے۔ کچھ کام جو مردوں کے کرنے کے ہوتے تھے ان کے سپرد کر دئے جاتے اور کچھ کام عورتیں کرتیں۔ دوسرے لفظوں میں سارے کنبے کا کام بڑے آرام اور سلیقے سے ہوتا اور کبھی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔

البتہ چھوٹے بڑوں میں بعض دفعہ تال میل کی کمی رہ جاتی۔ دو نسلوں کے درمیان جو خلیج ہوتی ہے وہ کئی دفعہ ایک دوسرے کو سمجھنے سے روک دیتی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ بزرگ نوجوانوں کے لیے خود ہی تجویزیں بنا لیتے اور ان سے صلاح کیے بغیر ان پر عمل کرنے لگتے۔ گھر میں نوجوان اتنے بڑے تو ہوتے ہی تھے کہ اپنا برا بھلا سوچ سکیں اور ان کی اپنی بھی پسند اور ناپسند ہوتی تھی۔ مگر اُس زمانے میں بزرگوں سے بحث کرنا یا ان کے فیصلے کی مخالفت کرنا جو انھوں نے اپنی دانائی اور تجربے سے کیا ہے بے ادبی سمجھی جاتی تھی۔ جب کسی نوجوان کو یہ بھی پتہ لگتا تھا کہ اس کا رشتہ کسی ایسی لڑکی سے طے کیا جا رہا ہے جس سے وہ بالکل ناواقف ہے، تو بھی اس کے لیے بزرگوں کے فیصلے کو ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

مستورات میں پردہ بہت سخت ہوتا تھا اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک

دوسرے سے ملنا تو درکنار، ایک دوسرے کو دیکھنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ ان دنوں دلّی کی یہ عام کہاوت تھی ــ "آگ اور پھوس کا بیر ہے"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نوجوان لڑکے اور لڑکی کا ملنا آگ اور پھوس کا ملنا ہے اور اس کا نتیجہ وہی نکلے گا۔ اس بارے میں ایک نوجوان پر بیتے واقعے کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ یہ نوجوان بڑا حسین تھا اور بعد میں ایک مشہور فلم سٹار ہو گیا تھا۔ وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ برابر کے گھر سے ایک حسین لڑکی ہر روز دوپہر کے وقت چھت پر آ کر کپڑے سکھاتی تھی۔ ایک روز ہمت کر کے وہ بھی اس سے ملنے چھت پر چلا گیا۔ لڑکے اور لڑکی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر دونوں ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔ تاہم دونوں پہلی ہی نظر میں محبت کا شکار ہو گئے۔ لڑکی کا دادا ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنی دونوں ٹانگیں کرسی کے دونوں لمبے بازوؤں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے برابر میں اس کا حقّہ رکھا ہوا تھا۔ وہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان جو کچھ ہو رہا تھا اسے جانتا تھا مگر ظاہرہ طور پر وہ سویا ہوا تھا تین چار روز کے بعد لڑکا حیران رہ گیا جب دادا نے زور سے آواز دی" اوپر کون ہے؟" نوجوان لڑکے نے انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اور لڑکھڑاتی زبان سے اپنا نام بتایا اور بولا کہ میں تو اپنے کبوتر کی تلاش میں اوپر آیا تھا۔ لڑکی کا دادا ہنس پڑا اور بولا ــ" برخوردار بہتر یہی ہوگا کہ تم اس کے پر کاٹ رکھو ورنہ کبوتر جلد ہی اڑ جائے گا۔" اس کنایے کو سن کر نوجوان سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی اس لڑکی کی شادی ہو گئی اور اس طرح سے یہ چند روزہ رُومان ختم ہو گیا!

گرمیوں میں عام طور پر سب لوگ کھلی چھت پر سوتے تھے۔ چھوٹی بہو بیٹیاں بڑوں سے دور دوسری ملی ہوئی چھت پر سوتی تھیں۔ ایسی ہی ایک رات کو ایک حویلی میں ایک نوجوان لڑکا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی بے تاب ہو گیا اور اپنی بیوی سے ملنے کی شدید خواہش کو نہ دبا سکا۔ لیکن وہ بہت دیر تک اپنے بستر کو نہ چھوڑ سکا مبادا اس کی اس حرکت پر کسی کی آنکھ کھل جائے اور اسے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ آخر کار جب اسے محسوس ہوا کہ سب سو گئے ہیں تو اس نے ہمت کی اور اٹھ کر اپنی بیوی کی چارپائی کی طرف

دبے پاؤں چلنے لگا۔ مگر اسی وقت اس کی ایک چچی کھنکاری اور سرگوشی کے لہجے میں بولی کہ برخوردار اِدھر نہیں اُدھر!

جب حویلی میں نئی دلہن آتی تھی تو ہر چھوٹے بڑے کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ ہر ایک اس کے آرام، آسائش اور ہر ضرورت کا خیال رکھتا اور سب کی یہی کوشش ہوتی کہ دلہن نئے گھر میں اپنے گھر سے بھی زیادہ آرام پائے۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ صرف دولہا ہی گھر میں ایک واحد آدمی ہوتا تھا جو دولہن سے دوسروں کی موجودگی میں بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ایک بڑے کنبے میں شوہر اور بیوی کو شاذ ہی ایک دوسرے سے ملنے کا موقعہ ملتا تھا۔ دن بھر دلہن کو گھر کی عورتیں گھیرے رہتی تھیں اور کبھی اس کو تنہا نہ چھوڑا جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اگر وہ دن میں پلنگ پر آرام بھی کرتی تو کوئی نند یا بھابی اس کے ساتھ ہی لیٹ جاتی۔

عموماً صبح کے وقت جب گھر کے مرد کام پر چلے جاتے تو مستورات جن میں بزرگ عورتیں اور چاچیاں اور بھابیاں بھی شامل ہوتیں، بیٹھ جاتیں اور دولہا اور دلہن کی شب بسری کے انتظامات کا فیصلہ کرتیں۔ ایک موزوں کمرے کا انتخاب کیا جاتا اور نوکر اس کی جھاڑو بہاری اور صفائی میں لگ جاتے۔ عورتیں خود بھی کمرے کا معائنہ کرتیں اور شام سے پہلے ہی چمچماتا ہوا کمرہ تیار ہو جاتا اور دیواروں کو تصویروں سے سجایا جاتا۔ جگہ جگہ پھولوں کے گلدستے اور دوسری آرائشی چیزیں رکھ دی جاتیں۔ فرش پر ایک دری بچھائی جاتی اور اس پر ایک خوشنما غالیچہ ایک منقش چھپر کھٹ جس کے پائے سنہری ہوتے اور جو دلہن جہیز میں لائی ہوتی ہے، کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ بستر کو بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے رنگین ریشمی فیتوں کے ساتھ پلنگ کے پایوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ کمرے میں سے آلتو فالتو سب چیزیں نکال دی جاتیں۔ عموماً ایک تپائی پلنگ کے پاس سرہانے کی طرف رکھ دی جاتی سرخ لٹوں کے بنے چار پتلے اور لمبے تکیے جو پلنگ کی چوڑائی کے برابر ہوتے تھے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دئے جاتے تھے۔ ان پر عمدہ کڑھے ہوئے غلاف چڑھے ہوتے تھے۔ ان کے اوپر ہتھیلی جتنے بڑے نرم سلک کے گل تکیے رکھ دئے جاتے تھے۔ نیچے کی طرف پہلوؤں کی جانب رانوں کے لیے گول تکیے بھی رکھے جاتے تھے۔

شام کو تازہ مہکتے ہوئے پھولوں کی لڑیاں پلنگ پر ٹانگ دی جاتیں اور دیواروں، کونوں اور آلوں دوالوں میں اگر کی بتیاں لگادی جاتیں اور تمام کمرہ مہک اٹھتا۔ جب رات کافی ہوجاتی تو دلہن کی بھابیاں اور نندیں دلہن کو لے جاکر اسے دروانے میں سے اندر دھکیل دیتیں۔ قدرتی شرم وحیا کے سبب دلہن اپنے آپ اندر کبھی نہ جاتی اگلی صبح جب دولہا کمرے سے باہر نکل آتا تو بھابیاں اور نندیں اندر گھس جاتیں اور بڑی دیر تک دبی دبی ہنسیوں، قہقہوں اور چھیڑ چھاڑ کی آوازیں آتی رہتیں۔

ایک دفعہ ایک بھابی نے جب دیکھا کہ تکیے پر یہ مصرعہ کڑھا ہوا تھا ــــ " نہ چھیڑ اے نسیم بہار سونے دے" تو اس نے حیا سے سرخ ہوتی ہوئی دلہن کو طعنہ دیا ــــ کیا نسیم بہار تمہارا نام ہے ؟

حویلی کی زندگی کا ایک خوشگوار پہلو یہ تھا کہ بزرگ ہر صبح گھر کے چھوٹے بچّوں کے ساتھ بڑا وقت صرف کرتے تھے۔ ہر صبح مائیں اس بات کو دیکھتی تھیں کہ بچے منہ ہاتھ دھوکر صاف ستھرے کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ تیاری کراتے کراتے مائیں بچّوں کو کچھ ضروری باتیں بھی بتاتی جاتی تھیں مثلاً " دانت میں منجن، آنکھ میں انجن نت کر نت کر۔" یا "کان میں تنکا، ناک میں انگلی مت کر، مت کر۔" بچّوں کے ہاتھ پاؤں کے ناخنوں کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی کہ بڑھے ہوئے نہ ہوں۔ جب بچے ہر طرح سے تیار ہو جاتے تو انہیں کہا جاتا تھا کہ بزرگوں کے سامنے پیش ہوں اور انہیں آداب وسلام کریں۔ بزرگ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں دعا دیتے ــــ اِتّا بڑا، کڑوے نیم سے بھی بڑا۔

وہ بچوں کو اپنے پاس پیار سے بٹھا لیتے تھے اور ان سے کہا کرتے تھے کہ اپنی آنکھیں بند کرو اور پھر وہ انہیں پڑیوں میں لپٹی ہوئی مٹھائی اور خشک میوہ دیتے جسے پاکر بچّوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا اور وہ خوشی کے مارے چیختے چلاتے اور اچھلتے۔

گھر کے بزرگ بہت دیر تک بچوں کے ساتھ کھیلتے۔ پیٹھ کے بل لیٹ کر اور بچّوں کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر " مجو مجوسے" کرانا ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اس سے بچے بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ گھر کے دوسرے بڑے بھی بچّوں کے ساتھ کھیلتے رہتے (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کوئی کسی بچے کو مشک کی طرح پیٹھ پر اٹھا لیتا اور اسے اوپر نیچے کرتا رہتا۔ بچے خود بھی کھیل کرتے رہتے تھے۔ دائرے میں بیٹھ جاتے تھے اور اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر اٹکن بٹکن[۲] کھیلتے۔ بڑے ان کا کھیل دیکھتے رہتے اور کسی بات میں بچوں کی لڑائی ہونے لگتی تو فیصلہ کروا دیتے۔ بہت چھوٹے بچوں کو جو چل بھی نہیں سکتے تھے گڑولنوں پر چڑھا کر چلنا سکھایا جاتا۔ اگر کوئی بچہ گر پڑتا تو بڑا اسے چپ کرانے کے لیے فرش کو کوٹتا اور کہتا جاتا۔ بچے کو کیوں گرایا، بول پھر گرائے گا؟ بچہ سمجھتا کہ فرش کو مار پڑ رہی ہے اور وہ روتا روتا ہنسنے لگتا۔ یہ کھیل کافی دیر تک چلتے رہتے اور جب بڑوں کے کام پر جانے کا وقت ہو جاتا تو ایک ایک بچے کو باری باری کانوں پر سے اوپر اٹھا کر کہتے،

"آ تجھے دلّی دکھاؤں!"

بچوں اور بڑوں کے یہ کھیل یہیں نہیں ختم ہو جاتے بلکہ رات کو پھر ہوتے۔ بچے دادا

---

[۱] جو جو کے پائی کے
کانا کوٹ بلائی کے
راستے میں ایک کوڑی پائی
کوڑی میں نے بھڑبھونجے کو دی
بھڑبھونجے نے چنے دئے
چنے میں نے گائے کو کھلائے
گائے نے مجھے دودھ دیا۔
دودھ کی میں نے کھیر پکائی
کھیر میں نے مور کو چٹائی
مور نے مجھے پنکھ دیا
پنکھ میں نے راجہ کو دیا
راجہ نے مجھے گھوڑی چڑھایا

ہٹو ہٹو راجہ بیٹے کی سواری آ رہی ہے!

[۲] اٹکن بٹکن دہی چٹاکن
اگلا جھولے، بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے
پھول پھول کی بالیاں
با واگئے بدیس
لائے سات کٹوریاں
ایک کٹوری پھوٹ گئی
نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی

دادی اور دوسرے بڑوں کے بستروں پر جائے بغیر نہ سوتے۔ کہانیوں کی فرمائش بھی کرتے اور بڑے دھیان سے سنتے۔ اکثر بچے کہانی سنتے سنتے سو جاتے اور پھر بڑے انہیں گود میں اٹھا کر ان کی ماؤں کے پاس پہنچاتے۔ اس طرح سے بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان ایک خوشگوار رابطہ قایم رہتا اور شفقت اور محبت اور جڑیں پکڑ لیتیں۔ رات کو جب سب سو جاتے اور حویلی میں خاموشی چھا جاتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کنبے کی محبت اور پیار سے گندھی زندگی کسی چھوٹی سی مٹھی میں بند ہو گئی ہو جو صبح ہوتے ہی پھر کھل جائے گی!——

دلی کی حویلی ایک ایسی ہی مٹھی تھی۔

ایک نور آدمی، ہزار نور کپڑا

ایک پرانی کہاوت ہے ——"ایک نور آدمی، ہزار نور کپڑا" آدمی کا رنگ و روپ چاہے کیسا بھی ہو لیکن اچھے لباس کی پھبن کی بات ہی نرالی ہوتی ہے۔ اچھی وضع قطع کا کپڑا پہن کر آدمی کی سج دھج میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عمدہ لباسوں کے تنوع میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر وقت اور دور میں نہ صرف نئے نئے کپڑوں کا رواج ہوا بلکہ ملبوسات کی وضع قطع میں بھی خوشگوار تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ چونکہ عمدہ لباس سے انسانی حسن اور وقار دو بالا ہو جاتا ہے، اس لیے کپڑے کو' ہزار نور' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مغلوں اور راجپوتوں کے میل جول اور آپس کی بیاہ شادیوں نے ہندوستانی پہناوے کو ایک نیا ہی روپ عطا کر دیا۔

ہندوستانی لباس کی تاریخ پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ پرانی کتابوں اور ایلورا اور اجنتا کے غاروں میں بنی تصویروں سے پتہ لگتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے شاید سلے ہوئے کپڑے پہننے کا رواج نہیں تھا۔ عورتیں اور آدمی اپنے بدن کو بے سلی چادروں، ساڑھیوں اور دھوتیوں سے ڈھانپتے تھے۔ اُن عرب سیاحوں نے جو مسلم فاتحوں سے پہلے ہندوستان آئے، سندھ سے بنگال تک کے ساحلی علاقوں میں لوگوں کو اسی طرح کے کپڑوں میں دیکھا۔

اگرچہ پہلے عرب مسلمان جو ہندوستان آئے کرتے، ڈھیلی ڈھالی سفید رنگ کی قمیض اور قبا پہنتے تھے لیکن کسی طرح بھی ان کی شباہت اور لباس مقامی لوگوں سے بہتر نہیں تھا۔ لیکن بعد میں، بغداد کے امرا شاندار پگڑیاں، پا جامے اور قبائیں پہننے لگے اور وہ سب لباس



علی مردان خاں (شاہجہانی دَور کے امرا کا ایک لباس)



رام جی داس گڑوالے (اس دَور کے رئیسوں کا ایک مخصوص لباس)

ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اپنا لیے۔ ہندوستان میں شروع کے مسلمان بادشاہوں کی تصویروں میں انہیں وہی کپڑے پہنے دکھایا گیا ہے جو ایران اور عباسی حکمران پہنتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہندوستانی سلطان ہندو راجاؤں کی طرح جواہرات بھی پہنتے تھے۔

دلی کے مغل دربار میں پگڑی، ایک چھوٹا کوٹ، تنگ ٹخنوں تک کے پاجامے، اونچی ایڑی کے جوتوں اور کمر کے گرد ایک پٹکا پہننے کا رواج تھا۔ دلی کے امرا بھی یہی لباس پہنتے تھے اور محمد شاہ رنگیلے تک یہی لباس رہا۔ اگر کوئی تبدیلیاں آئیں بھی تو وہ قابلِ توجہ نہیں تھیں۔ اس لباس میں اندر کی طرف نیمہ جامہ یعنی کہنیوں تک کا آدھی آستینوں کا شلوکہ پہنتے تھے جس پر سامنے کی طرف گھنڈیاں لگی ہوتی تھیں۔ اس کے اوپر جامہ پہنا جاتا۔ اس میں گریبان نہ ہوتا بلکہ دونوں جانب کے کنارے جنھیں پردہ کہتے ایک دوسرے پر ترچھے آکر سینے کو ڈھانپ لیتے۔ سینے کا بالائی حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا تھا اسی طرح کھلا رہتا جیسے آج کل انگریزی کوٹوں میں کھلا رہتا ہے۔ سینے پر جامے کا وہ حصہ جو بائیں طرف سے آتا نیچے رہتا اور داہنے پہلو پر بندوں سے باندھ دیا جاتا۔ پھر اس میں کمر کے پاس سے ایک سکرٹ سی جوڑ دی جاتی جو ٹخنوں کے اوپر تک لٹکتی رہتی۔ اس میں بہت سی چنٹیں دی جاتیں اور اس کا گھیر بہت بڑا ہوتا۔ جامے کی آستینیں آدھی کلائی تک بے بلی اور کھلی رہتیں اور دونوں جانب لٹکا کرتیں۔ اس کے نیچے سیدھا سادہ تنگ موہریوں کا پائجامہ ہوتا جو امرا میں مشروع اور گلبدن کا ہوا کرتا۔ کمر میں پٹکا جامے کے اوپر باندھا جاتا تھا۔

بابر اور ہمایوں کی حکومت میں حکمرانوں، بیگموں، شہزادیوں اور غیر ملکی لوگوں میں جو پہناوا رائج تھا وہ شہنشاہ اکبر کی حکومت میں بدل گیا۔ راجپوت رانیوں کی اوڑھنیاں، انگیاں اور گھیرے دار لہنگے سب کے من کو ایسے بھائے کہ بیگمیں اپنا ترکستانی لباس بھول گئیں۔ اکبر کو بھی ہندوستانی پوشاک بہت پسند تھی۔ ہمایوں کے "عزت تاج" اور "خاصہ تاج" (ہیرے لعل جڑی ٹوپیاں) پگڑیوں میں بدل گئے۔ نورجہاں نے اپنی راجپوت سوت جگت گوسائیں (شاہجہاں کی ماں) کی پوشاک دیکھ کر اپنے سر سے پیر تک کے پہناوے میں کافی ردوبدل کر لیا۔ باریک ہلکی ڈھاکے کی ململ، تنزیب، آب رواں، لاہی اور

گلشن کے دوپٹے سر اور منہ ڈھانپنے کے لیے بنوائے۔ یہ اوڑھنیاں پنچ تولیاں بھی کہلاتی تھیں۔ انگیا کی جگہ محرم اور سینہ بند نے لیلی۔ گھیرے دار لہنگے چھوڑ کر پیشوازیں بنوائیں۔ یہ پیشوازیں مردوں کے جامے کی طرح ہوتی تھیں۔ گرمیوں میں رنگیں ململ کی اور جاڑوں میں کمخواب، زربفت اور اطلس کی دلہن کے لیے نورمحلی پوشاک بنتی۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا شاہی بیگموں اور شہزادیوں کے لیے انگیا کرتی بنواتی۔ اورنگ زیب کو سادگی پسند تھی۔ اسے رنگین اور تڑک بھڑک کے کپڑوں سے چڑ تھی۔ مگر اس کی موت کے بعد پھر وہی قیمتی اور چمکیلے کپڑوں کا رواج ہوگیا۔

شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے مشہور غیر ملکی سیاح منوچی لکھتا ہے کہ مسلمان عورتیں ساڑھیاں بھی پہننے لگی تھیں۔ قلعے والی اور امیر گھرانوں کی عورتیں جاڑوں میں قبا پہنتی تھیں۔ یہ ایک طرح کا آگے سے کھُلا دوہرا روئی دار جامہ ہوتا تھا۔ قبا کے دونوں پلوؤں کو بیگمیں اور امیرزادیاں انمول ہیرے جواہرات جڑے بٹنوں سے جوڑ لیتی تھیں۔ کوئی عورت چاہے وہ امیر گھر کی ہو یا غریب گھر کی، مردوں کے ہاتھ کے سلے کپڑے نہیں پہنتی تھی۔ کپڑے سینے کا کام مغلانیاں یا درزنیں کرتی تھیں۔ یہ ترکستانی وضع قطع کے کپڑوں میں تو ماہر ہوتی ہی تھیں لیکن جیسے جیسے وقت بدلتا گیا انھوں نے ہندوستانی لباس سینے میں بھی کمال حاصل کر لیا۔ ان کے سلے دوپٹے، محرم، کرتیاں، پیشوازیں اور پاجامے نئے ڈھنگ کے ہوتے تھے۔ یہ دھنک، ہیچک، کوگھرو، کلابتو، سلمے ستارے، تکورے، کٹوریاں، کرن، بھچّے، بانکڑی اور چمپا ٹانکنے میں اور ننھی جان اور ریشم کے تاروں سے کپڑوں میں ایسی دلکشی پیدا کرتیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ ان کے ٹانکنے میں ایسا کمال اور جادو تھا کہ اگر ہزار بیگمیں بھی کسی ایک محفل میں ہوں تو ان سب کے لباس الگ الگ نظر آئیں گے۔ ایک کی پوشاک دوسرے سے کبھی نہیں ملے گی۔ کیا مجال کہ کسی دوسری بیگم کی سج دھج ایک سی ہو جاتے۔ جس بیگم یا شہزادی کا پہناوا سب سے خوب صورت اور دلکش ہوتا اس کی قلعے اور شہر میں دھوم مچ جاتی اور اس کے لباس کا چرچا ہوتا۔

اس ضمن میں ایک بات کہنا ضروری ہے کہ اگر کسی بیگم یا شہزادی کے کسی لباس کی نقل تیار کرلی جاتی یا اس سے ملتی جلتی پوشاک نظر آجاتی تو وہ بیگم اور شہزادی اپنے اس لباس کو ترک کردیتی اور کبھی نہ پہنتی اور اس کے بدلے ایک نیا لباس بنواتی جو اس سے پہلے کبھی نہیں بنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہی افراد اتنے نفاست پسند اور شان و شوکت والے تھے کہ ایک دن کا پہنا کپڑا پھر بہت دلوں تک نہیں پہنتے تھے۔ کچھ کپڑے تو ایسے ہوتے تھے جو بدن پر بالکل چپک جاتے تھے اور انہیں پھاڑ کر اتارا جاتا تھا۔ کپڑوں کے علاوہ پیروں میں پاپوش یا جوتیاں پہنی جاتیں۔ مخملی جوتیوں پر زری کے کام کے بیل بوٹے بنائے جاتے تھے۔ جواہرات جڑی جوتیاں بھی پہنی جاتی تھیں۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل کی بہن کی ہیرے جواہرات جڑی جوتی بڑی انمول مانی جاتی تھی اور اس سے پہلے ایسی جوتی پہنا کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ یوں تو سب بیگمیں دوپٹے اور اوڑھنیاں اوڑھتی تھیں لیکن کبھی کبھی بادشاہ سے پوچھ کر کچھ بیگمیں اور شہزادیاں چھوٹی چھوٹی پگڑیاں بھی پہن لیتی تھیں۔ قلعے اور شہزادیوں میں یوں تو رنگین کپڑے پہنے جاتے تھے۔ لیکن ہر موسم میں الگ الگ رنگ کے کپڑے پہنے جاتے تھے۔ بسنت پر تو بادشاہ اور بیگموں سے لے کر ہر دلی کا شہری بسنتی رنگ میں رنگ جاتا تھا۔

جاڑوں میں چھیل چھبیلی بیگمیں تو باریک حباب سے دوپٹے اوڑھتیں لیکن عام طور پر شال، دوشالے، چادرے، دلائیاں اور چھٹنکی، ادھ پوی اور پاؤ سیری روئی کی رضائیاں اوڑھی جاتیں۔ صدریاں، کمریاں اور نیمہ آستین بھی پہنی جاتیں۔ چادرے غف کپڑے کے ہوتے۔ دوپٹے، پشوازیں، محرم، کرتیاں تو باریک کپڑوں کی ہی ہوتیں۔ کبھی کبھی رنگین میانی دہ دیگر دولائیوں اور رضائیوں میں باریک ابرے لگاتے۔

پاجاموں کے لیے طرح طرح کے کپڑے آتے تھے۔ کمخواب، مشجر، زربفت، نیم زری پوتھ، اطلس، رادھا نگر، بانک کنار، مشروع، گلبدن، مخمل، نین سکھ، تن سکھ، چھینٹ قلم کاری مومی چھینٹ، گنگی، بانات اور کشمیرا کے موسم کے مطابق پاجامے بنتے تھے۔

باریک کپڑوں کے لیے ململ، تنزیب، آبِ رواں، ہواؤ دریا، چینی گھاس، لاہی

محمودی، تار ترنگا، جھونا، چوتاری، گنگا جل، اساوری، پھوار، بنارسی، گلشن، ڈور جالی چندیری اور ڈھاکے کی ململ، چکن، کریب اور جامدانی پسند کی جاتی تھی۔

قلعے میں جوڑے عام طور پر ایک رنگ کے ہی پہنے جاتے تھے۔ دو رنگ کے کپڑے بہت کم پہنے جاتے تھے۔ دوپٹہ، محرم، کرتی ایک ہی رنگ کے ہوتے اور تہ پوشی دوسرے رنگ کی۔ لیکن تین رنگ کے کپڑے تو کوئی کوئی شہزادی یا بیگم پہنتی۔ امرا کے گھروں میں بھی قلعے والی روش ہی چلتی۔ دراصل تین رنگوں کے لباس کو پہننے کے لیے بہت سلیقہ اور بڑی خوش مذاقی درکار تھی۔ تین رنگوں کو اس طرح ملانا ضروری تھا کہ وہ آنکھوں کو بھائیں مثلاً اودی تہ پوشی، سبز محرم کرتی اور نارنجی دوپٹہ۔ اگر ان تین رنگوں میں سے ایک رنگ نکال کر دوسرا رنگ پہن لیا جاتا تو اس پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ شہر کے گلی کوچوں میں تو کسی کو الٹے سیدھے تین رنگوں کے لباس میں دیکھ لیتے تو اس قسم کے جملے کستے —— تین ترنگا دیوالی کا ہیجڑا یا ترنگی بلی۔

شاہی محلوں، امیروں اور خوشحال گھرانوں میں پردہ بہت تھا۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی پردہ اپنا لیا تھا۔ جب کبھی کسی حویلی کی لڑکیاں اور عورتیں باہر سڑک پر سواریوں میں بیٹھنے کے لیے، مندر، جمنا پر نہانے یا کسی کے یہاں جاتی تھیں تو حویلی سے لے کر باہر سڑک تک پردہ تن جاتا تھا۔ جب سواریوں میں عورتیں بیٹھ جاتیں تو ڈولی یا تانگے پر بھی پردہ ڈال دیتے۔ عورتوں کا منصب یہی سمجھا جاتا تھا کہ چراغِ خانہ ہیں۔ کوئی عورت کھلے منھ اکیلی نظر آتی تو اسے طوائف یا ویشیا سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں کوئی عورت اور جوان لڑکی بغیر برقعے کے نہیں نکلتی تھی۔ برقعے سیدھے سادے اور ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے جن میں ڈیل ڈول ظاہر نہ ہو۔ کیا مجال جو نقاب منھ سے سرک جائے۔ یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہوتا تھا کہ برقعے میں کوئی جوان عورت ہے یا بڑھیا۔ برقعے کی جالی میں سے جب صاف دکھائی نہیں دیتا تھا تو عورتیں نقاب کو اندر سے چٹکی میں لے کر ایک آنکھ کھول لیا کرتی تھیں، صرف ایک آنکھ۔ ہاں کاریگروں کی عورتیں، نوکرانیاں، باندیاں، چوڑی والیاں یا اسی طرح کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ مگر انہیں بھی اپنے بڑوں کا دھیان رکھنا پڑتا تھا۔ کبھی کسی مرد کو آتے دیکھتیں

توشرم سے سر کا پلّو آگے کر لیتی تھیں۔ پردے کی وجہ سے عام عورتوں کا لباس عام طور پر سادہ ہوتا۔ مسلمانوں میں شلوار قمیض، یا کرتہ غرارہ، دوپٹہ اور کبھی کبھی چوڑی دار پاجامہ۔ ہندو عورتیں ساڑھی یا سادہ دھوتی پہنتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں سر پر اوڑھنی اوڑھتیں بدن پر کرتی ہوتی اور ٹانگوں میں ازاریں پہنتیں۔

دلی کے پرانے گھروں میں خادمہ یا نوکرانی کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ خادمہ بچوں کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرتی۔ جب کوئی لڑکی پرانی اوڑھنی اوڑھ کر ناک بھوں چڑھاتی تو گھر کی خادمہ اسے چھیڑ کر کہتی ــــ " ہاں ہاں میری بنّو کو تو ہر دم نئی اوڑھنی چاہیئے۔ وہ کاہے کو پہنے گی پرانی اوڑھنی۔ آ میرے پاس آئیو، تجھے گیت سناؤں ــــ" پھر گانے لگتی۔

بھاتی ہے جی سے بندی کو آنچل کی اوڑھنی
اوڑھوں گی میں کبھی نہیں ململ کی اوڑھنی
منگوا دو کوئی مجھ کو مسلسل کی اوڑھنی
میں وہ تو اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی

بنّو منھ بنا کر کہتی ۔" بس رہنے دو اپنا گیت۔ گلا ایسا جیسے پھٹا ڈھول !"

جب کوئی لڑکی اوڑھنی کو ایسے ہی کندھے پر ڈال لیتی اور ہر دنگا مچاتی، قہقہے لگاتی پھرتی تو خادمہ ڈانٹ کر کہتی ــــ" ہے ہے کیسی کلچھنی ہے۔ اوڑھنی اوڑھے ایک پٹّی، چھاتی ڈھکے نہ پیٹ !"

پرانے وقت میں لڑکیاں بڑی بوڑھیوں سے سب کچھ سیکھ لیتی تھی۔ گھر کی عورتیں اور لڑکیاں دوپٹے گھر میں ہی آرام سے رنگ لیتیں۔ پھر نگے دوپٹے رنگنا بھی ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پانی ابالا، رنگ اور سوڈا ڈالا اور چلبچی میں ڈال کر جیسا چاہا ڈھنگ سے رنگ لیا۔ کلف بھی دے لیتی تھیں۔ سب عورتیں اور لڑکیاں دوپٹوں کے انتخاب اور اوڑھنے میں بڑا سلیقہ دکھاتی تھیں۔ گیلے دوپٹے پر ابرق کا برادہ چھڑک کر اسے چمکیلا بھی بنا لیتی تھیں۔ ابرق کی ہلکی چمک آنکھوں کو بڑی بھلی لگتی تھی۔ تیج تہواروں پر گوٹہ کناری لگے

دوپٹے پہنے جاتے تھے۔ جیسا موسم ہوا ویسا ہی دوپٹہ رنگ لیا۔ بسنت پر بسنتی، ہولی پر گیندئی، عید پر گہرا عنابی اور سبزئی اور ساون کی تیجوں پر ہرا۔ پھر دیوالی سے لیکر جاڑے بھر گہرے رنگوں کے دوپٹے اوڑھتیں۔

رنگریز کبھی کبھی گھر کی ڈیوڑھی پر بھی آتے تھے۔ دلی میں ایک جھمن نامی رنگریز بڑا مشہور تھا۔ جھمن رنگریز کے نام پر دلی میں ایک گلی بھی ہے۔

کریب پر گوٹے کناری کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ ٹھپّے کی گوٹ اور اِدھر اُدھر سنہرا گوکھرو اور گوکھرو کے بیچ میں بیل اور اس کے اوپر چمپا یا کرن لگادی جاتی تھیں۔ کسی کسی گوکھرو کے بیچ ریشم اور زری ملی کالی ڈوری بھی لگا دیتے تھے۔ دوپٹوں پر کارچوبی کا کام بھی ہوتا تھا اور کارچوبی بیلیں بھی ٹانکی جاتی تھیں۔ سلمے ستارے اور نکورے کا کام بھی ہوتا تھا۔ موتی پوتھ بھی بیچ بیچ میں لگائے جاتے تھے۔ دوپٹوں پر کڑھائی کا کام بھی بڑا عمدہ ہوتا تھا۔ کارچوبی کے کام میں اور کڑھائی کے کام میں پھول، پان کی بیلیں، انگوری بیل، چڑیاں، طوطے اور مور بھی بنائے جاتے تھے۔ دوپٹے کے دامن یا پلّو کے کونوں پر ترنجیں بنائی جاتیں۔ کرن اور کلابتو کے پلو بھی ٹانکے جاتے تھے۔ ٹسر اور ریشم کے دوپٹے بھی پہنے جانے لگے تھے۔ دوپٹوں پر مقیش کا کام بھی ہوتا تھا۔ سارے دوپٹے پر پاس پاس ستارے ٹنکے ہوتے تو دوپٹہ بڑا جگمگ کرتا۔

دلی کی سفید پوشی مشہور تھی۔ مرد گھروں میں تو ننگے بدن، بنیان، دھوتی، تہمد یا کرتہ پاجامے پہنتے تھے لیکن جونہی ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھنے کی سوچتے، کھونٹیوں پر لٹکے صاف ستھرے کپڑے پہن لیتے۔ بڑے بوڑھوں نے مرتے دم تک اپنا پرانا دیسی لباس نہیں چھوڑا۔ ہندو مسلمان ایک ہی رنگ میں رنگے تھے۔ لالہ جی، منشی جی اور میاں صاحب کے پہناوے میں ذرا ذرا ہی فرق تھا۔ کوئی سر پر دوپلّی ٹوپی پہنے ہے تو کوئی گول فنّے دار پگڑی۔ پراٹھے والی گلی سے تھوڑی دور آگے چل کر کناری بازار میں پگڑی باندھنے والے بیٹھتے تھے۔ وہ دلی والوں کی ہر ذات اور برادری کے پہناوے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بنیوں، کھتریوں، کائستھوں، برہمنوں اور دوسری جاتیوں کی پگڑیاں الگ الگ طرح کی ہوتی تھیں۔ کسی نے اپنی ذات

بتائی اور وہ اس کی پگڑی پوچھ تاچھ کیے بغیر باندھ دیتے۔ ننگے سر گھومنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کوئی دو پلی ٹوپی اپنے پٹے دار بالوں میں اٹکائے چلا جارہا ہے تو کوئی چوگوشیہ، پنج گوشیہ ٹوپی پہنے ہے۔ کسی کی نفیس کا مدار مخملی ٹوپی ہوتی جس میں زری بوٹی کی زمین پر فیتے سے چاند اور صحرائیاں بنی ہیں۔ اِن ٹوپیوں کو ترچھی، بانکی اداؤں سے پہنا جاتا تھا۔ پگڑی پہننے کا بھی رواج تھا۔ کسی کے سر پر جھبے دار پگڑی ہے تو کوئی دو پلڑی پہنے ہے۔ کوئی کوئی پگڑی کے ساتھ کلاہ بھی پہنتا تھا۔ بچے یوں تو گھر میں بنی لٹھے کی گول کڑھی ٹوپیاں پہنے رہتے لیکن شادی بیاہ میں ٹھپّے کی، سلمے ستارے اور زری کی اور گوٹہ ٹنکی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ ویسے بہت چھوٹے چھوٹے بچے اچھے اچھے گھروں میں بھی ننگے ہی رہتے۔ آگا بھی کھلا ہوا ہے، پیچھا بھی کھلا ہے۔ یوں بھی بڑا ہو یا چھوٹا بہت سارے کپڑے سلوانے کا رواج نہیں تھا۔ سب کے پاس نپے تلے چند کپڑے ہوتے تھے۔ جاڑے میں دلی والوں کو بڑی ٹھنڈ لگتی تھی۔ چھوٹا ہو یا بڑا روئی کی پھولدار چھینٹ کی کرتی یا صدری اوپر یا نیچے ضرور پہنے رہتا۔ بچوں اور بڑوں کے کنٹوپ نما ٹوپے ہوتے۔ جاڑے میں دلی والے ٹوپے پہن لیتے جن میں سے صرف آنکھیں، ناک اور منھ نظر آتا تھا۔ فلالین کے پاجامے بھی پہنتے تاکہ ٹانگوں کو بھی سردی نہ لگے۔ مندیلیں، بنارسی، دو پلی اور گوٹے دار پگڑیاں مسلمانوں میں مروج تھیں۔ قلعہ معلّٰی میں پگڑی بغیر کوئی نہیں جاسکتا تھا۔

درباری لوگ جامہ بھی پہنتے تھے۔ بڑے بڑے منصب دار، امرا شاہی خاندان کے افراد جن میں شہزادیاں بھی شامل تھیں کلغیاں بھی لگاتے تھے۔ ہندو بھی جامہ پہنتے تھے۔ پھر چولی کے انگرکھے کا رواج ہوگیا۔ مسلمانوں میں الخالق، بالابر، شیروانی، بعد میں اچکن، انگرکھے، قبا، جبہ وغیرہ کا حسبِ موسم دستور تھا۔ پاجامے یا تو تنگ موہری کے ٹخنوں تک یا ایک برکے یا بہت کھلے پائنچوں کے پہنے جاتے تھے۔ آڑے پاجاموں کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا۔ ان دنوں آبِ رواں اور شبنم کے کرتے اور انگرکھے پہنے جاتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں انگرکھا پہنتے تھے۔ ہندوؤں کے انگرکھے کا پردہ داہنی طرف اور مسلمانوں کا بائیں طرف ہوتا تھا۔ سادے اور کڑھے ہوئے گول پردے کے انگرکھے

ہوتے تھے۔ نہین سلی ہوئی تنی سے انگرکھے کے پردوں کو باندھ لیا جاتا تھا۔ گرمیوں میں ململ، تنزیب اور ڈورےے کے انگرکھے بھی پہنے جاتے تھے اور جاڑے میں مخمل کے۔

ہندو گھروں میں عورتوں کو لہنگے کا بڑا شوق تھا۔ چھ سات گز کے گھیر کے لہنگے پہنتی تھیں۔ گھر میں تو چھینٹ اور سوتی دھاری دار، اور چار خانے کے لہنگے پہنتی تھیں لیکن شادی بیاہ، تیج تہواروں میں کناری ٹکے ریشمی لہنگے پہنے جاتے تھے۔ امیر گھروں میں عورتیں مخمل، کمخواب، گلبدن، مشروع، اطلس اور ساٹن کے لہنگے بنواتیں۔ بنارسی بوٹی دار اور ٹسر کے لہنگوں کا بہت رواج تھا۔ لہنگے کے دامن پر ایک ایک بالشت کی کسی دوسرے رنگ کی گوٹھ لگائی جاتی تھی اور اس پر آڑی آڑی کناری کی یا نورانی وضع کی دھنک ٹانکی جاتی۔ لہنگوں پر گوکھرو کا جال بھی بنایا جاتا تھا۔ پہلے دو انگل کا لچکا لگایا، پھر دو کچے گوکھرو ٹانکے، بیچ میں بیل لگائی، ایک بالشت بھر کا ٹھپّہ لگا کر پھر دو گوکھرو ٹانک دیے اور ان سب کے اوپر چپا لگادی۔

لہنگوں میں کمر کے اوپر کمر کے ناپ کی ترپن کر کے چنٹ ڈال کر ایک ڈبوٹا پانچ چھ انگل پٹّی کا لگادیا جاتا۔ ڈبوٹے میں ریشمی ناڑا پڑ جاتا۔ لہنگا تیار ہو جاتا۔ لہنگوں پر سلمے کی بھاری بھاری چوڑی چوڑی بیلیں بھی ٹانکی جاتیں۔ سلمے کی چھڑی بوٹیاں بھی لہنگے میں ڈلتی تھیں۔ اگر کبھی لہنگا ہلکا پہننا ہوا تو صرف لچکا ٹانک کر کنگری لگا دیتے یا کنارے کے لنگور ہی لگا دئے جاتے۔

ان دنوں پوشاک کی بڑی دھاک تھی۔ ہر ایک کی سج دھج نرالی ہوتی تھی۔ اگر کوئی جوان ہے تو اس کے لباس کے ایک ایک ٹانکے سے جوانی ٹپکتی تھی اور جو بوڑھا ہے تو اس کے لباس سے سادگی اور وقار ٹپکتا تھا۔ بانکوں کا بانکپن، چھیلاؤں کا چھیلاپن، پہلوانوں کی پہلوانی، امیر غریب کی پہچان، پوشاکوں سے ہو جاتی تھی اگر شریفوں کی پوشاک کو رذیل اختیار کر لیتے تھے، شریف اسے یا تو چھوڑ دیتے یا اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کر لیتے تھے۔ شریفوں میں پہلے اونچی چولی کے انگرکھوں کا رواج تھا۔ جب ڈوموں اور میراثیوں نے یہ وضع اختیار کر لی تو شریف نیچی چولیاں یہاں تک کہ ناف

تک بڑھا کر پہننے لگے۔ ڈوموں میں نیچے دامن کا رواج ہوا تو شریفوں نے اونچے دامن رکھ لیے۔ ڈھاکے کی ململ، لکھنؤ کی شربتی، سونی پت کا نینون اور بنارسی، کپڑوں کی سج دھج قائم رکھتے تھے۔ تنی ہوئی مونچھیں اور گلمچھے والے مرد لباس کو مزید وقار عطا کرتے تھے۔ انگرکھے اور غرارے دار پاجامے کے ساتھ گول نیچے کی سلیم شاہی جوتیاں یا کڑھی ہوئی دیسی جوتیاں پہنی جاتی تھیں۔ کوڑیا پُل پر دیسی جوتیاں بنانے والے بیٹھتے تھے اور سلیم شاہی جوتیاں بلی ماران میں ملتی تھیں۔

وقت بدلتا گیا اور ہندوستان غلام ہو کر انگریزی عملداری میں آگیا۔ سر پر کرسٹی ٹوپی، بدن پر اچکن اور شیروانی پہنی جانے لگی، پھر کوٹ پتلون اور ہیٹ (ٹوپ) کی طرف پڑھا لکھا طبقہ راغب ہوگیا۔ پاؤں میں انگریزی پمپ اور فیتے والے جوتے پہنے جانے لگے۔ گھر میں لوگ اب بھی کرتہ پہنے رہتے لیکن جب کچہری جاتے تو دھوتی لپیٹ کر اس پر پتلون چڑھا لیتے۔ ان کی پتلون عجیب اور پھولی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ شام کو گھر لوٹنے پر ایک دم کوٹ پتلون اتار دیتے۔ ان کپڑوں میں دن بھر چین نہیں آتا تھا مگر نوکری پر بھی لات نہیں مار سکتے تھے۔

انگریزوں کی حکومت نے جب جڑیں پکڑ لی اور ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا اقتصادی طور پر پس رہا تھا تو آزادی کی جنگ شروع ہوگئی۔ پھر گاندھی جی آگئے اور کھدر پہننے کا رواج ہوگیا۔ کم از کم آزادی کے دیوانے تو خواہ وہ ہندو تھے یا مسلمان یا کسی اور مذہب کے، کھدر پہننے لگے۔ انگریزی لباس اور کپڑے کے خلاف نفرت کی ایسی لہر پیدا ہوگئی کہ ولایتی کپڑوں کی جگہ جگہ ہولی جلائی گئی۔

لیکن آزادی کے بعد کا منظر لباس کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ پڑھا لکھا طبقہ لباس کے معاملے میں بالکل مغرب زدہ ہے۔ طرح طرح کے ڈیزائنوں کے کوٹ پتلون کے علاوہ جینز اتنی مقبول ہوئی کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے علاوہ بڑی عمر کے لوگ بھی انہیں پہننے لگے۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ایک سا ہی لباس پہننے لگے اور لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح چھوٹے بال کٹوانے لگیں۔ کچھ مردوں نے عورتوں کی طرح لمبے بال رکھنے شروع کر دیے۔ اس تعلق

میں ایک لطیفہ سنئے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک حقیقی واقعے پر مبنی ہے۔ کسی صاحب نے اپنے پاس بیٹھے مہمان سے پوچھا۔

"جناب وہ سامنے جو لڑکا ناچ رہا ہے کیا آپ کا بیٹا ہے؟"

اس مہمان نے سن کر کہا۔

"اجی جناب وہ میری لڑکی ہے، لڑکا نہیں۔"

وہ صاحب ایک لمحے کے لیے تو بڑے حیران ہوئے مگر از راہِ اخلاق بولے۔

"خوب۔ آپ خوش نصیب باپ ہیں۔"

مہمان تنک کر بولا۔

"جناب میں اس کا باپ نہیں ماں ہوں۔"



حسن آرائی

بناؤ، سنگار

دلی کی عورتوں کو بناؤ سنگار کا اتنا ہی شوق رہا ہے جتنا کہ کسی اور جگہ کی عورتوں کو۔ دراصل بناؤ سنگار عورتوں کا جنھیں "صنفِ نازک" کہا جاتا ہے ایک فطری شوق ہے۔ بناؤ سنگار کے تین بنیادی اجزا ہیں، لباس، زیورات اور خوشبویات۔ آخری الذکر جزو میں وہ آرائشی اشیا بھی شامل ہیں جو جسم پر یا کسی بھی عضو پر مَلی یا لگائی جاتی ہیں جیسی کہ مہندی، ابٹن، تیل، مسّی، غازہ، سُرخی وغیرہ۔ کوئی عورت کتنے بھی زیورات پہن لے اور خوشبویات کا استعمال کرے لیکن اگر لباس پرکشش نہیں ہے تو اس کا بناؤ سنگار مکمل نہیں ہوگا۔ اس لیے ہر عورت پہلے یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ کونسا لباس پہنے گی اور پھر اس جوڑے کو الگ رکھ کر وہ زیورات اور خوشبویات کی طرف توجہ کرتی ہے۔ غسل بلاشبہ ہر بناؤ سنگار کا ابتدائی عمل ہے۔

پرانے وقت کی عورتوں کے لباس میں زیادہ تنوع نہیں تھا۔ غریب عورتوں کا لباس ایک دھوتی یا ساڑھی تھی جسے وہ اپنی کمر سے باندھ کر سر پر اوڑھ لیتی تھیں۔ ساڑھی کے ساتھ انگیا یا چولی پہنی جاتی تھی۔ بابر نے اس وقت کی ہندو عورتوں کی ساڑھی کو اس طرح بیان کیا ہے "ایک لمبا چوڑا کپڑا جس کا ایک سرا کمر کے گرد باندھا جاتا ہے اور دوسرا سر پر پھینکا جاتا ہے"۔ ان دنوں کی ساڑھی پر عموماً دو رنگوں کی دھاریاں پڑی ہوتی تھیں۔ بعض مرتبہ نوجوان کنواری لڑکیاں زیادہ دل کش نظر آنے کے لیے ساڑھی کا دوسرا سرا کندھے پر

ڈال لیتی تھیں۔ ہندو عورتوں کو سرخ لباس بڑا پسند تھا اور وہ اکثر اپنے کپڑوں کو گھر پر ہی سرخ رنگ میں رنگ لیتی تھیں۔ انگیا غریب اور امیر دونوں عورتیں پہنتی تھیں اور کمر تک نیچی ہوتی تھی تاکہ پیٹ کا کوئی حصہ ننگا نظر نہ آئے۔ ساڑھی کے ساتھ پیٹی کوٹ پہننے کا رواج تھا اور کچھ عورتیں چولی اور گھاگرا بھی پہنتی تھیں۔ گھاگرا بعد میں مسلمان عورتیں بھی پہننے لگی تھیں۔ منوچی لکھتا ہے "عام طور پر عورتیں دو یا تین جامے پہنتی تھیں اور کسی کا وزن آدھی چھٹانک سے زیادہ نہیں ہوتا تھا اور ہر ایک کی قیمت چالیس پچاس روپے ہوتی تھی"

مغلوں کے عہد میں مسلمان عورتیں چست پاجامے اور قمیضیں پہنتی تھیں۔ عام عورتوں کا لباس شلوار اور قمیض پر مشتمل تھا۔ قمیض آدھی باہوں کی ہوتی تھیں اور نیچے کے کھلے بازوؤں کو زیورات سے سجایا جاتا تھا۔ عورت اپنی حیثیت کے مطابق شلوار کے لیے کپڑے کا انتخاب کرتی تھی مگر عموماً یہ کئی رنگوں میں دھاریاں پڑا ہوا کپڑا ہوتا تھا۔ امیر عورتیں کشمیری اون کی بنی ہوئی قبا بھی پہنتی تھیں جو کمر پر سے اتنی سکڑی ہوئی ہوتی تھی کہ کمر ذرا سی لگتی تھی۔ کچھ امیر عورتیں ایسی اعلیٰ اور باریک کشمیری شال بھی پہنتی تھیں جو انگوٹھی میں سے گزر جاتی تھی۔ شاہی بیگمات ایک خاص ذوقِ جمال رکھتی تھیں اور کپڑوں کی تراش اور سلائی کے لیے خود ہدایت دیتی تھیں۔ مثلاً بیگم نورجہاں اپنے لباسوں کی وضع قطع اور ڈیزائن کا خود فیصلہ کرتی تھی۔ بہت سے گوٹے کناری کے کپڑوں، فیتوں اور لباسوں کو نورجہاں سے منسوب کیا جاتا ہے جیسے نورمحلی، پنچ تولیہ، بادلہ، کناری شمس اور فرشِ چاندنی۔

ہندو اور مسلمان عورتیں اپنے سر کو دوپٹے سے ڈھکتی تھیں جو عموماً باریک سوتی کپڑے یا ریشم کا ہوتا تھا۔ ریشمی دوپٹے میں چاندی اور سونے کے تاروں کا کام بھی ہوتا تھا اور دوپٹے کے سرے دونوں طرف گھٹنوں تک نیچے لٹکتے تھے۔ مسلمان عورتیں جب باہر جاتیں تو سفید رنگ کے برقعے اوڑھ لیتی تھیں۔ بعد میں سیاہ رنگ کے برقعوں کا بھی رواج ہو گیا۔ ہندو عورتیں اپنے بالوں میں پھول وغیرہ بھی لگاتی تھیں۔ شہزادیاں اور

منصب داروں کی لڑکیاں سر پر پیچ بھی پہنتی تھیں۔ اسے ٹھوڑی سے ایک تکونی شکل میں باندھا جاتا تھا۔ کچھ شہزادیاں بادشاہ کی اجازت لے کر چھوٹی چھوٹی خوشنما پگڑیاں بھی باندھ لیتی تھیں۔

ہر عورت کا بناؤ سنگار اس کے خداداد حسن پر منحصر ہے۔ اگر عورت کے ناک نقشے اور جسم میں کشش نہیں ہے تو بڑے سے بڑا بناؤ سنگار اسے دلکشی عطا نہیں کرے گا۔ اس ضمن میں جو نسوانی صورتیں دلی والوں کو بھاتی تھیں یا جوان کا معیار حسن تھا اس کی تفصیل دینا بھی نامناسب نہ ہو گا۔ گورا سبزہ رنگ، جیسا کہ موتی کی آب کا، نہ کہ کسی فرنگی میم کا سا۔ بال سیاہ اور گھنے، بھویں پتلی اور کھنچی ہوئیں، جٹی ہوں تو کیا کہنے، قد میانہ، جسم گدرا مائل بہ لاغری، پیشانی محراب دار یا کشادہ، ناک پتلی اور نتھنے تنگ۔ نازک چھوٹا دہن، ہونٹ پتلے اور بستہ، بتیسی چھوٹی، چمکدار اور ہموار، گول شانے، چھلا کمر، چھوٹے ہاتھ پاؤں، پتلی لمبوتری انگلیاں، ناخن آبدار اور گلابی۔

غسل

ہندو عورتیں صبح سویرے ہی نہا لیا کرتی تھیں۔ پھر پوجا پاٹھ میں لگ جاتی تھیں۔ اگرچہ بہت سی عورتیں گھر میں مردوں کے اٹھنے سے پہلے ہی نہا لیتی تھیں مگر عام طور پر وہ جمنا جی میں نہانا پسند کرتیں۔ اس کے لیے وہ تڑکے ہی ننگے پاؤں اپنے گھروں سے چادر اوڑھ کر نکل جاتیں۔ جمنا پر عورتوں کے نہانے کے لیے مخصوص پردہ گھاٹ ہوتے تھے۔ عورتیں پہلے بالوں میں تیل لگاتیں، پھر ریٹھوں سے انھیں دھوتیں، بدن پر ابٹن اور چھاتیوں پر چندن لگاتیں اور نہا دھو کر کنگھی سے مانگ نکال کر بال بناتیں۔ سہاگنیں مانگ میں سیندور بھرتیں، چہرے پر غازہ اور لالی لگاتیں، آنکھوں میں سرمہ لگاتیں اور دانتوں پر مسی ملتیں۔ نئے یعنی دھلے ہوئے دوسرے کپڑے پہنتیں، بندی لگاتیں، اتارا ہوا زیور پہنتیں، ڈبیہ میں سے نکال کر پان کھاتیں اور اسی طرح چادر اوڑھ کر گھر واپس آجاتیں۔

امیر مسلمان گھرانوں میں عورتوں کے غسل کا کافی اہتمام کیا جاتا تھا۔ صابن کا ذکر آئین

اکبری میں بھی آیا ہے مگر شاید عمدہ نہانے کے صابن کم ہی بنتے تھے اس لیے ابٹن، ہلدی اور چاول کو پیس کر، اس کا مرکب، صندل اور اسی قسم کی دوسری اشیا بدن کو صاف کرنے اور کھال کو چکنی اور خوبصورت بنانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ خادمائیں آملہ، بیری کے پتے اور اڑد کی دال پیس کر سر پر لگاتیں تاکہ بال لمبے، گھنے اور چمکدار بنیں۔ حمامی غسل خانے کے اندر اپنی مالکن کی مالش بھی کرتی اور مختلف اعضا پر "ٹکیاں" بھرتی تاکہ جسم بالکل ہلکا پھلکا ہو جائے۔ جاڑوں میں جلد کو نرم رکھنے کے لیے "گل فتنہ" ملتیں اور پھٹے ہوئے حصوں پر موم روغن لگاتیں۔ جلد کا روکھا پن عیب میں داخل تھا اور چکنے چپڑے چہرے پسند کیے جاتے تھے۔ چھاتیوں کے لیے صندل اور مُشک کا پتلا لیپ استعمال کیا جاتا۔ غسل کے بعد جب بال سوکھ جاتے تو مشاطہ کوئی عمدہ خوشبو دار تیل بالوں میں لگا کر کنگھی سے بال بنا کر چوٹی کر دیتی۔ اس کے بعد چہرے کا سنگار شروع ہو جاتا اور زیورات پہنے جاتے اور منتخب لباس پہن کر عورت سج دھج کر بیٹھ جاتی۔

محلسرا میں غسل اور سنگار

محلسراؤں میں سنگِ مرمر کے پانچ پانچ درجے کے حمام ہوتے تھے جن میں فرش، اجارہ، حوض، ستون اور محرابیں خالص سنگِ مرمر کی ہوتیں۔ چھتیں لداؤ کے گنبد ہوتے۔ بیچوں بیچ روشندان ہوتا اور اس میں روشنی آنے کے لیے چھوٹے چھوٹے مربع شیشے لگے ہوتے۔ کھڑکیاں ہوتیں جن میں چونے کی زہ بنا کر شیشے بٹھاتے تاکہ حمام خوب روشن رہیں۔ حمام گرم اور سرد دونوں ہوتے۔ ایک درجہ جامہ کن کہلاتا جہاں کپڑے اتارے جاتے اور ایک درجہ معتدل ہوتا جس میں بیگمات گرم حمام کے بعد آبیٹھتیں۔ ان حماموں میں اگر کی بتیاں خوشبو کے لیے روشن کی جاتیں اور کوڑیا لوبان کی دھونی دی جاتی۔ حمام میں خاص طور پر جامہ کن اور معتدل درجے میں مغلانیاں اور لونڈیاں، باندیاں ساتھ رہتیں۔

گرمیوں میں بیگمات اور شہزادیاں سرد حماموں میں نہاتیں، محل کی نہروں اور حوضوں میں تیرتیں، گھنٹوں فواروں کے نیچے پھوار میں بیٹھی رہتیں اور چھینٹے کھیلتیں۔ گرمی کی چاندنی

راتوں میں کھانے سے پہلے غسل کیا جاتا۔ غسل خانوں میں صرف بیگمات، شہزادیاں یا ان کی باندیاں ہوتیں۔ جو پانی سے ڈرتی اس کو زبردستی گھسیٹ کر پانی میں ڈالتیں۔ اس کی چیخیں اور دوسروں کی کلکاریاں محلسرا میں ادھم مچادیتیں۔

مغلانیاں اور لونڈیاں ساری تیاری بیگمات کے لیے حمام میں ہی کرتیں۔ کوئی کسی چیز کا ٹانکا لگاتی، کوئی مہندی بناتی۔ مہندی میں رنگ لانے کے لیے کتھا اور چڑیا کی بیٹ ملاتیں۔ اگر کسی بیگم کو سیاہی مائل سرخ رنگ پسند ہے تو اس میں ذرا سا نیلا تھوتھا ملا دیتیں۔ دلہنوں کے حمامی مہندی لگائی جاتی، کوئی چھلا چور مہندی لگاتی، کوئی ہتھیلیوں پر مچھلیاں بناتی، کوئی چاند، سورج یا ستارہ بناتی۔ بعض قندی مہندی لگاتیں، کوئی جالی کی مہندی لگاتی۔ مہندی لگانے کے بعد ارنڈ کے پتے ہاتھوں میں لپیٹ کر حنا بند باندھ دیے جاتے۔ پاؤں میں بھی مہندی ہاتھوں کی وضع کی ہی لگائی جاتی۔ مہندی ایسی رچتی جیسے سرخ باقرخوانیاں یا بیر بہوٹیاں۔

پانچ چھ گھنٹے حماموں میں گزرتے۔ اکثر ناشتہ بھی یہیں کرلیا جاتا۔ جب دن گرم ہوجاتا تو ان حماموں میں سے نکلا جاتا۔ حمامی عورتیں چپی ملی کرکے بدن کو پھول سا بنادیتیں حمام کا اہتمام شروع سے ہی ہوجاتا۔ صبح کی نماز وظیفے کے بعد، لونڈی فوراً زیرانداز بچھادیتی۔ مقابے والی مقابہ سامنے رکھتی اور الٹے قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ مقابے میں بیسن دانی کھلی دانی، منجن کی ڈبیا، جیبی، پیلو کی مسواک، ابٹن کی ڈبی اور صندل کی ٹکیاں ہوتیں۔ اٹھاپچیں ٹھنڈے گرم پانی کے آفتابے لیے کھڑی ہیں۔ رومال خانے والیوں نے زانوپوش زانوؤں پر ڈال دیا۔ زانوپوش بانات، اطلس، مخمل اور گلبدن کے ہوتے۔ روپاک سے چہرہ پونچھا دستمال سے ہاتھ، پاپاک سے پاؤں پونچھے اور سنگاردان سامنے آگیا۔

سنگاردان

سنگاردان میں آئینہ، گیسودانی، شانہ، پیچ میں کنگھی، حنا بند، ایک چھوٹی سی تلے دا[ني]
میں سوئی تاگا اور موباف جن کے کناروں پر دھنک کی بنی ہوئی کلیاں اور کرن اور تھل[ے]

کے پھول ٹنکے رہتے۔ سرمہ دانی، سلائی، کجلوٹی، تیل گیری، تیل کی نفیس کپی، مستی کی ڈبیا، افشاں کی ڈبیا، چھوٹی سی قینچی، ایک ڈبیہ میں کاشغری، سفیدے کی ڈبی، ایک ڈبیا سمندری سیپ کے سفوف کی، ایک کٹوری میں شہاب، ایک ڈبیا میں کاشانی، مخمل کے خال، ایک کٹوری میں گوند کا پانی، لکھوٹی میں لاکھا، ایک گنگا جمنی نلکی میں سُرما، کاجل، شہاب اور زعفران لگانے کی سلائیاں۔ ایک سلائی کافی موٹی ہوتی جس پر بتیں لپیٹ کر بال گھونگر والے بنائے جاتے۔ مشاطہ پہلے عمرِ اقبال اور سہاگ کی دعائیں دیتی، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو، کوکھ مانگ بھری رہے اور پھر اللہ اللہ کر کے بناؤ سنگار شروع ہوتا۔

پہلے مشاطہ صندلی کا چھاپہ ہلکا سا گلے اور مانگ پر دیتی۔ پیچھے گھٹنوں پر بیٹھ کر تیل گیری بیٹھ پر ڈال اور تیل کی کپی میں سے تیل کٹوری میں نکال کر بالوں میں لگاتی اور اچھی طرح سے جڑوں تک ملتی اور کنگھی نکال موٹے دندانوں سے بال سلجھاتی۔ پھر باریک دندانوں سے بالوں میں خوب کنگھی کر کے مانگ نکال دیتی۔ چاندبیریوں کا یا محمد شاہی پٹیوں کا سر گوندھتی۔ کنواری لڑکیوں کے سیپ کے سر گوندھے جاتے تاکہ مانگ پھٹ کر چوڑی نہ ہو جائے اور کوٹرے کے موباف ڈالے جاتے تاکہ بالوں کی نوکیں پھٹیں نہیں اور بال محفوظ رہیں اور بڑھیں۔

بیگم صاحبہ کی کھجوری چوڑی چوٹی گوندھ کر مشاطہ موباف دانی میں سے لباس کے رنگ پر کھلنے والے رنگ کا موباف نکال کر ڈال دیتی۔ مانگ بھرتی اور افشاں چنتی۔ بیگم صاحبہ سیپ کے سفوف کی پوٹلی میں سے سفوف نکال کر منہ پر ملتیں اور باریک ململ کے ٹکڑے سے صاف اور یکساں کر لیتیں۔ پھر روئی سے شہاب لے کر رخساروں پر لگاتیں۔ پپوٹوں پر حدقۂ چشم پر ہلکا ہلکا افیم، زعفران اور سفوف کا لیپ کر کے آنکھوں کے حلقے بنائے جاتے۔ پھر دنبالے دار سرمہ لگا کر آنکھوں کو غلافی بنایا جاتا۔ شہاب سے دو خط دنبالے سے زاویہ بناتے ہوئے اوپر نیچے کھینچے جاتے اور آنکھیں مچھلیاں بن جاتیں۔ کاجل سے بڑی نفیس بھویں بنائی جاتیں۔ کن پیٹوں پر گوند لگا جڑاؤ یا کارچوبی نرلے بند چپکائے جاتے۔ بانچھ پر بالائی لب سے ہٹا ہوا مخملی تل لگایا جاتا۔ کتھا چونا ملا لاکھا بنا کر سلائی سے ہونٹوں پر باریک

خط لا کھے کا کھینچا جاتا۔ اس پر مسی کی تحریر سلائی سے کر دی جاتی۔

جا مدار خانے والی جوڑوں کے دست بقیچے حاضر کرتی۔ موسم کے اعتبار سے کوئی کھلتا ہوا رنگ پسند کر لیا جاتا۔ لونڈیاں اوٹ کھڑی کر دیتیں بیگم نے پوشاک بدلی۔ مشاطہ ہر قسم کی مدد کے لیے حاضر رہتی۔ اب موباف ہٹا کر چاندی کی ہشت پہلو انگیٹھی میں سونے کی سلائی گرم کی جاتی اور اس پر لٹوں کو لپیٹ کر حلقے بنائے جاتے۔ اب زلفیں جو گرہ گیر ہو جاتیں، کچھ شانوں پر بکھرا دی جاتیں۔ کالا دانہ اتار کر آگ میں ڈال دیا جاتا تاکہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے اور بناؤ سنگار میں کوئی خلل نہ پڑے۔ اب مشاطہ نے چٹ چٹ سر سے پیر تک کی بلائیں لیں، خدمت کی سرفرازی کا آداب بجا لائی اور الٹے قدموں، بیگم کو قدرے آفتاب اور قدرے ماہتاب چھوڑ کر رخصت ہوئی۔

زیورات

اب جواہر خانے والیاں زیورات کے خوانچے اور کشتیاں لے آتیں۔ گہنے وہ جن پر ہوشیار میناگروں نے باغ و بہار، ہزار گلے اور گل کے، مینے کے اور کندن گروں نے کندن کے، یا سادہ کاروں نے متناسب خانے اور خطوط بنا کر، زہ بٹھا کر انہیں پر آہنگ بنا دیا۔ اور نگ ایسی خوبصورتی سے بٹھائے ہوئے ہیں کہ ڈالی کے پھول کیا ہوں گے۔ جس رنگ کا جوڑا پہنا ہے، زیور اور جواہرات اسی رنگ کے پہنے جائیں گے۔ اگر لباس دو رنگ کا ہے تو زیورات کے نگینے بھی دو رنگ کے ہوتے۔

مغلوں کے دور کے چند زیورات جنھیں بیگمات اور شہزادیاں اور امیر زادیاں پہنتی تھیں، یا حتی المقدور عام عورتیں پہنتی تھیں، یہ تھے۔

سر کے زیور — سیس پھول۔ اس کا ذکر ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں بھی کیا ہے۔ یہ گھنٹی کی شکل کا سونے یا چاندی کا کھوکھلا زیور تھا اور اسے سر کے اوپر پہنا جاتا تھا۔

مانگ۔ یہ زیور مانگ پر ہی مانگ کے حسن کی افزائش کے لیے پہنا جاتا تھا۔

چاند۔ ماتھے پر پہنا جاتا تھا اور سونے اور ہیروں جواہرات کا بنتا تھا۔ یہ

ستارے، چاند، سورج یا پھول کی شکل کا ہوتا تھا۔

بندولی۔ ماتھے کا سچے موتیوں کا زیور تھا۔

سیس جال۔ جال نما سونے، چاندی کے تاروں اور موتیوں اور ہیروں کا سر کا زیور جو تمام سر کو خوشنمائی سے ڈھک لیتا تھا۔

جڑاؤ چوٹی۔ ہیرے، زمرد اور موتیوں کی جڑاؤ چوٹی۔

سورج۔ سونے اور ہیرے جواہرات کا چاند سے بڑا ماتھے کا زیور۔

جھومر، چھپکے، سیس پٹی، ٹیکہ۔ سونے چاندی اور موتیوں کے مختلف وضع اور شکل کے ماتھے کے زیور۔

کان کے زیور۔ کان میں اوپر کی جانب چار چھید اور نیچے کی جانب تین یا چار چھید کیے جاتے تھے۔ اوپر کے چار چھیدوں میں پتے، بالیاں، جڑاؤ، سادہ، مولسری کے پھول کی اور موتی چور کی پہنی جاتی تھیں۔ نیچے کے چھیدوں میں چھلنیاں، جھمکے، کرن پھول، لڑے، چودانیاں، مچھلیاں، بالے، جھالے، لٹکن، بندے، آویزے، مور بھنور اور کرن پھول وغیرہ پہنے جاتے تھے۔ اکبر شاہ کے زمانے کا کان کا ایک زیور چمپا کلی تھا جو پتوں سے ملتا تھا۔

ناک کے زیور۔ ناک کے سیدھے نتھنے میں ایک سوراخ کیا جاتا تھا مگر بلاق کے لیے دونوں نتھنوں کے جوڑ میں سوراخ کر دیا جاتا تھا۔ ناک کے زیور تھے، کیل، لونگ، نتھ، بلاق بیگمات اور شہزادیوں کی کیل اور نتھیں سونے اور ہیرے کی ہوتیں۔

گلے کے زیور۔ گلے کے زیور بے شمار تھے۔ مالا، موہن مالا، جگنی، ڈھولیا، چندن ہار، چندن ہانس، کنٹھی، ست لڑا، توڑا، بدھی، طوق، بارہ طبق، زنجیر، ہیکل، حمائل وغیرہ۔ یہ زیورات سونے کے بنتے اور ان میں ہیرے جواہرات، موتی اور قیمتی پتھر بھی استعمال ہوتے تھے۔

کمر کے زیور۔ تگڑی، کمر پیٹی، زنجیر، چدر کھٹکا۔ کمر میں زیور عام طور پر ہندو عورتیں پہنتی

تھیں اور زیادہ تر چاندی کے ہوتے تھے مگر کئی مغل شہزادیوں نے چھوٹی چھوٹی کمر پیٹیاں سونے اور ہیرے جواہرات کی بنوالی تھیں اور تقریبات کے موقعوں پر شوقیا پہنتی تھیں۔

ہاتھ کے زیور۔ چوڑیاں، جہانگیریاں، دست بند، پہنچی، لچھے، کنگن، تیتر پنکھیاں، گجرے چوڑا وغیرہ ہاتھوں کے زیور تھے۔ بہت سی قسم کے کڑے بھی ہوتے تھے اور سب سے آگے پہنے جاتے تھے۔ شیر دہاں، مگر دہاں، طوطے کے سر کے اور مور اور مینڈھے کے سر کے بڑے مقبول تھے۔

پاؤں کے زیور۔ خلخال، جھانجن، بل، کڑے، رم جھول، پازیب، بانک، پاٹل، گھنگرو وغیرہ پاؤں میں پہنے جاتے تھے۔ پاؤں کی انگلیوں میں چٹکی چھلے، بچھوے، انوٹ اور رانوٹ بچھوے پہنے جاتے۔ یہ زیور سب چاندی کے بنتے تھے اور دراصل گھنگرو کے سوا ہندووانی زیور تھے جو مسلمان عورتوں نے بھی اپنا لیے۔

سولہ سنگار

عورتوں کے سولہ سنگار بہت مشہور ہیں اور ہندوؤں کی قدیم تاریخی کتابوں اور دھرم گرنتھوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ جو عورت سولہ سنگار کرلیتی تھی وہ سنگار کی ہر ضرورت کو پورا کرکے اپنے روپ کو مکمل کرلیتی تھی۔ یہ سولہ سنگار اس طرح ہیں۔

۱ کنگھی کرنا

۲ سندھور لگانا (سہاگنوں کے لیے)

۳ بندی

۴ انجن یعنی سرمہ

۵ تیل

۶ ارگجا

۷ پان	۸ مسّی
۹ نیل	۱۰ مہندی
۱۱ پھول	۱۲ آلتا۔ پاؤں کے رنگنے کا سرخ رنگ۔
۱۳ داتن	۱۴ منجن
۱۵ ابٹن	۱۶ چندن

عطر یا خوشبو

عورتوں کو مردوں کی طرح عطر یا خوشبو لگانے کا بڑا شوق تھا۔ خوشبوؤں کا ذکر پراچین کال میں بھی ملتا ہے۔ مورخ بوکا رو نے ۱۶۴۴ء میں ہندوستان میں پرتگالی نوآبادیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان خوشبویات کا بھی ذکر کیا ہے جو ان دنوں عورتوں میں خاص طور پر مقبول تھیں اور جنھیں "صبا" کہا جاتا تھا۔ کوتلیہ کے ارتھ شاستر میں غسل کے لیے خوشبودار اشیا کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔ آئینِ اکبری میں بھی عطروں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ان دنوں عطر نصف روپیہ فی تولہ سے پچپن روپے فی تولہ تک بکتے تھے۔ عطر صندل، عرقِ سیوتی، عرق چمبیلی، عرق مولسری اور عنبرِ اشہب کا شمار بہترین عطروں میں ہوتا تھا۔ بیگمات غسل کے بعد اور رات کو بستر پر جانے سے پہلے عطر ضرور اپنے لباس اور بدن پر لگاتی تھیں۔ اکبر کا عطر کا ایک الگ محکمہ تھا جسے خوشبو خانہ کہتے تھے۔ یہ شیخ منصور کی نگرانی میں تھا۔ اس خوشبو خانے میں ماہرین نئے نئے عطر ایجاد کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے بیگمات اور بادشاہ اور شہزادوں کے لیے وہ جذبات انگیز عطر تیار کرتے تھے جن میں وہ موتی، سونا اور افیم کی خاک بھی ملاتے تھے۔ نورجہاں کی والدہ نے گلاب کے پھولوں کا ایک نیا عطر بنایا جس کا نام "عطرِ جہانگیری" رکھا گیا۔ جہانگیر نے اس عطر کے بارے میں لکھا ہے "اس کی خوشبو اتنی تیز ہے کہ اگر اس کا ایک قطرہ ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ دیا جائے تو سارے بازو میں خوشبو پھیل جاتی ہے اور دن بھر نہیں جاتی۔"

کھانا پینا اور دسترخوان

آزادی سے پہلے ہوٹلوں اور کلبوں میں کھانا کھانے کا رواج نہیں تھا۔ انگریزی حکومت میں ہوٹل اور کلب گنتی کے تھے۔ ان میں انگریز جاتے یا ان کی ریس کرنے والے کچھ ہندوستانی امیرا ور اعلیٰ سرکاری افسر بھی کبھی کبھار چلے جاتے تھے۔ دراصل ہوٹلوں میں کھانا کھانا یا کھڑے ہوکر بازاروں میں کھلے عام کھانا ہندوستانی تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

گھر کی عورتیں اور بہو بیٹیاں ہر قسم کا لذیذ کھانا بنا لیتی تھیں اور بڑے گھروں میں باورچی اور رسوئیے بھی ہوتے تھے جو ہر قسم کے کھانے بنانے میں ماہر ہوتے تھے۔ گھروں میں بڑی عورتیں لڑکیوں کو بچپن سے ہی ہر طرح کے کھانے پکانے کے گُر سکھا دیتی تھیں۔ انہیں اچار مربے کچوریں پکوان وغیرہ سب کچھ بنانا آتا تھا۔

دلی میں حلوائیوں اور دوسری کھانے پینے کی جگہوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ دلی والے کھانے کے ہمیشہ شوقین رہے ہیں۔ دلی کی چاندنی چوک میں پراٹھے والی گلی سارے ہندوستان میں مشہور تھی۔ بیتے دنوں میں مہنگائی نام کو بھی نہیں تھی۔ مغلوں کے آخری دور میں روپے کا سیر بھر گھی اور دو پیسے کا سیر بھر دودھ ملا کرتا تھا اور دودھ ایسا گاڑھا کہ اس میں سینک سلائی کھڑی کر دو تو گرے گی نہیں۔ بہت بعد کے وقت میں بھی اگر کسی کی جیب میں ایک آنہ بھی ہوتا تو دلی میں آرام سے پیٹ بھر سکتا تھا۔ ویسے بھی دلی والے چاہے پیسے دار ہوں یا غریب' کھانے پینے میں کوئی کسر نہیں رکھتے تھے۔ جو طبیعت ہوتی کھاتے اور آنند

کے تار بجاتے۔ جو چیز بازار سے لاتے، ڈھیر ساری لاتے۔ آموں اور خربوزوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے گھروں میں آتے تھے۔ جلیبیوں، سموسوں اور خستہ کچوری کے بڑے بڑے دَونے ہاتھوں پر دھرے لے آتے۔ ان دنوں ڈھاک کے پتّوں کے دَونوں کا رواج تھا یا تیلیوں سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی ٹوکریوں کا جن میں کاغذ رکھ کر حلوائی سودا لگا دیتے تھے۔ جو چیز گھر میں آتی سارا کنبہ مل بانٹ کر کھاتا تھا۔ کوئی بہت کنجوس یا مکھی چوس کھانے پینے میں کمی کرتا تو اس کی ہنسی اڑا کر کہتے ــ " جوڑ جوڑ مر جائیں گے، مال جنوائی کھائیں گے۔" یا " ارے یار یا تو کھائے گھی سے، نہیں تو جائے جی سے۔"

ایک میر صاحب تھے۔ ساٹھ ستّر کے پیٹے میں ہونگے۔ ان کے ایک دوست ان کی ہی عمر کے ایک لالہ جی تھے۔ برسوں کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور دونوں کا آپس میں ہنسی مذاق رہتا تھا دونوں خوش طبع اور خوش گفتار تھے۔ میر صاحب کہتے ــ " ماس بناسب گھاس رسوئی " لالہ جی بولتے ــ " کھانڈ بناسب رانڈ رسوئی۔" میر صاحب پھر کہتے۔ " چاندنی چوک میں فتح پوری مسجد کے نیچے شاہجہاں پوری ہوٹل اور جامع مسجدؒ کی سیڑھیوں پر بیٹھنے والا مٹیا کبابی بھئی واہ کیا بات تھی اور ہاں یاد آیا، دلّی کی نہاری جس نے نہیں کھائی، کچھ نہیں کھایا۔" اسی طرح دونوں کی پر لطف نوک جھونک اور باتیں چلتی رہتیں اور بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی۔ میر صاحب دہلی کے سلطانوں کے دستر خوان سے لے کر مغلوں اور خاص طور پر اورنگ زیب کی لاڈلی بہن روشن آرا بیگم کے دستر خوان تک کا ذکر کرتے۔ میر صاحب کی باتیں بڑی لچھے دار ہوتی تھیں۔ چٹخارے لے لے کر کہتے:۔

" سلطان محمد تغلق کے دستر خوانِ خاص پر بیک وقت دو سو اور عام دستر خوان پر بیس ہزار آدمی روزانہ کھانا تناول کرتے تھے۔ مغلیہ خاندان کی شان تو بالکل نرالی تھی۔ ان کے دستر خوان نعمتوں کے لحاظ سے نہایت پُر تکلف اور اخراجات کے اعتبار سے ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے ماہوار کے ہوا کرتے تھے۔ ہندوستانی نوابوں اور امرا کے یہاں بھی رکاب دار بڑی بڑی تنخواہوں پر نوکر ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ پہلے مسور کی دال کے ایک پیالے پر

تین اشرفیوں کی لاگت آتی تھی۔ کھانا پکانے والوں میں تین قسم کے آدمی ہوتے تھے۔ اوّل " دیگ شو" یعنی دیگ دھونے والے، دوم "باورچی" جو بڑی بڑی دیگیں پکا کر تیار کرتے تھے، سوم " رکاب دار" جو اعلیٰ قسم کے کھانوں کی چھوٹی چھوٹی ہانڈیاں تیار کرتے تھے اور دسترخوان آراستہ کرتے تھے۔ اس لحاظ سے رکاب دار کا رتبہ سب سے بلند ہوتا تھا۔"

روشن آرا بیگم کا دسترخوان

روشن آرا بیگم کے دسترخوان کی شان واقعی نرالی تھی۔ جب اورنگ زیب اپنے بھائیوں کو ختم کر کے اور والد شاہجہاں کو قید کر کے دلی کے تخت پر بیٹھا تو اس کی لاڈلی بہن خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ آئے دن لال قلعہ میں جشن منائے جانے لگے۔ حیات بخش باغ اور مہتاب باغ میں بہار آ جاتی۔ باغوں کی رنگ برنگی پڑی پھلکاری منہ سے بولتی۔ قناطیں لگا کر پردہ کر دیا جاتا۔ کیا مجال کہ کسی آدمی کی پرچھائیں بھی پڑ سکے۔ شامیانے تن جاتے۔ ان میں کرن کے بڑے بڑے طرّے اور جھالریں جھلمل کر رہی ہوتیں۔ چھت پر سنہرے اور روپہلے تاروں کا جال بنا ہوا ہوتا۔ کہیں گنگا جمنی لیس کا چار خانہ ہوتا جس میں سلمے ستاروں کے پھول تاروں بھرے آسمان کی طرح جگمگا رہے ہوتے۔

جشن میں قلعے کی بیگمات، شہزادیاں اور سلاطین زادیاں بھی آتی تھیں اور نوابوں اور امرا کی بہو بیٹیاں بھی بلائی جاتی تھیں۔ یہ سب سولہ سنگار کیے اور چھتیس زیوروں سے سجی ایک سے ایک بڑھیا دوپٹے، پیشوازیں اور محرم کرتیاں پہنے ہوتیں۔ کمخواب، زربفت، مشرو اور گلبدن کے پاجامے ہوتے۔ سکھپال، ڈولیوں اور پالکیوں میں بیٹھی چلی آتیں۔ سواریوں سے اترتیں اور اپنی اپنی جگہ ایرانی قالینوں پر زری کے مخملی گاؤ تکیے لگا کر بیٹھ جاتیں۔ مہمانوں کے پیچھے لونڈیاں اور باندیاں مورچھل ہلا رہی ہوتیں۔ سب سے پہلے مہمانوں کی تواضع ٹھنڈے شربت سے کی جاتی۔

مغل عورتیں پان اور حقے کی شوقین تھیں۔ ان کے سامنے چاندی کے نفیس حقے رکھ

دئے جاتے۔ خاصدان میں پان کی گلوریاں رکھی ہوتیں۔ پان دان، حسن دان،' اور آرامدان رکھے ہوتے۔ ویسے بھی باغ پھولوں سے مہک رہا ہوتا۔ چاندی کے فوارے اچھلتے ہوتے۔ اگر، لوبان، گلاب، خس اور دوسرے عطر بھی چھڑکے جاتے اور مہمانوں کے کپڑوں پر بھی عطر ملا جاتا۔ اب لیجئے وہ سامنے سے روشن آرا بیگم اٹھلاتی، اتراتی خواصوں کے گھیرے میں چلی آرہی ہیں۔ آگے آگے جشنیں اور ترکنیں ہتھیاروں سے لیس قدم قدم پر" بسم اللہ بسم اللہ" کہتی چلی آرہی ہیں۔ روشن آرا بڑے طمطراق سے مخملی مسند پر جلوہ افروز ہو جاتی ہیں۔ زری کے گاؤ تکیے کا سہارا لے کر روشن آرا نے پاؤں مسند کے نیچے دھری ہوئی نقرئی چوکی پر رکھ دئے ہیں۔ مسند کے اوپر ہیرے، لعل اور جواہرات جڑی چھتری کے چاروں طرف ٹھوس سونے کے انار، موتی کی لڑیوں کے بیچ لٹکے ہوئے بڑے خوشنما لگ رہے ہیں۔ روشن آرا بیگم کی مسند کے دائیں طرف چاندی کی چوکی پر چینی ابھرواں کام کا ایک بہت بڑا پیالہ نما برتن رکھا ہے۔ اس میں چاندی سونے کے ہلکے پھلکے ستارے بھرے ہوئے ہیں۔ اب بیگمیں، شہزادیاں اور امیروں کی بہو بیٹیاں اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک ایک کرکے روشن آرا بیگم کے سامنے آتی ہیں، جھک کر سلامیں عرض کرتی ہیں اور نذرانے پیش کرتی ہیں۔ روشن آرا بیگم پیالے میں رکھے سونے چاندی کے ستارے مہمانوں پر اچھال کر انھیں خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔ دستر خوان بچھایا جا رہا ہے۔ کھانا چنے جانے سے پہلے ہر چیز کا ایک ایک ٹکڑا کتے بلیوں کو کھلایا جاتا تھا۔ اس سے پتہ لگ جاتا تھا کہ کھانے میں زہر تو نہیں ملا دیا گیا۔ سنگِ یشب کی پیالیوں میں کھانے کی اشیا رکھی جاتیں کیونکہ ان میں بال پڑنے سے پتہ لگ جاتا تھا کہ کھانے میں زہر ملا ہوا ہے۔ دستر خوان پر سینکڑوں قسم کے کھانے ہوتے۔ کہاں تک نام گنوائے جائیں۔ کھانا ہاتھ سے کھایا جاتا تھا لیکن نہایت صفائی اور سلیقے سے۔ کیا مجال جو انگلی کے اوپر، پوروں سے نیچے ہاتھ سَن جائیں۔

کھانا کھانے کے بعد برتنوں میں کھلی، بیسن اور آٹا وغیرہ رکھا ہوا آتا۔ سب ہاتھ صاف کرتیں اور رومال سے پونچھتیں۔ گلوریاں منہ میں رکھتیں، حقے کا دم لگاتیں اور گاؤ تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈومنیاں آجاتیں۔ روشن آرا بیگم کے

حکم پر بیٹھے سروں میں گانا شروع ہو جاتا اور چلتا رہتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اورنگ زیب نے موسیقی پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی تاجپوشی کے نو سال بعد گانا سننا بند کیا تھا۔ کچھ مورخوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگرچہ اورنگ زیب گانے بجانے کو خلاف شرع سمجھتا تھا مگر محلسراؤں میں کافی عرصے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ روشن آرا بیگم کا یہ جشن صبح تک چلتا رہتا۔ مگر پو پھٹتے ہی جشن بند کر دیا جاتا اور سب اپنے اپنے محلوں اور حویلیوں کی راہ لیتیں۔

دلی کے باورچیوں کا فن

جب دلی اجڑنے لگی اور مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹمانے لگا تو دلی کے بڑے بڑے کاریگر لکھنؤ جا بسے لیکن وہاں بھی دلی والوں نے لکھنؤ والوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ اِس سلسلے میں دلی کے ایک شہزادے مرزا آسمان قدر اور واجد علی شاہ کا ایک قصّہ مشہور ہے۔ دلی کا یہ مغل شہزادہ لکھنؤ گیا تو واجد علی شاہ کا مہمان ہوا۔ واجد علی شاہ کے دستر خوان پر ایک مربہ لاکر رکھا گیا جو دیکھنے میں بڑا خوبصورت لگتا تھا گویا ابھی ابھی تازہ اور لذیذ بنا ہے۔ مغل شہزادے نے اسے کھایا تو چکرا گیا کیوں کہ وہ مربّہ نہیں تھا بلکہ نمکین قورمہ تھا جس کی شکل مربّے کی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر شہزادے کو بڑی خفّت ہوئی۔ اس نے بھی واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ لکھنؤ کے بادشاہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ آج دستر خوان پر ان کے ساتھ بھی دھوکا ہوگا۔ مگر وہ چوکنے رہنے پر بھی دھوکا کھا گئے اور کھاتے چلے گئے۔ مغل شہزادے کے دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے مگر واجد علی شاہ جس چیز کو چکھتے وہ میٹھی اور شکر کی بنی ہوئی نکلتی۔ سالن تھے تو شکر کے، چاول اور پلاؤ تھے تو شکر کے۔ روٹیاں، اچار اور چٹنی تک سب شکر کی۔ یہاں تک کہ سب برتن بھی شکر کے تھے! واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کر ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکے پر دھوکا کھاتے چلے گئے۔

یہ سوچنا ایک قدرتی بات ہے کہ شہزادے آسمان قدر کا کھانا بنانے والے باورچی نہیں حلوائی ہونگے۔ یہ بات نہیں تھی۔ یہ کھانا باورچیوں اور حلوائیوں نے مل کر بنایا تھا شہزادے کے ساتھ ان کا اپنا باورچی شیخ حسین علی اور حلوائی بھی دلی سے لکھنؤ گئے تھے

اور وہ ہر قسم کی چیزیں بنانے میں ماہر تھے۔

گھنٹے والا شاہی حلوائی

حلوائی کا ذکر آیا تو گھنٹے والا شاہی حلوائی کا ذکر ناگزیر ہے۔ ۱۷۹۰ء میں لالہ سکھ لال کے نام کا ایک حلوائی دلی میں جے پور سے آیا۔ اس نے پہلے سودا پٹڑی پر لگایا۔ پھر دکان کرایے پر لے لی۔ اس نے اپنی دکان کی چھت پر بہت سی گھنٹیاں لٹکادیں۔ یہ گھنٹیاں مندروں میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کی مانند تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دکان کے نوکران گھنٹیوں کو بجاتے رہتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عالم شاہ کی مدد کے لیے جب مہاراجہ سندھیا دہلی آیا تو اس نے چاندنی چوک میں بادشاہ کا دربار سجایا۔ بادشاہ کی سواری آئی تو اس حلوائی نے گھنٹے بجا بجا کر استقبال کیا۔ اس مکان کے پاس جس میں دکان تھی، راجہ جگل کشور کی حویلی کے دروازے پر بھی ایک گھنٹا لٹکا رہتا تھا۔ حلوائی گھنٹے والے کے نام سے مشہور ہوا اور حویلی میں آنے جانے والی عورتوں کے کہار اس جگہ کو "گھنٹے نیچے" کہا کرتے تھے۔ یوں تو گھنٹے والا شاہی حلوائی پستے کی لوز، موتی پاگ، ترکھونٹ، بونٹ بادام، کھویا اور نگتی کے لڈو، مکھن بڑے، امرتیاں، پھینی، اندرسے کی گولیاں اور بہت سی دوسری مٹھائیاں بناتا تھا مگر اس کا قلاقند، حلوہ سوہن، سوہن پپڑی اور نان خطائی قلعے والوں کو بہت پسند تھیں۔ اس دکان سے بادشاہوں بیگموں اور شہزادیوں کے یہاں مٹھائی کے تھال جاتے تھے۔ دلی والے حلوائی کا نام تو بھول گئے لیکن دکان گھنٹے والے شاہی حلوائی کے نام سے دلی میں ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔ لندن میں کچھ عرصے بعد نمائش ہوئی تو انگریزوں نے اسے وہاں بلوایا تھا۔ بیاہ شادیوں میں، ہرے ہرے پتوں کی پتّل میں سات دالوں (شیریں دان، نمک دان، میوہ دان، کھوئے دان، ربڑی دان، ملائی دان اور اچار دان) کے علاوہ گھنٹے والے حلوائی کی رام پوری خاص چیز ہوتی تھی۔ اب تو لوگ اس کا نام بھی بھول گئے۔

اسی تعلق میں ایک اور چھوٹی سی بات قابلِ ذکر ہے۔ امن چین کے دن تھے سستے کا زمانہ تھا۔ ایک دن کوئی ہنس مکھ گاہک جس کی گھنٹے والے حلوائی کے ساتھ دوستی تھی، اس کی دکان پر آیا اور ایک پیسہ جیب میں سے نکال کر لالہ کی طرف پھینکا اور بولا ــــ

"لالہ یہ پیسہ لے لو۔ پستے کی لوز دیدو اور جو ریزگاری بچے واپس دیدو۔" لالہ نے پیسہ اٹھایا اور اپنے نوکر کو دے کر کہا۔" اسے ٹرام کی پٹڑی پر رکھدو۔" اس نے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں ٹرام آئی اور پیسے کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ نوکر نے دونوں ٹکڑے لاکر لالہ کو دیدئے۔ لالہ نے ایک دونے میں پستے کی لوز رکھ کر اور پیسے کا آدھا ٹکڑا گاہک کو دے کر کہا۔
"یہ لو لوزا اور یہ رہی ریزگاری۔"

شاہی حلوائیوں میں کنجس حلوائی جس کے نام کی گلی دریبے میں آج تک ہے بڑا مشہور تھا۔ اس نے مغل بادشاہ بہادر شاہ اور اس کے والد اکبر شاہ کے زمانے میں بڑا نام کمایا۔ حلوہ بنانے میں اس کا مقابلہ نہیں تھا۔ بادامی حلوہ، سنگھاڑے کا حلوہ، روے، مونگ، ادرک، بادام، گاجر وغیرہ کے حلوے بڑی عمدگی اور نفاست سے بناتا تھا۔ کنجس حلوائی کے یہاں کی کچی پوری بہت مشہور تھی۔

بیدواڑے اور گھنٹہ گھر کے پاس بھانا ببّر کی دکانیں تھیں۔ وہ نمکین مٹھائی بنانے میں ماہر تھا۔ پستے کی برفی اور کھوپرے کا پیڑا بہت اچھا بناتا تھا۔ یہاں کی بنی مٹھائی کی جوہریوں کے بڑی مانگ تھی۔ بڑشاہ بولے پر سرنی حلوائی (آنندی مل سرنی مل) اور چھوٹے دریبے یا پراٹھے والی گلی میں بہت سی دکانوں پر سویرے حلوہ پوری، خستہ کچوری، مٹھریاں اور نمک پاروں کی خوب بکری ہوتی تھی۔ بہت سے گھروں میں ان سے ناشتہ ہوتا تھا۔ شام کو جلیبیاں اور رات کو اوٹے ہوئے دودھ کو کڑاہی سے ایک چوڑے منھ کی لٹیا میں بھر کر اونچی لمبی دھار سے مٹکینوں میں بھر کر گاہکوں کو دیتے تھے۔ ایک پردیسی نے یہ دیکھ کر کہا تھا۔" لالہ جی ایک گز دودھ ہمیں بھی دیدو۔"

مٹیا محل میں لالہ جھبّر مل اور چاندنی چوک میں کوچہ قابل عطار کے پاس حبشی حلوہ سوہن والے کی دکان تھی۔ مسلمانوں کے یہاں یہ حلوہ بہت کھایا جاتا تھا۔ فتح پوری مسجد کے نیچے شاہجہاں پوری ہوٹل میں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مستیا کبابی کی دکان پر بھی لوگ دور دور سے کھانے آتے تھے۔

ہیرا دلّی کا ایک مشہور کاریگر تھا۔ پیٹھے کے انگور تیار کرتا تھا اور چھوٹی سی پٹاری

میں رُوئی لگاکر اس پر ان انگوروں کے گچھے سجا دیتا۔ پیٹھے کے انگوروں پر اصل انگوروں کا دھوکا ہوتا۔ انگور کے گچھے کچھ مرجھائے ہوتے، کچھ لالی لیے اور کچھ گہرے ہرے ہوتے۔ جب تک انگوروں کو ہاتھ سے چھوا نہ جاتا اچھے اچھے دھوکا کھا جاتے۔

مٹھائی اور نمکین کے تھال سجانے میں کلو سنگھ بانکے نے بڑا نام کمایا تھا۔ امیر گھروں اور محلات میں اُس کی بڑی مانگ تھی۔ چاندنی چوک میں چھوٹے دریبے کے نکڑ پر لالہ کنور سین کی دکان ہے۔ ان کے ہاں سے اچھا نمکین سودا اور کہیں نہیں ملتا تھا۔ دلّی میں سب سے پہلے دال بیجی ان کے یہاں ہی بننی شروع ہوئی تھی۔ لالہ کنور سین بہادر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے بڑوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے لدھیانہ میں کام شروع کیا تھا۔ پھر دلی آکر آٹے دال کی دکان شروع کر لی تھی۔ بعد میں اسے بند کر کے مٹھائی اور نمکین کی دکان کھول لی۔ مونگ کا 'دلِ خوشحال' ان کی دکان کی خاص مٹھائی تھی۔ دریبے میں گوری شنکر کی دکان بھی مشہور تھی۔ اس دکان کا پیٹھا، اندرسے کی گولیاں، ملائی کے لڈو اور پھینی لاجواب ہوتے تھے۔

ماہرِ فن باورچی

لکھنؤ کے نواب سعادت علی خاں کے یہاں دلی کا ایک باورچی نوکری کرنے کے لیے گیا۔ نواب صاحب نے پوچھا: "کیا پکاتے ہو؟" کہا۔ "ارہر کی دال پکاتا ہوں۔" پوچھا: "تنخواہ کیا لو گے؟" کہا: "پانچ سو روپے" نواب صاحب نے رکھ لیا۔ مگر باورچی نے کہا: "میں ایک شرط پر کام کرونگا۔ جب حضور کو میرے ہاتھ کی دال کا شوق ہو تو ایک دن پہلے حکم ہو جائے اور جب خبر دوں کہ دال تیار ہے تو اسی وقت کھا لیں۔" نواب صاحب نے باورچی کی بات مان لی۔ کچھ دن بعد باورچی کو دال پکانے کا حکم ہوا۔ اس نے تیار کی اور خبر کر دی۔ لیکن بار بار کہنے پر بھی نواب صاحب دال کھانے نہیں آئے۔ باورچی پریشان ہو گیا۔ اس نے دال کی ہانڈی اٹھا کر ایک سوکھے پیڑ کی جڑ میں ڈال دی اور نوکری چھوڑ کر چل دیا۔ کچھ دن بعد دیکھا گیا کہ جس پیڑ کے نیچے دال پھینکی گئی تھی وہ ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ نواب صاحب کو دلی کے اس باکمال باورچی کے چلے جانے کا بڑا ملال ہوا۔

دلی کا ایک رسوئیا ایسے اچھے کریلے پکاتا تھا کہ دیکھنے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں بھاپ بھی نہیں لگی اور ویسے ہی ہرے اور کچے رکھے ہیں مگر کاٹ کر کھانے کے بعد پتہ لگتا کہ بہت ذائقے دار اور پکے ہوئے ہیں اور کڑواہٹ بھی بالکل نہیں ہے۔

کائستھوں کے لذیذ کھانے

دلی کے کائستھ گھروں میں بھی بڑا عمدہ کھانا بنتا تھا۔ کیونکہ کائستھوں اور مسلمانوں کا بڑا میل جول تھا، مسلمان بھی اپنے کائستھ دوستوں کے یہاں کھانا بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ دلی کے ماتھر کائستھوں کے یہاں گوشت کی ایک قسم بڑی لذیذ بنتی تھی۔ اسے "شب دیغ" کہا جاتا تھا۔ گوشت کو مختلف سبزیوں میں ملاکر اور اس کے اندر مختلف مگر مخصوص مصالحے ڈال کر گھنٹوں دھیمی آنچ پر پکایا جاتا تھا۔ مچھلی کے کوفتے، دم گل، اور ادلے پسندے روز کھائے جاتے تھے۔ کائستھ گھروں میں ارہر، اڑد اور مسور کی دال بھی بہت عمدہ بنتی تھی۔ ارہر اور اڑد کی دال گھلی ملی "ملواں" بھی بناتے تھے اور "کھلواں" بھی۔ کھلواں، ارہر اور اڑد کی دال میں ایک ایک دانہ الگ نظر آتا تھا۔ کائستھ گھروں میں بیسن کے "ٹکے پیسے" بھی سبزی کے طور پر بنائے جاتے تھے۔ بیسن کا ایک گول رول سا تیار کرکے اسے ابال کر اس کے گول گول "ٹکے پیسے" کاٹ کر ان کی رسے دار سبزی بناتے تھے جو بڑی سواد ہوتی تھی۔ مسور کی دال مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں بڑی عمدہ بنائی جاتی تھی اور اسے اتنی لذیذ غذا سمجھی جاتی تھی کہ یہیں سے وہ محاورا مشہور ہوا ــ "یہ منھ اور مسور کی دال!"

پراٹھے

دلی والوں کو پراٹھے کھانے کا بڑا شوق تھا۔ دلی کی مشہور پراٹھے والی گلی میں پراٹھے سادہ، بل دار، روے کے، میدے کے، کئی کئی پرت والے اور خستہ، ہر قسم کے ملتے تھے۔ آلو اور گوبھی کے پراٹھے دھنیئے کی چٹنی کے ساتھ بڑا مزہ دیتے تھے۔ پرانی باتیں سب ختم سی ہوگئیں۔ مگر بہت سے دلی والوں کے گھروں میں ابھی تک اجلی اجلی کٹوریوں اور تھالیوں میں کھانا کھایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں صبح کچی رسوئی اور شام کو پکی رسوئی بنتی تھی۔ بڑے بوڑھے پرانی کہاوت یاد دلا کر کہتے تھے ــ "فقط دال روٹی اور سب بات کھوٹی"۔

اچار، مربے

دلی والے چٹورے مشہور ہیں۔ اچار، مربے، کانجی وغیرہ کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے۔ سارا سال گھروں میں اچار مربے پڑتے رہتے ہیں۔ آموں کے دنوں میں گھر گھر سردتہ چلتا رہتا اور پھاڑیاں سکھائی جاتیں۔ چھوٹی نارنگی، کمرخ، لگروندے

اور نیبو کے اچار بھی پڑتے اور چقندر، بینگن، کریلے، کدو، شلجم، مولی، آلو، کچالو، کٹھل، لسوڑے، کمل ککڑی اور ٹھینٹے کے بھی۔ مربے بھی طرح طرح کے تیار کیے جاتے تھے۔ آم کا، املی کا، آنولے کا، سیب کا اور فالسے وغیرہ کا مربہ عام بنایا جاتا تھا۔ آنولے کا چاندی کا ورق لگا مربہ سویرے ناشتے کے وقت بھی کھاتے تھے۔ بڑے کہتے تھے ــــ "کاتک جو آنولے کھائے۔ کٹنبھ سمیت بیکنٹھ جائے۔"

گنجے نہاری والے

مسلمان نان بائیوں کے یہاں شیرمال، باقرخانی، کلچے اور خمیری اور رومالی روٹیاں بکتی تھیں۔ جاڑے بھر یہ نہاری کی دکان بھی لگاتے تھے۔ نہاری بارہ مسالے کی چاٹ ہوتی تھی۔ امیر غریب سب رغبت سے کھاتے تھے۔ نہاری کا رواج دلی کے سوا اور کہیں نہ تھا۔ سب سے زیادہ مشہور گنجے نہاری والے کی دکان تھی جو قابل عطار کے کوچے اور سیدانیوں کی گلی کے بیچ میں بیٹھتا تھا۔ نہاری کے شوقین بڑی دور دور سے اس کے پاس پہنچتے تھے۔ گرم گرم روٹی اور دیگ سے نکلی ہوئی نہاری۔ جتنی نلیاں چاہیں جھڑوائیں، اوپر سے بھیجا ڈلوایئے، پیاز سے کڑکڑاتا ہوا اصلی گھی، ادرک کا لچھا، کتری ہوئی ہری مرچیں، اوپر سے نچڑا ہوا کھٹا۔ لوگ چٹخارے لے لے کر کھاتے تھے۔ گنجے نہاری والے کی دکان پر سورج نکلتے ہی بھیڑ لگ جاتی۔ دس لوگ اندر بیٹھے کھا رہے ہوتے اور بیس ہاتھوں میں برتن لیے کھڑے ہوتے۔ ایک پیسے سے لے کر ایک روپے تک کے گاہک ہوتے تھے۔ نہاری اب بھی دلی کے مسلمانوں کو مرغوب ہے اور سوئی والان، کالی مسجد، چوڑی والان وغیرہ میں اب بھی دکانیں ہیں مگر نہ اب وہ مسالے ہیں اور نہ اصلی گھی۔ گنجے نہاری والے جو نہاری کھلا گئے اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔

گھمّی کبابی

گھمّی کبابی بھی بڑا مشہور تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لے کر دلی دروازے اور پھاٹک حبش خاں تک اس کے کباب کھائے جاتے تھے۔ دکان تو اب بھی موجود ہے اور کباب ہی اس پر بکتے ہیں مگر گھمّی والی وہ بات اب کہاں۔ جاڑوں میں شام کو پانچ بجے کے بعد اور گرمیوں میں مغرب کی اذان کے قریب دکان جمتی تھی۔ کلیجی، گردے اور بکری کے بھیجے تلے ہوئے الگ اور بھنے ہوئے الگ

رکھتا تھا۔ قیمہ سیخوں پر چڑھاتا جاتا اور آپ ہی آپ بولتا رہتا۔ گاہکوں سے بڑی لچھے دار مخصوص دلی کی زبان میں بات کرتا۔ گاہک کباب کھاتے رہتے اور اس کی مزیدار باتوں سے اپنے لطف کو دُونا کر لیتے۔ رات کو دیر تک دکان کھلی رہتی اور ہر روز کا سامان ہر روز ختم ہو جاتا۔

شاہی دسترخوان

مصورِ غم مولانا راشد الخیری مرحوم نے اپنی تصنیف "وداعِ ظفر" میں بہادر شاہ ظفر کے دسترخوان کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی دسترخوان اس طرح بچھایا جاتا کہ نیچے چمڑا، چمڑے پر ستیل پاٹیاں ستیل پاٹیوں پر وسط میں چار گز لمبا اور آدھ گز اونچا تخت۔ بادشاہ تخت پر بیٹھتے، دائیں طرف بیگمیں، بائیں طرف شہزادیاں، سامنے دوسرے مرد اور عورتیں۔ پہلے سیلاپچی بادشاہ کے روبرو آتی۔ ان کے بعد داہنی طرف سے سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سیلاپچیوں کے تین دور ہوتے۔ شاہی سیلاپچی سے صرف بیگموں کے ہاتھ دھلتے، دوسری سے شہزادیوں کے اور تیسری سے مردوں کے۔ دسترخوان پر جو اشیا لگائی جاتیں ان کی تفصیل موسم کے مطابق اس طور پر ہے۔

پتیلی کے کباب

ہرن، مرغ، تیتر، بٹیر، مور، خرگوش، چہے، مرغابی، سُرخاب۔

شامی کباب

بکرا، مرغ، ہرن، قاز، کلنک، ہریل، جنگلی کبوتر، مچھلی (روہو، سیل، بلّی، مہاشیر)

سالن سادہ

مرغ، بکرا، ہرن، کبوتر، مچھلی، ہریل اور سادہ کچا ٹوٹے مسالے کا، کھڑے مسالے کا، پسے مسالے کا۔

سالن ترکاری

دراز گھیا۔ ترئی۔ بھنڈی، آلو، اروی، کچالو، پنڈالو، رتالو، کھیرا، ککڑی زمین قند، پرول، شلغم، چقندر، گوبھی، مٹر، بینگن، کریلے، ساگ، کچنار، سیم کے بیج۔

چاول نمکین

بریانی، قبولی، پلاؤ، مرغ پلاؤ، ہریل پلاؤ، چنا پلاؤ، صندلی پلاؤ، نرگسی پلاؤ، فالسائی پلاؤ، شاہی پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، شاہجہانی پلاؤ، نورجہانی پلاؤ، بونٹ پلاؤ۔

چاول میٹھے

زردہ، متنجن، کشمشی متنجن، بادامی متنجن، مہریلی متنجن، فالسائی متنجن، مار اللّھی متنجن، اسرائیلی متنجن، مزعفر۔

روٹی

چپاتیاں سادہ، پراٹھے سادہ، بل دار، روے کے، میدے کے، شیرمال، باقرخانی، خمیری، گاؤدیدہ، گاؤزبان، نان گلزار، نان بہار، ہمایونی روٹی، روغنی روٹی، کلچے، بیسنی روٹی، مکئی کی روٹی، باجرے کی روٹی، جو کی روٹی، چاول کی روٹی، بڑی روٹی، اصفحی روٹی، کمل گھی کی روٹی، نیلوفری روٹی، مصری کی روٹی۔

کھیر

فیرینی، سادہ کھیر، آلو کی کھیر، بادام کی کھیر، پستے کی کھیر، آموں کی کھیر، گاجر کی کھیر، چنوں کی کھیر، رس کی کھیر، نقرئی کھیر، طلائی کھیر۔

دلیہ اور رائتہ

دودھ، ٹنڈے، بینگن، درازگھیا، ترئی، کریلے، گوشت۔

بورانی

سادہ، ککڑی، مونگ، بیسن، کھیرا، بینگن۔

قیمہ

مرچ، سادہ، ہری مرچ، لال مرچ، سیاہ مرچ، میتھی، سویا، کریلے، خاگینہ، انڈے۔

سموسے

آلو، قیمہ، تیتر، بٹیر، مرغ، مچھلی، اروی کے، انڈے کے، زعفرانی، نرگسی، سلیمانی، سادہ۔

ٹکڑے

خمیری، نان پاؤ، گاؤدیدہ، گاؤزبان، میٹھے، سلونی، آبی، ترنجی، ہندوستانی، ایرانی۔

دالیں

بادشاہ پسند، سرخابی، بحری، ترکمانی، سادہ، بھنی ہوئی، تلی ہوئی، بھیگی ہوئی، خشک ارہر، مونگ، ماش، پنج میل، مسور، ملکہ مسور۔

کھنڈویاں

بیسن، دہی کی، سادہ، قلمی، لمبی، گول، چوکور، بھنی ہوئی، تلی ہوئی۔

میٹھی چٹنیاں

انناس، آم، لکروندے، پیاز، راحت جان، پودینہ۔

سلونی چٹنی

پودینہ، ہری مرچ، کیری، آم، پیاز، لحمی، عرق نانی، سرکہ، ادرک، ایسم کے بیج پسے ہوئے اور تلے ہوئے۔

مربّے

آم، انناس، ادرک، امرود، بہی، سیب، گڑھل، بڑھل، کھٹل، گاجر، مولی۔

حلوے

گاجر، روا، مولی، چنا، موتی چور، مونگ، نورجہانی، اکبری، فرخی، آسمانی، زعفرانی، فلک نما، عزیزی، ایرانی، تورانی، عربی، تاشقندی، مصری۔

مٹھائیاں

حلوہ سوہن، گلاب جامن، قلاقند، موتی پاک، کھجور، امرتی، لڈو، پیڑے، بالوشاہی، اندرسے، اندرسے کی گولیاں، پیٹھے کی مٹھائی، پھینیاں، ربڑی، بالائی

پھل

آم، خربوزے، کیلے احمد آبادی، بنگالی اور کوبی، رنگترے، شریفے اور لیچیاں۔

ان تمام لوازمات کے ساتھ ساتھ متعدد برتنوں میں کھلی، بیسن، ابٹن، صابن اور آٹا رکھا رہتا تھا۔ ہاتھ پونچھنے کے لیے رومال بھی ساتھ ہی رکھے رہتے تھے۔ بادشاہ چاروں طرف ایک نظر ڈالتے اور سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھتے۔ ایک خواص گلاب پاش کھولتی اور چاروں طرف چھڑکتی۔ اس کے بعد کیوڑا چھڑکا جاتا اور آخر میں عطر حسن۔ جب فضا معطر ہو جاتی تو بادشاہ سب سے پہلے فرینی میں چمچہ ڈال کر شروع کرتے۔ اس کے ساتھ ہی قلعے کے نیچے جمع ہوئے قلاش اور مفلس لوگوں کو سات من روٹیاں خمیری اور سالن بٹنا شروع ہو جاتا۔ مغل بادشاہ غریبوں کو کھلائے بغیر خود کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔



حفصے کا شوق

پان اور حقّہ

پان کی شان کے کیا کہنے۔ پان کی قدر ہمیشہ ہوتی آئی ہے۔ پوجا پاٹھ، بیاہ شادی، تیج تہوار ہو یا جشن اور میلے، پان کی مانگ ہر وقت اور ہر جگہ ہوتی ہے۔ پان ہمارے سماج اور ہماری تہذیب اور تمدن کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ پان کا استعمال ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہوتا آرہا ہے۔ آریاؤں کے عہد میں یعنی ویدک زمانے میں بھی پان کا رواج تھا۔ رامائن، مہابھارت اور جاتکوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ عظیم شاعر کالی داس نے اپنی تخلیقوں میں پان کا ذکر کیا ہے جس کے لیے اس نے 'تمبول' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بھی پان کا ذکر خوب کیا ہے اور اس کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ حکیموں اور ویدوں نے بھی اس کے گن گائے ہیں۔ امیر خسرو نے بھی پان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ بڑی بوڑھیاں ان کی پہیلیاں اور ان کے دوسخنے بچوں کے جی بہلاوے کے لیے سناتی آرہی ہیں۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی پان کا حال لکھا ہے۔ وہ اپنے ایک سفر نامے میں لکھتا ہے:-

"سلطان محمد تغلق کی شاہی دعوتوں میں کھانے سے پہلے شربت پلایا جاتا تھا اور کھانے کے بعد پان کی گلوری پیش کی جاتی تھی۔ شاہی محلات میں پان کھانے کا بڑا رواج تھا۔ شام کے وقت بیگمات بادشاہ کے پاس جانے سے پہلے کنیزوں سے پان سپاری منگوا کر کھاتی تھیں۔ مغلوں کے عہد میں شاہی

محلات سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک مہمانوں کا استقبال پان کھلا کر کیا جاتا تھا۔ ہندو راجاؤں کے محلوں میں بھی رانیوں کو پان کھانے کا شوق تھا۔"

ایک دن مغل شہنشاہ اکبر نے بیربل سے پوچھا۔" شاہوں میں بڑا کون ؟ پتوں میں سب سے بڑھیا کون سا پتہ ؟" بیربل نے دست بستہ کہا۔" جہاں پناہ سلامت، شاہوں کے شہنشاہ آپ۔ پتوں میں افضل پتہ پان کا جو آپ کے دہنِ مبارک سے سرخرو ہوتا ہے۔ آپ کے منہ تک پہنچ کر اپنی رونق اور اپنی عزت بڑھاتا ہے۔"

مرہٹوں کے باجی راؤ پیشوا کی محبوبہ مستانی پریوں سے زیادہ حسین تھی اور ناچ گانے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ سولہ سنگار کرتی اور پان کھا کر منہ رچاتی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ پان کھاتی تو پان کی سرخی اس کی صراحی دار، سفید اور بلوریں گردن میں سے اترتی دکھائی دیتی تھی۔ راجپوتوں کے محلوں میں بھی پان کو ایک خاص چیز سمجھا جاتا تھا۔ مغل بادشاہوں نے تو اپنی بیگموں اور شہزادیوں کو پاندان کے خرچے کے لیے الگ جاگیریں بھی دی تھیں۔

پان کی گلوریوں میں "موتی پھونک" لگایا جاتا تھا۔ کتھے کو کیوڑے کے عرق کے چھینٹے دے کر صاف کرتے تھے۔ چھالی کُٹی جاتی تھی، رنگ نکھرتا جاتا تھا، کتھا بنتا جاتا تھا۔ چکنی ڈلی ایسی کہ آنکھوں کو تراوٹ پہنچے۔ الائچی کے دانے دکن سے اصلی چوگھڑے کے آتے تھے۔ پان کے پتے میں جائفل، لونگ الائچی، موتی کا کشتہ، مشک، عنبر، کیسر اور سونے کے ورق ڈال کر، صندل کے دستے میں پیسا جاتا تھا۔ اس زمانے میں دلی میں جو نفاستیں، پان کے لیے برتی جاتی تھیں وہ، غالباً لکھنؤ کو چھوڑ کر، ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں نہیں برتی جاتی تھیں۔

دلی کے لال قلعے میں پان کی گلوریاں چار طرح کی ہوتی تھیں، سموسہ گلوری، لقمی گلوری تعویزی گلوری اور بیڑا۔ پان اس ترکیب سے کھایا جاتا تھا کہ پورے پان پر کتھا چونا لگا دیتے تھے اور پان دان میں یا پانوں کی ڈبیا میں کھدر کے گیلے کپڑے میں باندھ کر رکھ لیتے تھے۔ جب کھانے کی خواہش ہوئی تو ایک ٹکڑا نکال کر کھا لیا۔ کتھا چونا اتنی احتیاط

سے لگایا جاتا تھا کہ پان پر ہر جگہ ایک سا ہوتا تھا۔ پان جاڑے، گرمی، برسات یعنی موسم کے حساب سے بنایا جاتا تھا۔ جاڑے کا پان ایسا ہوتا تھا کہ کھاتے ہی بدن میں گرمی دوڑ جاتی تھی اور پیشانی پر پسینہ پھوٹ پڑتا۔ گرمیوں کے پان ٹھنڈک پہنچاتے اور برسات کے دل کو سکون۔ یہ سب امیروں کے چونچلے تھے۔ لیکن پان فقیروں، درویشوں اور خانہ بدوشوں کی بھی سوغات رہا۔

بدن پر نہیں لتّہ
پان کھائے البتّہ
غریب شاعر کہتا ہے
کیا کروں خانہ بدوشی میں
قدر مہمان کی
لیجئے ڈبیہ کہ حاضر ہے
گلوری پان کی!

زمانے گزر گئے لیکن پان کے بارے میں کچھ کہاوتیں اور رسمیں ابھی تک چلی آ رہی ہیں۔ بھانجے بھانجی کے بیاہ میں رخصت کے وقت بہن کے رشتے داروں اور عورتوں کو نقدی دینے کی رسم کو 'تامبول' یا 'تنبول' بھی کہا جاتا ہے۔ جب لڑکے کو لڑکی کا باپ سات پانوں کا بیڑا بھیجتا ہے تو سمجھو بات پکّی ہو گئی۔ مسلمانوں میں دولہا میاں گھوڑے پر سوار ہو کر دلہن کو ڈولے میں بٹھا کر رخصت کرا کے لاتے ہیں تو بہت سے سقّوں کے سروں پر جہیز کا جو سامان ہوتا ہے اس میں پاندان اور اگالدان بھی ہوتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ دلی کے چوک، چوراہوں اور گلی کوچوں میں پھیری والے اور سودا بیچنے والے جو کچھ بیچتے، اونچی آواز سے گا کر بیچتے۔ ان میں پنواڑی اور پنواڑنیں بھی ہوتیں۔ پنواڑنیں البتہ نہ آواز دیتیں، نہ گاتیں۔ ان کے لگے بندھے گھر ہوتے اور وہ ان میں جا کر عورتوں میں پان بیچ دیتیں۔ پنواڑی اپنی مخصوص آواز میں لہک لہک کر گاتا۔

لیلو پان کی گلوری

گوری کے لیے گلوری

ہرا ہرا پان ہے

لال لال شان ہے

بدخشاں کی دکان ہے

یہ پان ہے، یہ پان ہے

لیلو گوری کے لیے گلوری!

دلی کی پنواڑنیں بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ گھروں میں آنے والی پنواڑنوں کے علاوہ کچھ پنواڑنیں اپنے مردوں کی دکان پر بھی کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتیں اور کوئی میلہ بھرتا تو خود دکان جما کر بیٹھ جاتیں۔ من چلے اور شوقین مزاج لوگوں کو اپنی لچھے دار باتوں سے بہلاتیں اور پان کی خوب بکری ہوتی۔ اگر پنواڑن نوجوان اور طرح دار ہوتی تو گاہک خود ٹوٹا پڑتا۔ دراصل پان اور پان کی دکان کا تعلق عشق مزاجی سے بہت ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار حضرتِ داغ اپنے ساتھیوں سمیت، پھول والوں کی سیر میں گئے، داغ پان کے رسیا تھے اور عشق مزاجی گھٹی میں پڑی تھی۔ ایک نوجوان اور شوخ پنواڑن کی دکان سجی دیکھ کر اس کی طرف بڑھے اور پنواڑن سے بولے "بی پنواڑن، دس پان لگانا۔" پنواڑن نے جوتی کی نوک پر ہاتھ لگا کر کہا "کیا فرمایا کتنے لگاؤں؟" مرزا داغ جھینپ گئے اور پنواڑن سے صحیح محاورہ سن کر چوکڑی بھول گئے اور سنبھل کر بولے۔ "دس پان بنانا۔" دلی کی پنواڑنیں بھی بامحاورہ اردو بولتی تھیں!

پان کے بارے میں ایک لطیفہ سنیئے۔ ایک بار کوئی اجنبی دلی آیا۔ ادھر ادھر گھومتا رہا اور تھک ہار کر ایک پان کی دکان پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو پان کھاتے دیکھا۔ جب بھیڑ چھٹی تو اس نے بھی پان لیا اور اس کے بعد پان پر پان کھانا شروع کر دیا۔ پنواڑی پان بناتا رہا اور اچنبھے سے اسے دیکھتا رہا۔ اجنبی نے بہت سے پان کھا لیے اور پیٹ بھر گیا تو پیسے دے کر چلتا بنا۔ دوسرے دن پنواڑی نے اس اجنبی کو اپنی دکان سے کنّی کاٹ کر جاتے دیکھا تو آواز دی "اے حضور پان تو کھاتے جائیے۔" اجنبی نے مڑ کر جواب دیا۔

"آج نہیں۔ آج تو میں روٹی کھا کر نکلا ہوں۔" اس چٹکلے کو سن کر بڑوں کا کہا یاد آگیا کہ پان کھانے کے لیے سلیقہ چاہیئے۔ یہ نہیں کہ بکری کی طرح پیٹ بھرنے کے لیے چبڑ چبڑ چباتے جایئے۔ پان نہ ہوا، پیپل کا پتہ ہو گیا!

بڑی بوڑھیاں بھی یہی کہا کرتی تھیں کہ ہر لڑکی کا سگھڑ پن اس کے پان دان کی صفائی سے معلوم ہوتا ہے۔ پان بہت صاف ہونے چاہئیں۔ ایک ایک پان اچھی طرح سے دھویا جاتا تھا۔ پان کی رگوں میں خشخاش کے دانوں سے بھی چھوٹے چھوٹے کیڑے چپٹے رہتے ہیں اور پانوں کو پانی سے اچھی طرح نہ دھویا جائے تو پان کھانے والے کے پیٹ میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ پان کھانے والے کے مسوڑھوں، دانتوں اور گلے میں ان کیڑوں کے زہر سے بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ پانوں کو دھو دھو کر اور ان کی رگوں کو صاف کر کے موٹے کھدر کے کپڑے میں پانی سے تر کر کے رکھا جاتا تھا۔ کتھے چونے کی کلیوں اور چمچیوں کو بھی اچھی طرح سے صاف کر لیا جاتا تھا۔ صاف ستھرا پاندان گھر کی زینت بڑھاتا تھا۔ کتھّے کو بھی صاف پانی میں پکا کر کلھیوں میں ڈھک کر رکھ دیا جاتا تھا۔ چونے کی بھی خاص احتیاط اور صفائی رکھی جاتی تھی۔ پاندانوں کے اندر کتھے چونے کی کلہیاں، زردے چھالیا کی ڈبیاں، الائچیوں اور بن چکنی وغیرہ کی ڈبیاں الگ الگ ڈھکنوں سے ڈھکی ہوئی پٹاری میں رہتی تھیں۔ پان کو اگر باریک کپڑے میں لپیٹ کر رکھا جاتا تو جلدی سوکھ جاتا۔ اس لیے موٹے کپڑے میں ہی تر کر کے تہہ در تہہ رکھتے تھے اور کپڑے کو متواتر گیلا کرتے رہتے تھے۔ پانوں کو تازہ رکھنے کے لیے یہ عمل ضروری تھا۔

پرانے زمانے میں، اور خاص طور پر راجپوتوں میں، کسی کام کی تکمیل کا عہد پان سے کیا جاتا تھا۔ کوئی معرکہ آن پڑتا تو بھرے دربار میں پان کا بیڑا رکھ دیا جاتا اور سورما اس معرکے کو سر کرنے کا عہد لیتا، وہ اُس پان کے بیڑے کو اٹھا لیتا۔ وہ سورما معرکہ سر کرتا یا اپنی جان دے دیتا۔ کسی کام کے بیڑا اٹھانے کا محاورہ اسی روایت سے بنا۔

اگر پان عمدہ بنا ہوا ہوتا اور کتھا چونا صحیح مناسبت سے یکساں لگا کر سرد پانی میں تر کر کے رکھ دیا جاتا، تو باسی پان اپنا الگ ہی مزہ دیتا تھا۔ ایسے ہی باسی پان کے

بارے میں ایک شاعر اور ادیب نے کیا خوب کہا ہے ''باسی گلوری کھائی نہیں اور لالی آئی نہیں۔ جدھر اٹھ گئی شفق ہی شفق دکھائی دے گی۔ گلوری نہیں بجلی ہے خداوند، اِدھر کلّے میں دبائی، اُدھر خون گرمایا۔'' شاید غالب نے بھی کسی کی ہتھیلی پر پان کی چکنی ڈلی دیکھ کر یہ شعر کہا تھا۔

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیئے

پان میں کتھا چونا لگانے کے لیے بہت خوبصورت چچیاں ہوتی تھیں جن کے سروں پر مور بنے ہوتے تھے۔ دیسی پانوں کا رواج بہت تھا لیکن مگھئی، سانچی، بنارسی، کانپوری، جگن ناتھی، بنگالی، بیگمی اور مہوبے کے پان بھی کھائے جاتے تھے۔ اگر کوئی زیادہ پان کھاتا تو اُسے ہمیشہ ٹوکا جاتا تھا۔ ''جب دیکھو کلّے میں گلوری ٹھسی ہے۔ باچھوں سے پیک بہہ رہی ہے۔ منھ بیر بہوٹی بنا ہوا ہے'' کوئی کہتا۔ ''پان کھانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے پان اچھی چیز ہے۔ خون پیدا کرتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد منھ صاف کرنے کے لیے اچھی چیز ہے۔ گلے، دانت اور معدے کی دوا ہے لیکن یہ پان آخر پان ہے۔ تمیز سے تو کھانا ہی چاہیئے۔''

اگر کوئی کسی کو پان دیتے وقت چھالیہ کترنے بیٹھ جاتی تو بڑی بوڑھیاں ناراض ہو جاتیں۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے'' کتری کترائی چھالیہ ہر وقت بھری رہنی چاہیئے'' سمجھاتیں کہ پان آدمیوں سے بھی زیادہ مزاج دار ہوتا ہے۔ ان کی دیکھ بھال ٹھیک ہونی چاہیئے۔ زیادہ پانی ملا، گلے، کم ملا، مر گئے۔ بس پانی زیادہ ہو نہ کم۔

پاندان اور خاصدان بہت نفیس، قیمتی اور خوبصورت بنے ہوتے تھے۔ پاندان چتائی کے کام کے بھی ہوتے اور جال دار بھی۔ پاندانوں میں ویسے پیسے دھیلے پڑے رہتے تھے لیکن بھولے سے بھی کوئی زیور رکھ دیتی تو اس کی بہت ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تھی۔

بیشتر گھروں میں چونے کو خوب چھان کے صاف کرکے، تازہ دہی کا چھنا ہوا توڑ اس اس میں ملا دیتے تھے تاکہ زبان نہ کٹے۔ اس سے چونا اتنا خوشگوار اور لطیف ہو جاتا کہ زبان رائی کائی نہ ہوتی۔ مگر کئی لوگ تیز چونا پسند کرتے تھے، اس لیے دہی کا توڑ نہیں ملاتے تھے مگر پان میں چونے کی مقدار کچھ کم کر دیتے تھے۔ کتھا بھی بکھٹا، کڑوا اور کسیلا نہیں پسند

کیا جاتا تھا۔ کتھّے میں کیوڑے کی خوشبو دیدی جاتی۔ کتھا چونا چھان کر کلھیوں میں اس طرح بھرا جاتا کہ کرکراہٹ نہ رہے۔ گری، بادام، پستے اور سپاری کو باریک کاٹ کر اس میں الائچی کے دانے اور دھنیے کی مینگی ملا کر گوڑ بنایا جاتا تھا۔ خاص خاص موقعوں پر الائچی دانے بھی پیش کیے جاتے تھے۔ دانوں پر چاندی کا ورق لگا ہوتا تھا۔

عورتیں، مردوں کو کھلانے کے بعد کھانا کھاتی تھیں۔ کھانے کے بعد پان کھانے کو جی کرتا تھا مرد اور عورتیں دونوں ہی پان رغبت سے کھاتے تھے۔ عموماً چھوٹے بچوں کو پان نہیں دیا جاتا تھا مگر بچے بھی بڑوں کی دیکھا دیکھی پان مانگتے۔ انہیں پان کی ایک چھوٹی کترن دے کر بہلا دیا جاتا تھا۔ اِسی سے بچوں کے منھ لال ہو جاتے تھے۔ پان کھا کر بچے بڑے خوش ہوتے تھے اور اترا اترا کر چلتے اور بات کرتے تھے۔

پان کے رنگ سے نہ ہماری شاعری بیگانہ ہے، نہ ہماری موسیقی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پان نے ہمارے ادب، ہماری تہذیب، ہمارے تمدن اور عوامی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہ بول اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ جار کو وچار کہاں، گینکا کو لاج کہاں، گدھے کو پان کہاں!

۲۔ پان پرانا، گھرت نیا اور کلونتی نار
یہ تینوں تب پایئے جب پرسن ہویئں مرار

۳۔ چبا کہ پان کو تم نے یہ کمال کیا
دیا جو ہم نے زمرد تو اس کو لال کیا

۴۔ چھپا لیا غم نے تیرے ورنہ میں ایسا نہ تھا
جاؤ بس چوں نہ کرو، پان سے گالی دے لی

کسی نے پان کے لیے یہاں تک لکھ دیا:۔ یوں تو ہر وقت جان حاضر ہے، لیکن اس وقت پان حاضر ہے۔

"سرخروئی کے لیے کیا کر گئے، پان کھایا، پان کھا کر مر گئے۔ اور صاحب مرنے کے بعد بھی جو پان کھا کر مرے تھے وہ لوگ حشر کے دن اٹھے، جب مزاروں سے سرخرو اٹھے۔ کہیں پان سرخرو کرتا ہے حشر کے دن کہیں خود سرخرو ہوتا ہے۔"

فارسی کی ایک کہاوت ہے ۔"برگِ سبز است تحفۂ درویش" کہتے ہیں اس میں پان کی طرف ہی اشارہ ہے۔ پان پہیلیوں، محاوروں اور کہاوتوں کا پھول بھی ہے۔ مثلاً:

۱۔ گھوڑا اڑا کیوں، پان سڑا کیوں ــــ پھیرا نہ تھا۔

۲۔ سات کبوتر، ساتوں رنگ، ڈربے میں جاکر ایک ہی رنگ ــــ پان

۳۔ دیکھو جادوگر کا کمال ــ ڈالے سبز نکالے لال

قدیم وقتوں میں، وقت کاٹنے کا محاورہ "پان پھیرنا" تھا۔ اسی طرح "پان کھلائی" رسم کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ شوکت تھانوی نے ایک جگہ لکھا تھا۔

"وہ پان جس میں سونف، ملہٹی، خوشبو کی گولیاں اور نہ جانے کیا کیا ڈالا جاتا ہے، میٹھا پان کہلاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ براہِ راست قلاقند کیوں نہیں کھا لیتے۔ یا پان بھی بجائے اُن چیزوں کے ایک گلاب جامن رکھ کر کیوں نہیں کھا لیتے۔ اچھے خاصے منھ کو زچہ خانہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔"

پان پر ہی یہ دو چٹکلے بھی مشہور ہیں ــ

ایک صاحب نے سب کے سامنے بڑی دیدہ دلیری سے پان کی پیک فرش پر تھوک دی۔ یہ سوچ کر کہ یہ شاید کسی قسم کا اشارہ سمجھتے ہوں، ان کے سامنے اگالدان رکھ دیا گیا۔ اگالدان دیکھ کر بولے ــ ہٹا لو اپنا یہ برتن ورنہ اس میں تھوک دونگا۔

بجلی کا کھمبا، سڑکیں سب گلنار۔ انہیں دیکھ کر ایک غیر ملکی سیاح نے ایک خط میں لکھا ــ"ہندوستان میں اتنی سخت گرمی پڑتی ہے کہ میں نے لوگوں کو سڑکوں پر خون تھوکتے دیکھا۔"

پان کا پتہ کئی علاجوں کے لیے بڑا مفید مانا جاتا ہے۔ پان کے پتے کو بھگو کر کنپٹیوں پر رکھ کر لوگ سر کا درد دور کرتے تھے۔ کان اور گلے کے سوجنے پر اس پر پان کا پتہ باندھ

دیتے۔ پھوڑے پر پان کے پتے کی پلٹس باندھ دیتے۔ گلا خراب یا آواز بیٹھی ہوئی ہے تو پان میں ملہٹی ڈال کر کھا لیتے۔ لوگ ہاضمے کے لیے بھی پان کو مفید سمجھتے تھے۔

حقّہ

حقے کا رواج بہت پرانا ہے۔ مغلوں اور راجپوتوں کے دور میں حقّے کا رواج زیادہ ہو گیا۔ پھر بیڑی استعمال ہونے لگی مگر بیڑی زیادہ تر غریب اور دیہاتی لوگ استعمال کرتے تھے۔ انگریزی دور میں چرٹ اور قسم قسم کے سگرٹ آ گئے مگر حقے کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ دیہات میں تو سب حقہ ہی پسند کرتے تھے اور آج نئے دور میں بھی حقہ دیہات میں اسی طرح مقبول ہے۔ حقہ سب برادری کے لوگ آپس میں مل کر پیتے تھے۔ ایک حقّہ ہو اور دس آدمی بیٹھے ہوں تو سب باری باری کش لگاتے ہیں اور حقے کی نے حقہ کھسکا کر ایک دوسرے کی طرف موڑتے رہتے ہیں۔ اس سے برادری مضبوط ہوتی ہے اور جذبۂ یگانگت بڑھتا ہے۔ اس میل جول کی بنا پر ہی سے "حقہ پانی بند" کا محاورہ شروع ہوا۔ برادری کے کسی فرد کا کسی قصور کی بنا پر حقہ پانی بند کر دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ برادری کا کوئی آدمی اس کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھے گا یعنی ایک طرح سے اسے برادری سے خارج کر دیا گیا۔

دلی میں بھی حقے کا بڑا رواج تھا۔ گھروں میں پاندان کی طرح حقہ بھی رہتا تھا۔ حقّہ عموماً مردوں کے کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ زیادہ تر بزرگ حقہ پیتے تھے۔ چلم عورتوں اور لڑکیوں سے نہیں بھروائی جاتی تھی۔ یا تو ملازمین اور یا چھوٹے لڑکوں کو چلم بھرنے کے لیے کہہ دیا جاتا تھا۔ چلم میں' سوراخ میں ایک کچا کوئلہ اٹکا کر اس پر کوئی دو تولہ تمباکو کی ٹکی رکھ دیتے تھے۔ اس پر ایک گول ٹھیکری رکھ دی جاتی تھی۔ اب چلم آگ کے انگاروں' یا اپلوں کی آگ کے لیے تیار تھی۔ لڑکا یا ملازم چلم لے کر رسوئی میں جاتا مگر اندر نہیں گھستا۔ چلم کو باہر زمین پر رکھ کر آگ مانگتا اور رسوئی میں بیٹھی عورت آگ چولہے میں سے نکال کر چلم کے پاس رکھ دیتی۔ یہ آگ دستپناہ سے اٹھا کر چلم میں ڈال لی جاتی۔ روز روز چلم بھرنے والے

تو آگ ہاتھ سے اٹھا کر ہی چلم میں ڈال لیتے۔ چلم دن میں کئی کئی دفعہ بھری جاتی۔ چار اوقات تو چلم کے لیے لازمی تھے، سو کر اٹھنے کے فوراً بعد، کھانا کھانے کے بعد، دوپہر اور شام کو اور رات کو سونے سے پہلے۔

قلعے میں مردوں اور عورتوں کو حقے کا بڑا شوق تھا۔ خاص طور پر شہزادیاں حقہ بہت پیتی تھیں۔ حقے کئی قسم کے ہوتے تھے جن میں لمبی نے والا پیچواں اور فرشی بہت پسند کیے جاتے تھے اور شان و شوکت کے مظہر مانے جاتے تھے۔ نوابوں اور امرا کی بیٹھکوں میں شاندار بیش قیمت پیچواں رکھے رہتے تھے۔ چلم کو کشوری کہا کرتے تھے۔ حقہ مردانے کی لوازمات میں سے تھا۔ شاہی حقوں اور امیروں اور نوابوں کے حقوں کی نَے بہت ہی عمدہ اور بعض اوقات بیش قیمت شے کی بنی ہوتی تھیں۔ حقے دلی میں بھی بنتے تھے مگر مرادآباد، دکن کے شہروں اور بنگال سے بھی منگوائے جاتے تھے۔ چنبر میں چاندی کی زنجیریں لگائی جاتی تھیں۔ منہالیں بھی بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔

تمباکو کئی قسم کے ہوتے تھے اور تیار تمباکو دکانوں پر عام ملتا تھا۔ تمباکو میں شیرا ملا کر کڑواہٹ کو دور کرتے تھے۔ خمیرہ اور خوشبو بھی ڈالتے تھے اور خاص، قیمتی اور خمیرہ اور خوشبو ملے تمباکو کو پیا جاتا تو کمرہ مہک اٹھتا۔

"حقہ تازہ کرنے" کا مطلب پانی بدلنا ہوتا۔ حقے کو الٹا کر کے سارا پانی نکال دیتے اور تازہ پانی بھرتے۔ پانی کی ہی وجہ سے کش لگانے سے حقہ "گڑگڑ" کی آواز دیتا۔ تمباکو نوشی کے تمام آلات میں صرف حقہ ہی بولتا یا گڑگڑاتا ہے۔


FIROZE 86

بچّوں کے کھیل کود

کیا میرؔ تو روتا ہے پامالیٔ دل ہی کو
ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھالی ہے

بچوں کا کھیل تماشے میں بڑا دل لگتا تھا۔ اندھیری اور بڑ کھابڑ گلیوں میں، کھلے چوراہوں پر، محلّوں، کوچوں میں، گھروں اور حویلیوں کے صحنوں میں، باہر میدانوں میں، بچوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھیلتے نظر آتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے کھیل تو اب بھولے بھی جا چکے ہیں۔ دلی کے بچے پڑھائی کے مقابلے میں کھیلوں کے زیادہ شوقین تھے اور ان کا بس چلتا تو کبھی اسکول نہ جاتے۔ اسکول سے لوٹتے ہی اپنی تختی، ٹین کی سلیٹ اور بستہ ایسے پھینکتے جیسے کسی قید سے چھٹکارا ہو گیا ہو اور منہ ہاتھ دھوئے بغیر ماں نے جو کچھ دیدیا اسے جلد جلد کھا پی کر کھیلنے کی تڑپ میں اڑنچھو ہو جاتے۔ کچھ بچے گھر میں یا محلے میں ہی کھیلتے مگر بہت سے اپنے یار دوستوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر کھلے میدانوں میں آجاتے جیسے کہ پریڈ گراؤنڈ، بیگم کا باغ یا کمپنی باغ یا ملکہ کا باغ (جو آج کل گاندھی گراؤنڈ کہلاتا ہے)۔ دلّی کی حویلیاں اور مکان بھی ایسے کنبڈے کے بنے تھے کہ بچے گھر کے آنگن اور چھت پر آرام سے کھیلتے تھے۔

۱۸۵۷ میں جب انگریزوں نے دلّی کو فتح کر لیا تو انھوں نے پریڈ گراؤنڈ پر بنے خانم کے بازار کے مکانوں اور حویلیوں کو ڈھا کر فوجیوں کی پریڈ کے لیے میدان بنادیا۔ اس میں

اور رام لیلا میدان اور گاندھی گراؤنڈ میں طرح طرح کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ پریڈ گراؤنڈ میں گلی ڈنڈا، گچھی پالا، گیٹریاں اور کبڈی کی پالیاں جمتیں۔ کمپنی باغ میں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کھیلا جاتا تھا اور باغ کے پیڑوں کی آڑ میں آنکھ مچولی ہوتی۔

بچوں کے گھر کے آنگن اور گلی محلے میں کھیلے جانے والے کھیل بڑے نرالے اور دلچسپ ہوتے تھے۔ ہر موسم کے کھیل الگ ہوتے تھے، گرمی کے اور، برسات کے اور جاڑے کے اور۔ ان کھیلوں کے نام سن کر ہی ہنسی آجاتی ہے۔ کچھ کھیلوں کے نام یہ ہیں۔

آنکھ مچولی، کوڑا جمال شاہی، ٹِگا ٹِگائی، کانا کوا، ہل کنکری، چیل چھپٹا، چڈی چڈول، چدر چھپول، کوڑی جگن مگن، سرنگ لال گھوڑی، چورانی، ہتھا پالش، جھائیں بم، تال بم، چکر بھنی، چکر پھیری، چنی منی کا پہاڑوا، ڈنڈا ڈولی، کل کل کانٹا، تالہ کنجی، بھول بھلول، انی منی مونا مائی۔ اکڑ بکڑ، گیٹریاں، آمیری کشمش آمیرے مکھانے، نکّی آوے۔

ان کھیلوں میں آنکھ مچولی سب سے زیادہ مقبول تھا۔ کئی بچے اکٹھے ہوجاتے ہیں اور اپنا حساب کتاب کرکے ایک بچے کو 'چور' بنادیتے ہیں جو چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک بچہ 'دائی' بن جاتا ہے اور وہ 'چور' کی آنکھوں پہ پٹی باندھ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیتا ہے۔ دوسرے بچے اِدھر اُدھر چھپ جاتے ہیں اور پھر 'دائی' پٹی اتار دیتی ہے اور وہ بچہ چھپے ہوئے بچوں میں سے کسی کو ڈھونڈنا شروع کردیتا ہے۔ جس بچے پر اس کا ہاتھ پہلے پڑجاتا، اب وہ 'چور' بنتا۔ اگر کوئی بچہ لگاتار سات دفعہ تک کسی کو نہ پکڑ سکتا تو اس کی ٹانگیں باندھ کر اور ایک "بڑھیا" بنا کر ایک کونے میں بٹھا دیتے اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈی پکڑا دیتے وہ اپنی ڈنڈی کے سہارے 'پانی' بھرنے جاتا اور بچے اس کے آگے پیچھے ہنستے اور تالیاں بجاکر 'بڑھیا' کہہ کہہ کر چھیڑتے۔ 'بڑھیا' اپنی ڈنڈی گھما کر انہیں مارنے کی کوشش کرتی، اور اگر اس کی ڈنڈی کسی کے لگ جاتی تو اب وہ بچہ 'چور' بن جاتا۔

'کوڑا جمال شاہی' کو بھی بچے بہت پسند کرتے تھے۔ اس میں بہت سے بچے ایک بڑا دائرہ بنا کر ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کپڑے کا ایک مضبوط سا کوڑا بنا لیتے

ہیں۔ ایک بچہ جس کے ایک ہاتھ میں کوڑا ہوتا ہے اور دوسرے میں ایک چھوٹا سا رومال دائرے میں بیٹھے ہوئے بچوں کے پیچھے دوڑتا ہوا گھومتا ہے۔ کوئی بچہ پیچھے مڑکر نہیں دیکھ سکتا اور کوڑے والا بچہ دوڑتا دوڑتا یہ کہتا جاتا ہے ــــ "کوڑا جمال شاہی پیچھے دیکھے مار کھائی۔" وہ موقع پاکر کسی بچے کے پیچھے رومال گرا دیتا ہے مگر چکر پورا کرتا رہتا ہے۔ اگر بچہ پیچھے ٹٹول کر اس کے پہنچنے سے پہلے رومال نہیں دیکھ لیتا تو اس کی پیٹھ پر تڑسے کوڑا پڑتا ہے اور اس وقت اسے پتہ لگتا ہے کہ رومال اس کی پیٹھ کے پیچھے تھا۔ وہ اٹھ کر دائرے میں بھاگنے لگتا ہے اور اس کے پیچھے کوڑے والا لڑکا دوڑ کر کوڑے مارتا رہتا ہے۔ دائرہ پورا ہونے کے بعد کوڑے کی مار کھانے والا اب کوڑا لے لیتا ہے اور اس کی جگہ پر کوڑے والا بیٹھ جاتا ہے۔ یہ عمل اسی طرح بار بار دہرایا جاتا ہے اور بچوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔

چڈی چڈول میں بچے دو دو بچوں کی جوڑی بنا کر ایک حلقے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر جوڑی کا ایک بچہ سوار اور دوسرا گھوڑا بنتا ہے۔ سوار کے ہاتھ میں کوڑا ہے اور گھوڑا ٹک ٹک کر کے چل رہا ہے۔ "سوار" کبھی کبھی "گھوڑے" کو کوڑا بھی مار رہا ہے اور بولتا جاتا ہے ــــ "چل میرے گھوڑے ٹک ٹک چل۔"

چادر چھپول میں چھوٹی عمر کے بچوں کو بڑا مزہ آتا ہے۔ کسی ایک بچے کو چادر کے اندر چھپا دیا جاتا ہے اور باقی سب بچے اِدھر اُدھر چھپ جاتے ہیں۔ پھر جو بچہ چور بنتا ہے اور جس کی آنکھ پر چھپنے چھپانے سے پہلے پٹی باندھ دی تھی، اس کی پٹی کو کھول کر اسے چادر کے اندر چھپے ہوئے بچے کو بغیر دیکھے صرف چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے اور چھونے سے شناخت کرنے کو کہتے ہیں۔ اگر چھپا ہوا بچہ پہچانا گیا تو پھر وہ چور بنے گا۔

سرنگ لال گھوڑی یا زنجی بھی بڑا مقبول کھیل تھا۔ اس میں بچوں کی دو ٹولیاں بن جاتی تھیں اور سب سے بڑا لڑکا ٹولی کا سردار ہوتا تھا۔ دونوں سردار ساتھ ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے اور دو لڑکے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ان کے سامنے آکر کہتے۔

اڑنگ بڑنگ میں پڑی زنجیر
کوئی لے ٹکا، کوئی لے تیر
تیر کی بیٹی ہری کمان
کوئی لے بڈھا، کوئی لے جوان

یہ لڑکوں کے ٹولی میں چنے جانے کا طریقہ تھا۔ سردار جو مانگتا اور جس لڑکے کا وہ "نام" ہوتا وہ اس کی طرف چلا جاتا اور دوسرا دوسرے سردار کی طرف۔ جب دونوں ٹولیاں بن جاتیں تو ایک سردار اپنا جوتا ہوا میں اچھالتا، اگر جوتا سیدھا پڑتا تو اس کی ٹولی سوار بنتی اور اگر الٹا پڑتا تو دوسری ٹولی سوار بنتی۔ جو بچے گھوڑیاں بنتے وہ ایک دائرے میں کھڑے ہوکر اور آگے کو جھک کر گھوڑیاں بن جاتے اور ان پر سوار چڑھ جاتے۔ پھر ایک سوار اتر کر ایک ہی سانس میں یہ کہتا ہوا چکر لگاتا۔

سرنگ لال گھوڑی
تو مجھ سے کیوں نہ بولی
سرنگ لال پٹکے
تم ہم سے کیوں نہ چٹکے
یا
بتّی بتّی سریشتہ
پھول پان بیچتا

اگر کسی سوار کا چکر کاٹتے ہوئے سانس ٹوٹ جاتا تو ساری گھوڑیاں دھم سے سواریوں کو نیچے گرا دیتیں اور اب وہ سوار گھوڑیاں بنتے اور گھوڑیاں ان پر سوار بن جاتیں۔ یہ ایک ایرانی کھیل تھا اور وہاں اسے کُرنگ کہتے تھے۔ مگر مغل شہنشاہ اکبر نے اس کا نام کُرنگ سے بدل کر سرنگ کر دیا تھا کیونکہ ہندی میں 'کو' برا سمجھا جاتا تھا اور 'سو' اچھی باتوں اور چیزوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جیسے کپوت اور سپوت۔

چور رانی یا سات سمندر کے کھیل میں بھی بچوں کا بڑا جی لگتا تھا۔ اسے لڑکیاں اور لڑکے

دونوں بڑے شوق سے کھیلتے تھے۔ اس کھیل میں زمین پر ڈھیلے سے یا کوئلے سے (اگر فرش پکا ہے) لکیریں ڈال کر سات خانے یا گھر بنا لیتے تھے۔ یہ گھر مستطیل بھی ہوتے تھے اور تکونے بھی۔ ان گھروں کے نام جنھیں سمندر بھی کہا جاتا تھا اس طرح ہوتے تھے، پہل، دوج، تیج، چمو، کانا، پے اور مٹک۔ ایک کھلاڑی اس کے پہلے خانے میں پتھر یا ٹھیکری کا گٹہ ڈالتا ہے جسے "چوّا" بھی کہتے تھے۔ اور پھر اچک کر اس خانے میں جا کر ایک ٹانگ سے کھڑے ہو کر گٹّے کو پیر مار کر دوسرے خانے میں پہنچاتا ہے اگر گٹا خانے سے باہر چلا گیا یا کسی لکیر پر پڑ گیا تو کھلاڑی ہار جائے گا۔

چیل جھپٹّا، کل کل کانٹا یا لہرم لہرا بھی بڑا دلچسپ کھیل ہوتا تھا۔ اس کھیل میں بہت سے بچے دو ٹولیاں بنا کر اِدھر اُدھر چھپ جاتے تھے۔ دونوں ٹولیاں ایک دوسرے کو اپنی کچھ چیزیں پہلے سے ایک دوسرے کو دکھا دیتے تھے اور پھر انہیں گھر میں اِدھر اُدھر چھپا دیتے تھے۔ پھر ان کی تلاش شروع ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ چیزیں تلاش کرنے والی ٹولی جیت جاتی تھی۔ کئی جگہ چیزیں چھپانے کی بجائے لڑکے خود ہی اِدھر اُدھر چھپ جاتے ہیں اور دوسری ٹولی کے لڑکے انہیں تلاش کرتے ہیں۔ اس کھیل میں جیتنے والے لڑکے ہارنے والے لڑکوں کے ہاتھ کی پشت پر اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے زور کی چانٹی بھی مارتے تھے۔

بچوں کا ایک اور پسندیدہ کھیل تھا تال بم یا چکر بھنی یا چکر پھیری۔ اس میں بچے گھیرا باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں۔ اس گھیرے کے بیچ میں ایک کھلاڑی کھڑا ہوتا ہے۔ گھیرا بنائے ہوئے بچے ایک دوسرے کو کھینچتے ہوئے تیزی سے گھومتے ہیں۔ گھیرے میں کھڑا ہوا لڑکا گھیرے کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے مگر گھیرے والے لڑکے اور تیزی سے گھومنا شروع کر دیتے ہیں اور اسے نکلنے سے روکتے ہیں۔ اگر وہ لڑکا گھیرا توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو گھیرے والے لڑکے سب ہار گئے۔ پھر کسی اور لڑکے کو گھیرے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کھیل چلتا رہتا ہے۔ اس کھیل میں بچے گھیرے میں گھومتے ہوئے بہت شور مچاتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں ــــ "جھائیں مائیں، کوّے کی برات آئی۔"

"نکّی آوے" بچوں کا ایک پرانا کھیل تھا۔ جب ایک بچہ دوسرے سے کہتا کہ ایک گھڑی یا دو گھڑی کی نکی آوے تو دوسرا لڑکا اتنی دیر کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا۔ اگر دایئں پاؤں کی نکی بدی ہے تو کہے گا دایئں پاؤں کی نکی آوے اور جو بایئں پاؤں کی بدی ہے تو اس کا نام لے گا۔ اگر کسی بچے کا پاؤں وقت سے پہلے زمین پر ٹک جاتا تو وہ ہارا ہوا مانا جاتا۔ بس اسی طرح یہ کھیل چلتا رہتا۔ دلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی لکھتے ہیں کہ مغلوں کے آخری بادشاہ کا مولا بخش نام کا ہاتھی بہت ہوشیار اور عقلمند تھا لیکن ایک دن اس نے مستی کی حالت میں اپنے فیلبان کو غافل پاکر سونڈ میں لپیٹ کر اور اس کا ایک پاؤں اپنے پاؤں کے نیچے رکھ کر چیر ڈالا۔ فیلبان کی بیوہ کا ایک ننھا سا بچہ تھا۔ وہ شوہر کے غم میں روتی پیٹتی آئی اور اس بچے کو ہاتھی کے آگے بٹھا کر بولی لے موئے مولا بخش اس کو بھی مار ڈال۔ مولا بخش نے اپنی سونڈ سے اس بچے کو پکڑ کر اپنی گردن پر بٹھا لیا۔ اس روز سے یہ بچہ جب تک مولا بخش کے سامنے رہتا، مولا بخش جو وہ چاہے کرتا تھا۔ جب یہ بچہ مولا بخش کی آنکھ سے اوجھل ہوتا تو مولا بخش دنگا کرنا شروع کر دیتا۔ فیلبان کے بچے کا نام رحمت علی تھا۔ جب یہ بچہ بڑا ہوا تو اس کے ہم عمر بچے اس سے کھیلنے آتے تھے اور مولا بخش بھی ان سے کھیلتا تھا۔ اس طرح لڑکوں کا مولا بخش سے یارانہ ہو گیا۔ جہاں کسی لڑکے نے مولا بخش سے کہا کہ مولا بخش نکی آوے تو مولا بخش اپنا ایک پاؤں اٹھا لیتا تھا اور وقت پورا ہونے پر اس لڑکے کے کہنے سے ہی پاؤں زمین پر رکھتا تھا۔ اگر فیل خانے کا کوئی آدمی بچوں کو دھمکا کر بھگا دیتا اور وہ نکی مانگ کر چلے جاتے تو مولا بخش اپنا پاؤں اٹھائے رکھتا تھا۔ مولا بخش کو سمجھایا جاتا کہ وہ بچہ چلا گیا پاؤں نیچے رکھ دے مگر وہ کسی کی نہ سنتا۔ آخر اسی لڑکے کو بلا کر لایا جاتا اور اسی کے کہنے سے مولا بخش پاؤں زمین پر رکھتا۔

بچے کوڑیوں سے بھی خوب کھیلتے تھے اور ان کا ایک پیارا کھیل "کوڑی جگن مگن" یا "کوڑی چھپول" تھا۔ بچے دو ٹولیوں میں بنٹ کر اپنا اپنا سردار چن لیتے تھے۔ ایک ٹولی کا بچہ ایک کوڑی اچھالتا تھا اور دوسری ٹولی کا بچہ "مانگتا" تھا۔ اگر اس نے "سیدھی" مانگی اور کوڑی الٹی پڑی تو وہ ہار گیا۔ اب ہارنے والے کو جیتنے والے کا ہر حکم ماننا ہے۔ جیتنے

والا اسے اپنی ٹولی میں بڑی بے آرامی سے بٹھاتا۔ کبھی اسے کہتا سورج کی طرف منھ کر کے بیٹھو اور کبھی کہتا کہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ۔ پھر جیتنے والا لڑکا ہاتھ میں کوڑی لیے گھومتا پھرتا اور کسی ایک بچے کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دیتا اور پھر اس کی ٹولی کے سارے ہی بچے مٹھی بند کر لیتے۔ اب دوسری ٹولی کے ہارے ہوئے لڑکے کو ایک مقررہ وقت میں یہ معلوم کرنا ہے کہ کوڑی کس کے ہاتھ میں ہے۔ باری باری یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اور بچے دلچسپی میں ڈوبے ہوئے اور وقفے وقفے کے بعد شور مچاتے ہوئے یہ کھیل کھیلتے رہتے۔

میدانی کھیلوں میں لڑکوں کے مقبول کھیل تھے، کبڈی، گلی ڈنڈا، گیٹریاں، گچھی پالا اور کنچہ۔ چھوٹے بچے تو یہ کھیل گلیوں میں ہی کھیل لیتے تھے۔ ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ انگریزوں کے وقت کے کھیل ہیں۔ کبڈی ہمیشہ سے بڑا مقبول کھیل رہا۔ جوتوں یا کپڑوں کو بچھا کر کبڈی کا پالا جما لیتے اور ہل کبڈی، ہل کبڈی، کا شور مچ جاتا۔ کچھ لڑکے یہ بھی کہتے "ہل کبڈی دھن تارا، سلطان بیگ دے مارا" کئی لڑکوں کا سانس اتنا لمبا ہوتا کہ مشکل سے ٹوٹتا۔ کبڈی دو طرح کی ہوتی تھی، چھپّول اور لمبی۔ چھپّول میں ایک طرف کا لڑکا 'کبڈی کبڈی' کہتا ہوا پالے میں گھستا تھا اور سانس ٹوٹنے سے پہلے اس کو پکڑنے والوں میں سے کسی کے ہاتھ یا لات مار کر اپنے پالے میں واپس آجاتا تھا۔ جس کے اس کا ہاتھ یا ٹنگڑی لگ جاتی وہ کھیل سے باہر ہو جاتا۔ جب کسی ٹولی کے سب لڑکے اس طرح نکل کر بیٹھ جاتے تو وہ ٹولی ہار جاتی۔ لمبی کبڈی میں کوئی پکڑ دھکڑ نہیں ہوتی۔ صرف بھاگنا اور حریف کو چھونا ہوتا۔ حریف کو چھوتے ہی لڑکا اپنے پالے میں واپس آجاتا۔

گیٹریاں کھیل بھی بچوں کو بڑا پسند تھا۔ ہر ایک بچے کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی چکنی ڈنڈی ہوتی۔ اسے نکّا یا تلوا یا پاپچی کہتے تھے۔ ایک لکیر کھینچ کر اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور ڈنڈی رکھ دیتے تھے اور کھیلنے والا لڑکا لکیر کے پرے کھڑا ہو کر اپنے ہاتھ کی ڈنڈی سے اس ڈنڈی کو مارتا۔ جو لڑکا ایک ہی باری میں سب ڈنڈیوں کو مار لیتا وہ جیت جاتا۔ گلی ڈنڈا پہلے ویسے ہی کھیلا جاتا تھا جیسے آج کھیلا جاتا ہے۔ اسی طرح کنچے کی گولیاں بھی وہی تھیں جو آج ہیں۔ گچھی پالا وہی کھیل تھا جسے آج بھی دنیا بھر میں لکڑی کے ایک

نکیلے ٹکڑے کو جسے گُلّی کہتے ہیں زمین سے اوپر اچھالا جاتا ہے۔

بچوں کی دنیا بڑی معصوم اور نرالی ہوتی ہے۔ ان کے طے شدہ کھیل کود تو ہوتے ہی ہیں مگر ان کی باتیں، ان کی چھیڑ چھاڑ، ان کا ایک دوسرے سے ہنسنا بولنا، نئی نئی باتیں سیکھنا اور انھیں مزے لے لے کر دہرانا یہ بھی ان کے ننھے منے کھیل ہی ہوتے ہیں۔ دلی کے بچے ان معاملوں میں ہوشیار اور چوکنے ہوتے تھے اور نئی نئی باتیں انہیں خوب سوجھتی تھیں۔ لڑکے بانس کا ڈنڈا گھر سے لے آتے اور اسے اپنی ٹانگوں میں پھنسا کر گھوڑا بنائے گلی میں گھومتے پھرتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا گر پڑتا تھا اور ذرا سا لنگڑا کر چلتا تو اسے "لنگڑ دین، پونے تین" کہہ کر خوب چھیڑتے۔ برسات ہوتی تو ننگے دھڑنگے چیختے چلاتے باہر نکل آتے اور ایک دوسرے پر پانی اور کیچڑ اچھالتے۔ ساتھ ساتھ کہتے رہتے ــــ "ایک" تو جھٹ پہلا بچہ کہتا "تیرے منہ میں چھیک۔" کوئی "دو" کہہ دیتا تو کہتے ــــ "سر پکڑ کے رو۔" "تین" تو بجائے بین "چار" کھا چوہے کا اچار۔"

مولوی صاحب اور پنڈت جی کو بھی نہیں بخشتے تھے ــــ

"تختی پہ تختی، تختی پہ رائی ــــ مولوی صاحب کی داڑھی میں آگ لگائی۔"

"پنڈت جی پنڈا اختہ ــــ گولی ماری فاختہ۔"

جوتے کا گھسا ہوا پرانا تلا سڑک پر سے اٹھا کر ہاتھ میں چھپا لیتے۔ کوئی لڑکا آتا تو ہاتھ پیچھے کر لیتے اور کہتے ــــ "آ تجھے شیشہ دکھاؤں۔" جب وہ لڑکا آگے بڑھتا تو دوسرا جھٹ جوتے کا تلا اس کے سامنے کر دیتا۔ وہ کھسیانہ ہو کر آگے بڑھ جاتا اور شرارتی لڑکا خوب قہقہے لگاتا۔ اگر جانے والا لڑکا موٹا بھی ہوتا تو وہ زور زور سے کہتا "موٹا آلو پلپلا۔ بہو کو لیکر گر پڑا۔"

بچوں کی جتنی جلدی دوستی ہوتی تھی، اتنی ہی جلدی بات بات میں کٹی ہو جاتی تھی۔ دلوں ایک دوسرے سے نہیں بولتے تھے مگر دل میں ایک دوسرے کے لیے تڑپتے بھی رہتے تھے اور موقعے کی تلاش میں رہتے تھے۔ پھر کوئی لڑکا بچولی بن کر بیچ میں پڑ جاتا تھا۔ کئی دن تک اس کے ذریعے سوال جواب ہوتے رہتے۔ آخر میں بچولی دونوں کو سمجھاتا اور

ایک پرچی کے دو ٹکڑے کرتا اور ایک پر ایک لڑکے سے "تو" اور دوسرے سے دوسرے پر "بہ" لکھواتا اور اس طرح سے 'توبہ' پوری ہو جاتی۔ دونوں لڑکوں کی پھر دوستی ہو جاتی اور اب ایسے ہاتھ ہیں اور گلے میں بانہیں ڈالے پھرتے جیسے ایک جان اور دو قالب ہوں۔

جب کبھی آسمان پر چیلیں منڈلاتیں تو بچے شور مچانا شروع کر دیتے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر چیختے۔

چیل چیل چلّاتی جائے
چیل کا بچہ روتا جائے
چڑیا منگل گاتی جائے
کوّا ڈھول بجاتا جائے

اب ذرا ان بچوں کی پُرلطف باتیں اور تُک بندیاں بھی سن لیجئے کیوں کہ یہ باتیں بھی ان کے کھیل کود اور کھلواڑ کا حصّہ ہیں:۔

"جلے کو جلائیں گے — حلوہ پوری کھائیں گے۔"
"آمیری مچھلی کتنا پانی — تیری جمنا میں کتنا پانی — اِتنا پانی۔"
"اکڑ بکڑ بھمبے بھوں۔ اسی نوّے پورے سو۔"
"سوئی میں لاگا دھاگا۔ چور نکل کر بھاگا۔"
"آمیری کشمش ڈھونڈ مجھے۔ آمیرے مکھانے ڈھونڈ مجھے۔"
"آمیرے بادام ڈھونڈ مجھے۔ آمیرے چھوارے ڈھونڈ مجھے۔"
"کھنڈا، تیری ماں کا پیٹ ٹھنڈا۔ چھُری تیری ماں بڑی۔"
"آم لو جی آم کے — آم ہیں سرکار کے — ہم بھی ہیں دربار کے۔
ایک آم چوس لو — کھٹا لو، مٹھا لو۔"
"کالی کلوٹی بینگن لوٹی۔ بڑے بازار میں دھم دھم کوٹی۔"
"وہی بات، گدھے کی لات۔"

"چپ چاپ چٹری کا باپ"

"ایک کہانی گو گورانی۔ ہم کو دُدھا تم کو پانی"

بچوں کی دنیا بھی بڑی عجیب دنیا ہوتی ہے۔ معصوم خوشیوں سے بھرپور، شرارتوں سے بھری ہوئی۔ وہ بچے ہی کیا جو شرارتی نہیں۔ کھیل کود اور کھلواڑ ہی ان کی زندگی ہے۔ وہ چیخیں، وہ غل غپاڑہ، وہ دھما چوکڑی، وہ چھیڑ چھاڑ، تختیوں سے لڑائی، ایک دوسرے پر سیاہی بھرے پھونسڑے پھینکنا، قدیم دلی کی گلیوں اور کوچوں کی ایسی رونق تھی جسے یاد کرتے ہی دل و دماغ جذبۂ مسرت سے بھر جاتے ہیں۔



پھیری والے

پھیری والوں کی آوازیں

پرانے زمانے میں، پھیری والے دلی کی سماجی زندگی کا ایک ایسا حصّہ تھے جس کے بغیر دلی والوں کی زندگی بڑی بے کیف اور ادھوری ہو جاتی۔ کوئی بھی رہائشی یا کاروباری جگہ ایسی نہیں تھی جہاں پھیری والے نہیں آتے جاتے تھے۔ گلی محلے، کوچے بازار، دفتر مدرسے، تفریح گاہیں، کوئی چپّہ کی ذد سے نہیں بچا تھا۔ گھر والے ابھی مشکل سے سو کر ہی اٹھتے کہ پھیری والے گلیوں میں آوازیں دینے لگتے۔ ہر پھیری والے کا آنے کا وقت بندھا ہوتا تھا اور لوگوں کو بھی پتہ ہوتا تھا کہ فلاں پھیری والا فلاں وقت آئے گا مگر ایک ایک کر کے دن بھر میں تیس چالیس پھیری والے آجایا کرتے تھے۔ ہر پھیری والا اپنے گاہک کو اور ہر گاہک پھیری والے کو خوب پہچانتا اور نام سے جانتا تھا اور دونوں دعا سلام کے بعد ایک دوسرے کی خیر و عافیت بھی پوچھ لیتے تھے۔

دلی کے پھیری والوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے سودے کو ایک بڑی لچھے دار آواز میں اور اکثر مترنم لہجے میں اور بعض باقاعدہ گا کر بیچتے تھے۔ کسی مورخ نے سچ لکھا ہے کہ دلی کے بازاروں کوچوں میں پھیری والوں کی آوازیں سن کر ایسا لگتا تھا کہ اصفہان کے شاعر چوک میں غزل پڑھ رہے ہیں۔ دلی کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہاں ہر آدمی چاہے وہ پڑھا لکھا تھا یا نہیں ایک فن کارانہ ذوق اور حس رکھتا تھا۔ پھیری والے جو بھی آواز لگاتے، وہ عام طور پر ان کی اپنی اختراع ہوتی یا اگر کسی اور کی بھی ہوتی تو اس

میں اپنی طرف سے بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کر لیتے۔ لیکن جو کچھ بھی کہتے دریا کو کوزے میں بند کر دیتے اور سننے والوں کو بڑا مزہ آتا۔ آدمی نے اگر چیز نہ بھی لینی ہوتی تو بھی پھیری والے کی آواز سن کر اس کی زبان چٹخارے لینے لگتی اور اسے خریدنے کی خواہش اس کے دل میں جاگ جاتی۔

پھیری والوں کا گا کر اپنے سودے کو بیچنے کا رواج مغلوں کے زمانے میں شاہجہاں کے عہد سے شروع ہوا۔ شاہجہاں کی خواہش تھی کہ پھیری والے اس کی نئی راجدھانی شاہجہاں آباد میں اپنی چیزوں کو صاف اور اونچی آوازیں بیچیں تاکہ گھر کی عورتیں گلیوں میں اپنے گھروں کی ڈیوڑھی پر ضرورت کی چیزیں خرید سکیں اور پھیری والے اور راہ چلتے ہوئے انھیں نہ دیکھ سکیں۔ ان دنوں ہندو اور مسلمان عورتوں میں پردے کا رواج یکساں تھا۔ لڑکیوں کی شادی بیاہ کے موقعے پر عورتیں گھروں میں بیٹھی بیٹھی جہیز کا پورا سامان خرید لیتیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں بڑا سستے کا زمانہ تھا اور دلی والے روز مرہ کی ضرورت کی معمولی چیزیں چھوٹے سکوں سے ہی خرید لیتے۔ ان دنوں کے رائج چھوٹے سکے یہ تھے۔ کوڑیاں، گنڈے، دام، چھدام، دمڑی، ادّھی، منصوری پیسہ، پیسے اور ٹکے یا ادّھنے۔ ایک پیسہ ۲۵ گنڈوں یا ۱۰۰ کوڑیوں کے برابر تھا اور ایک دام پیسے کا $\frac{۱}{۲۵}$ واں حصّہ، چھدام $\frac{۱}{۴}$ واں، ادھی آدھا پیسہ اور ٹکا دو پیسے کے برابر ہوتا تھا۔ بچے تو پھیری والوں سے ان سکوں سے ہی چھوٹی موٹی چیزیں لے کر کھاتے رہتے تھے۔ گندم ایک روپے کا ایک من اور گھی ایک روپے کا پانچ سیر ملا کرتا تھا۔ کافی بعد میں، جب انگریزی دور شروع ہوا اور قیمتیں کچھ بڑھیں تو روپے، آنے، پیسے، دھیلے اور پائی کا رواج ہو گیا۔ مگر اُس زمانے میں بھی پندرہ روپے مہینے میں ایک عام، چھوٹے کنبے کا اچھی طرح گزارہ ہو جاتا تھا۔

گلابی جاڑے میں سب سے پہلے صبح سویرے بھڑبونجے، دولت کی چاٹ یا نمش، تلنگنی والے اور مکھن کی گولیوں والے گلیوں اور سڑکوں پر نکل آتے تھے۔ بھڑبونجے کے کندھے پر ایک بڑا تھیلا لٹکا رہتا تھا جس میں بھاڑ کے بھنے ہوئے چنے ہوتے تھے۔ اسی تھیلے کے اندر

دو اور چھوٹے تھیلوں میں مُرمُرے اور پرمل بھی ہوتے تھے۔ دلی والوں کو بھُنے ہوئے چنے کھانے کا بڑا شوق تھا۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ بھنے ہوتے چنوں کو سونگھنے سے زکام نزلہ ٹھیک ہوجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر صبح بہادر شاہ ظفر کو بھی بھنے ہوئے چنے سونے کی ایک طشتری میں رکھ کر دئے جاتے تھے۔

دولت کی چاٹ یا نمش (دودھ کے جھاگوں کی پستوں کی آب والی چاٹ) دلی والوں کی ایک خاص نعمت ہوتی تھی۔ یہ مٹی کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ہوتی تھی اور اسے کیا ہندو، کیا مسلمان سب چھوٹے بڑے بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ اس کی نیچے کی کھرچن تو بہت ہی لذیذ ہوتی تھی۔ اسے بانس کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چھلی ہوئی کھپچیوں سے کھاتے تھے۔

دولت کی چاٹ والے کی آواز ــــ "چاٹ ہے دولت کی' دل والوں کی۔ مفلس کا دل اچاٹ ہے' یہ دولت کی چاٹ ہے' چاٹ لو دولت کو' دولت کی چاٹ' دولت کو" کانوں میں پڑتے ہی زبان چٹخارے لینے لگتی۔ پھر "تلنگنی کالی مرچوں والا" آتا۔ مکھن کی گولیاں ایک پیسے کی چار ملیتں اور مکھن کی گولیوں والا آواز لگاتا رہتا ــــ "لیلو گولی مکھن کی' تازہ خالص مکھن کی" اس کے بعد ایک بہنگی میں سبزی رکھے سبزی والا داخل ہوتا۔ وہ اونچی آواز میں اپنی سبزیوں کی تعریف بھی کرتا اور بھاؤ بھی بتاتا۔ "آنے سوا یا ہوگئی مٹر ــــ نرم میٹھی' بھرواں مٹر"

علی گنج اور شاہ مرداں کی گاجریں ساری دلی میں مشہور تھیں۔ پھیری والا صدا لگاتا۔

"شاہ مرداں کی لاٹریاں
علی گنج کی ہیں جی' گڑ سے زیادہ مٹھلیاں"

شاہ جی کے تلاؤ کے سنگھاڑے سب سے زیادہ ذائقے دار اور میٹھے ہوتے تھے۔ پھیری والا اپنے سنگھاڑوں کی تعریف میں گا گا کر کہتا تھا۔

"نرمل تلاؤ کے دودھیا
کیوڑے کی بیل کے بتاسے

کانٹوں سے ہریالے
شاہ جی کے تلاؤ کے
دودھیا سنگھاڑے لیلو۔"

شاہ جی کا تلاؤ تو اب نہیں رہا لیکن یہ وہی جگہ ہے جہاں اب کملا مارکیٹ ہے۔
بھنے ہوئے سنگھاڑے والا آواز لگاتا ۔"کاغذی گری کے بھنا دئے بادام"۔
گنڈیری والا آکر محلے کے ایک کونے میں بیٹھ جاتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سروتہ ہوتا اور وہ گنے کو چھیل کر اور گنڈیریاں کاٹ کاٹ کر ایک کپڑے پر بچھاتا جاتا۔ جب ڈھیری بن جاتی تو اس پر گلاب کی پتیاں بکھیر دیتا اور کیوڑا چھڑکتا۔ گنڈیریوں پر ململ کا ایک گیلا کپڑا ڈھکا رہتا جس پر وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی کے چھینٹے مارتا رہتا۔ ایک طرف ثابت گنّے بھی بیچنے کے لیے رکھتا۔ وہ بڑے عمدہ لہجے میں بلند آواز سے کہتا۔
"بالو شاہی گنڈیریاں، رسیلی گنڈیریاں کیوڑے والی"۔
پونڈوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔
"پیٹ کا بھوجن، ہاتھ کی ٹیکن
ہونٹوں سے چھیلو، کٹورہ بھر شربت پی لو
میاں پیٹ کا بھوجن، ہاتھ کی ٹیکن، بلّی کی بتی"۔
مونگ پھلی کے رسیا سارے دلی والے تھے۔ جہاں اکتوبر کا مہینہ شروع ہوا، مونگ پھلی والے آنے لگے۔ بھنی ہوئی مونگ پھلی لوہے کے ایک بڑے تسلے میں رکھ کر اُسے ایک چھابڑے پر لگا لیتے۔ بیچ میں اُپلے کی آگ کی یا کچے کوئلوں کی ایک ہنڈیا رکھ دیتے اور گا گا کر کہتے۔
"کھا لو بھنے بادام، لیلو پشاور کی گریاں، چھنا بادام کی گریاں"۔
پان والے بھی گلی گلی گھوم کر پان بیچا کرتے تھے۔ دلی والوں میں، عورتوں اور مردوں دونوں کو پان کھانے کا بڑا شوق تھا اور ہر گھر میں پاندان ہوتا تھا۔ ایک پیسے کے چھ یا آٹھ

ثابت پان ملتے تھے۔ پھیری والے اپنی ٹوکری یا ڈھولی میں گیلے کپڑے میں بندھے ہر طرح کے چھوٹے بڑے پان بیچتے تھے اور قدم قدم پر آواز لگاتے تھے۔

"لیلو بنگلہ پان، کرارا پیلا پتہ بنارس کا، کانپور کا تیکھا رسیلا پان، پان لو پان"

آج سے کوئی سو سوا سو سال پہلے خانم کے بازار میں ایک مشہور پنواڑی تھا۔ اس کا نام حسینی تھا۔ حسینی جب بازار میں آتا تو لال پگڑی باندھے، صاف ستھرا لال انگرکھا پہنے۔ ایک تھال ہاتھ میں ہوتا جس کے اندر پان کی گلوریاں لگی بندھی، چاندی کے ورق میں لپٹی رکھی رہتیں۔ چوک میں کھڑا ہو جاتا اور بڑی مترنم آواز میں بڑی لچھے دار زبان میں راہ گیروں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا رہتا۔

"لے لو پان کی گلوری، میں پان کا بیپاری
یہ پان ہے سرکاری، اس کو کھاتے ہیں درباری"

"بڑا بڑا پان ہے، لال لال شان ہے
بدخشاں کی دکان ہے، یہ پان ہے، یہ پان ہے"

"کھا لو میرا بیڑا، یہ بیڑا ہے پان کا، بڑھیا دکان کا"

"جدائی کی رات میں ساتھ رہتا ہے، ملاپ کی رات میں مزہ دکھاتا ہے،
میرے پان کا یہ بیڑا ہے"

"ہریالا ہے متوالا ہے، اچھے جوبن والا ہے۔ میرے پان کا یہ بیڑا"

"کندن کو شرماتی ہے، جوبن کو چمکاتی ہے، اچھے منھ کو سہاتی ہے،
گوری جب چباتی ہے، ہونٹوں آگ برساتی ہے،
لے لو گوری کے لیے گلوری!"

"دلدار کی اک شان ہے، یہ پان اس کی جان ہے،
اور جان بھی اک پان ہے۔ لے لو میرے پان کی گلوری"

دلی میں کئی گنجان محلوں میں عورتیں بھی پھیری پر سودا بیچتی تھیں۔ ذرا دن چڑھتا تو کاچھن اپنا چھبا لیے پہنچ جاتی۔ بڑے مزے دار کچالو بیچتی۔ اس کے علاوہ پھلوں کی چٹ پٹی

چاٹ بنادیتی۔ پیسے دو پیسے کے پتے میں مزہ آجاتا اور عورتیں ہونٹ چاٹتی رہ جاتیں۔ آلو شکر قند، امرود، کمرخ، کھیرا، اور کیلے کے دو دو قتلے ڈھاک کے پتے پر رکھ مرچ مصالحہ لگا، نیبو چھڑک کر اور دونوں ہاتھوں سے پتے کے دونے کو اوپر نیچے کر کے اور پتلی سینکھ لگا کر دے دیتی اور کہتی۔ "بی بی پھل تو ہو وے ہی ہے مگر ہاتھ کا بھی کمال ہوتا ہے، لو چکھو، یاد رکھوگی، تھوڑی سی "سی سی" تو ہوگی"۔ بی بی پتہ ہاتھ میں لے کر بولتی۔ "بچوں کے بھی بنا دے مگر صرف نمک اور چٹنی ڈالیو" اتنے میں بچے بھی آدھمکتے اور ان کے پتے بننے لگتے۔ کاچھن پتے بناتی رہتی اور بچوں کو دعائیں دیتی رہتی۔ "اللہ عمر دے، نیک نصیبہ ہو"

باہر کی عورتوں کا دعائیں دینے کا رواج مغلیہ زمانے میں شروع ہوا تھا اور انگریزوں کی حکومت کے دور میں بھی رہا۔ جو عورت بھی کسی کام سے گھر میں آتی یا کوئی سودا بیچنے آتی، ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دعائیں دینے لگتی۔ "اللہ سلامت رکھے، بچے جئیں، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو، روزی روزگار میں برکت ہو۔ حکم بنا رہے"

محلوں اور گلیوں سے نکل کر ذرا بازار کا بھی نظارہ دیکھتے ہیں۔ پھیری والے یہاں بھی گھوم پھر رہے ہیں۔ دکانیں سودوں سے بھری ہوئی ہیں مگر پٹڑی پر اور بیچ بازار میں اور چوراہے پر پھیری والے بھی گھوم پھر کر سودا بیچ رہے ہیں۔ کچھ پھیری والے اپنے چھیبے سمیت بیٹھے بھی ہوئے ہیں مگر آوازیں سب لگا رہے ہیں۔ کیوں کہ بازار میں بساطی کا سامان والا، پھل والے، سبزی والے اور ہر طرح کے پھیری والے ہیں، اس لیے آوازیں بھی بے شمار سننے کو ملتی ہیں۔ دیکھئے بنیان والا کیا کہہ رہا ہے۔

"بڑے بڑے بنیان، گرمیوں کی جان، میاں لیلو بنیان، بڑھاؤ اپنی شان"

دلی میں پھول جگہ جگہ بکتے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ ان پڑھ ہوتے تھے اور زبان کی نزاکتوں سے بالکل بے بہرہ مگر ان کی آواز کا جادو دل میں اتر جاتا ہے۔

"یہ کٹورے ہیں گجراتی موتیا کے
پھول لو جی چنبیلی کے، کنٹھے البیلی کے"

ایک اور پھول والا کہتا۔ "لو کٹورے موتیاں، میاں لو کٹورے، کیا لپٹیں آرہی ہیں

چنبیلی ہیں۔" "کیا بہار ہے زرد چنبیلی ہیں۔" جب لہک کر کہتا تو منہ سے موتیاں کی بجائے نکلتا — "پھولیں موتیا ئی کے۔"

دلی میں بارش کے چھینٹے پڑتے اور توت (شہتوت) اور جامنیں بکنے لگتیں۔ ذرا دیکھئے توت والا کیا کہتا ہے۔

"ریشم کے جال میں ہلایا، قند کا بنا ہے جلیبا کھالو
تیری چھاتی تر، اودا بنا ہے، جلیبا کھالو
کھالو بھیا اودا بنا ہے جلیبا لو۔"

جامنوں والا ہانک لگاتا —

"کالی کالی بھونرالی جامنیں، ساون بھادوں کا نمکین
نون کے بتاسے، نون والے نمکین۔"

اُدھر سے فالسے والی کی آواز آتی —

"اودے اودے نون کے بتاسے، شربت کو۔"

گرمیوں میں آم، خربوزے، ککڑی، تربوز وغیرہ کی بہار ہوتی۔ آم والا چلّاتا۔

"کیرانے کا لڈوا، سرولی کی بہار
لڈو ہیں پال کے، پال کے لڈو، باسی پراٹھے کے سنگ کھالو
رس کے گھڑے ہیں، یہ چوسنے والے۔"

خربوزے والا گاتا لہک لہک کر اور سب سے بازی لے جاتا —

"ننھے کے ابا چکو لانا
چکھ کے لینا، سچی کہنا
پھیکے یا میٹھے؟"

بیچ میں سے کوئی شکر قند والا بول اٹھتا —

"بن کڑھائی کا حلوہ، شکر قندی"

ککڑیوں والا ککڑیوں کو پانی سے تر کرتا رہتا اور چلّاتا۔

"لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں۔
تیر کر آئی ہے، بہتے دریاؤ ہیں۔"

یا

"شرط والے کی باڑی ہے۔"

یعنی نام نہیں لیا مگر بتادیا کہ یہ وہ ترکاری ہے جو دریا کے فالیزیں بوئی جاتی ہے۔ "شرط والے کی باڑی" سے مطلب ہوتا کہ شرطیہ میٹھی باڑی کی ککڑیاں ہیں۔

تربوزا ور کسیرو والے بھی پیچھے نہ ہٹتے۔ تربوز والا پکارتا۔

"لال کا ڈلا، لال کا ڈلا
لالوں میں آجا، چھلکوں سمیت لال،
قند کے ڈلے ہیں، رنگت کے گھڑے ہیں۔"

"گرمی کی ٹھنڈائی ہے۔ میرٹھ سے منگائی ہے۔" یہ کسیرو والے کی آواز ہے۔ کسیرو میرٹھ میں کثرت سے ہوتے تھے اوران کو کھانے سے ٹھنڈک پڑتی ہے۔

ایک آواز گلی میں اچانک سنائی دیتی ـــــ

"اودے اودے ہری چھتریوں والے، ڈھیکلیوں کے پالے۔"

یہ بینگن بیچنے والے کی آواز تھی۔ وہ بینگن بیچتا تھا مگر اس کا نام نہیں لیتا تھا مگر اشاروں میں بتادیتا تھا کہ وہ کیا بیچ رہا تھا ـــــ "چنے کی دال میں گھلاؤ، دو ہی گھڑی میں توڑا، جی لینا مارو ہے۔" یہ بھی بتادیتا تھا ـــــ "بھاڑ میں بھلبھلاؤ" اب کسی کو کوئی شبہ نہ رہتا کہ وہ بینگن بیچ رہا ہے جسے چاہے بھاڑ میں بھنوا کر بھرتہ بنواؤ، یا چنے کی دال میں پکاکر سالن یا قلیے کا لطف اٹھاؤ۔

لیجئے ہرے ہرے بونٹ والا بھی چلا آیا ـــ وہ لگاتار بولے جارہا ہے۔

"لڑیوں ہی پھلے، جب پھلے ایسے ہی پھلے۔"
"واہ بے چنے تیری پھلت۔"
"آؤ میاں سیر میں سوا سیر ناج، بالشتیوں ہی پھلے۔"

کھیرے والا اس کی آواز سے بھی اونچی آواز میں کہتا۔

"کھیرے کی نوبہار، کھیرے کی عجب ہے بہار، کھیرا ہے خنکی کھیرا"

پھل والے آتے ہیں تو آتے ہی چلے آتے ہیں۔ آڑو والے کی آواز آرہی ہے۔

"ڈال ڈال کا کھلا پیوندی ہے"

"کالے پہاڑ کی سوندھی اور میٹھیاں"، "بیجوں سے میٹھیاں"۔ یہ پھونٹیں اور کچریاں بیچنے والی کی آواز ہے۔

بھٹے والے کہتے۔ "دریا کی ریتی کے کیلے کا ہی مزہ"، "نوبہار کیلے بھٹے لے جا ہری ڈال کے"، "بھٹے بھی لینا، جھومتی ڈالیوں والے"، "لے جا ریتی کے تازے کا ہی مزہ"

لیجئے بیر والا کیا عمدہ بیر لایا ہے۔ کہہ رہا ہے۔ "باغ والوں کی گنڈیریاں ہیں بیر"

"لو باغوں کے سیو بیر" جھاڑی بونٹی کے بیر کی تو حقیقت ہی کیا۔ لیکن آواز تو سنیے۔ "جھاڑی بونٹی کے ہیں بیر" کانٹا چبھ گیا بکھر گئے بیر، گھونگھٹ والی نے توڑے ہیں بیر"

کھرنی والا گا گا کر کہہ رہا ہے۔

"گجرات کے چھینے ہیں، ترمیوے، تیری جان کو ترمیوے، قطب صاحب کے چھینے میوے"

کھجور والا عام طور پر شام کو آتا تھا۔ دلی والے کھجوروں کو بڑی رغبت سے کھاتے تھے اور دودھ میں اونٹا کر بھی پیتے تھے۔ کھجور والا کہتا۔

"کھالے، چھوارا لگا دیا"، "کلکتے سے منگائی ہیں اور ریل میں آئی ہیں"

"میاں دانہ تو شیدی گوہر کے باغ کا قند بن بنا ہے"

دہی کے بڑے، پکوڑی اور پانی کے بتاشے والا آتا تو اس کے گرد ایک بھیڑ لگ جاتی۔ عورتیں بھی کوئی برتن بھیج کر اندر منگوالیتیں۔ اس کی آواز سن کر سب لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

"دہی کے بڑے، میاں بیوی سے لڑے"

"کھاؤ پکوڑی، بنو کروڑی"

کسی کو دیکھتا کہ زکام ہو رہا ہے تو کہتا۔ "پانی کے بتاشے کھاؤ، نزلہ بھگاؤ"

تل شکری یعنی گجک اور ریوڑیوں والا اپنا خوانچہ لگائے بیٹھا ہے۔ اپنی سریلی آواز

یوں نکال رہا ہے۔

" یہ جاڑے کی لو، کھوپرا ہے گجک۔"

" پٹی میں حلوہ سوہن کا مزہ۔"

اب ذرا تانگے والے کی آواز بھی سنیئے۔

" جامع مسجد کی سواری، جامع مسجد کی سواری، ٹرام کا بھاڑا، منڈی کو میاں جی منڈی کو۔"

ایک تانگے والا دوسری طرف کو منھ کرکے کھڑا ہے۔ وہ آواز لگاتا ہے۔

" قاضی حوض کو بابو جی، لالہ جی قاضی حوض، ہوا کی سواری ہے یہ ہوا کی۔"

ایک صندوق بیچنے والا گاکر آواز لگا رہا ہے۔

"ہم سے مندا کوئی نہ بیچے، نو روپے کے تین، نو روپے کے تین میاں جی نو روپے کے تین۔"

ذرا ٹوپی والے کا اندازِ بیان دیکھئے۔ ٹوپی کا نام زبان پر نہیں لاتا مگر مطلب ادا کردیتا ہے۔ گاہک کی طبیعت کو کیسے ابھارتا ہے۔

" چار چار آنہ، چار چار آنہ، بڑی چھوٹی چار چار آنے کو لیتے جانا، چار آنے کو۔ سر کی عزت چار آنے کو۔ عزت داروں کے سودے۔ سرداروں کے سودے۔ چار آنے کو، چار آنے کو۔"

غزلوں کی کتابیں بیچنے والوں کا الگ انداز تھا۔ کتابیں پٹڑی پر سجائی ہوئی ہیں اور ایک کتاب والا آواز لگا رہا ہے۔

" بچالے بچالے رسولِ عربی مجھ عاصی کو بچالے رسولِ عربی۔"

ایک کتاب والا اگرچہ مسلمان ہے، یہ ہندوانی بول الاپ رہا ہے ــــ

"سنادے سنادے سنادے کرشنا بنسری کی تان سنادے کرشنا۔"

ایک جوتے والا لکڑی کے تختے پر دھڑا دھڑ جوتا بجا رہا ہے اور کہتا جا رہا ہے۔

" ٹوٹے نہ پھوٹے، جان لے کے چھوٹے اور چھ مہینے قبر پر دھرا رہے۔"

"جل جیرا" اس زمانے میں بھی مرغوب تھا۔ دیکھئے، اپنے سودے کے کیسے گن گا رہا ہے۔

زیرے کی آگئی بہار
پیئو جی جل جیرا ہے
پیتے ہی آجائے ڈکار
پیئو جی جل جیرا ہے
پیتے جانا جی سرکار!
بنا ذائقہ ہڑ کا پانی

چورن والا ایک اور ہی رنگ دکھا رہا ہے۔ اس کے پاس سب کے لیے چورن ہیں۔

سونٹھ ہے نیبو کے رس کی!
پاچک ہے چلونا، جس میں سبھی رنگ سلونا
میرا چورن ہے گا ٹھوس، بڈھا کھائے سنبھالے ہوس
چورن ہے البیلا، جس کو کھائیں گورو چیلا
چورن گولی انار دانہ، بچوں کو پھسلانہ
چورن امل بید کا سچا، اس کو کھاوے بوڑھا بچہ

چنے والا بھی بڑے ترنم سے کہتا ہے۔

میرا چنا بنا ہے اعلیٰ جس کو کھاتے بابو لالہ
چنے ہیں، مصالحے کے بنے ہیں، گھی کے تلے ہیں، لون مرچ کے ملے ہیں
کھائے گا چنا، رہے گا بنا!

ایک نے صرف ریوڑیاں لگا رکھی ہیں۔ جگہ جگہ گلاب کی پتیاں بکھیر رکھی ہیں اور کیوڑہ بھی چھڑکا ہوا ہے۔ بغیر رُکے گاتا جاتا ہے۔

گلابی ریوڑیاں، کڑاکڑ بول رہی ہیں ریوڑیاں
مکھڑا کھول رہی ہیں ریوڑیاں
میری ریوڑیاں ہیں تر بابو لیتے جانا گھر کھانا چار یار مل کر
دلی شہر بڑا گلدستہ جس میں بنے ریوڑی خستہ پیسے والے کو ہے سستہ

لیا اسکول کا سیدھا رستہ آکر کھاوے ریوڑی خستہ کھا کر جائے مدرسے ہنستا
میری ریوڑی کڑکڑ بولے
بابو جی کا منوا ڈولے!

اگرچہ پھیری لگانے والوں کے زمرے میں سادھو اور فقیر اور پانی پلانے والے سقّے نہیں آتے لیکن انہیں بالکل علیحدہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر روز فقیر بھی طرح طرح کی آوازیں لگا کر گھر گھر گھومتے پھرتے۔ ان کی صدائیں سننے والوں کے دل میں رحم کا جذبہ جگاتی تھیں اور عبرت کا سبق سکھاتی تھیں۔ اس وقت کے فقیروں کی کچھ مخصوص آوازیں سنیئے۔

"کیا تھا، کیا ہو گیا۔ چمن تھا گُل ہو گیا۔"
"یاد رب کی اور خیر سب کی۔"
"یہاں دے اور وہاں لے۔"
"تیرے آگے کی بھی خیر، تیرے پیچھے کی بھی خیر۔"
"اِس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے۔"
"فرید شکر گنج، نہ رہے دکھ نہ رہے رنج۔"
"رام نام کی لوٹ ہے، لوٹ سکے تو لوٹ۔"
"بھج لو نام گوسائیں۔ بھیجو مائی چٹکی۔"
"ہری شنکر، کانٹا لگے نہ کنکر۔"
"رحم قلندر، دودھ ملیدہ، مست قلندر دودھ ملیدہ۔"

جو سقّے گھوم پھر کر یا ایک جگہ کھڑے ہو کر راہ گیروں کو پانی پلاتے تھے وہ چھل پلانے والے سقّے کہلاتے تھے۔ سہ پہر سے ہی ان کا چوک چوراہوں پر جمگھٹا لگ جاتا تھا۔ بڑی تال سُر سے اپنا کٹورہ بجاتے تھے۔ دو کوڑی، چار کوڑی پیاس لیتے تھے۔ بعد میں دمڑی، دھیلہ اور پیسہ لینے لگے۔ ان کی آوازیں ملاحظہ کیجئے۔

"تیرے پاس ہو تو دے جا، نہیں پی جا راہِ مولا۔"
"سبیل ہے حسین کے نام کی، سبیل ہے دونوں شہزادوں کے نام کی۔"

"پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی۔ پیاسو سبیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی۔"

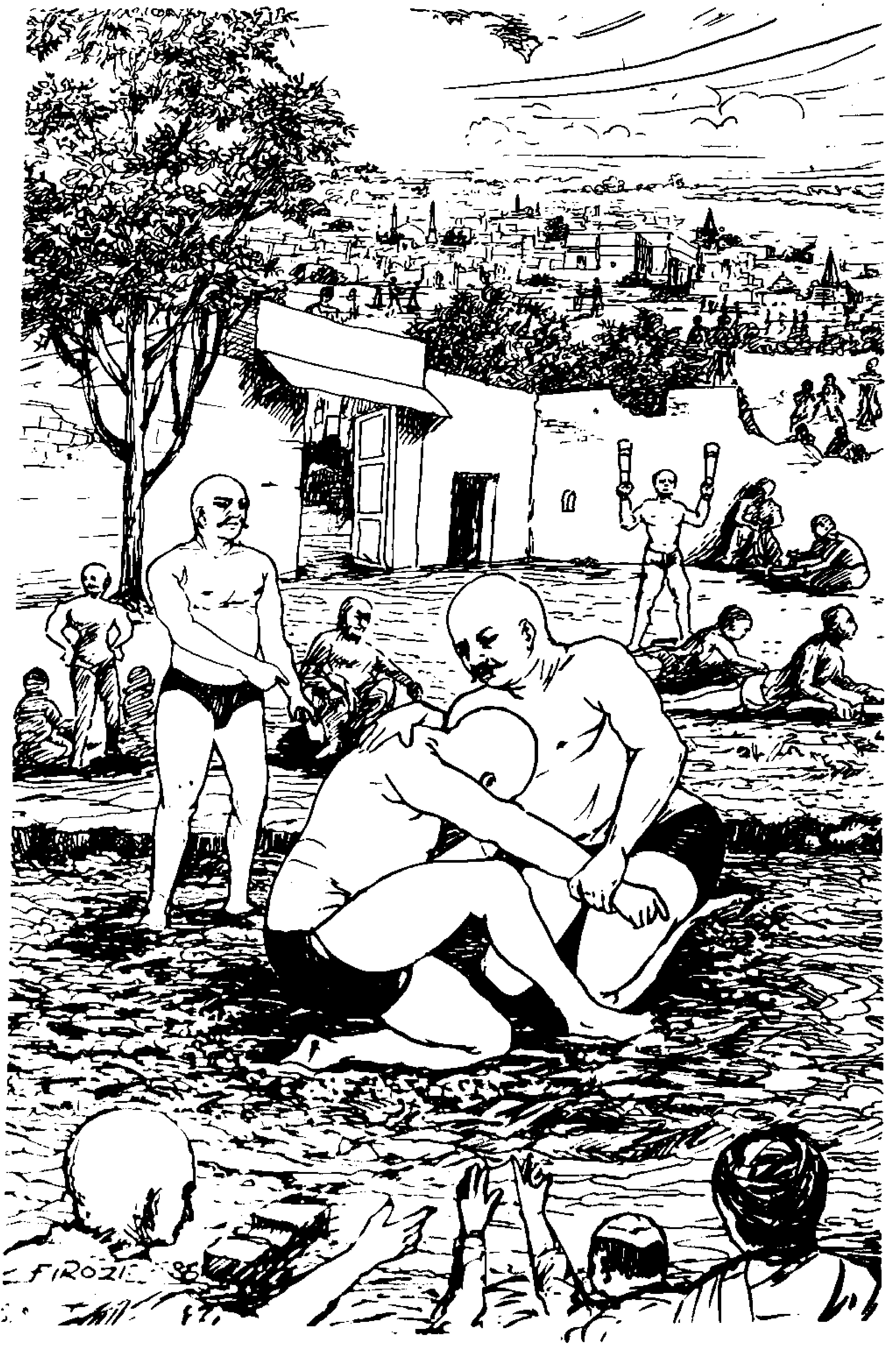
پرانے زمانے میں چاندنی چوک کے بیچوں بیچ نہر جاتی تھی جس کا نام سعادت خاں کی نہر تھا۔ اس کے دونوں طرف کنجڑے، سبزی فروش اور پھل فروش اور دوسری دنیا بھر کی اشیا بیچنے والے بیٹھا کرتے تھے۔ اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دکان داروں اور پھیری والوں کی آوازوں کا ایک عجیب ہی لطف آتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ہم کسی بازار میں سے نہیں گزر رہے ہیں بلکہ کسی ایسی محفل میں کھڑے ہیں جہاں شعر خوانی بھی ہو رہی ہے اور ملی جلی مترنم آوازیں فضا میں موسیقی بھی بکھیر رہی ہیں۔

آج بھی پھیری والے تو بہت گھومتے ہیں مگر وہ مانوس صدائیں، وہ مترنم آوازیں، وہ ٹنک بندی اور پھڑکتے جملے اب کہاں۔ وہ ماحول، وہ فضا، یکسر بدل گئی ہے۔ نہ اُن جیسے خوش باش بیچنے والے ہیں اور نہ وہ خوش ذوق خریدنے والے۔ نہ وہ دل ہیں، نہ وہ مزاج۔

کسرت اور کشتی کا شوق

دلّی والوں کو کسرت اور کشتی کا شوق ہمیشہ رہا ہے۔ پو پھٹنے سے پہلے ہی، تاروں کی چھاؤں میں لڑکے لنگر لنگوٹ کس کر گھروں کی چھتوں پر چڑھ جاتے۔ پہلے تیل کی مالش کرتے اور پھر ورزش میں جٹ جاتے۔ ذرا چاندنا ہوتا تو چھتوں پر لڑکے ڈنڈ پیلتے اور مگدروں کی جوڑی ہلاتے دکھائی دیتے تھے۔ ڈنڈ پیلنے کے لیے چھتوں پر اینٹیں رکھی رہتی تھیں یا بل ڈنتر بنوا لیتے تھے۔ کسرت سے سینہ چوڑا، کمر چھلا اور پیٹ چپاتی سا ہو جاتا تھا۔ ڈنڈ اور بیٹھک کا چولی دامن کا ساتھ تھا اور ڈنڈ کے ساتھ بیٹھکیں بھی لگائی جاتی تھیں۔ اصول کے مطابق جتنے کوئی ڈنتر پیلتا، اس سے دگنی یا تگنی بیٹھکیں نکالتا۔ بیٹھکوں سے رانیں موٹی ہو جاتیں اور پنڈلیاں مضبوط بنتیں۔ ڈنڈ پیلنے سے چھاتی ابھرتی اور چوڑی ہو جاتی۔ ساتھ ہی بازوؤں میں طاقت آتی اور مچھلیاں ابھرتیں۔ کسرت کے بعد لڑکے کوئیں پر جا کر نہاتے اور گھر میں یا حلوائی کی دکان پر دودھ پیتے۔

جو لڑکے گھروں میں کسرت نہیں کرتے وہ تڑکے ہی گھر کے دروازے کی کنڈی کھول کر نکل جاتے اور اکھاڑے کی راہ لیتے۔ جاتے ہی کپڑے اتار کر لنگر لنگوٹ کس لیتے۔ پہلے ایک دوسرے کی مالش کرتے اور پھر کدال اور پھاوڑا لے کر اکھاڑے کی زمین ٹھیک کرنے میں لگ جاتے۔ اکھاڑے کی زمین کو چکنی مٹی اور گیرو ملا کر پولا کر لیا جاتا تھا۔ اب کسرت شروع ہو جاتی۔ ہر طرف سے ہوں ہاں اور بدن پر تھپیڑ یا ریپٹا پڑنے کی آوازیں آنے لگتیں۔ کہیں بل ڈنتر پر ڈنتر پیلے



اکھاڑے کا ایک منظر

جا رہے ہیں. پیچھے ایڑیوں پر کسی لڑکے کو بھی کھڑا کر رکھا ہے اور وہ لنگوٹ پکڑے ڈنٹر پیلنے والے کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا ہے. اس طرح سے ڈنڈ پیلنے سے بدن اور مضبوط ہوتا ہے. کوئی لڑکا دیوار پکڑ کر ایک کونے میں بیٹھک لگا رہا ہے اور دل ہی دل میں بیٹھکوں کی گنتی بھی کرتا جا رہا ہے۔ ایک سنتولہ اٹھا رہا ہے اور دوسرا لیزم سے ورزش کر رہا ہے. کس کے ہاتھ میں مگدروں کی جوڑی ہے تو کوئی موگریوں کے ہاتھ نکال رہا ہے۔ اکھاڑے میں صرف لنگر یا رومالی پہننے کی روایت ہے اور سب نے اسی سے ستر ڈھکا ہوا ہے۔ ورزش اور پہلوانی کرتے کرتے پسینے میں نہانے لگے ہیں لیکن تھکن نام کو نہیں۔ ایک کونے میں ایک لڑکا ہاتھوں کے پنجوں پر الٹا کھڑا ہے اور کبھی کبھی ٹانگوں کو گھٹنوں کے پاس سے سر کی جانب جھکا کر مور کی دُم کی نقل کرتا آہستہ آہستہ آگے پیچھے حرکت کر رہا ہے. اس مورجاتی انداز سے دل قوی اور دماغ روشن ہوتا ہے کیونکہ ان کی طرف خون کا دورہ تیز ہوتا ہے ۔

ورزش کے سامان میں لیزم (لوہے کی زنجیر والی کمان)، سنتولہ اور مگدروں کے علاوہ یا کا، نال (ایک گول وزنی پتھر جس کے بیچ میں ایک سوراخ ہوتا ہے) اور طرح طرح کے لوہے اور پتھر کے وزن بھی شامل ہوتے تھے۔ اگر اکھاڑے میں دو لڑکے کشتی میں مصروف ہیں تو دوسرے اس اثنا میں ان چیزوں سے ورزش کر کے اپنے آپ کو گرم کر لیتے ہیں۔

اکھاڑے میں پہنچتے ہی لڑکے سب سے پہلے اپنے گرو یا خلیفہ کے آگے سر جھکاتے اور اس کے پاؤں چھوتے تھے۔ پہلوانی میں گرو یا خلیفہ کی حیثیت والد سے بھی زیادہ سمجھی جاتی تھی اور اس کی حکم عدولی کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے اشارے اور حکم پر لڑکے ہر کام کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس وقت کے استاد نہ صرف اپنے شاگردوں کو پہلوانی کے داؤ پیچ ہی سکھاتے تھے بلکہ اخلاق کی تعمیر پر بھی پورا زور دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جب تک دل اور دماغ پر قابو نہیں ہوگا، کسرت کا کوئی فائدہ نہیں اور بدن نہیں بنے گا۔ ان کی پہلی سیکھ یہ ہوتی تھی کہ لنگوٹ کے پکے رہو۔ شاگردوں کو یہ بھی سکھایا جاتا تھا کہ ان کی چال میں پہلوانی شان ہونی چاہیئے۔ پہلوانی اصطلاح میں شاگردوں کو پٹھے کہا جاتا تھا۔ استاد بڑے ڈھنگ سے انہیں کسرت کرنا سکھاتے تاکہ جسم کے ہر عضو کی نشوونما ٹھیک طرح سے ہو ۔ یہ

احتیاط خاص طور پر برتی جاتی تھی کہ نہ صرف جسم کے اوپری حصے کو فروغ ملے بلکہ رانیں اور پنڈلیاں بھی مضبوط ہو جائیں۔ پہلوانوں اور شاگردوں کو اپنی جسم کی نمائش کا شوق ہوتا تھا۔

اکھاڑے میں گرو یا خلیفہ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا رہتا تھا اور اس کی نظر اپنے ہر شاگرد اور پٹھے پر رہتی تھی۔ وہ انہیں ہدایتیں بھی دیتا رہتا تھا۔ اس کی ہدایتیں عام طور پر چار باتوں تک زیادہ محدود رہتی تھیں۔ عمل کی پھرتی، اندرونی طاقت، موقعے پر صحیح داؤ کا استعمال اور مخالف کے داؤ کے توڑ کا بروقت استعمال۔ اس زمانے میں جو پکڑیں مقبول تھیں اُن میں قینچی، منڈھا، بغل، گھسہ، اڑنگا، اینٹی، قفلی اور دھوبی پاٹ شامل ہیں۔ قینچی کا داؤ بڑا مقبول تھا۔ پہلوان یہ کوشش کرتا تھا کہ اپنے مخالف کے گھٹنوں کو قینچی کی شکل میں موڑ کر اسے اینڈ کر دے۔ جو پہلوان قینچی کے داؤ کا شکار ہو جاتا تھا، اس کے گھٹنے بہت دیر تک اپنی اصلی حالت میں نہ آتے جب تک کہ اِس کا توڑ نہ استعمال کیا جائے۔

اکھاڑے کا منظر دیکھتے ہی بنتا تھا۔ دو تین پٹھے داؤ پیچ میں جُٹے ہیں۔ کسی نے اپنے حریف کو ٹانگوں میں سر دبا کر اٹھا لیا اور سر سے اونچا کر کے پٹکا تو آواز آئی۔ کیا دھوبی پاٹ پر مارا ہے۔ کوئی پٹ پڑا ہے تو اسے چت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ٹانگوں کو پکڑ کر مروڑا تو پٹ پڑا پہلوان بولا۔۔۔ دتے جاتا ؤ، ہوتا کیا ہے۔ کوئی بھسکڑا مار کر بیٹھ گیا تو اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ ایسا جم کر بیٹھا ہے کہ ہلائے نہیں ہلتا۔ کوئی بہت دیر سے پڑا اینڈ رہا ہے تو استاد نے اٹھ کر وہ چپیڑ اس جمائی کہ ہوش ٹھکانے آ گئے۔ کوئی ہاتھ جوڑے کر کے شیر ڈنڑ پیل رہا ہے۔ خلیفہ بتا رہے ہیں کہ اوپر اٹھتے وقت پیٹ کی نسیں کھنچی رہیں۔ کوئی سیپی سے پسینہ سونت رہا ہے تو کوئی خسم ٹھونک کر کہہ رہا ہے۔ آجاؤ ہو جاتے پکڑ۔ پٹھے ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کبھی پیر کے اڑنگے سے تو کبھی بلتھم سے۔ خلیفہ داؤ بھی بتا رہے ہیں اور ان کے توڑ بھی۔ کسی نے کولی بھرنے کی کوشش کی تو دوسرا کُہنی مار کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ کسی نے ایسا ریپٹا جمایا اور پھر چپیڑ اس ماری کہ گرد آباد کر دیا۔ پٹھے رَولا مچا رہے ہیں، ریپٹے مار رہے ہیں، لپاڈکی ہو رہی ہے دھول دھپا اور دھینگا مشتی میں لگے ہیں۔ اگر کسی کے رگڑ یا چوٹ لگ کر خون نکل آتا تو

اکھاڑے کی گیلی مٹی مٹھی میں بھر کر اس پر مَل دیتے اور علاج ہو جاتا۔ نس چڑھ جاتی یا موچ آجاتی تو خلیفہ ہی اسے جھٹکا مار کر ٹھیک کر دیتا۔ خلیفہ کو جسم کی ایک ایک ہڈی اور نس کا پتہ ہوتا۔ داؤ سکھانے کے لیے خود خلیفہ کبھی اکھاڑے میں اتر آتا اور کئی کئی پٹھوں کو چپٹا لیتا۔ پٹھوں کو ایک ایک کر کے اسی داؤ پیچ سے گراتا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ توڑ بھی بتاتا جاتا۔

جب کسرت اور محنت ختم ہو جاتی تو شاگرد اور پٹھے آرام کرتے اور پسینہ سکھاتے۔ یہ محنت دو تین گھنٹے سے کم کی نہ ہوتی۔ آرام کرنے کے بعد کئی پٹھے بدن پر تیل کا ہاتھ پھر مارتے۔ پھر سب نہانے کے لیے پاس کے کوئیں سے پانی کھینچتے اور خوب مَل مَل کر نہاتے۔ گھر پہنچ کر یا راستے میں ہی کسی مشہور حلوائی کی دُکان سے کم سے ایک سیر اونٹا ہوا دودھ پیتے۔ ان سب کی خوراک میں دودھ کے علاوہ بادام بھی شامل ہوتے۔ اگر استاد کسی شاگرد کا ذرا سا بھی پیٹ بڑھا ہوا دیکھ لیتا تو وہ اسے ایک دو مہینے کے لیے دودھ چھوڑنے اور اس کی بجائے بادام کی ٹھنڈائی پینے کی ہدایت کرتا۔ شاگرد اور پٹھے رات کو دودھ یا پانی میں چنے کی دال بھی بھگو کر رکھتے اور صبح اسے کھا لیتے۔ یہ بڑی قوت افزا خوراک سمجھی جاتی تھی۔

ہر اکھاڑے سے اس کے محلے کی مان مریادا جڑی ہوتی تھی۔ اگر کسی اکھاڑے کا پٹھا اپنے اکھاڑے یا استاد کے بارے میں کسی دوسرے اکھاڑے کے پٹھے سے کوئی برے لفظ سن لیتا تو ان کی ٹکر ہو جاتی۔ بُرائی کرنے والے سے جب تک چیں نہیں بُلوائی جاتی اس کو چھوڑا نہ جاتا۔ لیکن اگر وہ لڑکا جی دارا ور تگڑا ہوتا اور چیں نہیں بولتا تو پھر بیچ بچاؤ کرا دیا جاتا اور جیتنے والے کو شاباش ملتی، پیٹھ ٹھونکی جاتی اور شربت پلوایا جاتا۔ لیکن من مٹاؤ نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے کا دبیل نہیں بلکہ یار بن جاتا اور پھر کبھی استاد کی دعا پا کر داؤ پیچ کی کاٹ سمجھ کر آپس میں بھڑنت ہوتی۔

اکھاڑوں میں رکھ رکھاؤ اور ٹھیک ٹھاک کرنے کا سارا کام شاگرد اور پٹھے ہی کرتے تھے۔ ہر شاگرد کے دل میں اپنے اکھاڑے کے لیے اتنی ہی عزت ہوتی تھی جتنی اپنی پاٹھ شالہ یا مدرسے کے لیے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ بغیر کسی کے کہے شاگرد اور پٹھے اپنے اکھاڑے کی زمین کو یکساں، ہموار اور بھربھرا رکھنے کے لیے ہر روز کھدائی کرتے تھے۔ کنکر ڈھیلے نکالے جاتے تھے،

پانی چھڑکا جاتا تھا اور کبھی کبھی تھوڑا سا تیل بھی ڈال دیا جاتا تھا۔ کھدائی صبح شام دونوں وقت ہوتی تھی۔ اکھاڑے میں اترنے اور مشق کرنے سے پہلے شاگرد اور پٹھے اپنے گرو یا خلیفہ کی دعا لینے کے لیے "بجرنگ بلی کی جے" یا "عشق اللہ" کہا کرتے تھے۔ ہر اکھاڑے کا کچھ نہ کچھ تو خرچ ہوتا ہی تھا۔ اگر اکھاڑا کسی جماعت یا سنستھا کا ہے تو وہ جماعت یا سنستھا خرچ دیتی تھی۔ دوسرے اکھاڑوں کا خرچ محلے یا کوچے کا کوئی امیر یا سخی آدمی اٹھا لیتا۔ اگر ایسا کوئی ذریعہ نہ ہوتا تو پہلوان، شاگرد اور پٹھے آپس میں ہی چندہ کر لیتے۔ استادی شاگردی کی پرانی پکی روایت تھی اور مسلم شاگرد اور پٹھے اپنے خلیفہ کو دستار پہناتے اور کچھ نقدی نذر کرتے۔ ہندو شاگرد اپنے گرو کو دھوتی، مٹھائی اور پھل پیش کرتے۔

ہندو پہلوان، شاگرد اور پٹھے ہنومان جی کو مانتے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ اکھاڑوں کا دلی کی سماجی زندگی میں ایک خوشگوار پہلو یہ بھی تھا کہ وہ محلے والوں کی حفاظت کی ذمے داری بھی لیتے تھے۔ اکھاڑے کیا تھے اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ رام لیلا کا جلوس نکلتا یا مسلمانوں کا کوئی جلوس نکلتا تو اس علاقے کے پہلوان پوری عقیدت سے شامل ہوتے اور ہر طرح کی مدد دیتے۔

عبدالحلیم شرر کے مطابق اہلِ عرب، ترک، ایرانی اور تورانی وغیرہ فنِ کشتی سے ناواقف تھے۔ ہندوستان میں یہ فن آریہ نسل کے لوگ لائے، اگرچہ یونان اور مصر میں بھی اس کے فروغ کے تذکرے ملتے ہیں۔ دریائے نیل کے پاس بینی حسن کے مقبروں اور کھنڈرات کی دیواروں پر پہلوانوں کی کشتیوں کے بہت سے منظر کھدے ہوئے ملتے ہیں۔ اگرچہ وہ تصویریں اور نقش و نگار اب ماند پڑ گئے ہیں مگر ان کو دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ جو پہلوان ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں ان کے داؤ پیچ ویسے ہی ہیں جو ہندوستان میں استعمال ہوتے تھے۔ وہی پکڑ اور ویسے ہی چاروں شانے چت ان تصویروں میں بھی ہیں۔ ہندوستان میں فنِ کشتی بہت ہی قدیم ہے۔ وید پرانوں میں، راماین مہابھارت میں بہت سے بہادروں اور یودھاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ ان دنوں کشتی اور پہلوانی کے ہنر کو 'مل یدھ' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ایران، عرب اور ترکی میں یہ فن ہندوستان سے گیا ہے۔ یوں تو مغلوں سے پہلے بھی فنِ کشتی کو کئی

راجاؤں کی سرپرستی حاصل تھی مگر مغلوں کے عہد میں بادشاہوں، امیروں اور عوام نے کشتی اور پہلوانی میں بہت دلچسپی لی۔ بادشاہ خود دنگل دیکھنے آتے تھے اور جیتنے والوں کو انعام دیتے تھے۔ شیر علی تبریزی، مراد ترکی، بل بھدر اور بیج ناتھ شاہی پہلوان تھے۔

آج سے ڈھائی سو برس پہلے سالار جنگ اوّل نے اپنی فارسی کی کتاب "مرقعِ دلّی" میں، مہابت خاں کی ریتی (جہاں آج کل دہلی ڈیویلپمنٹ اتھارٹی انکم ٹیکس اور ریونیو ڈیپارٹمنٹ کے دفتر ہیں) کے اکھاڑے کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کیا ہے ــــ "یہ ایک بہت بڑا میدان ہے۔ یہاں کشتی کے شوقین نوجوان، ملک بھر کے نامی پہلوان اور دلّی کے ہزاروں باشندے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے لڑاکو اور ہاتھیوں کی طرح پہلوان کشتی لڑتے ہیں کہ دیکھنے والے حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ کشتیاں ختم ہونے پر لوگوں کو مٹھائیاں کھلائی جاتی ہیں۔"

دلّی میں یہ عام رواج تھا کہ آئے جمعے کو دنگل کیے جاتے۔ ان کا اعلان شہر بھر میں ڈھول پیٹ پیٹ کر کیا جاتا اور اکھاڑوں کا اور پہلوانوں کا نام لیا جاتا۔ جو پہلوان ان دنگلوں میں حصّہ لیتے وہ مقامی اکھاڑوں کے ہوتے تھے۔ حال ہی کے مشہور اکھاڑے تھے، چرنجی پہلوان کا اکھاڑا، گورومنی کا اکھاڑا، گرو ہنومان کا اکھاڑا، شیخو والے کا اکھاڑا، بھورے والے کا اکھاڑا، گونڈی شاہ والے کا اکھاڑا اور میران شاہ والے کا اکھاڑا۔ مگر ان سب سے پہلے کا مہابت خاں کی ریتی کا اکھاڑا جمعے کے دن ہونے والے دنگلوں کے لیے کہیں زیادہ مقبول تھا۔ بعد میں مہابت خاں ریتی کی بجائے یہ دنگل موتیا کھان میں ہونے لگے تھے۔ اُن دنوں پنجاب کے پہلوان بھی اپنا اپنا کمال دکھانے کے لیے اکثر دلّی آتے رہتے تھے۔ وہ بڑے بڑے دنگلوں میں شریک ہوتے تھے۔ رستم ہند گاما، گونگا پہلوان، امام بخش اور کیکر سنگھ وہ چند نام ہیں جو کُشتی کی دنیا میں دُور دُور تک مشہور تھے اور لوگ ان کی کشتی دیکھنے کے لیے سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آتے تھے۔ گاما ریاست پٹیالے کا درباری پہلوان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۲۰ میں وہ اپنے بھائی امام بخش کے ساتھ ولایت گیا اور وہاں اس نے اُدھر کے مشہور پہلوانوں کے ساتھ کُشتی لڑی۔ کیونکہ ولایت والے گاما کو زیادہ نہیں جانتے تھے اس لیے انھوں نے گاما کو اُن

چوٹی کے پہلوانوں میں شمار نہیں کیا جن کا درجہ متعیّن تھا۔ لیکن جب گاما نے بیس ایسے نامی پہلوانوں کو صرف ایک گھنٹے میں پچھاڑ دیا تو دنیا دنگ رہ گئی اور ان کشتیوں کے انتظام کرنے والوں نے بھی گاما کا لوہا مان لیا۔ مغرب میں زِبسیکو سب سے مشہور پہلوان تھا۔ گاما نے اسے بھی للکارا اور شکست دی۔ ایک سال بعد زبسیکو گاما سے جوابی کشتی کرنے کے لیے ہندوستان آیا۔ اُس وقت بہت سے تماشائی دور و نزدیک سے اس کشتی کو دیکھنے کے لیے جائے دنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہزاروں لوگ قطار میں لگے ٹکٹ خرید رہے تھے۔ مگر پوری بھیڑ ابھی دنگل میں پہنچ بھی نہ پائی تھی کہ خبر ملی کہ گاما نے زبسیکو کو صرف ۳۱ سیکنڈ میں چت کر دیا تھا۔ اس کے بعد گاما کو رستمِ زماں تسلیم کر لیا گیا۔

دلّی کے دنگلوں اور اکھاڑوں کے منظر اور پٹھوں کی آپس کی بات چیت اور خلیفہ اور گرو کی ہدایتوں کی جتنی بھی تصویر کشی کی جائے کم ہے۔ ہندوؤں کے ایک محلے کے اکھاڑے کو بھی دیکھتے چلتے ہیں۔ دو نوجوان اکھاڑے کی مٹی جسم پر ملے، لنگوٹ پہنے گتھم گتھا ہونے سے پہلے گرو جی کی آشیرواد لے رہے ہیں۔ پھر اکھاڑے میں اتر کر آمنے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ ملا رہے ہیں۔ اب صرف 'زور' کر رہے ہیں یعنی یہ اسے ریلتا ہوا لے جا رہا ہے اور وہ اسے پیلتا ہوا لے آ رہا ہے۔ جب تک سانس نہ پھول جاتے یہی ریل پیل جاری رہتی۔ دم لینے کے بعد پھر دونوں نے داہنے ہاتھ سے اپنی اپنی ران پر تھپکی دی اور گتھ گئے۔ ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گورو جی اونچے سے تھڑے پر بیٹھے بیٹھے داؤ بتاتے رہتے۔ کسی سے کہتے "سانٹیاں نکال" دوسرے سے کہتے۔ "او مٹی کے مادھو۔ پڑا کا پڑا رہ گیا۔ گدھا لوٹ لگا" اے لیجیے آن کی آن میں وہ نیچے سے نکل آیا اور دونوں پھر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ گرو جی کی آنکھیں سب پٹھوں پر لگی رہتیں۔ ایک سے کہتے "دھوبی پاٹ پر کھینچ لے" داؤ ادھورا رہ جاتا تو کہتے "قینچی ڈال" بس پھر کیا تھا ایک نے دوسرے کو بے بس کر دیا۔ لیکن گرو جی نے اب دوسرے کو داؤ کا توڑ بتایا ـــ "ابے تالے کو کہنی کی کنجی سے کھول اور قلا جنگ لگا" وہ جو بے بس ہو رہا تھا اب چھاتی پر چڑھا بیٹھا ہے۔ گرو جی مسکرا کر بولے "کشتی اور پہلوانی طاقت کا نام نہیں۔ پھرتی چاہیے پھرتی"

پہلے کئی اکھاڑوں میں کشتی کے علاوہ طرح طرح کے کرتب بھی سکھائے جاتے تھے مثلاً پھلکیتی یعنی لاٹھی گھمانا، پٹہ، بانک، بنوٹ (رومال کے کونے میں تانبے کا سکّہ باندھ کر ایسے ایسے گھمانا اور دانو پیچ کرنا کہ حریف کے ہاتھ میں تلوار، لاٹھی یا کوئی اور ہتھیار بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے)، برچھا اور جل بانک وغیرہ۔ ان فنون کو زیادہ تر ہندو اکھاڑوں میں سکھایا جاتا تھا۔ اس وقت کے ان کرتبوں کو سکھانے والے (کشتی کے علاوہ) مشہور دل تھے۔ پرس رام دل، بھیم دل، بھیروں دل، رام دل، بھیشم دل، کرشنا دل اور ہنومان دل۔ ان میں سے کچھ دل ابھی تک قایم ہیں۔ ہرا ماوس کو ان دَلوں کے پہلوانوں کے قدسیہ گھاٹ پر دنگل بندھتے۔ مُنّی گرو ۱۰۱ برس کی عمر میں حال ہی میں گزرے ہیں۔

مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی کشتی اور کسرت کا بہت شوق تھا۔ اس کے وقت میں استاد صدیق اور استاد سکھدیو اپنی غیر معمولی طاقت کے لیے مشہور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی جسمانی قوت کا یہ حال تھا کہ اگر کسی ہاتھی کو دُم سے پکڑ لیتے تو وہ آگے جنبش نہ کر سکتا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ اِن میں سے کوئی اگر کسی سِکّے کو لے کر ہاتھ میں انگوٹھے اور انگلیوں سے رگڑتا تو اس سکّے کے سارے حروف گھس جاتے۔ سیّد احمد دہلوی کے مطابق سکھ دیو مہاراجہ الور کے دربار کا پہلوان تھا۔ ۱۸۵۷ کی پہلی جنگِ آزادی سے کچھ ہی دن پہلے وہ بہادر شاہ کے دربار میں پیش ہوا اور بولا: "حضور سارے شہر میں منادی کرا دیں کہ اگر کسی کو مجھ سے کشتی کرنے کا حوصلہ ہو تو کل لال قلعے کے جھروکوں کے نیچے آ جائے۔ اگر کوئی نہیں آیا تو میں سمجھ لوں گا کہ کوئی پہلوان مجھ سے ٹکّر لینا نہیں چاہتا اور میں ہمیشہ کے لیے کشتی لڑنا چھوڑ دوں گا۔" دوسرے دن جھروکوں کے نیچے جمنا کی ریتی پر دلّی والوں اور آس پاس کے رہنے والوں کی بھیڑ اکٹھی ہو گئی اور ایک میلہ سا لگ گیا۔ مگر کسی کو سکھ دیو سے لڑنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ بادشاہ خود جھروکے میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ سکھدیو ایک مست ہاتھی کی طرح اکیلا کھڑا للکارتا رہا مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ پھر اس نے بھاری بھاری مگدر ہلا ہلا کر، زور اور محنت کر کے اپنی قوت اور طاقت کا مظاہرہ کیا۔ پھر وہ بادشاہ کے جھروکے کے نیچے کھڑا ہو کر دست بستہ بولا "جہاں پناہ اب اجازت دیجیے۔ مجھ سے کوئی لڑنا نہیں چاہتا۔" یہ کہہ کر سکھدیو نے لنگر لنگوٹ کھول کر

کپڑے بدلے اور اپنے قول کے مطابق آئندہ کشتی نہ لڑنے کا عہد کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے سکھدیو کی شجاعت اور مردانگی سے متاثر ہو کر فی البدیہہ یہ شعر کہا اور اسے ایک چاندی کی تختی پر کھدوا کر سکھدیو کے گلے میں ڈلوا دیا۔

صورتِ رستم، سیرتِ گیو
یکتا گرو، نہا سکھدیو

پہلوانی مردوں کا مشغلہ اور فن سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کشتی اور پہلوانی کیساتھ عورت کا نام نہیں جڑتا۔ ایک تو ویسے ہی صنفِ نازک اور پھر حیا کی پتلی۔ چلیئے لباس تو مختصر ہو سکتا تھا جیسا کہ آج کل تیراکی میں مگر آج سے نصف صدی یا اس سے بھی پہلے کسی عورت کا تیراکی یا کشتی کے لباس میں دیکھے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن صاحب نصف صدی پہلے بھی ہندوستان میں خاتون پہلوان ہوئی ہیں اور ایسی جنھوں نے مشہور مرد پہلوانوں کو پچھاڑ دیا۔ ایسے دو نام بے ساختہ ذہن میں آتے ہیں۔ ایک حمیدہ بانو کا اور دوسرا تارا بائی کا۔ حمیدہ بانو کافی مشہور ہو گئی تھی اور اس نے دلّی اور پنجاب میں کافی کُشتیاں لڑیں۔ لوگ اسے اور اس کی کشتی کو دیکھنے دُور دور سے پہنچ جاتے تھے۔ وہ بالکل مرد پہلوانوں کی طرح لڑتی تھی اگرچہ کچھ کا یہ کہنا تھا کہ حمیدہ بانو اور مرد پہلوان کا آپس میں خفیہ معاہدہ ہو جاتا تھا اور وہ جان کر حمیدہ بانو سے ہار جاتا تھا۔ تارا بائی بعد میں سرکس میں شامل ہو گئی تھی اور تار پر چلتی تھی۔ اس کے بہت سے کارناموں میں اپنے لمبے بالوں سے باندھ کر بہت وزنی پتھروں کو زمین سے اوپر اٹھانا شامل تھا۔

انگریزوں کے زمانے میں دلّی والوں نے دھیرے دھیرے اکھاڑوں میں جانا بند کر دیا۔ اونچے گھروں کے نوجوان لڑکوں کا نظریہ بدل گیا اور وہ کشتی اور پہلوانی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور والی بال وغیرہ میں دلچسپی لینے لگے اور کشتی اور پہلوانی غریب لوگوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں کے افراد تک محدود ہو گئی۔ اکھاڑوں کی تعداد قدرتی طور پر کم ہو گئی۔ پھر فکرِ معاش اور عوام

کی تنگدستی بھی ایک رُکاوٹ بن گئی۔ دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد پہلوانی کیا ہوگی اور وہ خوراک جو دو چار آنوں میں مہیّا ہو جاتی تھی، دو چار روپے میں بھی مشکل تھی۔ پھر بھی غریب اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے سہارے اکھاڑوں کی روایت دلّی میں قایم رہی۔ ہاں کُشتی اور دنگل میں بڑے بڑے راجہ مہاراجے دلچسپی رکھتے تھے ان کی ریاستوں میں فنکاروں کی طرح بڑے نامی پہلوان بھی قدر پاتے تھے۔

ایک بار بہت سے لوگوں نے سوچا کہ مہاتما گاندھی کو کسی دنگل میں بلانا چاہیئے۔ وہ گاندھی جی کے پاس پہنچے تو انھوں نے آنا منظور کر لیا۔ گاندھی جی دنگل دیکھنے پہنچ گئے۔ گاندھی جی کی وجہ سے بھی بہت بھیڑ اکٹھی ہو گئی تھی۔ دو نامی پہلوانوں کی ٹکّر تھی۔ دونوں پہلوان اکھاڑے میں اترنے سے پہلے گاندھی جی کا آشیرواد لینے آئے اور انھوں نے ان کے پاؤں چھوئے۔ گاندھی جی نے ایک لمبے چوڑے پہلوان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "کیوں بھائی ہم سے کشتی لڑوگے؟" پہلوان ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "نہیں باپو ہم آپ سے کشتی نہیں لڑ سکتے۔ آپ کی بہادری اور طاقت کے کیا کہنے۔ آپ نے تو اتنی بڑی سلطنت برطانیہ کو ہرا دیا۔ ہم کس گنتی میں ہیں جو آپ سے لڑیں۔"

آزادی کے بعد اب پھر دلّی کے اکھاڑوں میں جان آتی جا رہی ہے مگر پڑھا لکھا اچھے گھرانوں کا نوجوان لڑکا تو اکھاڑے سے ایسا کٹا ہے کہ اب شاید کبھی نہیں جڑے گا۔ بہرحال ایک روایت جو دلی میں اکھاڑے کی قائم ہو گئی تھی جاری ہے۔ آج بھی دلی میں اکھاڑوں کی تعداد کئی سو کے قریب ہو گی۔ جمنا کا کنارا آج بھی کئی اکھاڑوں کا مرکز ہے۔ گرو ہنومان کا اکھاڑا بڑا مشہور ہے۔ رُستمِ ہند سَت پال ان کے ہی شاگرد ہیں۔ ست پال کے علاوہ اشوک کمار، منگل داس گپت، راجندر سنگھ، سودیش کمار، ست بیر سنگھ، جگمندر سنگھ، جگدیش اور سکھ چین سنگھ بھی اچھے پہلوانوں میں گنے جاتے ہیں۔ دلّی کے دوسرے اکھاڑوں میں بدری خلیفہ کے اکھاڑے سے وجے کمار، آنند رائے اور جگدیش متّر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں آنند رائے اور وجے کمار نے کافی نام کمایا۔ گورو چیر بجیت کا پرشورام اکھاڑا بھی پرانا ہے۔ ہریانہ کے ماسٹر چندگی رام نے بھی جو

ہند کیسری کا خطاب جیت چکے ہیں دلی میں اپنا ایک الگ اکھاڑا قایم کیا تھا۔ دہلی کلاتھ ملز اور برلا ملز بھی کچھ اکھاڑوں کو مدد دیتی ہیں اور پہلوانوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ دلی سرکار بھی کشتیوں اور دنگلوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ لیکن اب وہ پرانی بات کہاں کہ دلی کے ہر کوچے اور محلے میں اکھاڑا قایم ہے، گھر گھر نوجوانوں کو کشتی اور ورزش کا شوق ہے، تڑکے ہی لنگر لنگوٹ اٹھا کر گلیوں میں لڑکے نکل پڑے ہیں، منہ اندھیرے ہی محنت اور ورزش کی ہوں ہاں چاروں طرف سنائی دے رہی ہے اور پٹھے اور شاگرد کسرت کے بعد کنوئیں سے ڈول کھینچ کھینچ کر ایک دوسرے کو نہلا رہے ہیں۔



مسیح الملک حکیم اجمل خاں

دکھ کا ساتھی

دلی کی ایک پرانی کہاوت ہے ــــــ جوہری سُکھ کا ساتھی ہے، حکیم دکھ کا۔

دلی میں مغلیہ دور میں، اور آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے بھی عام لوگوں کی زندگی ایک خاص قسم کی سادگی سے عبارت تھی۔ لوگوں کی آمدنی کم تھی اور پھر آج کی طرح کی رہن سہن کی ضرورتیں بھی نہیں تھیں۔ سب مل جل کر ہنسی خوشی سے رہتے تھے اور کسی قسم کی بناوٹ اور دھوکا نام کو بھی نہیں تھا۔ بیماری وغیرہ تو لگی ہی رہتی تھی۔ نہ اتنی آبادی تھی اور نہ اتنے ڈاکٹر اور ہسپتال۔ مگر مغلوں کے زمانے میں بھی اور بعد میں انگریزی حکومت میں بھی ہسپتال اور دواخانے وغیرہ آبادی کے لحاظ سے بہت کم تھے۔ بیماری کی روک تھام کے لیے بھی کوئی خاص احتیاطیں اور تدبیریں بھی عمل میں نہیں لائی جاتی تھیں اور صفائی وغیرہ کی طرف بھی اتنا دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ لوگ انگریزی دوا کے مقابلے میں دیسی علاج کو ترجیح دیتے تھے۔ انسان کی اوسط زندگی پچاس، پچپن سال کے آس پاس ہی تھی۔ مغلوں کے زمانے کی ایک اور کہاوت تھی ــــــ چہار چیز است تحفۂ دلّی، کھانسی، زکام، بخار اور تلّی۔

قدیم دلّی میں گھریلو نسخوں اور احتیاطوں کے استعمال کی ایک اپنی ہی دل پذیر داستان ہے۔ بیشتر لوگ ڈاکٹری علاج سے گھبراتے تھے۔ پینے کی کڑوی دوا سے نفرت تھی۔ ہسپتال کا نام سنتے ہی ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ اگر علاج ضروری ہی ہوتا تو ویدوں اور حکیموں کی طرف رجوع کرتے۔ شروع کے دو تین دنوں میں تو گھریلو نسخے اور روایتی طریقے ہی استعمال

کیے جاتے۔ ملہٹی کے پان سے کھانسی، جو شاندہ پی کر زکام اور خوب کلاں پھانک کر اور شربت بنفشہ پی کر بخار کو بھگاتے تھے۔ حلق کا کوا لٹک جاتا تو اسے ٹھیک کرنے کے لیے، بچوّں کو اکڑوں بٹھا کر بائیں کلائی اور گلے کی نسوں کو پانی کی بھری کٹوریوں میں انگلیوں کو بھگو بھگو کر ملتی تھیں۔ نیم کی چھال گھس کر لگانے اور ملتانی مٹی مل کر بدن کی مروڑیاں (گھموریاں) ٹھیک کی جاتیں۔ جے پور کا بھرن (سفیدہ) گھر میں رکھا رہتا تھا۔ اسے ململ کے ٹکڑے سے چھان کر کانسے کے برتن پر پانی سے رگڑتے اور جب نیلا پن آجاتا تو آنکھوں میں آنج لیتے۔ کاجل میں ملا کر بھی لگا لیتے تھے۔ دکھتی آنکھیں ٹھیک ہو جاتی تھیں۔ پھوڑے پھنسیوں کے لیے مرہم جگہ جگہ مفت ملتے تھے، وہ لے آتے تھے۔ برسات کے موسم کی پھنسیوں کو نیم کی نمبولی کھا کر ٹھیک کر لیتے تھے۔

لوگ جھاڑ پھونک، ٹونے ٹوٹکوں اور تعویز گنڈے باندھ کر بھی دکھ دلدر دور کرنے کا جتن کرتے تھے۔ کالی سیاہی میں موٹے قلم کو ڈبو کر کنپٹیوں پر منتر یا عربی میں کچھ لکھ کر کن پھیڑ جھاڑی جاتی تھی۔ اندھا دھند اعتقاد کا زمانہ تھا۔ دانت کا درد دور کرنے کے لیے زمین میں کیل گاڑ کر کچھ پڑھتے تھے۔ زمین میں چاقو گاڑنے اور نیم کی ٹہنی کی ہوا دینے سے موسم کا بخار دور کیا جاتا تھا۔ ناف ٹلنے پر مریض کو لٹا کر پانی کا بھرا لوٹا پیٹ کی ٹونڈی پر رکھ دیا جاتا تھا۔ پیلیا کے مریض کے لیے ایک تھالی میں تیل ڈال کر اور گھاس سے چھوا کر جھاڑا پھونکی کرتے تھے۔ تیل کی رنگت زیادہ پیلی ہو جاتی تو سمجھا جاتا کہ مریض کی حالت سدھر رہی ہے۔ جس کسی کے کمر میں چک آجاتی یا نس پر نس چڑھ جاتی تو وہ کسی ایسے آدمی سے بدن پر لات چھُواتا جو الٹا (یعنی پیر کے بل) پیدا ہوا ہوتا۔ سانپ، بچھو کے کاٹے کے بھی منتر تھے۔ پیٹ کی صفائی کے لیے اور خون کی خرابی دور کرنے کے لیے ہلکا سا جلاب لے لیتے تھے۔ گندا خون نکالنے کے لیے سینگی والے گلی گلی، محلے محلے آوازیں لگاتے پھرتے تھے۔ جونک چمٹا کر گندا خون نکال دیتے تھے

ہر روز سویرے دانتوں کو کوئلے اور بادام کے چھلکوں کے باریک پسے ہوئے منجن سے صاف کرتے۔ آنکھوں میں سرمہ اور کاجل بڑے بھی ڈالتے اور چھوٹے بھی۔ بزرگوں

کو بہت سے دوہے بھی یاد تھے جن کو سنانے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ گھر والوں کے لیے کون کونسی چیزیں فائدے مند ہیں اور کونسی نقصان دہ۔ کچھ مخصوص دوہے یہ ہیں۔

ہڑ، بہیڑا آملہ، تینوں نون تینگ
دانت بجر سوم ہوت ہیں، ماجوپھل کے سنگ

ہڑ، بہیڑا آملہ، چوتھی ڈال گلو
پنچم جیرا ڈال کے نرمل کایا ہو

دودھ بیاری جو کرے نت اٹھ ہڑیں کھائے
موتی دتون جو کرے تو گھر بید نہ جائے

کنوار کریلا، چیت گڑ، بھادوں مولی کھائے
پیسہ خرچے گانٹھ کا، روگ بساہن جائے

ساون ساگ، نہ بھادوں دہی
کنوار کریلا، نہ کاتک ماہی

اگر جھاڑ پھونک سے دانت کا درد دور نہ ہوتا تو نیم کی پتیوں کو کڑوے تیل میں ڈال کر اور گرم کر کے روئی کی پھریری سے سنکائی کراتے۔ لونگ لے کر بھی دانتوں میں دبا لیتے اور اس کا عرق درد کو دور کر دیتا۔ چوٹ لگتی تو ہلدی چونا لگا دیتے۔ کان کے درد کے لیے کڑوے تیل میں لہسن کی گانٹھ ڈال کر گرم کرتے اور دو بوند کان میں ٹپکا دیتے۔ بھڑ کاٹ لیتی تو جھٹ پانی پی لیتے اور چونا لگا لیتے۔ پیٹ کے درد کے لیے ہینگ کا لیپ کرتے۔ آنکھ میں انجن ہاری نکل آتی تو چٹا گھس کر لگا دیتے۔ آنکھیں دُکھنے آتیں تو ملائی کی پوٹلیاں باندھ دیتے۔ کسی کو الٹی کرانی ہوتی تو تانبے کا پیسہ گھس کر پلا دیتے۔

پرانے زمانے میں خسرہ اور ہنسی کھیلنی کا زور بھی رہتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ماتا نکل آئی ہے۔ حفاظت کے لیے ستیلا ماتا کے مندروں میں دعائیں مانگی جاتیں۔ میا کے میلے لگتے۔ ایک میلہ جے سنگھ پورہ میں اور دوسرا بدھو ماتا کا میلہ محل دار باغ کے پاس لگتا تھا۔

ماتا کے میلے پر عورتیں چھوٹے چھوٹے مونجھ کے پنکھے اور پھل اور بیر چڑھاتی تھیں۔ گھروں میں بچے کے سرہانے نیم کی ٹہنی رکھ دی جاتی تھی اور دوسرے بچوں کو بیمار بچے کے قریب نہیں آنے دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صرف دو تھے، ڈاکٹر ہیم چندر سین اور ڈاکٹر سانیال۔ ڈاکٹر ہیم چندر سین ہر روز سویرے محلوں میں گھوم کر اپنے خاص خاص مریضوں کا حال پوچھتے تھے، اپنی ڈائری لکھ لیتے تھے اور ان کو مشورہ دیکر واپس فوّارے اپنی ڈسپنسری پر چلے جاتے تھے۔ حکیم اور وید کافی تعداد میں تھے۔ یہ دراصل خاندانی پیشہ تھا اور پرانے آزمودہ نسخوں اور حکیم یا وید کی قابلیتِ تشخیص پر چلتا تھا۔ حکیموں کے گھروں اور مکانوں پر مریض بڑی تعداد میں آتے تھے اور ان میں غریب اور امیر سب شامل تھے۔ کئی حکیم خود بھی جراّح تھے ورنہ تجربے کار جراّح بھی کافی تعداد میں تھے۔ دلی کے حکیموں کی شہرت دور و نزدیک تک پھیل چکی تھی اور سارے ہندوستان سے بلکہ بیرونی ممالک سے بھی مریض اپنے علاج کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ دلی میں شریف خانیوں کا خاندان بڑا مشہور تھا۔ اسی خاندان کے محمود خاں صاحب بہت نامی حکیم تھے۔ بلّی ماران میں آپ کے مکان پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ عورتوں کی ڈولیوں کا بھی تانتا لگا رہتا تھا۔ حکیم صاحب ماہر نباّض تھے۔ مریضہ ڈولی میں سے ہاتھ نکال دیتی اور حکیم صاحب نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیتے۔ ایک مرتبہ افغانستان کا ایک شہزادہ ان کے پاس علاج کے لیے آیا۔ اس کے پیٹ میں کینچوا اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کا جسم گھل گھل کر کانٹا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب شہزادے کو قطب صاحب کی امریوں میں لے گئے۔ وہاں جھولے میں بٹھا کر اسے بڑے بڑے جھونٹے دلوائے۔ حکیم صاحب اسے مسہل پہلے ہی دے چکے تھے۔ شہزادے کو دست شروع ہو گئے اور جتنے کیڑے پیٹ میں تھے سب نکل گئے۔ شہزادے کی نہ صرف بیماری ہی ٹھیک ہو گئی بلکہ اس کی صحت میں اتنا اضافہ ہوا کہ وہ ہٹا کٹا ہو کر افغانستان لوٹا۔

دلی میں یونانی حکمت کی روایت بڑی پرانی ہے۔ علی گیلانی، اکبر ارزانی، شفائی خاں، جگ جیون، علوی خاں، اکمل خاں، شریف خاں، احسان اللہ خاں، محمود خاں اور سکھا نند

مغلیہ عہد کے چند ممتاز حکیم اور جراح تھے۔ فرشتہ نے علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ۴۵ ایسے مشہور حکیموں، جراحوں اور امراضِ چشم کے ماہروں کا ذکر کیا ہے جو یا تو سرکاری دواخانوں میں ملازم تھے یا کسی نہ کسی صورت میں دربار سے وابستہ تھے۔ محمد بن تغلق اپنے جھک پنے اور بے وقوفانہ حد تک ضدی خصلت کے باوجود اپنے زمانے کا ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اس کی حکومت میں صرف دلی میں ہی تقریباً ستر ہسپتال اور بڑے دواخانے یونانی طب کے اور ایک ہزار سے زیادہ طبیب اور حکیم سرکاری ملازمت میں تھے۔ اس کے دربار کے حکیم ضیا محمد مسعود نے دو جلدوں میں فارسی میں ایک مسودہ تیار کیا تھا جس میں مختلف بیماریوں کی تفصیلات، ان کا علاج، طاقتِ مردمی، مستورات کے لیے افزائشِ حسن کے طریقے، اولادِ نرینہ کے حصول کی ترکیبیں، مانعِ حمل کے طریقے، اور گھوڑوں کی بیماریوں اور ان کے علاج کے طریقے بھی دئے گئے تھے۔ یہ مسودہ اب ناپید ہے۔ فیروز شاہ تغلق خود علمِ طب کا ماہر تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے جو اہلکار اور ساتھی شکار کی مہموں میں زخمی ہو جاتے تھے، ان کی مرہم پٹی وہ خود کر دیتا تھا۔ وہ امراضِ چشم میں خاص دل چسپی لیتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے مارِ سیاہ کی کھال کو جلا کر اور اس میں کچھ دوسری ادویا ملا کر ایک سرمہ تیار کیا جس کا نام کحلِ فیروز شاہی تھا۔ یہ سرمہ آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے لیے اکسیر کا کام کرتا تھا۔

سکندر لودھی کے عہد میں میاں بھووا اس کا سب سے بڑا منصب دار تھا جسے حکمت میں غیر معمولی دل چسپی تھی۔ اس نے طب کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "معدن الشفا سکندر شاہی" تھا۔ میاں بھووا کی علاج معالجے میں دل چسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ تمام عمر مطالعے میں غرق رہا۔ گہرے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یونانی طریقۂ علاج ہندوستانیوں کے لیے زیادہ موزوں نہیں تھا کیونکہ ہندوستان کی آب و ہوا بہت مختلف تھی اور ہندوستانی ان دواؤں کے نام سے جو فارسی یا یونانی میں تھے، واقف نہ تھے۔ اس لیے اس نے سلطان سے درخواست کی کہ اسے آیورویدک طریقۂ علاج اور دواؤں پر فارسی میں ایک کتاب لکھنے کی اجازت دی جائے۔ یہ ایک قابلِ تحسین کوشش تھی۔

مغلوں کے عہد میں یونانی حکمت کو پھر فروغ ملا۔ بابر کے ساتھ ہی سمرقند اور کابل کے کچھ مشہور حکیم دہلی چلے آئے تھے۔ دہلی میں پہلے ہی سے یونانی طبیبوں کا زور تھا۔ بابر کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خود حکمت میں دل چسپی لیتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں یونانی حکمت اور طریقۂ علاج ہندوستان کے بیشتر حصوں میں پھیل گیا۔ بہت سے حکیم اور عالم ایران اور دوسرے وسط ایشیا ممالک سے اکبر کے دربار میں آ گئے۔ ابوالفضل نے ۲۹ ایسے مشہور حکیموں کا ذکر کیا ہے جنھیں دربارِ اکبری سے تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں۔

حکیم الملک، حکیم مصری، مُلّا میر، حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم زُمبل بیگ، حکیم علی گیلانی، حکیم حسن گیلانی، حکیم آرِستو، حکیم فتح اللہ شیرازی، حکیم مسیح الملک، حکیم جلال الدین مظفّر، حکیم لطف اللہ، حکیم سیف الملک لانگ، حکیم ہمام، حکیم عین الملک، حکیم شفائی، حکیم نعمت اللہ، حکیم داوائی، حکیم طالب علی، حکیم عبدالرحیم، حکیم روح اللہ، حکیم فخرالدین علی، حکیم استحاق، شیخ حسن پانی پتی، شیخ بینا، مہادیو، بھیم ناتھ، ناراتن اور شواجی۔

مشہور یونانی طبیبوں کے ساتھ بہت سے وید بھی مشقِ طب میں لگے ہوئے تھے اور بڑے مشہور تھے، مثلاً بھیرن، برجو اور چندرسین۔ اس زمانے میں فوجی مہموں پر حکیم اور وید بھی جاتے تھے۔ اس کے علاوہ شہزادے اور شہزادیوں کے اپنے ذاتی حکیم بھی تھے۔ شاہجہاں نے عوام کے لیے جہاں تک طبّی امداد کا تعلق ہے، پورے جوش و خروش اور فراخ دلی سے ایک عظیم کام کیا۔ اس کی سلطنت کے طول و عرض میں جگہ جگہ ہسپتال اور دوا خانے قائم کیے گئے۔ دلی میں جامع مسجد کے شمالی اور جنوبی کونوں میں دو بڑے ہسپتال قائم کیے گئے (دارالشفا) جن میں ممتاز حکیم ملازم تھے۔ ان ہسپتالوں میں مریضوں کو بغیر کسی تفریق اور امتیاز کے دوائیں مفت دی جاتی تھیں۔ شاہجہانی دربار کا مشہور ترین حکیم مسیح الزماں حکیم نورالدین محمد عبداللہ تھا جس کی فارسی کی تصنیف "طبِ داراشکوہی"

ایک شاہکار تھی۔ شروع شروع میں غلطی سے اس کتاب کو دارا شکوہ کی تصنیف سمجھا گیا۔ اس زمانے کی علم طب کی ایک اور مشہور کتاب "گنج باداورد" تھی۔ اس کے مصنف حکیم امان اللہ خاں تھے اور یہ کتاب طب کے موضوع پر ایک اہم دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ اس میں طبی درس و تدریس، یونانی اور آیورویدک علاج کے طریقوں کی تفصیلات اور مشہور یونانی حکیموں اور ویدوں کے تجربوں کا نچوڑ اور ان کے آزمودہ مجربات بھی شامل ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۰۵ عربی، فارسی اور سنسکرت کی مستند اور قدیم کتابوں کے مطالعے کے بعد اس نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں انسانوں اور جانوروں کی چند ایسی بیماریوں کا بھی ذکر ہے جن کا علاج جسم میں سے فالتو خون نکال کر کیا جاتا تھا۔

شاہجہاں کے زمانے کا ایک اور واقعہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مصنّف جسے طبابت میں دلچسپی تھی ایک دفعہ شکار کے لیے جنگل میں گیا۔ وہ تھک کر اپنے خیمے کے باہر بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک طرف سے ایک بچھو آرہا تھا اور اس نے ایک گرگٹ کو جو سامنے سے آرہا تھا کاٹ لیا۔ بچھو کا ڈنک لگتے ہی گرگٹ تڑپ گیا اور اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا اور اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے ایک جھاڑی پر لے گیا اور اس کے کچھ پتے اس نے کھا لیے۔ جب پتوں کو کھانے کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا تو وہ واپس آیا اور اس نے بچھو پر حملہ کر دیا۔ مگر بچھو نے پھر کاٹ لیا اور گرگٹ درد سے تڑپتا ہوا اُسی جھاڑی پر پہنچا اور اس کے پتے پھر چبانے لگا۔ ٹھیک ہو کر وہ پھر لوٹا اور ایک مرتبہ اور بچھو پر ٹوٹ پڑا۔ اس طرح سے وہ چار بار بچھو سے الجھا اور اپنی آخری کوشش میں اس نے بچھو کو مار ڈالا۔ تحقیق کرنے پر مصنف کو پتہ لگا کہ جس بُوٹی کے پتوں کو گرگٹ نے چبایا تھا اسے چرچرا یا چرچٹا کہتے ہیں اور اس میں زہر مارنے کی خاصیت تھی۔ زیادہ تفتیش کے بعد وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ بچھو کے کاٹے کے پُراثر علاج کے لیے اس جھاڑی کے پتّے اور جڑیں اکسیر تھیں۔

مغلوں کے زمانے میں بہت سے یوروپین سیر و سیاحت کے لیے ہندوستان آتے

تھے۔ ایسا ہی ایک سیاح منوچی تھا۔ یہ آدمی خود آموختہ ڈاکٹر تھا اور اس نے کافی عرصہ ہندوستان میں گزارا اور بڑے دلچسپ بیان چھوڑے ہیں۔ ایک قصّہ ایک نہایت زہریلے کیڑے کے بارے میں ہے جو اکبر کو جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے نظر آیا تھا۔ اکبر نے اپنے ایک اہلکار کو حکم دیا کہ اسے پکڑ لیا جائے اور اس کا زہر اکٹھا کیا جائے۔ جب اکبر اپنے کسی درباری یا امیر کے خلاف ہو جاتا تھا تو اسے ایک خلعت بھیج دیتا تھا جس کے کفوں اور کالروں پر وہ زہر لگا دیا جاتا تھا اور وہ اسے پہنتے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک قصّہ شاہجہاں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مخالفوں اور قصورواروں کو زہریلے سانپوں سے کٹوا کر موت کی نیند سلا دیتا تھا۔

یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بغداد میں خلافت کی صورت میں مسلم دربار قائم ہوا تو وہاں تمام معالج ہندو وید تھے' یا عیسائی اور یہودی۔ ایک بھی مسلمان حکیم دربار میں نہیں تھا۔ ہارون الرشید کی ایک بیماری کے موقعے پر ایک ہندو وید کو جس کا نام مانک تھا بغداد میں بسایا گیا تھا اور وہاں اسے ایک بڑے ہسپتال کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ عرب مصنفوں نے چھ اور ایسے ہندوستانی معالجوں کا ذکر کیا ہے جو اس وقت بغداد میں تھے۔

اس کے تقریباً ایک صدی بعد کی بات ہے کہ ابنِ سینا نے طب پر اپنی بے نظیر کتاب "القانون" پیش کی۔ لیکن جب مشرق میں مسلم سماج کا شیرازہ بکھرنے لگا تو یونانی طب کی مشق کرنے والے حکیم صرف ہندوستان میں رہ گئے۔ البتہ آیورویدک طریقۂ علاج ہندوستان کے باہر بھی نیپال' ملیشیا' برما' لنکا اور انڈونیشیا وغیرہ میں جاری رہا۔ ہندوستان میں یونانی طب کے حکیموں نے خاص طور پر بارھویں صدی میں "القانون" پر بڑا عمل کیا۔ علمِ طب پر راجہ ٹوڈرمل کی تصنیف "ٹوڈر آنند" چرک اور ششارو پر مبنی ہے۔

آیوروید کا مشرقی مسلم ممالک پر اتنا اثر پڑا کہ سترھویں صدی میں بغداد میں بہت سی آیورویدک کتابوں کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ اس بات کی بڑی شہادت ملتی ہے کہ یونانی اور آیورویدک علم طب نے ایک دوسرے سے بڑا استفادہ کیا۔ ہندوستان میں ابنِ سینا کے طبّی

اصولوں پر یونانی حکیموں نے ہی نہیں بلکہ بہت سے ویدوں نے بھی عمل کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان اصولوں میں ہندوستان کے مخصوص حالات اور ماحول کے پیش نظر ان میں خاطرخواہ اضافہ اور تبدیلی بھی کی گئی۔ پروفیسر نورالحسن نے حال ہی میں یہ رائے ظاہر کی تھی ––– "ابن سینا کبھی ہندوستان نہیں آئے لیکن وہ اپنے خیالات اور تحریروں سے ہمارے ساتھ رہے ہیں میں ایسا کہنے کی جسارت کروں گا۔"

ایک مشہور اور قابل حکیم عموماً ایک ماہر نباض ہوتا ہے۔ ایسی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں جن میں حکیموں کو مرض کی تشخیص بغیر مریض کے کچھ بولے یا کچھ دریافت کیے کرتے بتایا ہے۔ بہت سی پردہ نشین عورتیں اپنی کلائی بھی حکیم کے ہاتھ میں پکڑانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ایسی عورتیں اپنی کلائی میں ایک موٹا دھاگا باندھ کر اس کا سرا حکیم کی طرف بڑھا دیتی تھیں اور وہ اسی سرے کو ہی تھام کر نبض دیکھ لیتا تھا اور مرض کی تشخیص کر کے نسخہ لکھ دیتا تھا۔ بلاشبہ ان کہانیوں میں مبالغہ آمیزی بہت ہے مثلاً یہ کہ ایک مشہور حکیم کو آزمانے کے لیے لوگوں نے ایک بلّی کے پنجے میں دھاگا باندھ دیا اور حکیم کو بلوا کر اور اسے یہ کہہ کر کہ اندر کے کمرے میں ایک پردہ نشین خاتون کی طبیعت بڑی خراب ہے اس کے ہاتھ میں دھاگا تھما دیا۔ حکیم نے دھاگا پکڑ لیا اور مریضہ کی نبض سے مرض کی تشخیص کرنے لگا۔ حکیم اتنا ماہر تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ اندر کوئی خاتون مریضہ نہیں ہے بلکہ بلی کے پنجے میں دھاگا باندھا ہوا ہے۔ اس نے اپنے نسخے میں مریضہ کے لیے گوشت کے چھیچھڑے تجویز کر دیئے جنھیں بلیوں اور کتوں کو کھلایا جاتا تھا!

اس وقت کے زیادہ تر حکیم مریضوں سے جو ان کے مطب میں آتے تھے یا ان سے بھی جو ان کے گھر پر آتے تھے کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ لیکن امیر اور خوش حال مریضوں سے وہ تحائف قبول کر لیتے تھے۔ جنھیں نذرانوں اور شکرانوں سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس دور میں حکیم بہت زیادہ معروف بھی نہیں ہوتے تھے اور تحقیق اور تصنیف کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ وہ خود بھی بہت سی نئی دوائیں ایجاد کر لیتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ دلّی کی فتح کے بعد نادر شاہ کو اتنی پر تکلف ضیافتیں دی گئیں کہ

اس کا پیٹ خراب ہو گیا اور وہ اس میں ایک بھاری پن محسوس کرنے لگا۔ حکیم علوی خاں کو جو شاہی حکیم تھے بلایا گیا۔ وہ اپنی دواؤں کے ساتھ آئے اور سونے اور چاندی کے پلڑوں والی اپنی دواؤں کی ترازو بھی لے آئے۔ صحیح خوراک کو ناپنے کے بعد اور حکیم صاحبؒ کے مزید عمل کے بعد جب جڑاؤ ڈھکنے کو اٹھایا گیا تو نادر شاہ نے سونے کی ایک طشتری دیکھی جس پر ایک پیالہ اور ایک قیمتی پتھر کا چمچہ رکھا ہوا تھا۔ اس پیالے میں گُل قند تھا جو گلاب کی پتیوں، ان میں سے نکلے ہوئے رس اور شیرینی کا مرکب تھا۔ نادر شاہ کو اس کی شکل، خوشبو اور حکیم صاحب کی دل پذیر مسکراہٹ اتنی اچھی لگی کہ اس نے حکیم صاحب کے اشارے کے بغیر اس چمچے میں تھوڑا سا گل قند لیا اور کھا گیا۔ اس کا ذائقہ اسے اتنا پسند آیا کہ وہ یہ کہتے ہوئے کہ یہ نہایت لذیذ حلوا ہے سارا کا سارا گُل قند کھا گیا۔

نادر شاہ نے ان حکیم صاحب کو اور بھی کئی طریقوں سے آزمایا اور آخر میں ان سے اتنا متاثر ہوا کہ انھیں اپنے ساتھ ہی اپنے ملک لے گیا!۔

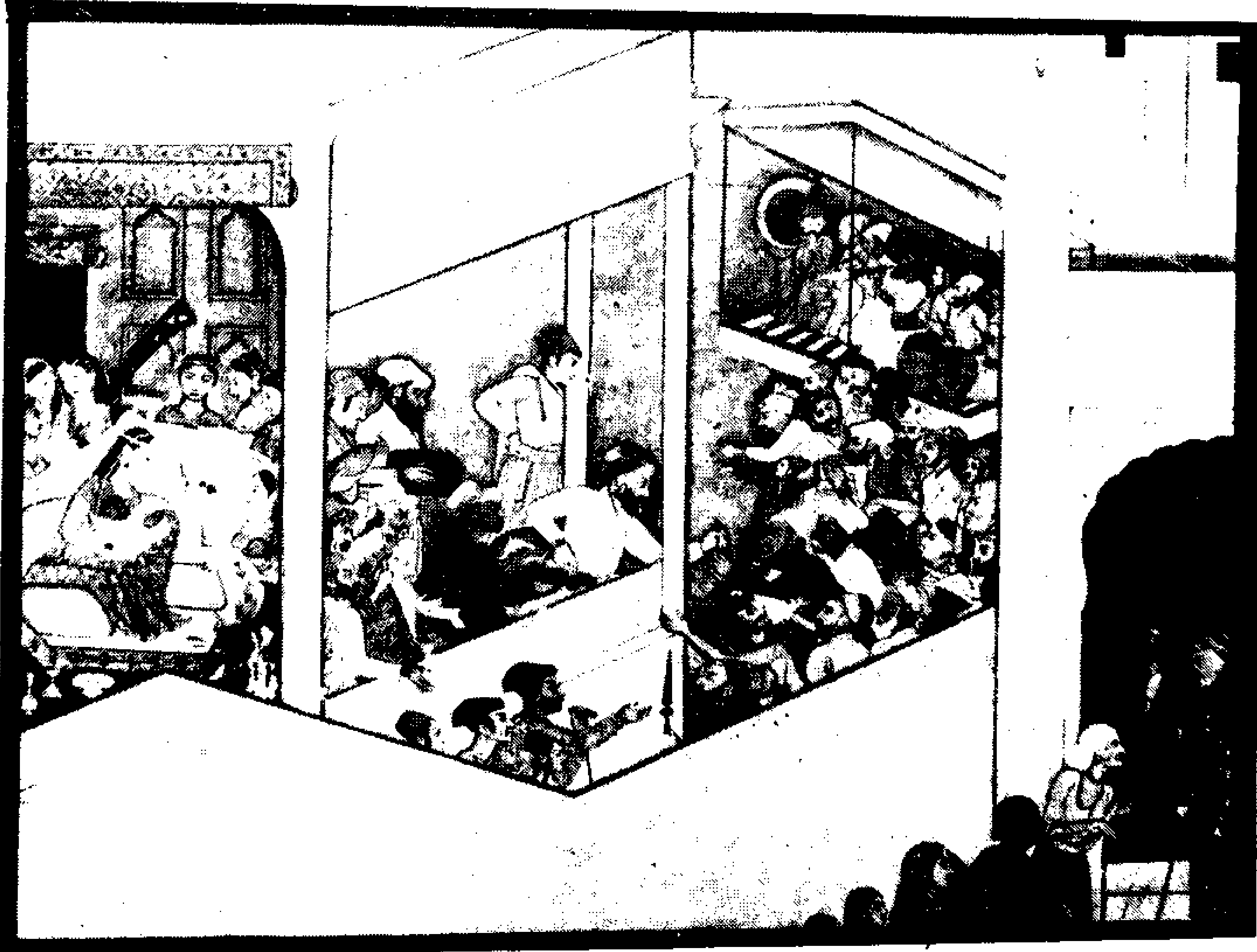
حکیم اجمل خاں کا شمار دلی کے بہترین طبیبوں میں ہمیشہ رہے گا۔ ان کی یاد ابھی دلوں سے محو نہیں ہوئی۔ بڑے سنجیدہ اور متین انسان تھے اور ساتھ ہی ایک باغ و بہار ہستی بھی تھے۔ سینے میں ایک ہمدرد دل رکھتے تھے اور اپنی قوم اور عوام کے لیے انھوں نے بڑا کام کیا۔ طب میں ان کی دسترس اور کمال کا جواب نہیں تھا۔ قرول باغ کی اجمل خاں روڈ اور طبیہ کالج ان کی یاد دلی والوں کے دلوں میں ہمیشہ قائم رکھیں گے۔ وہ جب لندن گئے تو ایک ہسپتال کو دیکھنے بھی گئے۔ انھوں نے آپریشن کی میز پر ایک مریض کو دیکھا۔ اس کے بارے میں یہ شک تھا کہ اس کے پیٹ میں کوئی زخم یا پھوڑا تھا اور ہسپتال کے ڈاکٹر اس کی تفتیش کر رہے تھے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے مریض کی نبض دیکھی اور اعلان کر دیا کہ اس کے پیٹ میں مچھلی کی ہڈیاں تھیں جنھیں ایک ہندوستانی بوٹی کے استعمال سے نکالا جا سکتا تھا۔ مگر ہسپتال کے سرجن نے اتفاق نہیں کیا مگر جب مریض کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا تو انگریز سرجن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پیٹ میں واقعی

مچھلی کے کانٹے تھے۔ ان کو نکلنے کے بعد مریض کو فائدہ حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا سے ہی ہوا۔

پرانے وقت میں بادشاہ، نواب اور راجے مہاراجے عیاشی میں بہت مبتلا رہتے تھے اور ان کے حرم میں بھی بہت زیادہ عورتیں ہوتی تھیں۔ اپنے جنسی مقصد کے حصول اور اپنی طاقت اور جوانی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ کشتے، طلے اور بھسموں کا استعمال کرتے تھے۔ کشتے اور طلے یونانی نسخوں پر تیار کیے جاتے تھے اور بھسم آیورویدک طریقوں سے تیار ہوتے تھے۔ کشتوں اور بھسموں کی پیدا کردہ حدت اور طاقت بے مثال ہوتی تھی اور راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے ستر بہتر سال کی عمر میں بھی اولاد ہو جاتی تھی۔ کشتوں اور بھسموں کی خوراک بہت ہی کم ہوتی تھی اور سونے چاندی اور جواہرات کے کشتے اور بھسم کی خوراک تو وزن میں صرف دو تین چاول کے دانوں کے برابر ہی ہوتی تھی۔ جاڑوں میں کشتے استعمال کرنے والے شاہی افراد، نواب اور امرا ململ کے کرتوں میں رہتے تھے اور کسی کسی روز تو ٹھنڈ میں بھی ان کے چہرے پر پسینہ پھوٹ آتا تھا۔ کشتوں کا اثر فوری ہوتا تھا اور دیر تک قائم رہتا تھا۔ انھیں حکیم ذاتی دیکھ ریکھ میں تیار کراتے تھے اور چونکہ ان میں نادر اشیا اور قیمتی دھاتیں پڑتی تھیں اور تیاری کا طریقہ مشکل اور محنت طلب تھا، ان کی قیمت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ امیر اور صاحب مرتبہ لوگوں کو یہ درکار ہوتے تھے، ان کی قیمت ضرورت سے کہیں زیادہ رکھی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آخری مغل بادشاہ نے بڑھاپے میں بھی اپنی جوان صورت اور جسمانی قوت کے لیے کشتوں اور طلاؤں کو ہی ذمے دار ٹھہرایا تھا۔ بعض شوقین امیر حکیم کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشتوں کی خوراک میں خود ہی اضافہ کر لیتے تھے۔ ایک مہاراجہ کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے کشتوں کا استعمال اس قدر کیا کہ اس کی جنسی خواہش ناقابلِ ضبط ہو گئی اور خود اس کے لیے پریشانی کا سبب ہو گئی۔ انھوں نے دلی کے ایک مشہور حکیم کو جن کے بنائے ہوئے کشتے وہ استعمال کرتے تھے بذریعہ تار بلوایا اور تار میں کھلے الفاظ میں اپنی کیفیت کی اطلاع دیدی۔ مہاراجہ کی یہ بات ساری دلی میں اور ان کی

ریاست میں پھیل گئی اور اگرچہ دلی کے حکیم نے ان کے ابلتے ہوئے جذبات کو قابو کر لیا مگر بہت عرصے تک مہاراجہ اپنے احباب اور دیگر لوگوں میں طعن و تشنیع اور مذاق کا نشانہ بنے رہے۔

حکیموں اور ویدوں کا وہ دَور اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ یہ لوگ فن کے تو ماہر تھے ہی مگر شرافت، بردباری اور رواداری کے بھی پیکر تھے۔ بہت سے حکیم اعلیٰ شاعر بھی تھے۔ یوں تو دلی میں اب بھی بہت سے حکیم اور وید ہیں اور ہمدرد دواخانے جیسے عظیم طبی ادارے ابھی موجود ہیں اور تحقیق کا کام بھی سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ہو رہا ہے مگر لوگوں کا رجحان اب جدید ایلوپیتھی ڈاکٹری کی طرف ہے اور دیکھنا صرف یہ ہے کہ طب کے ہمارے قدیم ادارے اس طوفان میں کب تک قائم رہ سکیں گے۔



بچے کی پیدائش

مشترکہ ریت رواج

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ میل جول سے صدیوں تک رہے ہیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر مشترکہ ریت رواجوں کی تشکیل اور ایک ملی جلی تہذیب کی تعمیر ناگزیر تھی۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان کی اسلامی رسوم صرف بنیادی یا زیادہ اہم معاملوں تک محدود تھیں جیسے نکاح، پیدائش اور تجہیز و تکفین۔ ڈھیر ساری دوسری رسمیں اسی سماج نے انہیں دیں جس میں انھیں ہمیشہ کے لیے رہنا تھا۔ مسلمانوں نے ان تمام رسموں کو بڑی مسرت اور فراخدلی سے اپنا لیا۔ منشی سید احمد صاحب اپنی کتاب "رسوم دہلی" میں لکھتے ہیں: "مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر رسمیں مروج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندوانی رسمیں ہیں جن میں سے بہت سی رسمیں تو جوں کی توں موجود ہیں۔ بعض کے نام تو وہی ہیں مگر طریقے بدل گئے ہیں۔ بعض میں برائے نام فرق کر دیا گیا ہے، بعض کو مذہبی امور میں بہ تغیر نام شامل کر لیا ہے۔" سید احمد صاحب نے آگے چل کر یہ بھی کہا ہے۔" اگرچہ علمائے مذہب نے ان رسموں کو اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مگر چونکہ گھر کے اندر کی اور گھٹ میں پڑی دوا اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی، کچھ بھی پیش رفت نہ گئی۔ گو خاص لوگوں میں کسی قدر کمی ہو گئی اور یہ خاص خاص اصحاب ان رسموں یعنی گھر کے اندرونی بھیدوں کو پابندِ شرع ہو کر بخوف خجالت اس قدر چھپانے لگے گویا باتیں بالکل بے اصول اور لغو ہیں۔"

جس صورتِ حال کی طرف منشی سید احمد صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ بھی تاریخی اور سماجی اعتبار سے عبوری تھی۔ جب دو تہذیبی دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہوں تو ایک ایسے اشتراک کا ابھر کر آنا لازمی ہے جس میں دونوں تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک مخلوط معاشرے اور سماج کی تعمیر کریں۔ کچھ اہم رسموں کا مطالعہ اس کی مزید وضاحت کر دے گا۔

بیاہ شادی کی رسمیں

ہر رسم کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک مذہبی اور دوسرا سماجی۔ مذہبی پہلو میں تو صدیوں تک کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، لیکن سماجی پہلو یکساں نہیں رہتا۔ کسی بھی تقریب میں جتنی شان و شوکت کا اظہار کیا جائے، اتنی ہی صاحبِ خانہ کی حیثیت اور ثروت تسلیم کی جاتی ہے۔ قدیم دنوں میں رشتے داروں کا گھر کے سب لوگوں کے ساتھ شادی بیاہ میں شامل ہونا لازمی تھا۔ رشتے دار ہفتوں پہلے پہنچ جاتے اور مہمانوں کی خاطر تواضع پر بہت خرچ آتا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں میں تقریباتِ شادی کی سادگی پر بڑا زور دیا گیا ہے مگر مسلمانوں نے بہت سے ہندو رواجوں کو اپنا کر شادی بیاہ کے موقعوں پر خوب دل کھول کر خرچ کرنا شروع کر دیا تھا۔

شاہجہاں کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے اپنے بیٹے دارا شکوہ کی شادی میں ۳۲ لاکھ روپے خرچ کیے تھے جس میں سے ۱۶ لاکھ روپے اس کی لڑکی جہاں آرا نے دئے تھے۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے فرخ سیر کی ایک راجپوت شہزادی سے شادی کی تفصیلات اور اس پر بے شمار دولت کے خرچ کیے جانے کا بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ جہاں راجہ اجیت سنگھ نے بے شمار قیمتی تحائف اور جہیز کی اشیا دیں، وہاں سیّد برادران نے جنھیں بادشاہ گر کہا جاتا تھا شہزادے کی طرف سے انتظامات میں کثیر رقمیں خرچ کی تھیں۔ رُتب الملک عبداللہ خاں نے اس موقعے پر پچاس لاکھ روپے کی قیمت کا ایک ہار پیش کیا تھا اور اس کے بھائی امیرالامرا حسین علی خاں نے بیس ہزار روپے نقد اور تیس ہزار روپے کی قیمت کا ہیرے جواہرات جڑا

ایک خنجر دیا تھا۔ اسی طرح دوسرے امیروں، نوابوں اور راجاؤں نے بیش قیمت تحفے دئے تھے۔ تورانی امیروں میں نواب روشن الدولہ سب سے سبقت لے گئے اور انھوں نے اپنی لڑکی کی شادی پر ساٹھ لاکھ روپے خرچ کیے۔ احمد شاہ کے وزیر صفدر جنگ نے اپنے بیٹے شجاع الدولہ کی شادی پر بھی بے تحاشہ روپیہ خرچ کیا۔

میر تقی میر کے مطابق، جو چاندنی چوک کے راجہ جگل کشور کے استاد تھے، راجہ صاحب نے اپنے بیٹے نند کشور کی شادی میں چالیس لاکھ روپے خرچ کیے تھے۔ اس موقعے پر کئی ہفتوں تک دلی والوں کی ضیافتیں ہوتی رہیں۔ راجہ جگل کشور نے اتنا خرچ کیا کہ پاس کوڑی بھی نہیں رہی۔ بیاہ کے بعد میر صاحب کو کچھ روپیوں کی ضرورت پڑی تو وہ راجہ جگل کشور کے پاس پہنچے۔ راجہ نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا — "میرے پاس تو کندھوں پر پڑی یہ شال رہ گئی ہے۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

دولہا اور دلہن کا انتخاب بڑی سوچ سمجھ کے بعد کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے جانچ پرکھ کے دو بنیادی اصول تھے۔ پہلے تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ خاندان برابر کا ہے یا نہیں۔ پھر مناسب جہیز کی بات بھی دیکھی جاتی تھی۔ جہیز ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں لیا دیا جاتا تھا۔ کئی دفعہ برابر کا گھر نہ ملنے کے سبب لڑکیاں کنواری بیٹھی رہتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسی وجہ سے مغل شہزادیوں جہاں آرا اور روشن آرا کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں اگر ماں باپ میں جہیز دینے کی استطاعت نہیں ہوتی تھی تو غریب طبقے کی لڑکیاں بھی بن بیاہے رہ جاتی تھیں یا والدین اتنا قرض اٹھا لیتے تھے کہ شادی کے بعد برسوں تک حالت نہیں سدھرتی تھی۔

اس زمانے میں ہندوؤں میں لڑکے اور لڑکی کی کم عمر میں ہی شادی کر دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں نے بھی اس کو اپنا لیا۔ شادیاں سب بات چیت سے طے ہوتی تھیں اور مسلمانوں میں مشاطہ اور ہندوؤں میں نائن ہی رشتے طے کرا دیتی تھی۔ محبت کی شادی کا تصور بھی نہیں تھا۔ عام طور پر دولہا اور دلہن شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھتے بھی نہیں تھے۔ مسلمانوں میں یہ دستور تھا کہ لڑکی کو مشاطہ اور اس گھرانے کی عورتوں سے جہاں سے بات آئی ہوئی تھی بہت چھپایا جاتا تھا۔ لڑکے والے بھیس بدل کر عورتوں کو بھیجتے تھے تاکہ

کسی نہ کسی طرح لڑکی کی صورت دیکھ آئیں۔ کوئی عورت عطر یا تیل بیچنے کے بہانے سے جاتی تھی اور کوئی گوٹہ کناری یا چھالیہ زردہ فروخت کرنے جاتی اور لڑکی پر نظر ڈال کر اور گھر کا حال دیکھ کر چلی آتی۔ ہندوؤں کے گھروں میں نائن بھی یہی کام کرتی کیونکہ لڑکی کو دیکھنے دکھانے کا رواج ہندوؤں میں بھی نہیں تھا۔ جوان بیٹے اور بیٹی سے بھی رائے نہیں لی جاتی تھی اور وہ بھی اپنے منہ سے اقرار یا انکار کرنا شرم و حیا کے خلاف سمجھتے تھے۔

منگنی۔۔۔ یہ رسم ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تھی۔ دولہا کے ہاں سے پندمرد اور قریبی رشتے کی عورتیں دلہن کے گھر مٹھائی کے خوان اور چڑھاوا لے کر جاتی ہیں۔ ہندوؤں میں اسے گود بھرائی بھی کہتے ہیں۔ مٹھائی میں بالوشاہی اور مصری کے نو یا گیارہ کوزے ہوتے تھے۔ پھولوں کا گہنا ہوتا تھا اور ایک کارچوبی بٹوہ رومال میں بندھا ہوا دلہن کے ہاتھ میں دینے کے لیے ہوتا تھا۔ دلہن والیاں ہر ایک سمدھن کے ماتھے پر انگلی سے صندل لگاتیں اور ایک ایک کر کے سب کے گلے میں ہار ڈالتیں۔ دلہن کو بیچ صدر میں قبلہ رو بٹھلاتے اور رسمیں شروع ہو جاتیں۔ دلہن سرخ جوڑا پہنے ہوتی تھی۔ بڑا سا گھونگٹ نکلا ہوتا۔ دلہن کو پھولوں کا گہنا اور سونے کی انگوٹھی اور چاندی کا چھلا پہنایا جاتا اور کارچوبی بٹوہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا۔ پھر سب لڑکی کو روپے پیسے دیکر "روپ درشن" کرتیں جو ہندوؤں کی منھ دکھائی ہے۔ سب رسمیں کر لی جاتیں تو مبارک سلامت کی دھوم مچ جاتی۔ منگنی کے بعد ہر تیج تہوار کو لینے دینے کی رسمیں کرنے لگتے۔

مائیوں بٹھانا۔۔۔ دلہن اور دولہا کو اپنے گھر میں ہندوؤں کی طرح مائیوں بٹھایا جاتا تھا۔ بیاہ سے سات یا گیارہ دن پہلے لڑکی کو مائیوں بٹھا دیتے۔ اس کے کپڑے زرد رنگے جاتے اور اس کے کھانے کے لیے پینڈیاں بنائی جاتی تھیں۔ اس کے ہر روز ابٹن ملا جاتا تھا اور لڑکی "مانجھے" پر بیٹھی رہتی۔ اُدھر دولہے کو بھی مائیوں بٹھایا جاتا۔ دونوں کے گھر میں ہم عمر لڑکی بالیاں اور جان جوان عورتیں سہاگ گھوڑیاں گاتیں۔ ایک سہاگ گھوڑی اس طرح تھی:۔

کھائے نہ جانے پینڈیاں، لاڈو میری باندھے نہ جانے بند

سیانی ہونے دو
باوا نے کس دیا ڈولا، اماں بیوی جانے نہ دے
سیانی ہونے دو
چچا نے کس دیا ڈولا، چچی بیوی جانے نہ دے
سیانی ہونے دو
بھائی نے کس دیا ڈولا، بھابو بیوی جانے نہ دے
سیانی ہونے دو

اسی طرح سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں "ساچق" اور رسم حنا بندی بھی مشترک ہیں اگرچہ تفصیلات میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں میں یہ بری اور مہندی کہلاتی ہیں۔ چڑھاوے کے بعد ڈومنیاں شادیانے گاتیں۔ پھر "سیٹھنیں" یعنی گالیاں شروع ہو جاتیں۔ یہ گالیاں اکثر ذو معنی فقرے ہوتے تھے جن کے ایک پہلو سے تہذیب اور دوسرے سے بدتہذیبی ظاہر ہوتی تھی۔

سمدھی میرے گھر آیا، ڈالوں واکے گلے موتیوں کا ہروا
سات سکھیوں میں ایسا لاگے جیسے بسنت کا گڑوا
جیسے ہولی کا بھڑوا

<u>بارات</u>۔ بارات مسلمانوں میں بالکل اسی طرح اور ویسے ہی دھوم دھڑکے اور باجے گاجے سے جاتی تھی، جیسے ہندوؤں میں۔ سوائے نکاح کے جو خالص شرعی رسم ہوتی، چھوٹی موٹی رسمیں سب ایک سی ہی ہوتیں۔ سہرا پہننے، گھوڑی پر چڑھنے اور بارات کے استقبال پر شاعروں کا سہرا پڑھنا بھی یکساں ہی تھا۔ سہرے کو شاعروں یا طوائفوں سے پڑھوانے کا رواج البتہ درباری تھا اور ہندوؤں نے اسے اپنا لیا تھا۔ ذوق اور غالب کے سہرے مشہور تھے جو انھوں نے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر کہے تھے۔ اس قسم کے سہرے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا — چاند کے دائرے پر زہرہ نے گایا سہرا

جسے کہتے ہیں خوش اس نے بلائیں لے کر
کبھی چوما، کبھی آنکھوں سے لگایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں الجھ کر لڑیاں
باندھنے کو جو تیرے سر پر اٹھایا سہرا
صاف آتی ہیں نظر آبِ گہر کی لہریں
جنبشِ بادِ سحر نے جو ہلایا سہرا

سہرے کے بعد عموماً مبارک باد گائی جاتی۔

دھوم شادی کی دھواں دھار مبارک ہووے
پیاری دلہن کو یہ دلدار مبارک ہووے
طوطیاں گاویں چہک کر تری محفل میں بنے
سہرا پھولوں کا زری دار مبارک ہووے

مبارکباد کے بعد ریت رسم کے واسطے دولہا کو اندر بلایا جاتا ہے۔ ایسا ہی ہندوؤں میں ہوتا ہے۔ دولہا کی بہنیں دولہا کے سر پر آنچل ڈال کر اندر لے جاتی ہیں۔ ڈومنیاں دولہا کو دیکھتے ہی ڈھولک پر یہ گیت گانے لگتی ہیں۔

بنا بنی کے لیے شبھ گھڑی آیاری بنا
نت گھڑی آیاری بنا
سیجیں مخمل کی بچھیں تکیے مشجر کے لگے
نور کے تنبو تلے لاکے بٹھایاری بنا
بنا بنڑی کے لیے سبھ گھڑی آیاری بنا

دولہا کے ساتھ سالیوں اور بھابیوں کی چھیڑ چھاڑ اور اس کے راستے میں مشکلیں ڈالنا مثلاً دولہا کا گائے بن کر دلہن کے ہاتھ پر رکھے کالے تل اور کھانڈ چاٹنا، دولہا سے مروج پسوانا، "نو باتیں" چنوانا اور اس سے سات سلام کہلوانا وغیرہ بھی بنیادی طور پر ہندوانی رسمیں ہیں جن کی صرف نوعیت کہیں کہیں بدل گئی ہے۔

جہیز ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں دیا جاتا تھا۔ جہیز سے مراد گھر بار اور خانہ داری کی ضروری اشیا سے تھا مگر اس میں کسی سے کوئی تکرار نہیں ہوتی تھی اور نہ کوئی مانگ تانگ ہوتی تھی۔ حتی المقدور لڑکی کے والدین سامان جُٹا دیتے تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی سات سے لے کر اکیس جوڑے تک دینے کا رواج تھا۔ تھوڑا بہت گہنا بھی چاندی اور سونے کا لڑکی کو دیا جاتا تھا۔ پلنگ، بستر اور برتن وغیرہ بھی روایتی طور پر دئے جاتے تھے۔

رخصتی کے وقت منڈھے کی رسم بھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں یکساں ہوتی تھی۔ سب مل کر روتے کہ گھر سے "چڑیا" جا رہی ہے۔ رخصتی کا گیت بڑا رقت انگیز ہوتا تھا۔

ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل
نیکا منڈھا چھواؤ رے
پربت بانس منگا مورے بابل
پاؤں منڈھا چھواؤ رے
منڈھے او پر کلس براجے، دیکھے راجہ راؤ رے
نو مہینے گرب میں رکھا اب نہ راکھا جائے رے
اوٹے رے کوٹے گڑیاں چھوڑیں، چھوڑا سکھیوں کا ساتھ رے
ڈہلیاں پربت بھئیں، بابل انگنا بھیا بدیس رے
لے بابل گھر اپنا ہم چلے پیا کے دیس رے
ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل نیکا منڈھا چھواؤ رے

پیدائش کی رسمیں

ہندوؤں اور مسلمانوں میں، پیدائش کی رسموں میں، صرف تفصیل کا فرق تھا۔ دونوں فرقوں میں لڑکے کی خواہش بڑی شدید تھی۔ بابر نے ہندال کی پیدائش سے پہلے ہی دو کاغذ کے پرزے اٹھائے اور ان میں سے ایک پر لڑکے کا نام لکھا اور دوسرے پر لڑکی کا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک پرزہ اٹھایا تو اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا

کہ اس پر لڑکے کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے اسی وقت عہد کیا کہ اگر خدا نے اسے بیٹا بخشا تو وہ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری دے گا۔ خواجہ حسن دہلوی نے اپنی ایک مثنوی میں کسی دوسرے مغل بادشاہ کی لڑکے کے لیے شدید خواہش کا بیان اس طرح کیا ہے۔

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار
تو پھر انگلیوں پر کیا کچھ شمار
جنم پترا شاہ کا دیکھ کر
تلا اور پر چھک پر کر نظر
کہا رام جی کی ہے تجھ پر نظر

بچے کی پیدائش کی رسمیں دلہن کے حاملہ ہونے کے وقت سے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ اس خبر کے پھیلتے ہی رشتے دار مبارکباد دینا شروع کر دیتے تھے۔ کچھ گھرانوں میں پہلی پیدائش کے لیے عورت کو اس کے میکے بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ رواج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تھا۔ "تبدیلِ رہائش" کو ایسے موقعوں پر اچھا شگون سمجھا جاتا تھا۔ اکبر کی راجپوت بیگم کو جو سلیم یعنی جہانگیر کی والدہ تھی محل سے فتح پور سیکری میں واقع شیخ سلیم چشتی کے گھر بھیج دیا گیا تھا۔

بیشتر گھرانوں میں دائیاں ایسے موقعوں پر کئی ہفتے پہلے سے ہی گھر پر رہنا شروع کر دیتی تھیں۔ پرانی دلی میں کونڈے والان کی حاجن دائی سب سے مشہور تھی اور اسے بڑی تجربے کار اور ہوشیار دائی سمجھا جاتا تھا۔ وہ خاص خاص گھروں میں ہی جاتی تھی اور ہر وقت بنی ٹھنی اور زیورات سے لدی رہتی تھی۔

بچے کے پیدا ہونے کے ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی ہیجڑے دروازے پر جمع ہو جاتے تھے اور ناچ گا کر بدھائی دیتے تھے۔ ان کا نیگ بندھا ہوا ہوتا تھا مگر گھر والے کی حیثیت اعلیٰ ہوتی تو منھ مانگی رقم اور کپڑے وغیرہ لیے بغیر نہیں ٹلتے تھے۔

سنوانسا۔ ساتویں مہینے کے آغاز میں مسلمانوں میں بھی میکے والے سدھوڑے کر

آتے تھے جو سات طرح کی ترکاریاں، میوے اور پکوان پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ رسم خالص ہندوانہ رسم ہے۔ پہلے حاملہ کو نہلا کر نئے سرے سے دلہن کی طرح سجاتے ہیں اور پھر سدھوڑ میں آئی ہوئی اشیا سے اس کی گود بھرتے ہیں۔ میکے والے دولہا کی بہنوں کو نیگ کے روپے بھی دیتے ہیں۔ نیگ کی رسم بھی ہندوانہ ہے۔ پھر لڑکی کی نندیں ناریل توڑتی ہیں۔ اگر گری سفید نکلی تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اجلا پھل یعنی بیٹا ہوگا۔

نوماسہ ــ نویں مہینے کے شروع میں میکے سے حاملہ کا جوڑا اور آرائش اور سنگار کا سامان جس میں چاندی کی بُہرنی اور تیل کی نقرئی پیالی بھی ہوتی ہے اور ایک سرخ اوڑھنی مع پھل اور میوہ، نندوں کے نیگ پنجیری کے روپے بھیجے جاتے ہیں۔ سسرال والے پنجیری بنا کر سب کو بانٹتے ہیں۔ ستوانسے کی طرح گود بھری جاتی ہے۔ اس موقعے پر دائی پیٹ پر تیل لگاتی ہے اور سب رشتے داروں سے حق پاتی ہے۔ اس موقعے پر جننے سے متعلق سارا سامان بھی منگوایا جاتا تھا۔ حاملہ کا پلنگ ایک " بھاگوان کونے" میں رکھوا دیا جاتا تھا۔ پنجیری جیسی ہندوؤں میں بنتی تھی، ویسی ہی مسلمانوں میں بنتی تھی یعنی روے اور سوجی کو گھی میں بھون کر کھانڈ، چھوارے گوند، مکھانے، گولہ اور سونٹھ ڈال کر بناتے تھے۔

پیدائش کے بعد کی رسمیں ــ بچے کو پہلے دن شہد، دوسرے دن گُھٹّی اور تیسرے روز ماں کا دودھ پلایا جاتا تھا۔ زچے کے سرہانے کوئی لوہے کا ٹکڑا رکھ دیتے تھے تاکہ بچہ اور زچہ دونوں نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ پھپھی آٹے کے دودھ سے جس میں ہری دوب پڑی ہوئی ہوتی تھی، چھاتی، دھلاتی تھی اور پھر بالوں کی ایک لٹ جس کا اسے الگ نیگ ملتا تھا۔ دولہا کی بہنیں یہ گیت گائیں ــ

بیرن بھیا میں تیری ماں جائی
ہولر سن کر بدھاوا لے کر آئی
چھاتی دھلائی کٹوری لونگی تو لٹ دھلائی رُپیّہ
پاؤں دھلن کو چیری لونگی تو خصم چڑھن کو گھوڑا

جہانگیر کی پیدائش پر یہ گیت گائے گئے تھے۔ ان میں بھی ہندوانہ جذبات گندھے ہوئے ہیں۔

۱۔ مانگے جودھا جی کا راج
للہ جی کا مال نہ چھوئے
تھال بھر موتی جودھا رانی لائیں
وہ بھی نہ لیوے یہ دائی
شال دوشالے جودھا رانی لائی
وہ بھی نہ لیوے . . . . .
ہاتھی گھوڑے جودھا رانی لائی
وہ بھی نہ لیوے . . . . . .
وہ تو مانگے ہے آدھا راج
بابل راج ــــ وہ تو مانگے ہے آدھا راج

۲۔ میرے بابل کو لکھیو سندیس
جھنڈولا آج ہوا
بابل ہماری نگری کے بیرن بالے دیس
جھنڈولا آج ہوا
رس بھری کھچڑی لا مورے بابل
نوبت باجے دوار
جھنڈولا آج ہوا

چھٹی اور عقیقہ (مونڈن) کی رسمیں بھی ویسے ہی منائی جاتی تھیں جیسے کہ ہندوؤں میں۔ چھ روز کے بعد جھنڈولے کو بدھ یا پیر کے روز چھٹی نہلائی جاتی تھی۔ یہ بھی عورتوں کی ہی رسم تھی۔ زچہ نہا دھو کر پلنگ پر بیٹھ جاتی تھی۔ گھر میں ناچ گانا ہونا اور باہر بھی ہیجڑے، بھانڈ اور کنچنیاں اپنا اپنا ناچ دکھاتیں۔ ڈومنیاں گھر کے اندر مبارکباد گاتی رہتی

تھیں۔ عقیقہ مردانے میں مونڈن کی طرح ہوتا تھا۔ مولوی سید احمد صاحب کا خیال ہے کہ عقیقہ ہندوؤں سے نہیں لیا گیا کیونکہ حضرت محمدؐ کے زمانے میں بھی عقیقہ کا رواج تھا۔ یہ بات صحیح ہے لیکن ہندوستان میں بچے کے بال نائی سے مسلمان گھروں میں اسی طرح کٹوائے جاتے ہیں جیسے ہندوؤں کے مونڈن میں یعنی نائی بال بھگوتا اور پھر استرے سے بچے کے بال ایک موٹی سی روئی پر لیتا رہتا۔ نیگ وغیرہ کی رسمیں بھی وہی تھیں۔

زچگیریاں — بچہ پیدا ہونے کے بعد چھ دن تک باری باری سے عورتیں جاگتی اور زچہ گیریاں گاتی رہتی ہیں۔

میرے بابُل کو لکھو سندیس، جھنڈولا آج ہوا
بابُل ہمارے راجہ کے چاکر بیرن بالے بھیس، بھائی بچہ ہے روپ
جھنڈولا آج ہوا

اس گیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے ابّا کو خبر بھیج دو کہ آج تمہاری بیٹی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میرے ابّا راجہ کے نوکر یعنی امیر اور عزت دار آدمی ہیں اور بھائی ابھی یانا ہے۔ اسی طرح کا گیت، جیساکہ اوپر ذکر آچکا ہے، جہانگیر کی پیدائش پر بھی گایا گیا تھا۔

ایک زچہ گیری میں زچہ کہتی ہے کہ میرے میکے اور سسرال کے عزیزوں کو بلاؤ تاکہ سب اپنا اپنا فرض ادا کرکے فارغ ہوں۔

بُلاؤری میری ساس بڑی کو، وہ آئیں پلنگ بچھائیں۔ پائل باجے چھنن چھنن
بلاؤری میری اماں بڑی کو، وہ گھی کھچڑی لائیں۔ پائل باجے چھنن چھنن
بلاؤری میرے ابّا بڑے کو، وہ آئیں بھانڈ نچائیں۔ پائل باجے چھنن چھنن
بلاؤری میرے خسر بڑے کو، وہ نوبت رکھائیں، نیگ چکائیں۔ پائل باجے چھنن چھنن
بلاؤری میری نند بڑی کو، وہ آئیں چھتیاں دھلائیں۔ پائل باجے چھنن چھنن
بلاؤری میری بہن بڑی کو، وہ آئیں کرتہ ٹوپی لائیں۔ پائل باجے چھنن چھنن

ڈومنیوں کی یہ زچہ گیری بڑی مقبول تھی۔ وہ لہک لہک کر گاتیں۔

میرے للّا کے گھونگر والے بال

اماں جیوے، باوا جیوے، اور جیئے پروار

میرے للّا کے گھونگروالے بال

ہنسلی چوموں، کٹھلا چوموں اور چوموں گلے ہار

کرتہ چوموں، ٹوپی چوموں اور چوموں گورے گال

میرے للّا کے گھونگروالے بال

اس زچہ گیری میں صاف ہندووانی عقیدوں کا ثبوت ملتا ہے۔

اس ہریالے نے جنم لیا، میں تو پالنا بناؤں گی رے

اگر چندن کا میں پالنا بناؤں، ریشم ڈور جھلاؤنگی رے

اس باوا پیارے نے جنم لیا، میں تو پالنا بناؤں گی رے

سونے روپے کی بابل کھچڑی لائیو، سگھڑ زچہ کو میں تارے دکھاؤنگی رے

اس گیت میں لڑکے کی پیدائش کو کرشن جی کے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

البیلے نے مجھے درد دیا، سانوریا نے مجھے درد دیا

پاتیلیا نے درد دیا

جائیے کہو لڑکے کے باوا سے اونچی نوبت دھراؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا پاتیلیا نے مجھے درد دیا

جائیے کہو لڑکے کے نانا سے رنگ بھری کھچڑی لاؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا۔۔۔۔

جائیے کہو لڑکے کے ماموں سے ہنسلی کڑے گھڑاؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا۔۔۔۔

جائیے کہو لڑکے کی خالہ سے کرتے ٹوپی لاؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا۔۔۔۔

رسوم میّت

جان کنی کے وقت مسلمانوں میں بھی کلمۂ توحید پڑھا جاتا ہے، جیساکہ ہندوؤں

میں گیتا یا رامائن کا پاٹھ کرتے ہیں۔ دم نکلنے کے بعد لاش کی درستی اور غسل وغیرہ کے رواج بھی تقریباً ایک سے ہی ہیں۔ رسمِ دیدار بھی دونوں میں ہی ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں جنازے کے ساتھ جانے والے اسی طرح کلمہ پڑھتے ہیں جیسے ہندوؤں میں "رام نام ستیہ ہے" کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے تو ہندوؤں میں بھی ایسے موقعے پر پوجا کی جاتی ہے۔ مردے کی تجہیز و تکفین کے بعد گھر والوں کے لیے حاضری کسی رشتے دار کی طرف سے دی جاتی ہے۔ ایسا ہی ہندوؤں میں ہوتا ہے۔ ہندوؤں میں سیاپے کی رسم کی مانند مسلمانوں میں پرسہ دینے کا رواج تھا۔ ہر پرسہ دینے والی عورت کے ساتھ ماتم دار عورت کو رونا پڑتا تھا۔ اگرچہ شریعت میں تین دن تک ماتم جائز ہے مگر ہندوستان کی عورتوں میں چالیس دن تک سوگ منایا جاتا تھا۔ یہ بھی ہندووانہ رسم و رواج کے مطابق ہے۔

فاتحہ، پھول، یا تیجا ـــ مسلمانوں میں وفات کے تیسرے روز قبر پر ازگجا اور پھول چڑھانے کی رسم ہوتی ہے۔ جس روز میت کو دفن کرکے آتے ہیں تو پھولوں کا دن اسی روز بتا دیا جاتا ہے۔ تیجے کے دن صبح سے دس بجے تک مرد فاتحہ کے مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ گھر میں آنے والی عورتیں کھانا کھا کر جاتی ہیں۔ امیروں میں مردوں کو بھی کھلانے کا دستور تھا۔ ہندو بھی تیسرے روز پھول چنتے ہیں۔

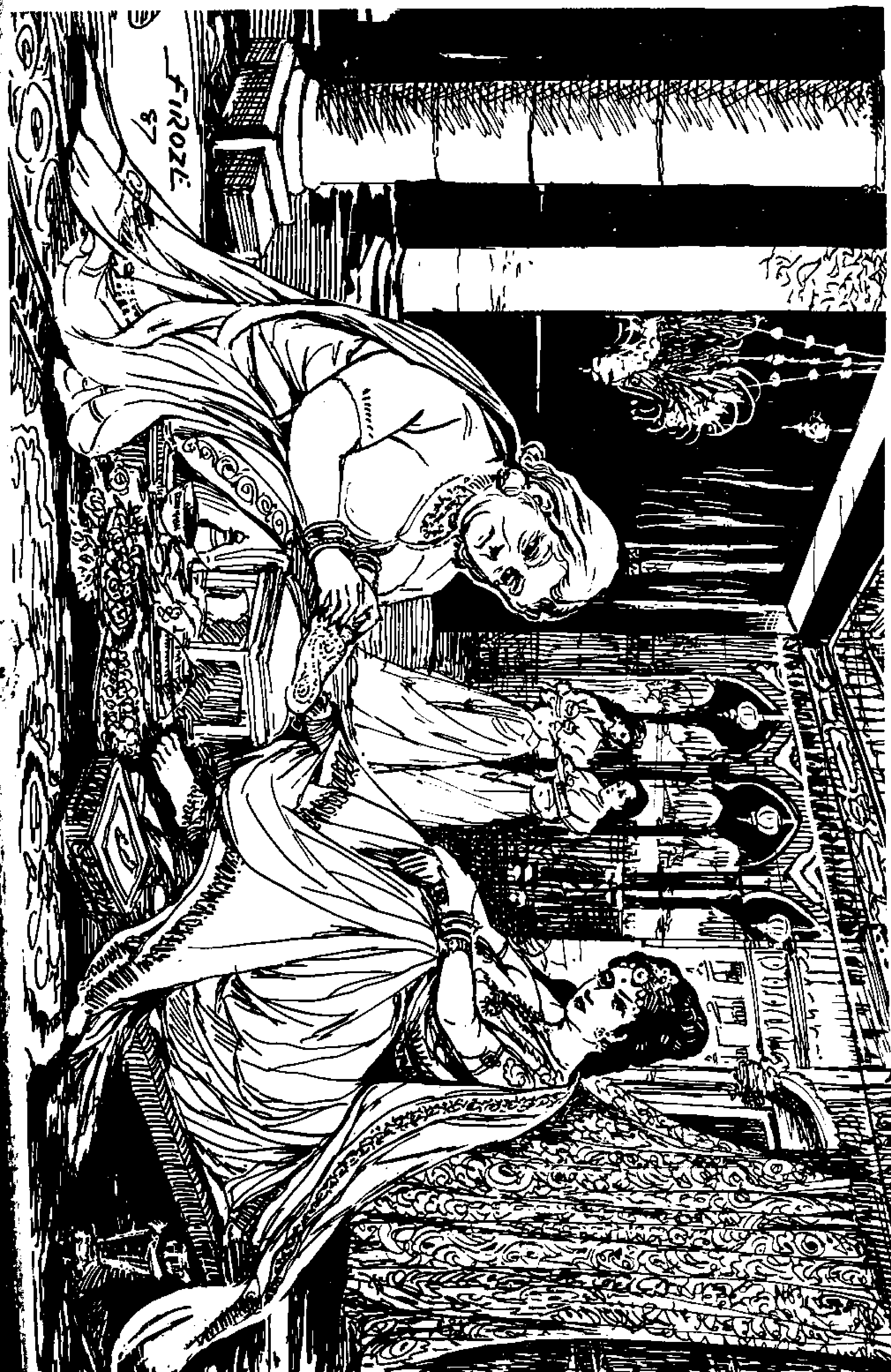
دستار بندی یا پگڑی ـــ یہ رسم بھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ہوتی تھی۔ اگر کسی کا باپ مر جاتا تھا تو اسے وارث قرار دینے کے لیے ننھیال والوں کی طرف سے پگڑی بندھوائی جاتی تھی۔ اس روز بھی مسلمانوں میں ہندوؤں کی طرح مہمانوں کو کھانا وغیرہ کھلایا جاتا تھا اور غربا میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ دسویں، بیسویں اور مہینے کی فاتحہ مع جوڑے کے دلوائی جاتی تھی۔

چالیسواں ـــ جس طرح ہندوؤں میں تیرھویں کی رسم تھی، ایسے ہی مسلمانوں میں چالیسواں کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ عموماً یہ رسم چالیسویں دن کی بجائے تین یا پانچ روز گھٹا کر کیا کرتے تھے۔ اس موقعے پر نئے کپڑے اور برتن وغیرہ خیرات میں دیے جاتے تھے۔ اس

روز سارے مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ یہ دن سوگ ختم ہونے کا تھا اور اب گھر والے کسی کی شادی یا خوشی کی تقریب میں شریک ہو سکتے تھے۔

صاحب استطاعت لوگ چالیسویں کے بعد ایک مخصوص روٹی کا انتظام بھی کرتے تھے جس میں باقرخانیوں کے سیر سیر یا دو دو سیر کے ٹکڑے، نقلوں کی تھیلیاں اور میٹھا رشتے داروں اور دوستوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ بعض لوگ اپنی روٹی اپنی زندگی میں خود کر جاتے تھے کیونکہ بعد میں کوئی کرے نہ کرے۔ روٹی سے غرض یہ ہوتی تھی کہ جن جن لوگوں کی تقریبوں اور رسموں پر وہ اپنی زندگی میں کھا چکے ہیں، انہیں کھلا کر وہ احسان اتارا جا سکے۔

رسمیں ہماری سماجی زندگی کا آئینہ ہوتی ہیں۔ جس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہوں اور جو ملک مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہو وہاں رسموں کا اشتراک بلکہ اختلاط ناگزیر ہے۔ اسی سے ایک مشترک سماج اور مشترکہ تہذیب ابھرتی ہے اور ایسی تہذیب ایک طاقتور اور متحدہ قوم کی سب سے نمایاں نشان ہوتی ہے۔ زندگی ہر دور میں رسموں کی پابند ہوتی ہے۔ یہ رسمیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ جو باتیں کل تک جانی بوجھی اور دیکھی بھالی تھیں، وہ اب بھولی بسری داستان بن گئی ہیں۔ مگر ایک چیز جو ہمیشہ قائم رہے گی۔ وہ جذبۂ انسانیت ہے جو ہماری رسموں میں یگانگت گھولتا ہے اور سماج کے چہرے کو نکھارتا اور سنوارتا رہتا ہے۔


FIROZE
87

نائن۔ دلّی کی بولی ٹھولی

ریت رسموں میں نائن اور مشاطہ کا بڑا دخل تھا۔ ان کے بنا سارے کام ادھورے تھے۔ ہندو گھرانوں میں تو بیاہ شادی، ریت رواج میں نائن کی بڑی پوچھ تھی۔

سیتے سیتے ذرا کمر سیدھی کی ہوگی کہ دادی اماں نے نائن کو ڈیوڑھی میں آتے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں سونٹا لیے، کلے میں پان دبائے، ہانپتی کانپتی چلی آرہی تھیں۔ اس کا ئستھ گھرانے کی یہ نائن اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔ بہت لچھے دار باتیں کرتی تھیں۔ جب بھی گھر میں آتیں، کسی کا ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ آتیں بھی ایسے ہی وقت تھیں جب گھر میں سوفتہ سا ہو۔ گھنٹوں بیٹھی بیٹھی دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتیں۔ کوئی اپنے بیٹے بیٹی کو سات تالوں میں بند کر کے بھی رکھے تو بھی ان کا کچّا چٹھا سنا جاتیں۔ پاتال تک کی خبر رکھتی تھیں۔ خوب بڑھا چڑھا کر باتیں کیا کرتیں۔ اور اچھے اچھے کو شیشے میں اتار لیتیں۔ مجال ہے کہ ان سے نک سک کا عیب چھپ جائے۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ لڑکے والوں کو کوئی لڑکی بہت پسند آ ئی۔ نائن کو رشتہ پکّا کرنے کا کام سپرد ہوا۔ نائن نے لڑکی کے پیٹھ کے بالوں کا رُخ دیکھ کر کہہ دیا کہ لڑکی کی پیٹھ پر سانپن ہے، رشتہ ٹھیک نہ بیٹھے گا۔ لڑکے والوں نے نائن کی بات آئی گئی کر دی اور بیاہ کر دیا۔ تھوڑے دنوں بعد لڑکے والوں کو نتیجہ بھگتنا پڑا۔ لڑکی بیمار پڑی اور لڑکا کبڑا ہو کر مرا۔

نائن کا کام رشتے طے کرانا ہی نہیں تھا۔ وہ ساری ریت رسمیں پوری کرواتی تھیں اور سب ٹھک ٹھیلوں میں گیت گاتی تھیں۔ اِن نائن کی آواز تو بہت پاٹ دار اور لوچ والی تھی۔ پرکھوں کے نام لے لے کر ڈھولک پر گیت گاتیں اور شادی بیاہ میں مہندی، گھوڑی، بنّے، سہاگ، بدھاوے، کنگنا، منڈھا، بدائیگی اور ٹونے گاتیں۔

نائنوں کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں اُن کو نان بہو کہہ کر اور بہو بیٹیاں تائی، چاچی کہہ کر بلاتی تھیں۔ یہ نائن تو خوب موٹی تازی تھیں اور پینیدا بہت بھاری تھا۔ بیٹھتیں تو بہت جگہ گھیر تیں۔ لڑکیوں نے نائن کا نام بارہ منی توپ رکھ رکھا تھا۔ لیکن ان کے پیٹھ پیچھے ہی باتیں بناتی تھیں۔ ان کے سامنے کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

جیسے ہی نائن نے آنگن میں پاؤں رکھا، ایک لڑکی نے دوسرے کے کان میں کہا۔ اے لو وہ آگئیں گھی کا کُپّہ، بارہ منی توپ۔ دوسری نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈانٹا۔ چپ رہ، نائن تائی نے سن لیا تو تیرا بیاہ کسی نکٹے سے کروادیں گی۔ ایک لڑکی دوڑی دوڑی گئی اور اس نے نائن تائی کے لیے کھٹیا لاکر ڈال دی۔ لیکن نائن زمین پر بچھی چاندنی پر دادی اماں کے سامنے پسر کر بیٹھ گئیں اور ہنس کر بولیں ـــ اے بیبو، پرے رکھ اپنی کھٹیا کو، میں نہیں بیٹھتی تیری کھٹملوں والی کھٹیا پر۔ لڑکی بولی ــ ہاں نائن تائی تم کاہے کو بیٹھو گی ہماری کھٹیا پر، تمہارے سیّاں نے تو ہر دم تمہارے لیے چھپر کھٹ بچھایا، ہمیشہ تمہاری نازبرداری کی۔ نائن تڑپ کر بولیں۔ سیّاں جی نے اس دنیا میں لاکھوں روپے بٹّے، کبھو نہ لائے لڈّو، ہم کو بیر کھلائے کھٹّے۔ اے سیّاں نے کمایا تو میں کیا کروں۔ میں تو تیری دادی کے ہی گن گاتی پھروں ہوں۔ سدا اِنھوں نے ہی مجھے پوچھا۔ میرے پاس تو جو کچھ جمع جتھّا ہے، تیری دادی کا ہی دیا ہوا ہے۔ مجھے اور کوئی کیوں نہال کرنے لگا۔ لڑکی بولی۔ نائن تائی ہم تو سمجھے تھے، تمہاری دوہری کمائی ہے۔ پر تمہارے اُن کی تو وہی بات نکلی کہ ٹیم ٹام کی پگڑی وہ بھی صدقہ جورو کا۔ نائن کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ دادی اماں نے لڑکیوں کو زور سے ڈانٹ کر کہا ـــ خبردار، بہت جیبھ چلانی اچھی نہیں۔ ٹر ٹر کیے چلی جارہی ہیں۔ اِتنے دلوں بعد تو نائن بہو آئی ہیں، بات ہی نہیں کرنے دیتیں۔ زیادہ اوندھا سیدھا بکو گی

تو برادری میں نام نکل جائے گا۔

دادی اماں کی بات سن کر سب لڑکیاں خاموش ہو کر ایک طرف کو سرک کر بیٹھ گئیں۔

دادی اماں نائن سے بولیں ــــ اچھی نائن بہو تم نے بھی حد کر دی۔ اِتنّے دنوں سے یاد کرتی تھی تمہیں۔ پر تمہیں یاد کرنے سے فائدہ بھی کیا۔ تمہیں تو ہچکی بھی نہیں آئی ہو گی۔ سچ پوچھو تو میرا کب سے تم میں دھیان لگا ہوا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ آج کیسے رستہ بھولیں۔ نائن نے مٹک کر جواب دیا ــــ لو اور سنو، یہ ایک ہی رہی۔ میں رستہ بھولی کہ آپ ہمیں بھولیں۔ کبھی تو یاد کیا ہوتا۔ نوکر چاکر ہی بھیج کر پچھوا لیا ہوتا کہ تمہاری نائن بہو مرے ہے یا جیے ہے۔ مریں تمہارے دشمن، دادی اماں بولیں، کیسی بات منھ سے نکالتی ہو تم بھی نائن بہو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ کہاں سے چلی آرہی ہو؟ ــــ اے ماں جی، نائن احسان جتاتے ہوئے بولی، تمہارا ہی کام کرتی پھروں ہوں۔ دادی اماں یہ سن کر کچھ حیران ہوئیں اور بولیں۔ ہمارا کام؟ کون سا کام؟ نائن اپنا ماتھا پکڑ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں ــــ اے اماں جی ہم تو سویرے سے اپنی ٹانگیں توڑ رہے ہیں اور بڑی بہو کو پتہ بھی نہیں! آپ ہی کے کہنے سے میں دیوان جی صاحب کے یہاں گئی تھی۔ آج کل ان کے بڑے دور دورے ہیں۔ چاندی رُل رہی ہے اُن کے یہاں۔ لڑکیاں بھی بڑی ہونہار ہیں۔ بہت سیوا اور ٹہل کرتی ہیں اپنے پیارے ماں باپ کی۔ ایک بٹیا تو چاند سی ہے۔ آنکھوں میں موتی کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہیں۔ آنکھیں ایسی کٹیلی ہیں کہ بھئی کیا کہنے، سر سر جڑا ہوا۔ اور بتیسی ایسی جیسے موتیوں کے دانے۔ آواز ایسی سریلی جیسے شہد کا ٹپکا۔ میں تو کہتی ہوں کہ اپنے پوتے کا بیاہ دیوان جی کی بٹیا سے رچا دو۔ شبھ کام میں دیر کیسی؟

دادی اماں کو دیوان جی کے گھر کا حال چال پہلے ہی سے پتہ چل چکا تھا۔ بولیں ــ نائن بہو تم بھی کس کے یہاں کی بات لے بیٹھیں۔ نام بڑے درشن تھوڑے۔ دیوان جی کے یہاں کی بھلی چلائی۔ ارے اب وہاں دھرا ہی کیا ہے۔ جہاں بہو کا پسینا وہیں سسر کی کھاٹ۔ پہلونٹی کی بیٹی کی شادی میں سارا روپیہ کنکری کر دیا۔ سب بارہ باٹ ہو گیا۔ اب تو توپھٹے حال ہیں ان کے۔ اور بڑی لڑکی تو آنکھ ناک کی کچھ اچھی بھی تھی، پر چھوٹی کے کیا کہنے۔

آنکھ نہ ناک بنو چاند سی۔ لیکن ماں جی، نائن بولیں، گانا بجانا ؟ ۔ ارے چھوڑو گانا بجانا، دادی اماں تنک کر بولیں، گانا بجانا وہ کیا جانے۔ بھانس نہ بھسکا، گانے کا چسکا۔ اسے ہمارے یہاں اور لے آؤ، نہ بھئی نہ، بیٹھی بیٹھی کہے گی سن رے ڈھول بہو کے بول۔ مجھے ان کے یہاں کا رتی رتی حال معلوم ہے۔ تم کہاں کی بات لے بیٹھیں، وہی بات ہوئی۔ دلی سے ہیں آؤں، خبر کہے میرا بھائی۔

نائن اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولیں۔ ائے میں کیا جانوں۔ میں ان کے یہاں گئی تو دیکھا کیا لڑکی کی مَوسی بیٹھی بڑ ہانک رہی ہے۔ لڑکی ایسی ہے، ویسی ہے، یوں کرے ہے، وُوں کرے ہے۔ دادی نے نائن کی بات کاٹ کر کہا ۔ اے سنی سنائی بات کا کیا۔ اس کی مَوسی بڑ نہیں ہانکے گی تو اور کون ہانکے گا۔ گھٹنے نویں گے تو پیٹ ہی کو تو نویں گے۔ نائن کو جب اپنی دال گلتی نظر نہ آئی تو جھٹ بات پلٹ کر بولیں ۔ ماں جی آپ کا تو بیبو کا بیاہ کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ چھوری کو کب تک گھٹنے سے لگائے بیٹھی رہو گی۔ خیر سے بارہ برس کی ہونے آئی، سیانی ہو چلی۔ کوئی اچھا سا گھر بر ملے تو ٹھیک کر دو۔ دادی بولیں اے نائن ابھی تو تم ہمارے پوتے کا بیاہ رچا رہی تھیں، اب بیبو کی بات کرنے لگیں۔ اے بیبو تو ابھی بہت بھولی ہے۔ اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اٹھان کی بڑی ہے۔ ایسی چھوٹی سی کو پرائے حوالے کیسے کر دوں ۔ ماں جی، نائن بولیں، میں تو آپ کے بھلے کے لیے کہتی تھی۔ ایسا بڑھیا گھر چھانٹا ہے بیبو کے لیے کہ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔ چھورا سندر صورت، موہنی مورت ہے۔ کچھ بہت بڑا بھی نہیں۔ بس یہی کوئی پندرہ سولہ کا ہوگا۔ آدمی بھی ان کے یہاں گنتی کے ہیں۔ کچھ رَدھان نہیں۔ اتا پتا بتا دوں۔ ارے وہی آپ کا جانا پہچانا گھر ریاست والے بخشی جی کا۔ نائن نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ دادی اماں بولیں ۔ ہاں ہاں بخشی جی کو کون نہیں جانتا۔ ایک وقت تھا کہ یہاں دولت رُلتی تھی۔ دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ پر اب وہاں کیا دھرا ہے ۔ بڑے باسن کی کھرچن بھی بہت ہوتی ہے ماں جی، نائن بولیں، یہ بھی سوچا ہے آپ نے۔ اُن کے پاس سب کچھ ہے۔ بیبو کے بھاگ میں تو بخشی جی کا گھر ہی لکھا ہے۔

دادی جی بولیں ــ یہ تو سچ ہے کہ جہاں جس کی لکھی ہے وہاں ہو کر رہے ہے۔ جڑیا سنجوگ کے ہاتھ میں ہے۔ پر میرا تو جی ان کے یہاں کے لیے ٹھکتا نہیں۔ مجھے تو بھرا پرا کنبے کا گھرا چھا لگے ہے۔ ایسے گھر کو کیا چاٹوں جہاں چوہی کا بچہ بھی نہیں۔ اور نائن بہو تمہارے کان میں ایک بات کہوں، ان کے یہاں تو یہ بُرائی ہے کہ بخشی جی کی دو دو بہویں ہیں۔ دونوں کی آپس میں بنتی نہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا سَوت چون کی بھی بُری۔ چھوٹی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، ہر وقت ناز نخرے، بناؤ سنگار میں لگی رہتی ہے۔ اور بڑی کا مزاج تو آگ ہے۔ اور ہاں ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ یوں تو بخشی جی دلی والے ہیں، پر اب تو رجواڑوں میں چلے گئے ہیں۔ اتنا بڑا کلیجہ کہاں سے لاؤں کہ اپنی بیبو کو کالے کوسوں بیاہ دوں۔ بڑوں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے، دلی کی بیٹی، متھرا کی گائے، کرم پھوٹیں تو باہر جائے۔

یہ بات تو نائن کے دھیان سے بھی اتر گئی تھی۔ فوراً ایک اور تجویز پیش کر دی ــ ماں جی اب زیادہ کُڑیدا بینی مت کرو۔ بیبو کو تو منشی جی کے یہاں بیاہ دو۔ جیسے تمہاری بیبو دو موتیوں میں ایک چُننی ہے، ایسے منشی جی کا لڑکا بھی لالوں میں لال ہے اور گھر بھی جیسا تم چاہو کنبے والا۔ سات مائیں، سات دھائیں۔ ہاں البتہ لڑکے کا رنگ ذرا گیہواں ہے۔ سو کیا ہوا۔ ماں کا پیٹ کمہار کا آوا، کوئی گورا، کوئی کالا۔ کیوں ماں جی کہو کیسا بڑھیا گھر ڈھونڈ نکالا۔ کہو تو آج ہی پکی کروا دوں۔ سوچ لو، کبھی پھر ڈِھسل جاؤ۔

دادی اماں نے اس بات کا تو کوئی جواب نہ دیا۔ سینے پرونے کی خلیطی لے کر کھڑی ہو گئیں اور نائن سے بولیں ــ اے نائن بہو پان کا ٹکڑا کھائے بنا نہ چلی جانا۔ ابھی آتی ہوں۔ اور دادی کے اٹھنے کی دیر تھی کہ سب لڑکیاں نائن کے پاس آدھمکیں اور آتے ہی ریل گاڑی سی چھوڑ دی۔ ایک بولی ــ اچھی نائن تائی، یہ بتاؤ تمہارا بیٹا تو موج میں ہے۔ رام جی رکھیں اب تو تمہارا ٹلو سامرتھ ہو گیا ہو گا اور تمہاری بہو کیسی ہے۔ بھئی ہم تو کہتے ہیں نائن تائی کی آج کل پانچوں گھی میں ہیں۔ کیوں نائن تائی؟ ــ

اپنی بہو بیٹے کی بات سن کر نائن طنزیہ لہجے میں بولیں ــ اے ہاں، ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں اور سر کڑھائی میں جو ہے۔ ہمارے بیٹا اور بہو کی سارس کی سی جوڑی ہے۔ اری

بیٹی اپنے خصم سے توسب راؤ رچاؤ کرے ہیں پر ایسی بے شرم کہیں نہیں دیکھی، نہ دیکھنا چاہوں ہوں۔ بیٹے پر تو ٹونا سا کر دیا ہے اور بیٹا کون سا اچھا ہے۔ جب سے بہو بیاہ کر لایا ہے نکھٹو ہو گیا ہے۔ گھر میں پڑا پڑا اینڈتا رہتا ہے۔ روٹیاں لگ گئی ہیں جو روکے گلّام کو۔ مرد کی صورت ہو کر کمایا نہیں جاتا پستی کے پینڈے بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ دونوں کے دونوں کھا کر سنڈ یا رہے ہیں۔ بیٹھا بیٹھا مٹھر مٹھر باتیں بناتا ہے۔ کام دھندا سب چھوڑ رکھا ہے۔ حرام خوری پر تُل گیا ہے۔ لوگ کہیں ہیں، ہے پرماتما بیٹا دے بیٹا دے۔ بیٹا ہوا تو اس نے کون سا نہال کر دیا۔ اور اس بہو کے لچھن تو دیکھو۔ مری جوں سی ہے۔ کام کی نہ کاج کی، ڈھائی من اناج کی۔ ہوئی فجر چولہے پہ نجر۔ لاکھ سمجھاتی ہوں کسالے کی کمائی ہے، یوں نہ گنواؤ۔ لیکن دونوں کے دونوں چکنے گھڑے ہیں۔ بوند پڑی اور پھسلی۔ ٹھیک ہے بھئی۔ ابھی تو چار پیسے کی مایا ہے لیکن جب کوڑی پلّے نہ رہے گی۔ ناوے کا اچھی طرح سُلفہ ہو جائے گا، پھر کیا ہوگا۔ ہوگا کیا؟ وہی حال ہوگا چنے چبالو، شہنائی بجالو۔ اری بیٹیو کیا بتاؤں ان دونوں کو تو حرام مال کا چسکا پڑ گیا ہے، خرچ گھنا اور پیدا تھوڑی، کس پر باندھوں گھوڑا گھوڑی۔ نائن تائی، ایک لڑکی بولی، ہم نے تو سنا تھا کہ تمہاری بہو بڑا جہیز لے کر آئی ہے اور تمہارے سمدھی راجہ کی پکی حویلی ہے۔ حویلی کا نام سنتے ہی نائن کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا، بولیں ــ حویلی، حویلی بڑا آیا حویلیوں والا۔ ارے تمہیں کیا معلوم ہماری بہو کا بیاہ سے پہلے کلیہا سا گھر تھا۔ اب اتنا بڑا ڈھنڈار مکان دیکھ کر اس کے دیدے پٹم ہو گئے ہیں۔ دھرا کیا تھا اس کے باوا کے پاس۔ یہاں آکر جُون پلٹ گئی۔ ورنہ تم جانو باپ بچارے کا تو مانگے تانگے سے کام چلتا ہو تو چلتا ہو۔ کبھی گڑ یا نون کی کنکری مل گئی تو چولہا گرم نہیں تو کڑاکا۔ جہیز دے گا وہ، بڑا آیا جہیز دینے والا۔ جیسے اس کے باوا کے یہاں کوئی کھیتی گڑھی تھی۔ وہ کس پر اپنی ہیکڑی جتاتا ہے۔ مجھ سے آنکھ ملا کر بات کرے۔ جلے کی بھرے بازار میں پگڑی اتار لوں۔ کہنے کو تو نام فتح چند ہے پر اس کی تو وہی بات، مرے نہ چوہا باپ پھاٹے خاں۔ ہے ہے بیٹی، اب کہاں تک اپنا جھینکنا جھینکوں۔ پرماتما کرے کسی کی بری گھڑی نہ آوے۔ سکھ سمپت کے سب کوئی ساتھی۔

دکھ میں کون کسی کی چنتا کرے۔ اپنی رام کہانی کہاں تک سناؤں۔ سچ پوچھو تو بیٹی میرا تو من ہی مرگیا ہے۔ ہر وقت کڑوی کسیلی باتیں ہوتی ہیں گھر میں۔ یہ دونوں کے دونوں منھ پر کالونس لگا کے چھوڑیں گے۔ اچھا بھئی کا لکھ لگنی ہے تو لگ کر رہے گی۔ بڑھاپے میں مٹی پلید ہونی ہے تو ہو کر رہے گی۔ سچ پوچھو تو اب سہار نہیں رہی۔ میں نے تو جو کچھ کیا تھا اچھے کے لیے کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بوؤں گی گیہوں، اپجیں گے جو۔ لڑکیاں بیچ میں ٹوک کر بولیں ___ اے نائن تائی اپنا جی مت کھٹا کرو۔ ہمیں کیا پتہ تھا۔ تمہارے بیٹا بہو ایسے نکلے ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے بڑی سُکھی ہوں گی ہماری نائن تائی۔ بیٹے کے بیاہ کے بعد بیٹھی بیٹھی راج رچاتی ہوں گی۔ پر یہ دونوں تو بڑے بے لچھنے نکلے۔ تمہاری ساری جمع جکڑی مسوس کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ شکل صورت کی تو بڑی بھولی لگتی ہے تمہاری بہو۔ یہ سن کر نائن پھر بگڑ کر بولیں۔ بھولی بھولی مت سمجھنا اس کو۔ پوری ڈائن ہے۔ اجی وہ تو جیتے کو نگل لے۔ اس کا بس چلے تو میرا بدھنا، بوریا، انگر کھنگر، کھاٹ کھٹولا سڑک پر پھنکوادے۔ نرک چودش سی کھڑی رہتی ہے۔ ایک چیز دیتی ہے اور بیس نہو رے دیتی ہے۔ کسی کی کہاوت ہے، گھر کر، گھر کر ستّر بلا سر دھر۔ اندر سے کُڑھ کُڑھ کر مر جاتی ہے اور اوپر سے جی شکھ جی شکھ کرتی رہتی ہے۔ بہو کے لیے ساس اس کی دوتی اور نند اس کی بیرن ہے۔ کتنا ہی سر کھپاؤ پر اس کی سمجھ میں آئے تب نہ! خیر میں نے بھی اس سری کی بہت دیکھی ہیں۔ دھوپ میں چونڈا سفید نہیں کیا۔ مجھ سے ٹر فش لائی تو منہ بگاڑ دوں گی۔ مجھ سے بہت لیپا پوتی اچھی نہیں، کیوں ٹھیک کہوں نہ؟ اے بولو نہ بولتی کیوں نہیں، ہونٹ سی کے کیا بیٹھی ہو؟

لڑکیاں خوب گردن ہلا ہلا کر نائن کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ ایک بولی ۔ اے نائن تائی کمال کر دیا تمہاری بہو نے تو۔ بڑی بے ایمنٹی نکلی وہ تو۔ بجائے تمہارا ہاتھ بٹانے کے تمہیں ستاتی ہے۔ گلچھرے اڑاتی ہے۔ وقت برباد کرتی ہے۔ گھر میں جی نہیں لگتا۔ نائن بولیں۔ اے ہاں اور کیا، بہو کا گھر میں تلوا نہیں ٹکتا۔ ہٹر دھبٹر آئی اور پھر باہر جا دھمکی۔ میری تو صورت سے چڑتی ہے۔ بس کی گانٹھ ہے۔ یہ ہی چاہتی ہوگی بڑھیا کو زہر دیدوں۔ پرائے

کیا معلوم، لاکھ زہر ہتھیلی پر لیے پھرو، بن کھائے کوئی مرتا ہے۔ اری بیٹی میں تو تقدیر کے لکھے کو پیٹ رہی ہوں۔ ایک تو اپنا مال لگانا دوجے اپنا جوبن گنوانا۔ ہے، ہے کیا کروں مجھے تو اب نہ کھانے کی سُرت رہی، نہ پینے کی۔ بس اس سٹر پیٹر میں دن نکل جاتا ہے۔ خیر آدمی ہے، جیسی پڑتی ہے سہہ لیتا ہے۔ ہم تو ساگ پات کھاکر گزارہ کر لیں ہیں لیکن سوچتی ہوں میرے بعد ان راجا رانی کا کیا ہوگا۔ دونوں اَین گین ہیں۔ ایک کو چھپاؤں، دوسرے کو نکالوں ــــ

نائن چٹکی میں سے ہُلاس نکوؤں میں رکھ کر اور سر کو پیچھے جھٹک کر بولیں ــ کہے دیتی ہوں جو بچہ اپنی ماں کو ستائے گا تو پرماتما اس کے پیٹ سے نو مہینے مٹکا بندھوا ئیگا۔ جی چاہتا ہے، دھرتی پھٹ جاتے اور اس میں سما جاؤں۔ اتنا کہہ کر نائن کا جی ململا سا ہونے لگا۔ وہ آنکھ میں آنسو بھر کر کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن دادی اماں کو آتے دیکھ کر جھٹ منھ موڑ کر پلّو سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔ دادی اماں نے پوچھا ــ یہ کیا بات ہے نائن بہو، جی تو اچھا ہے تمہارا، اے کچھ کہہ دیا کسی نے تم سے۔ لو یہ پان کا ٹکڑا تو کھالو۔ بولو تو سہی کیا ہوا ــ نائن دادی کے ہاتھ سے پان کا ٹکڑا لے کر بولیں ــ کچھ نہیں ماں جی، کچھ نہیں، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی بات نہیں، بس یونہی آنکھ میں کچھ رڑک رہا تھا۔


FIROZ

جنّت کی چڑیاں

کسی کے گھر لڑکا پیدا ہوا تو منٹوں میں دہلیز پر ہیجڑے آدھمکتے تھے اور ہاتھ نچا نچا کر بدھائی دیتے تھے، گاتے تھے اور ناچتے تھے۔ تعجب ہوتا تھا کہ ابھی رشتے داروں کو بھی طلاع نہیں ہوئی، ہیجڑوں کو کیسے خبر لگ گئی اور وہ بھی اتنی جلدی۔ اب گھر والے کتنے بھی مصروف ہوں مگر یہ ہیجڑے اپنا نیگ لیے بغیر نہیں ٹلیں گے۔ ان کا نیگ بندھا ہوتا تھا جس میں نقدی کے علاوہ کپڑے اور مٹھائی وغیرہ بھی ہوتی تھی۔ لڑکے کی پیدائش کا نیگ زیادہ اور لڑکی کا کم ہوتا تھا۔ دلی والے ہیجڑوں کو "جنّت کی چڑیاں" کہتے تھے!

دلی کی تاریخی زندگی اور سماجی طور طریقوں میں خواجہ سراؤں اور ہیجڑوں کی اپنی اہمیت رہی ہے۔ یہ کچھ خدا کی اور کچھ انسان کی بنائی ہوئی ایسی مخلوق ہے جسے سب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے انہیں دیکھا یا ان کے بارے میں سنا نہ ہو۔ ان پر نظر پڑتے ہی سب مسکرانے لگتے ہیں اور ان سے محفوظ ہونے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ "تیسری جنس" کے یہ افراد ہر گھر پر خوشی کے موقعوں پر پہنچ جاتے ہیں اور ڈھولک بجا کر اور ناچ گا کر گھر والوں کی خوشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف دوسرے مرد عورتوں اور بچوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے جو ان کا ناچ گانا تو دیکھتے اور سنتے ہی ہیں مگر ان سے چھیڑ خانی بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب تک چھیڑ خانی چلتی رہتی ہے ٹھیک ہے مگر جہاں ہیجڑوں کو غصہ آیا تو تو بہ ہی بھلی چھیڑنے والے کھینچ جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتے ہیں، اپنی ساڑھی آگے سے اٹھا اٹھا کر وہ گندی گالیاں دیتے

ہیں کہ نہ صرف چھیڑنے والا آدمی دم دبا کر بھاگ جاتا ہے بلکہ دوسرے مرد اور عورتیں بھی شرم کے مارے کھسک جاتے ہیں۔

بیشتر ہیجڑے اور خواجہ سرا قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں یعنی مردانہ صلاحیتیں شروع سے ہی نہیں ہوتیں۔ کسی گھر میں کوئی ایسا لڑکا پیدا ہوتا جس میں زنانہ اثرات نمایاں ہوتے تو جہاں وہ آٹھ دس سال کا ہوتا تو ہیجڑے اُس گھر پر دھرنا دیدیتے تھے کہ اسے ان کے ساتھ بھیج دیا جائے کیوں کہ وہ ان کی "اُمت" کا ہے۔ بیچارے والدین ہر روز کی مصیبت اور شرم اور بدنامی سے تنگ آکر لڑکے کو بہت سا سامان اور روپے پیسے دیکر ہیجڑوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ کئی امیر اور بارسوخ والدین اس کی مزاحمت کرتے تھے مگر کسی نہ کسی وقت، جلد یا بدیر اس لڑکے کو یا تو ہیجڑے ورغلا کر لے جاتے یا وہ خود ہی ہیجڑوں کی ٹولی میں جا ملتا۔ اس کے علاوہ ہیجڑے خود بھی بہت سے ایسے پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کو جو پیدائشی مخنث نہ ہوتے مگر جن میں زنانہ رجحانات پائے جاتے یا تو اغوا کر لیتے یا کسی ترغیب اور لالچ سے اسے اپنی ٹولی میں شامل کر لیتے۔ ایک دفعہ کوئی لڑکا ان کے چنگل میں پھنس جاتا تو پھر نہ نکل سکتا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک بڑی بھیانک رسم میں، بغیر کسی ڈاکٹر یا جراح کی مدد کے ایک تیز استرے یا چاقو سے اس کا عضوِ تناسل کاٹ ڈالتے اور اس طرح سے وہ لڑکا جو قدرتی طور پر مردانہ قوت اور صلاحیت رکھتا تھا، ہمیشہ کے لیے ہیجڑا بن کر ہیجڑوں کے ساتھ رہنے لگتا تھا۔ کئی شہروں میں بہت سے ہیجڑے اس جرم میں گرفتار ہوئے ہیں اور ان پر مقدمہ چلا ہے۔ بڑودہ کے محمد حنیف دورا نامی ایک پندرہ سالہ لڑکے کو اس طرح ہیجڑا بنانے کا مقدمہ بڑودہ کی عدالت میں ۱۹۸۳ میں چلا تھا اور مجرم ہیجڑوں کو سزا ملی تھی۔ مگر عام طور پر یا تو ایسی وارداتوں کا پتہ نہیں چلتا یا ہیجڑے کسی نہ کسی طریقے سے بچ جاتے ہیں۔ یہ وحشیانہ 'رواج' آج بھی قائم ہے اور حکومت ابھی تک اس کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ بات صرف ہیجڑوں کی برادری تک محدود رہتی ہے۔

ہیجڑوں کی 'ابتدا' کی ایک تاریخی وجہ بھی بیان کی جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک کئی مشرقی حکومتوں نے

زنا بالجبر کی سزا یہ رکھی ہوئی تھی کہ مجرم کے عضوِ تناسل کو کاٹ دیا جائے تاکہ وہ پھر اس جرم کا ارتکاب نہ کر سکے۔ ایسے لوگ ہیجڑے بن جاتے تھے۔

خواجہ سراؤں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ بادامی، پستئی اور صندلی۔ بادامی کا عضوِ تناسل بادام کی طرح ہوتا ہے، پستئی کا پستے کی مانند لیکن صندلی میں صرف پیشاب کی نالی ہی ہوتی ہے۔ داڑھی اور مونچھ صرف بادامی کے ہی نکلتی ہے۔ کوئی تیس چالیس برس ہیجڑوں میں، خاص طور پر دلی میں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو اپنے آپ کو "زنانہ" کہتا ہے۔ یہ لوگ اپنا عضوِ تناسل نہیں کٹواتے اور ان میں نسوانیت کا جذبہ زیادہ غالب نہیں ہوتا۔ ان میں سے کئی صاحبِ اولاد بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ناچ گا کر اپنی روزی کماتے ہیں اور عورتوں سے زیادہ نخرے دکھاتے ہیں۔ "زنانوں" کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

فرہنگِ آصفیہ کے مطابق، عیسیٰ کی پیدائش سے سات سو سال قبل خواجہ سرا بہت سے ملکوں میں بڑے مقبول ہو گئے تھے۔ اس وقت کا ایک قصہ بڑا مشہور ہے۔ ایک بادشاہ اپنی بیگم کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ایک رکھیل بھی تھی جو بڑی مکار تھی۔ اس نے بادشاہ کے محل کے ایک بھروسے کے قابل خواجہ سرا سے مدد چاہی اور اس خواجہ سرا نے بیگم کے خلاف بادشاہ کے اتنے کان بھرے کہ وہ اس سے بدظن ہو گیا اور بیگم اس کی نظروں سے گر گئی۔ بادشاہ نے خواجہ سرا کو ناظر جنگ کا خطاب دیا اور اس کا اقتدار بڑھتا گیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے بہت سے امرا نے اپنے بچوں کے عضوِ تناسل کٹوا کر انہیں دربار میں بھیج دیا۔ محل میں خواجہ سراؤں کا بڑا اثر و رسوخ تھا اور اس وجہ سے وہ حکومت میں اونچے اونچے مرتبوں پر لگائے جانے لگے۔ دلی کے ترکی سلطانوں کی حرم اتنی ہی بڑی ہوتی تھی جتنی مغل بادشاہوں کی بعد میں ہوئی۔ شاہی محل کے اندرونی انتظامات ایک 'حاکمہ' کے ہاتھ میں ہوتے تھے جو کسی امیر خاندان کی ہوتی تھی اور خواجہ سراؤں کو حرم کی چوکسی اور حفاظت سونپی جاتی تھی تاکہ حرم میں باہر سے کوئی پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔

مغلوں کے زمانے میں خواجہ سراؤں کو ناظر کا دفتر دیا جاتا تھا اور ان کو بہت سے فرائض سرانجام دینے ہوتے تھے۔ وہ حرم کی حفاظت پر لگی ہوئی عورتوں اور خواجہ سراؤں

پر نگرانی رکھتے تھے اور ان سے ہر روز رپورٹ طلب کرتے تھے کہ حرم میں کیا کیا ہوا اور کون کون آیا۔ جب حرم کی عورتیں معمولی قسم کے شکار وغیرہ پر جاتی تھیں یا مچھلی پکڑنے کے شوق میں دریا یا تالاب پر جاتی تھیں تو خواجہ سرا ان کے ہمراہ جاتے تھے اور ان کی نگہبانی کرتے تھے۔

مغلیہ دور میں، اور اس سے پہلے بھی کئی امیر گھرانوں میں ایسے لڑکوں کو ملازم رکھ لیا جاتا تھا جو مخنث ہوتے تھے۔ یہ لڑکے بڑے وفادار ہوتے تھے اور اپنے مالک کے ہر حکم کو بجا لاتے تھے۔ کئی خاندانوں میں مالک انہیں ایک رقم دیکر خرید بھی لیتا تھا۔ ان لڑکوں کی رہائش، کھانے پینے اور جیب خرچ وغیرہ کی ذمے داری مالک پر ہوتی تھی۔ یہ لڑکے تمام گھر میں بلا روک ٹوک جہاں چاہیں جا سکتے تھے اور گھر کی مستورات اور نوجوان لڑکیوں کا بھی ان سے جی لگتا تھا۔ بہت سے ایسے مخنث ملازم لڑکے گھر میں ملی اور مہمانوں کی دی ہوئی بخشش سے اچھی خاصی رقم اور تحفے تحائف جوڑ لیتے تھے۔ ایسے لڑکے مالک سے اپنی وفاداری کی بنا پر گھر میں ہی بوڑھے ہو جاتے تھے اور صرف موت ہی انہیں گھر سے جدا کرتی تھی۔ آخری مغلیہ دور میں گھروں میں مخنث ملازم رکھنے کا رواج اس لیے کم ہو گیا تھا کیونکہ اڑوس پڑوس میں لوگوں کی اس پر نظر رہتی تھی اور ہر ایک آدمی اس سے چھیڑ خانی کی کوشش کرتا تھا جس سے اس بڑے گھر کی بھی بدنامی ہوتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں یہ رواج کم و بیش ختم ہی ہو گیا تھا۔

خواجہ سرا کے لغوی معنی ہیں — خصی غلام جو گھروں میں آ جا سکے اور ناظر اور ہیجڑا اور نامرد۔ مجازاً وہ خصی انسان جو سلاطین، امرا، وزرا اور رؤسا وغیرہ کے محلسراؤں میں بطور دربان یا چوبدار حاضر رہتے تھے اور احکام رسانی کی خدمت بجا لاتے تھے۔ ہندوستان میں لوگوں کو خصی کرنے کا رواج مورخین کے مطابق تورانی، ایرانی اور ترکستانی حاکم اور سلاطین اپنے ساتھ لائے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کئی مشرقی ممالک میں زانی کی سزا یہ تھی کہ اس کا عضو تناسل کاٹ دیا جاتا تھا۔ بہت سے لوگ اس تکلیف سے جانبر ہی نہیں ہوتے تھے۔ اگر کوئی بچ جاتا تو اسے محلسراؤں میں جھاڑو دینے یا دربان کی ذلیل خدمت پر لگا دیا

جاتا تھا۔ جو سلاطین اور امرا ایسے ممالک سے ہندوستان آتے اور اقتدار حاصل کیا۔ انھوں نے اپنے محلسراؤں میں مقامی ہیجڑے ملازم رکھے۔ اس طرح سے ہندوستان میں ہیجڑوں اور خواجہ سراؤں کی اہمیت ہوگئی اور یہ لوگ آہستہ آہستہ منظم ہوگئے اور اپنی تعداد کو بھی جائز اور ناجائز طریقوں سے بڑھانے لگے۔

اگرچہ کسی کسی عہد میں ہندوستان میں بھی خواجہ سراؤں اور ہیجڑوں نے کافی ترقی کی اور اعلیٰ سرکاری اعزاز اور عہدے حاصل کیے' لیکن اس کی ابتدا ملک خطا سے ہوئی۔ اس ملک میں ان کے اقبال کا ستارہ کوئی تین ہزار سال پہلے ایسا چمکا کہ ان کے وارے نیارے ہو گئے۔ خواجہ سراؤں کو یہانتک ترقی ملی کہ وزیر اعظم کا عہدہ ان کے واسطے مخصوص ہوگیا اور رفتہ رفتہ وہ بادشاہ گر بن گئے۔ جسے چاہا تخت پر بٹھا دیا اور جسے چاہا اتار دیا۔ جب تک خطا کی حکومت قائم رہی' خواجہ سرا اسی طرح اقتدار میں رہے۔ ہاں جب تاتاریوں نے اہلِ خطا پر فتح پالی تو یہ لوگ ان عہدوں سے ہٹا دیئے گئے اور اپنی اصل خدمت پر مقرر ہونے لگے۔ بعد میں بعض بادشاہوں نے ان عہدوں پر بھی عورتوں کو مقرر کیا اور قلما قنیاں دربانی کے کام کو انجام دینے لگیں۔ لیکن جب اس انتظام میں دشواریاں پیش آئیں تو خواجہ سراؤں کا پھر محل سراؤں میں داخلہ ہوگیا۔

علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ملک کافور نے جو ایک خواجہ سرا تھا بہت ترقی کی۔ اس میں مردانہ خصوصیتیں زنانہ خصوصیتوں کے مقابلے میں زیادہ تھیں۔ وہ ایک بہادر اور وفادار انسان تھا اور دکن میں فوج کا سپہ سالار بن کر گیا اور کئی فتوحات حاصل کیں۔ مغل بادشاہ احمد شاہ کے زمانے میں ایک اور خواجہ سرا جاوید خاں تھا جو بادشاہ کی والدہ قدسیہ بیگم کے ساتھ مل کر حکومت کیا کرتا تھا۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے عہد میں محبوب علی خاں کا دور دورہ تھا۔

مغل سلطنت کے ختم ہونے کے بعد اگرچہ قانوناً خصّی کرنے پر پابندی لگ گئی تھی لیکن جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے' اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ پولیس میں اس کی کوئی رپورٹ نہیں ہوتی تھی اگرچہ ہیجڑوں کے گروہ کسی نہ کسی کو اپنے گروہ میں

لاکر خصّی کرتے رہتے تھے۔ اس کے برعکس ہیجڑے زیادہ منظم ہو گئے اور ان کی آبادی بڑھتی گئی اور ان کی رسموں اور رواجوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ ان کے نام بلاشبہ عورتوں پر ہوتے تھے، ہندووانہ نام بھی اور مسلمانی بھی مگر صرف یہی فرقہ ایسا تھا جس میں مذہب کو کوئی دخل نہیں تھا۔ ہیجڑا خواہ کسی مذہب میں پیدا ہوا ہو، ہیجڑا تھا اور اس ناطے سے سب بھائی بھائی تھے اور مل کر ایک ہی چھت تلے رہتے تھے۔ ہیجڑوں کا کوئی بھی معاملہ ہوتا ساری ہی برادری ایک جٹ ہو کر کام کرتی اور ضرورت پڑنے پر لڑتی۔

ہیجڑوں کے ہر ایک گروہ کا ایک چودھری ہیجڑا ہوتا تھا۔ کسی کو اپنے گروہ میں شامل کرتے تو چودھری کی اجازت لیتے۔ پھر اس کو خصی کرنے کی (اگر ضرورت ہے) رسم میں بھی چودھری کی مدد لی جاتی۔ چودھری اس نئے لڑکے سے دس دفعہ پوچھتا کہ وہ عضوِ تناسل کو کٹوانے کے لیے تیار ہے اور اگر وہ دس دفعہ ہاں کر دیتا تو لڑکے کو دس دن اور رات بالکل تنہائی میں رکھا جاتا۔ گیارھویں روز صبح اسے ایک منتخب جگہ پر لایا جاتا اور اس کے کپڑے اتار کر برف سے ٹھنڈا پانی اُس کے سارے جسم پر ڈالا جاتا۔ پھر اسے کوئی بے ہوشی لانے والی چیز دو تین مرتبہ سنگھاتے مگر یہ زیادہ اثر نہ کرتی اور لڑکے کو دُکھ تکلیف کا احساس رہتا۔ پھر دو مضبوط ہیجڑے اس کو بازوؤں سے بڑی مضبوطی سے پکڑ لیتے اور دو اس کی ٹانگوں کو پکڑتے۔ ایک اور ہیجڑا اس کے عضوِ تناسل پر برف کا پانی پھر پھینکتا اور عضوِ تناسل کو جڑ سے ایک مضبوط دھاگے سے کس کر باندھ دیتا، اتنا کس کر کہ لڑکے کو بڑی طرح درد ہونے لگتا۔ تمام ہیجڑے زور شور سے گانا بجانا اور ناچنا شروع کر دیتے تاکہ لڑکے کی چیخ و پکار ان کے شور میں دب جاتے۔ آناً فاناً ایک چھوٹے مگر تیز استرے سے ایک ہی ضرب سے عضوِ تناسل کو کاٹ کر ایک ہیجڑا تیزی سے بہتے ہوئے خون کو ایک مٹی کے برتن میں اکٹھا کر لیتا تھا۔ لڑکا اکثر بے ہوش ہو جاتا تھا اور پھر زخم پر بے شمار ٹھنڈا پانی ڈال کر، اسے خشک کر کے طرح طرح کے مرہم لگا دیتے تھے۔ لڑکے کو ایک دن اور رات سونے نہیں دیا جاتا تھا اور پندرہ دن کے سخت درد اور تکلیف کے بعد زخم بھرتا تھا۔ کئی دفعہ تو فوطوں کا صفایا بھی ساتھ ہی کر دیا جاتا تھا۔ کئی تحقیقی مطالعوں سے یہ پتہ چلا ہے کہ خصی

ہونے کے بعد اس آدمی کی نیند اڑ جاتی ہے، ڈراؤنے خواب آتے ہیں، یادداشت اور نظر کم ہو جاتی ہے، ذہانت پر فرق پڑتا ہے اور آواز کھُر کھُری ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس ظالمانہ رسم سے لڑکے کی زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک انسانی مشین بن کر جیتا رہتا ہے۔

ہیجڑوں کے اپنے اپنے گھرانے ہوتے ہیں جن کی پہچان ان کے جسم پر گُدے ہوئے مختلف نشانوں سے ہوتی ہے۔ ہر گھرانے کی اپنی روایتیں اور اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ ان کا چودھری زندگی بھر کے لیے چنا رہتا ہے اور اس کی موت پر ہی دوسرا چودھری چنا یا نامزد کیا جاتا ہے۔ مختلف گھرانوں کے آپس کے تعلقات بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ ان کا نظم و نسق کا اپنا طریقہ ہے اور کبھی پولیس تک کوئی جھگڑا نہیں پہنچتا۔ شکایتیں اور جھگڑے اپنی پنچایتوں میں یا اپنے چودھری سے طے کرا لیتے ہیں۔

جب کوئی ہیجڑا مر جاتا ہے تو کوئی رسم ادا نہیں کی جاتی۔ نہ کوئی روتا اور آنسو بہاتا ہے کیونکہ خون کا رشتہ کسی سے کسی کا نہیں ہے۔ مردے کو چاہے وہ کسی مذہب کا ہو دفنایا جاتا ہے ہیجڑے اپنے مردے کو عموماً رات کے وقت لے جاتے ہیں تاکہ لوگ انہیں دیکھیں نہیں۔ مردے کو بھی سفید کفن پہناتے ہیں اور ساتھ جانے والے ہیجڑے بھی سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ مردے کو بیٹھنے کی پوزیشن میں لاکر اس کے لکڑیاں باندھ دی جاتی ہیں تاکہ وہ سیدھا ہی رہے۔ اسے اسی طرح سیدھا لے جاتے ہیں اور قبر کھود کر سیدھا اسی طرح نیچے اتار دیتے ہیں۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے آج تک کسی ہیجڑے کا جنازہ نہیں دیکھا۔

ہیجڑوں کا ذریعۂ معاش مانگنا اور تہواروں اور خوشی کے موقعوں پر گھروں سے کپڑے اور روپے لینا ہے۔ انھیں نہ کوئی ملازمت دیتا ہے اور نہ یہ کرتے ہیں۔ یہ اپنا ذاتی کام دھندا ضرور کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے کیونکہ اپنے مخصوص طریقوں سے اچھا پیسہ کما لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ ہیجڑے تو اتنے امیر ہیں کہ دلی کے مختلف علاقوں میں بڑے بڑے سجے ہوئے مکانوں میں شان سے رہتے ہیں اور نوکر چاکر رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہیجڑے بوڑھے ہو جاتے ہیں تو دوسرے ہیجڑے ان کی پوری مدد کرتے ہیں اور کوئی ہیجڑا بے یار و مددگار

نہیں رہتا۔ ہیجڑوں کا ایکا مشہور ہے۔

ہیجڑوں کے حلقے بنٹے ہوئے ہوتے ہیں اور ہیجڑے صرف اپنے حلقوں میں جاتے اور مانگتے ہیں۔ یہ حلقے کافی بڑے ہوتے ہیں اور پورے گروہ کو ذریعۂ معاش مہیا کرتے ہیں۔ دلی کی آبادی ان کی آبادی کے مقابلے میں بہت زیادہ رفتار سے بڑھی ہے اور ہزاروں بچے ہر روز پیدا ہوتے ہیں اور شادیوں کا موسم ہو یا نہیں کہیں نہ کہیں شادی ہوتی ہی رہتی ہے۔ ہیجڑے ہر گھر میں خوشی کے موقعے پر پسند کیے جاتے ہیں اور بچے کے ہونے پر اور شادی بیاہ پر ان کا آنا مبارک سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی اگر کوئی چاہے کہ ان سے بچ جائے (کیوں کہ اب یہ ساڑھی کے علاوہ عام گھر سے بھی لڑکا ہونے پر یا شادی میں ایک سو ایک روپے سے کم نہیں لیتے) تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ان کی سراغ رسانی مکمل اور بے عیب ہوتی ہے اور پیچھے کی طرف گلی میں رہنے والا بھی ان سے نہیں بچ سکتا۔ وہ ہر محلے میں جمعدارنی، چوکیدار، نوکروں چاکروں اور چھوٹے چھوٹے بچوں سے پوچھتے رہتے ہیں کہ کسی کے کوئی بچہ تو نہیں ہوا یا ہونے والا تو نہیں ہے کسی کے ہاں شادی ہونے والی ہے یا نہیں، پچھلے سال جو گھر میں بہو آئی تھی، اس کے کچھ ہونے والا ہے یا نہیں۔ نائینوں اور پنڈتائنوں سے رابطہ قائم رکھتے ہیں، دائیوں سے پوچھتے ہیں اور ہسپتالوں کے چکر لگاتے ہیں۔ اپنی نیگ مانگنے کی روایت کو مضبوط کرنے کے لیے ہیجڑے اور خواجہ سرا اپنے آپ کو "جنت کی چڑیاں" کہتے ہیں تاکہ ان کا ہر گھر میں استقبال ہو۔

ہیجڑے کہیں بھی رہیں، انہیں عام شہریوں سے کٹ کر الگ تھلگ رہنا پڑتا ہے کیوں کہ بدنامی میں وہ رنڈیوں کے برابر ہی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے کہ ان میں سے اکثر ہیجڑے جو قدیم دلی کی الٹی سیدھی بستیوں میں رہتے ہیں بدفعلی کو ہی ذریعۂ معاش بنا لیتے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں ہے، سوا سو سال سے ایسا ہی ہوتا آرہا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے کمرے کرایے پر لے رکھے تھے یا کوئی بھی تاریک اور اجاڑ کونا، کھنڈر، دیوار، نالہ یا پیشاب خانہ اس کام کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں۔

پرانی دلی میں کئی مقامات پر ایسے بدنامی کے اڈے رہے ہیں۔

ہیجڑوں کی اکثریت لمبی عمر پاتی تھی۔ آج بھی صورتِ حال مختلف نہیں ہے۔ دلی میں حاجی مشتاق سب سے پرانا زنانہ ہے اور حوض قاضی کے تھانے کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہتا ہے۔ اس کی عمر اب پچاسی سال کے قریب ہوگی۔ اسے زندگی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ دلی کے زیادہ تر ہیجڑے اسی کے چیلے ہیں۔

ہیجڑے اپنے اتحاد کو اپنی بڑی طاقت سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ سیاست میں حصّہ نہیں لیتے لیکن ان کے ایک چودھری نے ایک مرتبہ دلی میں ہیجڑوں کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا — "سیاسی لیڈر بننے کے قابل صرف ہمارے طبقے کے لوگ ہو سکتے ہیں کیونکہ ہمارا نہ کوئی بیٹا ہوتا ہے، نہ داماد" اس جملے میں سیاست میں کنبہ پروری پر کتنی گہری چوٹ کی گئی ہے۔

ہیجڑے دلی کے سماج کی بڑی رونق ہیں۔ آج اس گھر پر بھیڑ ہے تو کل اُس گھر پر اللّٰہ کے پیدا ہونے پر ہیجڑوں کی رونق کچھ الگ ہی ہوتی ہے۔ ہیجڑوں کو دیکھ کر خوشی کے موقع پر سب گھر والوں کے چہرے کِھل جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جنّت کی چڑیاں خوشی کے موقع پر گھر پر نہ پہنچیں تو خوشی ادھوری سی رہتی ہے۔

بازاروں میں بھی یہ خوب رونق کرتے ہیں۔ ذرا دیکھئے بازار سجا ہوا ہے۔ شاید کسی تہوار کی آمد آمد ہے۔ یہ اس دکان پر اتنی بھیڑ کیسے اکٹھی ہے۔ اچھا ہیجڑے ہیں! بھئی کیا عمدہ ساڑھیاں پہنی ہیں۔ دور سے دیکھو تو نوجوان، خوبصورت اور اچھے گھروں کی عورتیں لگتی ہیں۔ صرف پاس آنے پر پتہ لگتا ہے کہ ہیجڑے ہیں۔ ہیجڑے ساتویں دن یا مہینے کے مہینے گھوم پھر کر دکانداروں سے پیسے اکٹھے کرتے ہیں۔ اب کوئی تہوار آیا ہے تو یہ خاص 'پھیرا' ہے۔ مین تہوار کے دن آنا بہت سے ہیجڑے پسند نہیں کرتے۔ دلی کے لالہ لوگ اور دوسرے دکاندار دھیلی روپے کو نہیں دیکھتے۔ خوشی سے سب پیسے دے رہے ہیں اور ہیجڑے ہاتھ نچا نچا کر اور دونوں ہتھیلیوں سے تالی بجا کر دعا دے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ تماشائیوں کی بھیڑ ہیجڑوں کے پیچھے چل رہی ہے۔

ہیجڑوں کے یہ خوشگوار پہلو ہیں جن کا دلی والے پہلے بھی مزہ لیتے تھے اور آج بھی لیتے ہیں۔ شاید اتنا فرق ضرور آگیا ہے کہ قدیم زمانے میں ہیجڑے اس وقت کے سماج کا ایک اہم حصّہ تھے۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں یہ اہم فرائض بھی ادا کرتے تھے اور سماج میں انہیں قدر کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا۔ امیروں اور حاکموں کے گھروں میں ان کا آنا جانا تھا۔ آج یہ سماج کا ایک الگ تھلگ ٹکڑا ہیں اور عام لوگ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے (کچھ بھی ہو، خوشی کے موقعوں پر ہیجڑے اپنی آمد سے اور اپنے ناچ گانے سے ہر چھوٹے بڑے کو محظوظ کرتے ہیں۔



ہندو اور مسلمان دوستوں کی ساتھ ساتھ قبر اور سمادھی

تہذیب اور وضعداری

وہ تہذیب اور وضعداری جو دلی میں قدیم زمانے میں لوگوں میں تھی، شاید اب کبھی دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ عمدہ اخلاق، اعلیٰ طور طریقے، مہذب سلوک، حد درجہ شائستگی اور تحمل دلی کی تہذیب کے نمایاں نشان تھے اور دلی والوں کی پہچان انہی سے ہوتی تھی۔ پھر ایسا نہیں تھا کہ یہ کسی مخصوص طبقے کی خصوصیتیں ہوں۔ دلّی کے ہر چھوٹے بڑے، امیر، غریب، خواندہ اور ناخواندہ میں یہی تہذیب اور شائستگی ملتی تھی۔ اس تہذیب کے بننے اور سنورنے میں صدیاں صرف ہو گئی تھیں۔ ایک مشترکہ تہذیب صدیوں کے باہمی میل جول سے وجود میں آئی تھی اور دلی کے افراد کی زندگی مکمل طور پر اس سے عبارت تھی۔

دیکھو نگہِ شوق سے دلّی کے نظارے
تہذیب کی جنت ہے، یہ جمنا کے کنارے!

دلی والوں کو اپنی تہذیب اور اپنی زبان دونوں پر فخر تھا۔ اردو کا دور دورہ تھا اور اس کی بنیاد وہی زبان تھی جو دلی اور میرٹھ کے علاقوں میں مدتوں سے بولی جا رہی تھی۔ دلی کی تہذیب اور اس کی ٹکسالی زبان کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور ایک کا دوسرے کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جوں جوں اردو نے ترقی کی، یہ دلی والوں کی زندگی اور تہذیب کا ایک اٹوٹ حصّہ بن گئی۔ اردو سے پہلے دلی میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ بھی فارسی بولتے اور لکھتے تھے۔ فارسی کے بہت سے شعرا دلی میں تھے۔ اس زبان

نے بھی دلی کی تہذیب کو سنوارا تھا۔ دلی کے لوگ بہت عرصے تک فارسی زبان استعمال کرتے رہے۔

دیوان خانے

ملاقاتیوں کو دیوان خانے میں بٹھایا جاتا تھا اور انہیں جھک کر "آداب عرض"، "تسلیمات" اور "بندگی" وغیرہ کہا جاتا تھا مسلمان اپنے ہندو دوستوں اور مہمانوں کو "از ایں جانب رام رام" بھی کہتے تھے۔ بیٹھنے کے بعد ملاقاتی اپنی عمر، مرتبے اور تعلق کے مطابق "نوازش"، "کرم"، "شکریہ" اور عنایت" وغیرہ بھی کہتے تھے۔ گفتگو میں میزبان اور مہمان دونوں حد درجے شائستگی برتتے تھے۔ بلند آواز سے بولنا، بات کاٹنا اور اپنی بات پر اڑے رہنا بے ادبی کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ گفتگو شروع کرنے سے پہلے ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی جاتی تھی اور مزاج پوچھا جاتا تھا۔ اس کے لیے بھی نہایت مہذب طریقہ استعمال کیا جاتا تھا مثلاً "مزاج مبارک یا مزاج شریف؟"، "گھر میں سب خیریت تو ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔

دیوان خانے خالص ہندوستانی ڈھنگ سے سجے ہوتے تھے۔ فرش پر سفید دودھیا چاندنی بچھی ہے اور چاندنی کے چاروں کونوں پر لوہے یا سنگِ مرمر کے گنبد نما میر فرش دھرے ہیں۔ اجلی اجلی چاندنی پر چاروں طرف مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں۔ گاؤ تکیوں پر ہر روز کے استعمال کے لیے تو سفید غلاف چڑھے رہتے لیکن خاص خاص موقعوں پر ریشمی یا کارچوبی غلاف چڑھا دئے جاتے تھے۔ صدر مقام پر ایرانی قالین بچھے ہوتے ہیں اور مسند کے اوپر دیوار میں ایک خوشنما طاق بنا ہوا ہے جس میں ایک آئینہ لگا ہوا ہے۔ چھت میں جھاڑ فانوس اور ہانڈیاں لٹکی ہوئی ہیں۔

دیوان خانہ مردانہ نشست کا کام تو دیتا ہی تھا مگر طرح طرح کی محفلیں اور مجلسیں بھی اس میں ہی منعقد ہوتی رہتی تھیں، یہاں گھر کی عورتیں نہیں آتی تھیں۔ کبھی بیت بازی ہوتی، کبھی ادبی محفلیں جمتیں، کبھی تاش، پچیسی یا شطرنج کی بازیاں ہوتیں، کبھی طلسم ہوشربا کی داستان سنائی جاتی، کبھی گانے بجانے کی محفل جمتی تو کبھی رقص و مجرا بھی ہو جاتا۔ ایسے موقعوں پر دیوان خانہ خوب سجایا جاتا اور مزید انتظامات کیے جاتے۔ حقے اور پیچواں لگ جاتے۔

گلاب پاش سے گلاب چھڑکا جاتا۔ موتیا کے گجرے اور کنٹھے گلوں میں ڈالے جاتے چنگیریوں میں چنبیلی کے پھول اور عطر میں بھیگی ہوئی روئی رکھی جاتی۔ چاندی کے خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں دیسی پان کی گلوریاں رکھی جاتیں۔ الائچیاں، زردہ اور قوام وغیرہ علیحدہ رکھا جاتا۔ پان کھائے جاتے، حقے کے کش لگتے، خمیرے کی لپیٹیں اٹھتیں۔ محفل جمتی، آپس میں بولیاں ٹھولیاں ہوتیں۔ آوازے کسے جاتے، ضلع جگت اور پھبتی بازی ہوتی اور خوش گپیوں اور نوک جھونک میں سارا دن یا ساری رات کٹ جاتی۔

شعرا دلی کے اس وقت کے شعرا اپنی وضع، سج دھج اور اپنی آن بان کے لیے مشہور تھے۔ تہذیب اور شرافت کے پتلے تھے۔ مشہور شاعر میر درد شرافت اور بردباری کے پیکر تھے اور ایک ایسے درویش صفت انسان تھے جن کا قناعت تکیہ اور بچھونا تھا۔ خدا جو دیتا اسی پر صبر کر لیتے اور کسی محرومی کا شکوہ کبھی زبان پر نہ لاتے۔ محرم کے دنوں میں وہ اپنے گھر پر مجلسیں کرتے تھے جن میں شہر کے رؤسا اور شرفا شامل ہوتے تھے۔ شاہ عالم ثانی بھی ان مجلسوں میں شریک ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بادشاہ کی ٹانگوں میں ایک ایسی محفل میں بیٹھے بیٹھے درد ہونے لگا اور انھوں نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں جو خلافِ ادب بات سمجھی جاتی تھی۔ چونکہ بادشاہ اس وقت محفل میں شریک ہونے والے ایک فرد تھے اور میر مجلس خود دردؔ تھے انھوں نے نہایت شائستگی سے مگر مضبوطی سے بادشاہ کی توجہ اس بے ادبی کی طرف دلائی۔

میر تقی میر اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے تھے۔ انھیں دلی سے عشق تھا۔ مگر بدقسمتی سے تنگ دستی نے انھیں مجبور کر دیا کہ دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے جائیں۔ وہاں انھوں نے ایک مشاعرے میں شرکت کی جہاں شاعروں نے ان کے عجیب و غریب لباس کا مذاق اڑایا۔ کچھ لوگوں نے جنھوں نے میرؔ کو پہلے نہیں دیکھا تھا، یہ بھی جاننا چاہا کہ یہ عجیب وغریب ہیئت والا شاعر کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ جب میر کی باری آئی تو انھوں نے یہ اشعار پڑھے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو   ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ایک دفعہ میرؔ لکھنؤ کے بازار میں گھوم رہے تھے کہ نواب آصف الدولہ کی سواری اُدھر سے گذری۔ میرؔ کو دیکھ کر نواب صاحب نے اپنی سواری روک دی اور میرؔ صاحب سے پوچھا۔

"آپ نے محل میں آنا کیوں چھوڑ دیا؟"

"بازار میں کھڑے ہو کر بات کرنا خلافِ تہذیب ہے۔" میرؔ صاحب بولے اور آگے بڑھ گئے!

ذوقؔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ انھیں ایک دفعہ شاہِ دکن سے بلاوا آیا کہ آپ حیدر آباد آئیے ہم آپ کو دلّی دربار سے زیادہ وظیفہ اور تعظیم و تکریم دیں گے۔ ذوقؔ بھی دلی کے شیدائی تھے۔ انھوں نے یہ کہہ کر شاہِ دکن کی پیش کش ٹھکرادی۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

مرزا غالبؔ بھی اپنے بعد کے وقت میں بہت تنگ رہتے تھے مگر ان کی خودداری نے بھی کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ دلی چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ ۱۸۵۷ کی تباہی کے بعد دلی کے باشندوں کی حالت بڑی ابتر ہو گئی تھی مگر دلی والوں نے اپنی خو نہ بدلی۔ نہ ان کی وضعداری میں فرق آیا اور نہ رواداری میں۔ ہندو مسلمان اسی طرح آپس میں تعلقات قائم رکھے رہے۔ مرزا غالبؔ کے دوستوں اور شاگردوں میں بہت سے ہندو تھے جن میں مرزا ہرگوپال تفتہ ان کے کافی قریب تھے۔ ایک خط میں غالبؔ انھیں لکھتے ہیں۔

"میں تمام انسانوں کو اپنا رشتے دار مانتا ہوں اور تمام آدمیوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو اور عیسائی ہوں، اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ دوسرے کیا سوچتے ہیں۔"

دلی کی وضعداری کی ایک اور مثال ایک امیر ہندو کی اس کہانی میں بھی ملتی ہے۔ایک دن جب بڑی گرمی تھی اس نے اپنے نوکر کو بھیجا کہ جاکر بازار سے ایک عمدہ تربوز خرید کر لاؤ۔ نوکر نے ایک بڑا تربوز پسند کیا اور اس کے دام چکاکر پیسے دینے ہی والا تھا کہ اتنے میں ایک اور خریدار آگیا اور اس نے اس تربوز کو زیادہ پیسے دیکر خریدنا چاہا۔نوکراور اس خریدار میں ضد ہوگئی کہ وہی تربوز لیناہے اور اس کے لیے دونوں بڑھ چڑھ کر دام بولنے لگے ۔آخر میں وہ نوکر تربوز کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور گھر پہنچ کر اس نے اپنے مالک کو ساری بات سنائی کہ فلاں نوکر بھی اس تربوز کو اپنے مالک کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ یہ نوکر اس کے ایک دوست کا تھا جو ایک مسلم نواب تھا۔ وہ امیر ہندو تربوز لے کر فوراً اس نواب کے گھر پہنچا اور بہت معافی مانگ کر تربوز انہیں پیش کیا۔نواب صاحب نے اسی وقت تربوز کو دو حصوں میں کاٹا اور ایک خود رکھ کر، دوسرا اپنے دوست کو دے دیا۔

رواداری

رواداری دلی کی تہذیب کا ایک نمایاں نشان رہی ہے۔ اس کا تعلق عوام اور خواص دونوں سے رہا ہے۔ حکمرانوں نے بھی اپنی رعیت کے کسی بھی طبقے سے اپنی بات طاقت کے زور سے نہیں منوائی۔ قدیم دلی کے سلطانوں کی اور مغلیہ حکومت کی زبان فارسی تھی لیکن کسی بادشاہ نے زبردستی اسے غیر مسلموں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ جہانتک روزمرہ کی بات چیت کا تعلق تھا، مسلم حکمرانوں نے یہی کوشش کی کہ مسلمان مقامی بولی ہی بولیں۔ شیخ نظام الدین اولیا ہندی پسند کرتے تھے اور قوال بھی ان کے سامنے اکثر ہندی کے دوہے اور اشعار سناتے تھے ایک دن کسی نے حضرتِ گیسودراز سے پوچھ لیا ۔"پیرومرشد صوفی صاحبان فارسی اشعار، غزلوں اور نغموں کے مقابلے میں ہندوی (ہندی) کو کیوں پسند کرتے تھے؟" انھوں نے جواب دیا۔" فارسی اشعار اور غزلوں کی اپنی مخصوص خوبیاں ہیں مگر ہندی بڑی نرم اور دل کو چھونے والی ہے۔ اس کا اظہار سیدھا اور موثر ہے۔ اس کے گیتوں کو سن کر عجز اور انکساری کے جذبے بیدار ہوتے ہیں۔ اس میں ملائمت اور نزاکت ہے اور اس میں جذبات کا اظہار بڑی عمدگی

سے ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ بھی ہمارے وطن کی زبان ہے"۔ رواداری اور تہذیب کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی؟

مغل بادشاہوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ہندو اور مسلم تہذیبوں کی آمیزش سے ایک نئی مشترکہ تہذیب کی تعمیر میں شہنشاہ اکبر نے جو کوشش کی اس کا ذکر ہندوستانی تاریخ میں ہمیشہ کیا جائے گا۔ اکبر مذہبی رواداری کا بہت بڑا حامی اور رہنما تھا۔ وہ اپنی سلطنت کی رعایا کو بغیر کسی مذہبی تمیز اور تفریق کے ایک ملے جلے ہندوستانی تمدن میں گندھا دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے ہر ممکن سعی کی۔ اس نے کئی ایسی رسوم اور رواجوں پر پابندی لگادی جن سے ہندوؤں کے جذبات مجروح ہو سکتے تھے۔ مثلاً گئو کشی کو ممنوع قرار دیدیا۔ اسی طرح سے اس نے کچھ مخصوص حالات میں خاص خاص دنوں میں گوشت خوری پر بھی پابندی لگادی۔ ۱۵۶۴ء میں اس نے ہندوؤں پر لگا ہوا جزیہ ہٹادیا۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان کے ساتھ بھاگ جاتی اور اسے زبردستی مسلمان بنالیا جاتا تو پکڑے جانے کی صورت میں ایسی ہندو عورت کو واپس اس کے رشتے داروں کے حوالے کر دیا جاتا اور اسے دوبارہ ہندو بنا دیا جاتا۔ یہی قانون ان حالات میں مسلمان عورتوں پر بھی عائد تھا۔ اکبر اتنا فراخدل تھا کہ اس نے کئی ایسے ہندو رواجوں کو اپنالیا جو اسے ذہنی سطح پر قابلِ قبول لگتے تھے۔

اکبر کی خواہش پر "سنگھاسن بتیسی"، "اتھر وید"، "رامائن" اور "راج ترنگنی" کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا گیا۔ اس طرح سے مغلیہ حکومت میں وہ بنیادیں مضبوط ہوگئیں جن پر ایک مشترکہ تہذیب اور تمدن کی عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی شکوک مٹ گئے اور ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملاکر بھائیوں کی طرح اس ملک کے کونے کونے میں رہنے لگے۔ پیدائش کی، شادی بیاہ کی اور دوسری رسمیں زیادہ میل جول سے ایک سی ہوگئیں اور محض رسوم کی بنا پر یہ شناخت کرنا مشکل ہوگیا کہ یہ مسلم گھرانہ ہے یا ہندو۔ ایک وقت وہ آگیا کہ اگر داڑھی یا ٹوپی کا شناختی نشان نہ ہوتا تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں پہچان بھی مشکل ہو جاتی کیونکہ لباس بھی دلی میں کم و بیش ایک سا ہی ہوگیا تھا۔ مسلمانوں

کی قبا اور بعد میں اچکن اور اُن جیسی دستار ہندو بھی پہننے لگے تھے۔ کئی مقامات پر شیخ فرقے میں شادیاں مُلّا اور برہمن دونوں کراتے تھے۔ کچھ کی کھاڑی میں بسنے والے میمن فرقے میں جب بچہ ایک مہینے کا ہو جاتا تھا تو اس کا نام رکھنے کے لیے کسی سرسوت برہمن کو بلایا جاتا تھا۔ اسی طرح سندھ کے سُنّی میمنوں میں اور آغا خاں کے پیروکاروں میں کچھ توہمات وہی تھے جو ہندوؤں میں بھی تھے۔ راجستھان میں سورت گڑھ کے پاس گوگھا میری کا مندر تھا جس میں پوجا مسلمان پجاری کرتے تھے اور دان دکشنا لیتے تھے۔ الور اور بھرت پور میں میوا ور مینا فرقوں کے لوگوں کے نام ہندوؤں پر تھے جن کے آگے صرف خاں جڑا رہتا تھا مثلاً گوردھن خاں، گردھر خاں وغیرہ۔ وہ ہندوؤں کے تہوار بھی مناتے تھے۔

اس تہذیبی میل جول کا اثر بڑا دیرپا رہا۔ دلی، پنجاب اور دوسرے شمالی حصوں میں ہندوؤں نے اسلامی تہذیب کے بہت سے پہلو اپنے رہن سہن میں اپنا لیے۔ لباس پر تو اس کا نمایاں اثر پڑا ہی مگر ناموں پر خصوصیت سے ہوا۔ ہندوؤں کے نام بھی مسلمانوں پر ہونے لگے۔ سکندر لال، اقبال چند، شیام پرویز وغیرہ چند ایسے نام تھے جو ہندوؤں میں عام ملتے تھے۔ اندور کے گرد و نواح میں ایسے مسلمان پٹیل بستے تھے جن کے ہندو نام تھے۔ وہ ہندوؤں کا سا لباس ہی پہنتے تھے اور ان میں سے بہت سے بھوانی کی پوجا کرتے تھے۔ پوُرنیہ میں ہر مسلمان گھر میں ایک "خدائی گھر" ہوتا تھا جس میں اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ کالی کی پوجا بھی ہوتی تھی۔ ان کے یہاں شادی کی کچھ رسوم بھگوتی دیوی کے مندر میں بھی کی جاتی تھیں اور ہندو دیوتاؤں کو پھل پھول کا پرشاد چڑھایا جاتا تھا۔

منشی ذکا اللہ

دلی میں ایک سے ایک باکمال ہستی ہوئی ہے۔ ایسی کئی ہستیوں نے ہندوستانی تہذیب اور تمدن پر ایسے دیرپا نشان چھوڑے ہیں کہ یہ ہستیاں ہماری تہذیبی شاہراہ میں سنگِ میل بن گئی ہیں۔ انسانیت، بھائی چارے اور مذہبی رواداری میں ان کا اٹوٹ اعتقاد تھا اور ان لوگوں نے اپنی زندگی کو مثال بنا کر ہماری سماجی زندگی کو منور کیا۔ ایسی ہی ایک ہستی شمس العلما منشی ذکا اللہ تھے۔ ان میں نیکی، عجز

اور فراخدلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مذہبی تعصب انہیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا اور وہ ہندوؤں اور عیسائیوں دونوں سے پیار کرتے تھے۔ وہ صدقدلی سے محسوس کرتے تھے کہ سب مذاہب ایک ہی منزل کے مختلف راستے تھے۔ ان کے دوستوں میں سی. ایف. اینڈریوز شامل تھے جنھوں نے منشی ذکا اللہ پر ایک کتاب بھی لکھی۔ منشی ذکا اللہ پروفیسر رام چندر کے شاگرد تھے اور پروفیسر صاحب کی صحبت میں بہت رہتے تھے۔ جب پروفیسر رام چندر عیسائی بن گئے تو دلی کے بہت سے لوگوں کو یہ شک ہوا کہ شاید منشی ذکا اللہ بھی عیسائی مذہب اختیار کرلیں گے۔ لیکن یہ شک غلط ثابت ہوا اور سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے خود لکھا ہے کہ وہ ایک سچے مسلمان تھے جو ایک خدا میں یقین رکھتے تھے اور ساری انسانیت کو اسی ایک خدا کی اولاد سمجھتے تھے۔

سی۔ ایف۔ اینڈریوز لکھتے ہیں ــــ

”ان کے قریبی دوستوں میں ہندوؤں کی تعداد کافی تھی، دلی میں بھی اور الہ آباد میں بھی جہاں وہ میئور سنٹرل کالج میں پروفیسر کے طور پر کافی عرصے رہے۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہر تفرقے کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ میں ایسے بہت سے ہندوؤں سے ملا ہوں جنھوں نے منشی ذکا اللہ کی دل سے تعریف کی ہے۔ جب لوگوں کو یہ پتہ لگا کہ میں منشی ذکا اللہ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں تو سب سے زیادہ اثر انگیز چٹھیاں مجھے چند ہندوؤں سے ہی ملیں۔ ان کے بیٹے عنایت اللہ کے مطابق پنڈت تلسی رام کے بیٹے نے انہیں بتایا تھا کہ جب اپنے آبائی گھر میں وہ دئے جلا کر پوجا کرتے ہیں تو دعا کے وقت وہ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کے ساتھ منشی ذکا اللہ کا نام بھی لیتے ہیں۔ پنڈت کاشی ناتھ نے عنایت اللہ کو یہ بھی بتایا کہ آپ کے والد منشی ذکا اللہ جتنا ہندوستان میں کوئی دوسرا مسلمان ہندوؤں کا دوست نہیں تھا اور ہر ہندو ان سے محبت کرتا تھا۔ عنایت اللہ یہ بھی کہتے تھے کہ میرے والد ہندوؤں کو بہت اچھا سمجھتے تھے اور ان کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

ہندوؤں کے دھرم، اور عقائد اور رسوم اور ریتوں کے بارے میں جتنی واقفیت والد صاحب کو تھی، شاید ہی کسی دوسرے کو ہو۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے نصیحت دیتے ہوئے سنسکرت کی ایک ضرب المثل سنائی اور اس کے معنی سمجھائے۔ منشی ذکاءاللہ کے بارے میں ایسے ہی خیالات ان کے بیٹے عنایت اللہ کے ہی نہیں بلکہ سینکڑوں دوسرے لوگوں کے بھی تھے۔"

مشترکہ تہذیب کا نیا رنگ

دلی کی سیاست اور کسی حد تک معاشرہ بدلتا رہا مگر دلی والے ہر انقلاب کو سہہ گئے۔ جب انیسویں صدی کے آخر میں دلی کے حالات میں ٹھہراؤ آیا تو دلی کی سماجی زندگی انہی قدیم پیمانوں میں ڈھلنے لگی۔ جمعرات کو درگاہ حضرت نظام الدین پر جاتے، منگل کو ہنومان مندر اور اتوار کو بھیروں کے مندر پر حاضری دیتے۔ رام لیلا کی سواری میں شریک ہوتے اور پھول والوں کی سیر کے میلے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے۔ بسنت کا تہوار مناتے اور عید اور دیوالی پر ملے جلے جلسے کر کے چھوٹی بڑی دعوتیں دیتے۔ اسی دور میں دلی کے محلے محلے میں، بڑی حویلیوں، دیوان خانوں، سراؤں، دھرم شالاؤں اور باغات میں مشاعرے بھی بڑی شان و شوکت سے کرائے جاتے تھے۔

تفتہ، مجروح، داغ، حالی، آرزو، نوبت رائے اور راسخ کی صحبتوں کے بعد ایک نئی فضا دلّی میں قائم ہو چکی تھی اور مشترکہ تہذیب ایک نئے رنگ میں ابھر رہی تھی۔ گھر گھر ہولی کی رنگ پاشیوں میں مسلم دوستوں کو بلایا جاتا تھا۔ جنم اشٹمی کے تہوار پر رقص و موسیقی کی محفلوں میں مسلم موسیقار استادوں اور پنڈتوں کو دعوت دی جاتی تھی۔ عید الفطر کے موقع پر مسلم گھروں میں کئی کئی دنوں تک ہندوؤں کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔

حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، آصف علی، مولانا احمد سعید اسیر دہلوی، پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی، عبداللہ آٹے والے، رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن رائے بہادر بنگالی مل، سیٹھ دینا مل سومانی، ست نرائن گڑ والے، سید وحید الدین بے خود، سراج الدین سائل، پنڈت برج کشور زتشی شور، منشی مہاراج بہادر برق، حیدر دہلوی،

لالہ سری رام (مولف خمخانۂ جاوید)، علامہ پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی دہلوی، ڈاکٹر تارا چند اور ان کے بعد خواجہ محمد شفیع، شاہد احمد دہلوی، عزیز حسن بقائی، لالہ سر شری رام، سر شنکر لال، لالہ مرلی دھر شاد، رائے بہادر مادھو پرشاد اور سر سوبھا سنگھ چند ایسے ممتاز نام ہیں جو اسی تہذیب و تمدن اور نشستوں اور محفلوں کی پیداوار تھے۔

حکیم اجمل خاں کی شریف منزل بلی ماران میں، مولانا احمد سعید دہلوی کی حویلی کوچہ ناہر خاں میں، آصف علی کی کوچہ چیلان میں، خواجہ عبدالمجید کی حویلی مٹیا محل میں، ملا واحدی کا مکان نزد جامع مسجد دہلی، چھنّا مل والوں کی کوٹھی چاندنی چوک میں، نواب سائل دہلوی کی حویلی، لال دروازہ، لال کنویں پر اور سر شری رام اور شنکر لال کی کوٹھی کرزن روڈ پر چند ایسے ہی مرکز تھے جہاں سخن گو اور سخن فہم حضرات اکٹھے ہوتے اور شعر و شاعری بھی ہوتی اور دوسرے موضوعاتِ زندگی پر گفتگو بھی ہوتی۔ نہ کسی کو چھوٹے بڑے کا خیال ہوتا اور نہ ہندو، مسلمان کا۔ یہ محفلیں بذاتِ خود انجمن بھی تھیں، لائبریری بھی، اکاڈمی بھی، کلب بھی اور تہذیب و شرافت قدر و منزلت، رواداری اور وضعداری کے مدرسے بھی۔ اس صحبت میں سب کچھ سیکھا جا سکتا تھا، صبر، توکل، تسلیم و رضا، احترام، شفقت اور علم و ہنر بھی۔

پنڈت امر ناتھ مدن ساحر دہلوی دلی کی تہذیبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ عمر اسّی کے قریب، اونچا قد، لمبی چوڑی داڑھی۔ اردو شاعری کے عاشق اور استاد تھے اور فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ پرانے وضع دار انسان تھے اور ان کی جبہ و دستار کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ مسلمان ہیں۔ دراصل دلی کے پرانے دور میں دلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس اور ان کی بول چال میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ پنڈت دتاتریہ کیفی اور پنڈت تربھون ناتھ زار کو بھی دیکھ کر اور ان کی گفتگو کو سن کر یہی لگتا تھا کہ ہندو نہیں مسلمان ہیں۔ ان دنوں ہندو اور مسلمان ایک ہی مشترکہ تہذیب میں گندھے اور گتھے تھے۔ پنڈت امر ناتھ ساحر بہت خلیق اور متواضع تھے۔ ایک دفعہ چند لڑکے رات کے گیارہ

بجے ان کے گھر پہنچ گئے۔ چوڑی والاں سے جو راستہ بازار سیتارام کو جاتا ہے' اس کے سر پر ان کا بالا خانہ تھا۔ کنڈی کھڑکی تو پنڈت جی ہاتھ میں لالٹین لیے زینے سے اترے اور لڑکوں سے پوچھا۔" کیسے زحمت فرمائی؟" لڑکوں نے کہا۔" ہمیں آپ کا کلام سننے کا اشتیاق ہے۔ صبح کی گاڑی سے ہمیں واپس جانا ہے۔" پنڈت جی نے فرمایا۔ "کیا مضائقہ ہے" اور خندہ پیشانی سے سب کو اپنے ساتھ اوپر لے آئے۔ کمرہ کھول کر آرام سے بٹھایا' ان کی خاطر تواضع کی اور اپنا کلام سنا کر رخصت کرنے نیچے تک آئے۔

پنڈت جی سالانہ مشاعرے بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام کرتے۔ دور دور سے شعرا آتے تھے اور دلی میں اس مشاعرے کی دھوم مچ جاتی تھی۔

میر ناصر علی دہلوی' سائل دہلوی' تاباں دہلوی' بے خود دہلوی' ملا واحدی دہلوی اور علامہ راشد الخیری دہلوی اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ بھی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کے دم سے دلی کی زندگی میں وہ رنگ اور وہ آب وتاب تھی کہ اس کا اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ادب ان سب کا اوڑھنا اور بچھونا تھا اور یہ سب ایک مخصوص انفرادیت کے حامل تھے۔ یہ سب لوگوں سے پیار کرتے تھے اور لوگ ان سے پیار کرتے تھے۔ پرانی تہذیب' شرافت اور رواداری کا نمونہ تھے۔ چہروں سے شرافت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ خواجہ حسن نظامی کی تو نرالی سج دھج تھی۔ ہزاروں کے مجمعے میں ان پر ہی نظر پڑتی تھی۔ سر پر زرد کلاہ نما ٹوپی' شانوں پر زلفیں' سنہری فریم کی عینک' ہونٹوں پر لاکھ جمی ہوئی' ٹخنوں تک جبہ اور آنکھوں میں مقناطیسی کشش۔ تحریر و تقریر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔

ایک محفل میں اہلِ ذوق ہندو اور مسلمان احباب شامل تھے' ایک پنڈت جی نے فرمایا کہ تلسی کا یہ دوہا مذہبی رواداری کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔

تلسی اس سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ
سب سے ہل مل چلا لیئے ندی ناؤ سنجوگ

پنڈت جی دوہا سنا کر بولے کہ ایسا ہی کوئی اردو کا شعر سنایئے جس میں یہی تلقین ہو

اور ذات پات اور دھرم کا بھید نہ رہے۔ فوراً ایک مولوی صاحب نے غالب کا یہ مشہور شعر سنا دیا۔

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہوگئیں

ایک صاحب بولے وہ کیا کبیر کا دوہا ہے ـــ نہ کاہو سے دوستی، نہ کاہو سے بیر، تو ایک صاحب نے علامہ دتا تریہ کیفی کے دو اشعار فوراً سنا دئے۔ علامہ کیفی خود بھی اس محفل میں موجود تھے۔ اشعار تھے ـــ

حدِّ جغرافیہ سے شعر کی دنیا ہے جُدا
دور کیلاش سے دوگنہ بھی یہاں طور نہیں
ادب و شعر کا عالم ہے وہ وحدت آئین
کہ جہاں کافر و دیندار کا مرکوز نہیں

سب طرف سے واہ واہ بلند ہوئی۔ اتنے میں صاحب خانہ کی طرف سے پانوں کی طشتریاں آ گئیں۔ لالہ ہرنام داس جوہری کی طرف سے چاندی کے ورق لگا ہوا سیب کا مربہ پہلے ہی سے آچکا تھا اور طشتریوں میں رکھا ہوا تھا۔ مولوی احمد سعید صاحب کے یہاں سے حبشی حلوہ سوہن کی ٹکیاں آ چکی تھی۔ مشروبات کے لیے گلاس، اندرسے کی گولیاں، پھینی وغیرہ اندر زنان خانے سے نیچے لا چکے تھے۔ قہقہوں کے درمیان کھانا پینا شروع ہو گیا اور شعر و شاعری کے دور کے بعد یہ مجلس برخاست ہو گئی مگر صاحبِ خانہ نے ایک دو نجی دوستوں کو روک لیا۔ دیوان خانے میں رونق دیر تک قائم رہی۔

آدابِ محفل کا یہ حال تھا کہ جو جس پہلو بیٹھ گیا بیٹھ گیا۔ بار بار پہلو یا نشست بدلنا خلاف تہذیب تھا۔ اب جو اٹھے ہیں تو اکثر عمر رسیدوں کی تو کمر ٹیڑھی ہو گئی۔ مگر محفل میں جو مزہ آیا اس کے مقابلے میں یہ بے آرامی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ صاحبِ خانہ باہر تک آتے ہیں اور سب مہمانوں کو کہہ رہے ہیں ـــ

"زحمت فرمائی کا شکریہ۔" سب سے فرداً فرداً "شب بخیر" اور "آداب" اور "بندگی" کی گئی۔

ڈاکٹر تارا چند نے اپنے ایک لیکچر میں خسروؔ اور غالبؔ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ـــ

"خسروؔ اور غالبؔ، یہ دو آدمی ایسے تھے جنھیں نہ صرف اپنے وطن سے پیار تھا بلکہ جوذات پات اور مذہب سے بالاتر ہو کر انسان دوستی میں یقین رکھتے تھے۔"

یہ خسروؔ ہی تھے جنھوں نے ہندوؤں کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کیے تھے۔

"ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے۔"

ہندوؤں کا ذکر آیا تو ایک بات بے اختیار ذہن میں ابھرتی ہے۔ ہندوؤں میں پوجا ہوتی ہے تو عورتیں پوجا کرتے وقت یہ کہہ کر منتی ہیں کہ میں ایک چٹائی کا پنکھا، ایک جھجّر اور ایک تانبے کا سکّہ شری کرشن جی کو ارپن کر رہی ہوں۔ لیکن جن دنوں سرکاری زبان فارسی تھی تو قلعے کے درباری اور خاص طور پر کائستھ صاحبان جب پوجا میں بیٹھتے تھے تو کہتے تھے۔

"یک فلوس و یک مراحی و یک بادکش بہ سری کرشن ارپن بدہم۔"

انیسویں صدی کے اوائل میں شاہ عبدالعزیز دہلوی اور بعد میں سرسیّد احمد خاں نے دلی کی تہذیب اور یہاں کے لوگوں کی خوبیوں کا ذکر پُرزور الفاظ میں کیا ہے۔ سرسیّد لکھتے ہیں۔

"حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید اور کسی اقلیم میں نہ ہوں. ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا نگینہ ہے۔ ہر ایک علم و ہنر سے شوق اور دن رات لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتا ہے۔ ہر ایک کی بات میں اخلاق ایسا سمایا ہے کہ اگر ایک ایک بات ان کی لکھی جائے تو ہزار ہزار اوراق کی کتاب بن جائے۔ اس پر حلم ویسا ہی ہے، مروت ایسی ہی ہے۔ دوست

پرستی کا کچھ بیان نہیں، بغض وحسد کا نشان نہیں۔"

دلی کی وہ محفلیں، دیوان خانوں کی وہ رونقیں، لوگوں کی وہ وضعداری، شرافت اور مروت اب ایک یاد بن کر رہ گئی ہے۔ وہ صورتیں جو کب کی خاک میں مل چکی ہیں۔ اب کبھی نظر نہیں آئیں گی۔ ایک ایک شخصیت، ایک ایک انجمن بلکہ ایک ایک دنیا تھی۔ ایسے بھی لوگ تھے جن کے لیے اخلاص، شرافت، رواداری اور شائستگی ہی سب کچھ تھا اور جو مل جل کر جینے کو سب سے بڑی مسرت سمجھتے تھے۔ اور دلی تو وہ سرزمین ہے جس کی خاک تلے ایک دو نہیں ایسی سینکڑوں ہستیاں محوِ خواب ہیں۔ ہر شخص اپنی ذات کا یکتا، ایک نگینہ، ایک گوہرِ آبدار تھا۔ وہ سب لوگ ایک مخصوص، مشترکہ تہذیب کی پیداوار تھے جس کی بنیاد محبت اور اخلاص پر تھی۔



شطرنج کے کھیل

گنجفہ، شطرنج اور چوسر

دلی کی قدیم سماجی زندگی میں اندرونِ خانہ تفریحات کی بڑی اہمیت تھی. اس وقت کا سماج آج کی مانند دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا، ایک جو خوشحال اور امیر تھا اور دوسرا جو مالی طور پر پست تھا. فرق صرف یہ تھا کہ خوشحال اور امیر طبقے کے افراد کو کسی کام کے لیے بھی خود محنت کرنی نہیں پڑتی تھی اور ان کے پاس دنیا بھر کا وقت تھا. وقت گزاری کے لیے دوستوں کی صحبت ضروری تھی اور چند احباب اکٹھے ہونگے تو اندرونِ خانہ تفریحات کا خیال بھی پیدا ہوگا. ان تفریحات میں بلاشبہ کھانے پینے اور گفتگو کے علاوہ اس قسم کے کھیل بھی شامل ہونگے جن سے چند گھنٹے دل چسپی میں گزر سکیں. اس لیے گنجفہ، شطرنج اور چوسر کے کھیل اپنائے گئے. جب اعلیٰ طبقے میں یہ کھیل داخل ہوگئے تو عام طبقے کے افراد تک بھی پہنچ گئے. انسانی فطرت میں داخل ہے کہ ہر کھیل میں شرط لگا کر اسے زیادہ دل چسپ اور پرکشش بنالیا جائے. شروع کی یہ شرطیں بعد میں بالکل جوئے کی شکل اختیار کر گئیں اور امیر اور غریب دونوں طبقے میں گنجفہ اور چوسر جوئے کے کھیل بن گئے. شطرنج البتہ اس سے مستثنیٰ رہی اگرچہ ہار جیت کی شرط اس میں بھی دو فریقین کے درمیان لگتی رہی.

گنجفہ یا گنجیفہ بہت ہی قدیم کھیل ہے. ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ گنجفہ مہا بھارت کے زمانے میں بھی کھیلا جاتا تھا اور اس وقت اسے "گنجپہ" کہا جاتا تھا. مغلوں کے عہد میں جو گنجفہ شروع ہوا اسے "مغل گنجفہ" بھی کہا جاتا تھا. گنجفہ تاش کا ایک

کھیل ہے جو اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے " بابر نامہ " سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کھیل کی ابتدا ہندوستان میں سب سے پہلے مغل شہنشاہ بابر نے کی۔ اکبر کے زمانے میں غالباً اس کھیل میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں اور یہ تبدیلیاں خود اکبر کی کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ شہنشاہ گنجفہ کے بڑے شوقین تھے۔ دو قسم کے گنجفوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک جس میں بارہ رنگ کے ۱۴۴ پتے ہوتے تھے اور دوسرا جس میں آٹھ رنگ کے ۹۶ پتے ہوتے تھے۔ اول الذکر گنجفہ وسط ایشیا اور ایران میں کھیلا جاتا تھا اور غالباً وہیں سے ہندوستان میں آیا تھا۔ مغل گنجفہ دوسری قسم کے گنجفے کو ہی کہتے ہیں۔ دلی والے مغل گنجفہ ہی کھیلتے تھے۔ آٹھ رنگوں کے مخصوص نام یہ تھے۔

۱۔ غلام ۲۔ تاج ۳۔ شمشیر ۴۔ اشرفی (زرِ سرخ)
۵۔ چنگ ۶۔ برات۔ ۷۔ سکّہ (زرِ سفید) اور ۸۔ قماش

بارہ پتوں میں ایک شاہ، دوسرا وزیر اور باقی کے دس پتے ایک سے دس تک کے ہندسوں سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ایران میں آج کل گنجفہ میں تاش کی طرح ۵۲ پتے ہوتے ہیں۔ چار رنگ اور ہر رنگ کے تیرہ پتے۔ ایرانی رنگوں کے نام ہیں ـــ کشنیز، خشت، دل، سرو، تیرہ پتوں میں سے تین کے نام متعین ہیں یعنی شاہ، بی بی اور سرباز۔ باقی کے دس پتے لفظوں کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ مغل گنجفہ میں غلام، تاج، شمشیر اور اشرفی " بڑی بازی " کہلاتے ہیں اور باقی کے چار رنگ " چھوٹی بازی"۔ ہر ایک رنگ میں میر اور وزیر ہوتا ہے جنھیں تاج اور گھوڑی بھی کہا جاتا ہے۔ بڑی بازی میں دوسرے دس پتوں کو دس سے ایک تک یعنی اوپر سے نیچے گنا جاتا تھا لیکن چھوٹی بازی میں اس سے الٹ ہوتا تھا۔ میر یا تاج کو " مہتاب " بھی کہا جاتا تھا اور اشرفی یا زرِ سرخ کو " آفتاب " کہا جاتا تھا۔ " آفتاب " والی بازی دن میں کھیلی جاتی تھی اور مہتاب والی رات کو۔

گنجفہ کے پتے شکل میں گول ہوتے تھے۔ یہ ۲۰ ملی میٹر سے لے کر ۱۲۰ ملی میٹر کے سائز میں ملتے تھے اور انھیں عمدہ لکڑی یا ہاتھی دانت کے ڈبے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ

پتے عام طور پر موٹے کاغذ، کف لگے سخت کپڑے یا چمڑے کے بنائے جاتے تھے جن پر تصویریں یا نشان پینٹ کر دئے جاتے تھے۔ امیر گھروں میں ہاتھی دانت، کچھوے کے خول اور سیپ کے بنے ہوئے پتے بھی استعمال ہوتے تھے جو کافی مہنگے ہوتے تھے۔ گنجفہ عموماً دیوان خانوں یا بیٹھکوں میں کھیلا جاتا تھا۔ گنجفہ اور شطرنج دو ایسے کھیل ہیں جو مردوں میں بڑے مرغوب تھے اور جب وہ انہیں کھیلتے تھے تو انہیں کسی اور بات کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اکثر یہ لوگ بھوک پیاس کی بھی پرواہ نہ کرتے اور صبح سے شام ہو جاتی مگر یہ لوگ اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایسے موقعوں پر یہ لوگ عام طور پر گھر کی طرف کا دروازہ بند رکھتے تاکہ اندر سے کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ اگر گھر کی عورتیں کوئی ضروری پیغام بھی بھجواتیں تو صاحبِ خانہ نظر انداز کر دیتے۔ ہاں کھیلنے کے دوران اگر انہیں کسی شے کی متواتر ضرورت پڑتی تو وہ تھا پاندان یا لگے ہوئے پانوں کی طشتری اور حقہ۔ جو لوگ شراب پیتے تھے وہ اس کا انتظام بھی درپردہ بیٹھک میں ہی کر لیتے اور مستورات کو خبر بھی نہ ہوتی۔

مغل گنجفہ سے پہلے ہندو سلطنتوں میں "دش اوتار" گنجفہ کھیلا جاتا تھا۔ ان پتوں پر ہندو دیوی دیوتاؤں کی بڑی خوبصورت تصویریں پینٹ کی جاتی تھیں۔ "دش اوتار" سے وشنو بھگوان کے دس اوتاروں سے مراد تھی۔ "دش اوتار" گنجفہ میں ۱۲۰ پتوں کا ایک سیٹ ہوتا تھا جس میں دس رنگ کے بارہ بارہ پتے ہوتے تھے۔ ان میں سے چھیانوے پتوں پر رامائن کے مختلف واقعات کی جھلکی پینٹ کی ہوئی تھی۔ "دش اوتار" گنجفہ ابھی تک اڑیسہ، مغربی بنگال اور جنوبی ہندوستان کے کئی صوبوں میں کھیلا جاتا ہے۔ اگرچہ "دش اوتار" گنجفہ کی ہندو عہد کی تمام تصاویر یعنی پتے عجائب گھروں میں دستیاب ہیں لیکن قدیم زمانے میں یہ کیسے کھیلا جاتا تھا، اس کا تذکرہ کسی مستند کتاب میں نہیں ملتا۔

مغل گنجفہ کو کم سے کم تین آدمی کھیلتے تھے اگرچہ عام رواج چار آدمیوں کے کھیلنے کا تھا۔ پہلے پتوں کو لکڑی کے ڈبے میں سے نکال کر کپڑے کی ایک سفید چادر پر رکھ دیا

جاتا. شروع میں ایک ایک پتہ ڈالا جاتا ۔ پھر دائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا جاتا۔ اور پتہ چاہیئے ؟ یہ کھیل نمبروں کا ہوتا ہے اور آدمی اپنا پتّہ دیکھ کر دوسرا پتّہ مانگ لیتا۔ کم سے کم آٹھ یا نو نمبر ہونے چاہئیں. کل پتّے بارہ ہونے چاہئیں اور کسی بھی صورت میں تیرہ سے زیادہ نہیں. جب سب پتّے بنٹ جائیں گے تو کھیل شروع ہوجائیگا کھیل وہ آدمی شروع کرے گا جس کے پاس کوئی میر ہو۔ میر کے بارہ نمبر ہوتے ہیں اور گھوڑی کے گیارہ باقی کے پتوں کے نمبران کے نشانوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ میر اور گھوڑی اگر آجائے تو پھینک دیا جاتا ہے کہ گدھا جوائی آگئے۔ جس کے پاس پہلے "دون" یعنی جوڑا آجائے تو وہ جیت گیا۔ ایک ہی رنگ کے پتّے " رنگ " کہلاتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ کھیل " فلیش " کھیل سے بہت ملتا تھا۔ اِکّے کی، میر کی، گھوڑی کی اور نہلے کی دون افضل مانی جاتی ہیں۔

گنجفہ میں " بیٹھنے " کے لیے کم سے کم ۱۰ نمبر چاہئیں، وہ بھی موقعہ دیکھ کر۔ ورنہ ۱۲ یا ۱۴ پر بیٹھنا زیادہ ٹھیک ہے۔ ۱۵ یا ۱۶ پر بیٹھنا ایسا جس میں جیتنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بڑھیا ۱۶ میر اور چوکے کے ہوتے ہیں اور گھوڑی اور پنجے کے۔ " دون " کے بعد " سیسر " یعنی تین پتّوں کی بازی ہوتی ہے یعنی دو اٹھّے اور ایک اِکّا۔ پھر اس کے بعد " گل بسر " ہے جیسے دو میر اور ایک اِکّا یا دو گھوڑی اور ایک اِکّا۔ اس سے بھی بڑا " نقش " ہے جو ۱۷ یا ۲۱ نمبر کا ہوتا ہے۔ سب سے بڑا نقش میر اور نہلے کا ہوتا ہے یا گھوڑی اور دہلے کا۔ چھوٹا ۱۷ نمبر کا نقش میر اور پنجے کا یا گھوڑی اور چھکّے کا۔ اگر ایک ہی رنگ کا نقش ہو تو وہ عام نقش سے بڑا ہوگا۔ میر اور نہلا اگر ایک ہی رنگ کا ہوگا تو وہ سب سے بڑا یعنی " نقش ہم رنگ " ہوگا۔ جس کے پاس ایسا نقش ہوگا وہ آواز لگا کر کہتا ہے۔ نقش ہم رنگ، پیسے دو سنگ۔

شطرنج

شطرنج دلی والوں کا وقت گزاری کا شاید اہم ترین اور سب سے محبوب ذریعہ تھی

اس کھیل کو دوسرے کھیلوں کے مقابلے میں امیرانہ کھیل سمجھا جاتا تھا۔ ہارون الرشید کا قول تھا کہ "تفریح کے بغیر زندگی گزارنا بڑا مشکل ہے اور میرے خیال میں ایک حکمران کے لیے شطرنج سے بہتر کوئی تفریح نہیں ہے۔" ہندوستان میں شطرنج بہت قدیم زمانے سے کھیلی جاتی رہی ہے۔ مشہور مورخ میکڈانل کے مطابق چہار پہلو شطرنج (چتورنگ) کا ذکر پندرھویں صدی کے آخری اور سولہویں صدی کے ابتدائی سالوں کے ایک سنسکرت مصنف نے کیا ہے، حالانکہ اس کا وجود اس سے پیشتر بھی تھا۔ اس کھیل میں چار آدمی شامل ہوتے تھے۔ دو پاسے استعمال کرتے تھے۔ پاسہ پھینکنے کے بعد جو تعداد آتی تھی، ہر مہرے کو اسی کے مطابق چلا جاتا تھا۔ اس کھیل میں چونسٹھ مربعوں کا ایک تختہ استعمال کیا جاتا تھا اور ۳۲ مہرے آٹھ آٹھ کے چار مجموعوں میں استعمال ہوتے تھے۔ ہر مجموعے میں ایک بادشاہ، ایک فیل، ایک گھوڑا اور رتھ پہلی قطار میں اور دوسری قطار میں ان کے چار پیدل سپاہی ہوتے تھے۔ انہیں اس طرح رکھا جاتا تھا کہ کھلاڑی کی طرف بائیں ہاتھ کے کونے میں ہمیشہ رتھ ہوتا تھا۔ اس طرح اس میں چار بادشاہ ہوتے تھے۔ ہر ایک کی خدمت میں جو مہرے ہوتے تھے وہ فوج کے چار سپاہیوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ جب کہ وزیر غیر حاضر ہوتا تھا۔

ایک دوسرے مورخ بلینڈ کے خیال کے مطابق شطرنج کی ابتدا ایران میں ہوئی۔ تیمور یہی چہار پہلو شطرنج کھیلتا تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ شطرنج کے عام کھیل کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ اس نظریے کے مطابق موجودہ شطرنج اس کی مختصر شکل ہے۔ دراصل شطرنج کے ہندوستانی کھیل ہونے کے سوال پر کافی اختلاف رہا ہے لیکن امیر خسرو کے دور میں یہ اختلاف زیادہ نہیں رہا۔ خود امیر خسرو اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ شطرنج ہندوستانی کھیل ہی ہے۔ تاریخی شہادتوں اور ثبوتوں کے آئینے میں ہندوستان کا یہ دعویٰ کہ یہ کھیل اس کی ہی دین ہے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ موجودہ شطرنج کے علاوہ شطرنج کامل یا چہار بتی شطرنج بھی اس دور میں کھیلی جاتی تھی۔ تاہم ایک رائے یہ بھی رہی کہ شطرنج سب سے پہلے چین میں کھیلی گئی اور چینیوں نے ہی اسے ایجاد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ایک چینی سپہ سالار نے

ایجاد کیا تھا جو اپنے سپاہیوں کو کسی کھیل میں مصروف رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ سیاست میں حصہ نہ لیں۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی (۱۸۹۸) میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ چھٹی صدی کے آخری دور میں کسریٰ نوشیرواں کے دربار میں ایک ہندوستانی سفارت گئی تھی اور ایران میں شطرنج کی ابتدا اسی سفارت کے ذریعے ہوئی تھی۔ بہت سی اسلامی تاریخوں میں اس ہندوستانی سفارت کا ذکر ملتا ہے جو قنوج کے راجہ کے دربار سے گئی تھی۔

بان بھٹ کے ہرش چرت کے مطابق شطرنج ہندوستان میں ۲۵۰۰ سال پہلے کھیلی جاتی تھی۔ پتنجلی (۵۰۰ سال قبل مسیح) اور پاتنجلی نے بھی اپنی تحریروں میں شطرنج کا ذکر کیا ہے۔ ان تحریروں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ شطرنج کا گھر ہندوستان ہی تھا اب عام طور پر یہ اتفاق کیا جاتا ہے کہ شطرنج مشرق کا کھیل ہے اور غالباً ہندوستان ہی اس کا موجد ہے۔ ہندوستان سے یہ ایران پہنچی اور ایران سے عرب اور بہت بعد میں عرب سے یہ مغربی ممالک میں پہنچ گئی۔

عہد وسطیٰ میں شطرنج کو ہندوستان میں بڑا عروج حاصل ہوا اور ایک مشہور ہندوستانی کھلاڑی ابوالفتح ہندی نے اس کھیل میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی۔ امیر خسرو اور ملک محمد جائسی کے حوالوں سے پتہ لگتا ہے کہ یہ کھیل ہر طبقے میں بڑا مقبول تھا اور دلی میں شطرنج کافی کھیلی جاتی تھی۔ جائسی کی ایک منظر کشی میں سلطان علاؤالدین خلجی اور راجہ رتن سین کو چتوڑ کے قلعے میں شطرنج کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

مشہور شاعر مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے کہ دلی کے مرزا رحیم الدین حیا اور کرامت علی انیسویں صدی کے بہترین شطرنج کے کھلاڑی تھے۔ ان دنوں دہلی میں دو طرح کی شطرنج کھیلی جاتی تھی۔ ایک حاضرا اور دوسری غائب یعنی نابینا شطرنج۔ دلی کے عبدالحکیم غائب شطرنج کے ماہر کھلاڑی تھے۔ غائب یا نابینا شطرنج میں دونوں کھلاڑی پس پردہ بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے نمائندے ان کے بتانے پر مہرے شطرنج کے بورڈ پر چلاتے ہیں۔

اکبر کو اس کھیل کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز وہ بیربل کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ چوتھی یا پانچویں چال کے بعد اکبر کو محسوس ہوا کہ اس کی ہار یقینی تھی۔ پردے کے پیچھے ایک راستہ حرم سرا میں جاتا تھا۔ اکبر چپکے سے اس راستے میں سے نکل گیا تاکہ اپنی راجپوت مہارانی سے صلاح کر سکے کہ اس صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیئے۔ مہارانی کا مشورہ یہ تھا۔ ”بیربل کو اپنا وزیر جیتنے دیجیے، اور آپ اپنی اگلی چال کا پیادہ مارلیں۔ اس طرح بیربل پھنس جائے گا اور بازی ہار جائے گا۔“

بیربل سمجھ گیا کہ بادشاہ اندر محل سرا میں صلاح لینے گئے ہیں اور وہ بازی چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ جب اکبر واپس آیا اور اس نے دیکھا کہ اس کا مخالف اس اثنا میں بازی چھوڑ کر چلا گیا تھا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے ایک قاصد بھیج کر فوراً اسے گھر سے بلوایا۔ قاصد نے لوٹ کر کہا کہ بیربل غسل کر رہے تھے اور انھوں نے کہا ہے کہ وہ کچھ دیر بعد آئیں گے۔ کافی وقت گزر گیا مگر بیربل نہیں آیا۔ بادشاہ طیش میں تھا اور اس نے پھر قاصد بھیجا اور بیربل کو فوراً طلب کیا۔ اسی دفعہ قاصد نے آکر یہ کہہ دیا کہ بیربل پوجا کر رہے تھے اور تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ بادشاہ کی بے صبری اور غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ لگی ہوئی شطرنج کی بازی کے آس پاس ہی چکّر لگا رہا تھا۔ اس نے تیسری دفعہ قاصد بھیجا اور اب کے یہ دھمکی دی کہ بیربل فوراً حاضر نہیں ہوا تو اسے سخت سزا ملے گی۔ چونکہ شطرنج کے کھیل میں کسی دوسرے سے صلاح کرنا خلاف قواعد تھا، بیربل نے قاصد کے ہاتھ یہ جواب لکھ کر بھجوا دیا۔ ”جہاں پناہ اگر آپ کا مقصد اپنے وزیر کے بدلے میں میرے پیادے کو مارنے کا ہے، تو اس کا اب کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بازی تو اسی وقت ختم ہو گئی تھی جب حضور خلافِ قانون درمیان میں ہی اٹھ کر صلاح مشورہ کرنے کے لیے اندر تشریف لے گئے تھے۔“

شہزادہ سلیم کو بھی جو بعد میں جہانگیر کے نام سے تخت پر بیٹھا شطرنج کا بڑا شوق تھا ایک دفعہ اس نے ایک راجپوت راجہ سے شرط لگائی کہ اگر وہ بازی ہار گیا تو اپنی دل پسند کنیزوں، جہاں بیگم، حیات بیگم اور دل آرام بیگم میں سے ایک کو راجپوت راجہ کو دے دیگا۔ جوں جوں بازی چلتی رہی، سلیم کو احساس ہو گیا کہ وہ بڑی

مشکل میں پڑ گیا ہے۔ پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی ان تینوں کنیزوں سے مشورہ کرنا خلاف از قانون تھا مگر اپنے آپ راجپوت راجہ سے بات کرتے ہوئے اس نے کنیزوں تک بازی کی صورتِ حال پہنچادی تھی اور اس امید میں تھا کہ شاید کوئی کنیز کسی اشارے سے اس کی مشکل کا حل بتا دے۔ جہاں بیگم کو حل تو کوئی نہیں سوجھا مگر اس نے اس ڈر سے کہ سلیم بازی ہارنے پر اس کو ہی راجپوت راجہ کے حوالے نہ کر دے یہ شعر پڑھا۔

تو بادشاہِ جہانی، جہاں زِ دست مدہ
کہ بادشاہِ جہاں را، جہاں بکار آید

(تو جہاں کا بادشاہ ہے، اپنے ہاتھ سے "جہاں" کو مت۔ کیونکہ جہاں کے بادشاہ کو "جہاں" ہی کام آتا ہے)

پھر شہزادہ سلیم حیات بیگم کی طرف سے کسی اشارے کی امید کرنے لگا۔ مگر اس نے بھی یہ شعر پڑھ دیا۔

جہاں خوش است ولیکن حیات می باید
اگر حیات نہ باشد، جہاں چہ کار آید

(جہاں تو ٹھیک ہے مگر اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے "حیات" چاہیئے۔ اگر "حیات" نہ ہوگی تو جہاں کس کام کا)

سلیم کو اپنی ان دونوں کنیزوں سے اپنے مسئلے کا حل نہیں ملا۔ وہ آخر میں دل آرام سے کسی حل کی امید کرنے لگا۔ دل آرام نے اس کے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا اور فی الفور یہ شعر پڑھا۔

شاہا دو رُخ بدہ، دل آرام را مدہ
پیل و پیادہ پیش کن، است کشت مات

(اے شہزادے دو رُخ دیدے مگر "دل آرام" کو مت دے ـــ پیل اور پیادہ آگے بڑھا اور گھوڑے کو چلا کر کشت دے اور بازی جیت لے)

شہزادہ سلیم دل آرام کے بتائے ہوئے حل پر بڑا خوش ہوا۔ چشم زدن میں اسے

چال سمجھ میں آگئی اور اس نے اسے کھیل کر اپنے مخالف کو ہرا دیا۔ کئی کتابوں میں تین کنیزوں کی بجائے چار کا تذکرہ ملتا ہے۔ چوتھی کنیز کا نام فنا تھا مگر شہزادہ سلیم نے اس سے حل کی توقع جہاں بیگم اور حیات بیگم کے بعد کی تھی۔ فنا کا جواب یہ تھا۔

'جہاں' و 'حیات'، وہمہ بے وفا است
طلب کن "فنا را" کہ آخر فنا است

("جہاں" اور "حیات" اور سب کچھ بے وفا ہے ۔ "فنا" کو طلب کر کیونکہ آخر ہر شے نے فنا ہونا ہے ۔ یعنی 'فنا' کو اپنے ساتھ رکھ)

انسانی زندگی افکار و حوادث کا مجموعہ ہے۔ انسان کو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے جہاں جسمانی طاقت کی ضرورت ہے وہاں اسے ذہنی تفریح بھی درکار ہے۔ دلی کے ایک حکیم کا قول ہے۔ "کھیل انسانی جسم اور ذہن کے نشو و نما کے لیے اشد ضروری ہیں۔ درونِ خانہ کھیل ذہن کو فرحت اور کشادگی بخشتے ہیں"۔ شطرنج ایک ایسا ہی کھیل ہے۔ اس کھیل سے زیادہ کسی اور کھیل میں اتنی یکسوئی اور انہماک کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کچھ لوگ اس کھیل کو منحوس سمجھتے ہیں، شاید اس لیے کہ اس میں الجھا ہوا انسان، جب تک کہ بازی کا فیصلہ نہ ہو جائے، گھر کے کسی کام کاج کی پرواہ نہیں کرتا اور ایک ایک بازی میں دن رات صرف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے مگر کسی بھی پہلو سے اس پر نحوست کا الزام نہیں لگ سکتا۔ یہ صرف ایک وہم ہے۔ ایسا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا جس سے یہ ثابت ہو کہ شطرنج کے کھلاڑی پر ناگہانی مصیبت نازل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس شطرنج کے بیشتر کھلاڑی صاحب اقتدار اور ثروت رہے ہیں۔ شطرنج کا کھیل دانائی اور یادداشت کی کسوٹی بھی سمجھا جاتا ہے۔ دلی کے چند حکمرانوں کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ جب وہ کسی آدمی کو بڑے عہدے پر مقرر کرنا چاہتے تو اس کی فہم و فراست کا امتحان شطرنج سے لیتے۔ اگر وہ آدمی شطرنج دانائی اور بردباری سے کھیلتا تو اسے ملازم رکھ لیا جاتا۔

جہانگیر کا شوقِ شطرنج تخت نشینی کے بعد اور تیز ہو گیا تھا۔ جب وہ ملکہ نور جہاں کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا تو اس کے سامنے ایک مربع فٹ کی بساط اور چھوٹے چھوٹے مہرے

نہ ہوتے تھے بلکہ محل کے اندر ایک مرصّع قطعۂ زمین پر مرمر اور موسیٰ کی پچی کاری کا ایک خوشنما تختۂ بساط ہوتا۔ اس پر حسین وجمیل داسیاں کچھ پیادوں کے لباس میں ملبوس ہوتیں، باقی بادشاہ اور وزیر کے روپ میں اپنے سر پر تاج رکھے، اسپ اور فیل اور رخ اپنے سروں پر خود لگائے، ہاتھوں میں نیزے، تلواریں اور ڈھالیں سنبھالے مہریں بن کر اپنے خانوں میں کھڑی ہوتیں۔ بادشاہ اور ملکہ اپنی بلند نشست گاہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے مطلوبہ مہرے کو مناسب خانے میں حرکت کرنے کی فرمائش کرتے اور وہ پری پیکر مہرا ایک دل رُبا انداز میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا اور اپنے رتبے اور درجے کے مطابق اپنے حریف پر وار کرتا، روکتا یا پٹ کر بساط چھوڑ دیتا۔ اسی طرح پوری بازی کھیلی جاتی۔

شطرنج کی کچھ عام اصطلاحیں یہ ہیں۔

بساط ——— تختۂ شطرنج۔

شاطر ——— چال چلنے والا یعنی کھلاڑی۔

فرزیں ——— وزیر کا دوسرا نام۔

چال ——— مہرے کی حرکت

رکن ——— مہرا۔

گھر ——— خانہ

اڑدب ——— بادشاہ کا اکیلا رہ جانا۔ کھیل کا بغیر ہار جیت کے ختم ہو جانا۔

کشت ——— بادشاہ کو خطرہ

مات ——— بادشاہ کے سامنے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہونا۔ شکست اور بازی کا خاتمہ۔

انگریزوں کی حکومت کے عہد میں، ہندوستان کے یوروپین باشندے مغربی ڈھنگ اور اصولوں سے شطرنج کھیلتے تھے۔ شطرنج کے ٹورنامنٹ شملہ اور دہلی میں باقاعدہ کیے جاتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہوتے ٹورنامنٹ میں (۱۸۹۹) دلی کے راجہ بالو نے جو مہاراجہ پٹیالہ کے محکمۂ کھیل کے انچارج بھی تھے ۲۸ میچوں میں سے ۲۷ جیتے تھے اور

انہیں شطرنج کا چیمپین قرار دیا گیا تھا۔ راجہ بابو نے شطرنج پر ایک کتاب " یارِ شاطر" بھی لکھی تھی جو ابھی تک شطرنج کھیلنے والوں کے لیے رہنمائی کی ایک مستند دستاویز مانی جاتی ہے۔ اس میں شطرنج کی ہر ممکن چال اور اس کے توڑ (اگر اس کا امکان ہے) کا ذکر ہے۔ شاید ہی کوئی دماغ سوز چال ایسی ہو جس کا اس کتاب میں ذکر نہ ہو۔ دو سو سے زیادہ بازی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں کے نقشے بھی دیے گئے ہیں۔

چوسر

چوسر یا چوپڑ ایک قدیم ہندوستانی کھیل ہے۔ اِسے پچیسی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے خالص ہندوستانی کھیل ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ چوپڑ مہابھارت کے زمانے میں بھی کھیلی جاتی تھی۔ کوروؤں اور پانڈوؤں میں اکثر چوپڑ کی بازی لگتی تھی۔ قدیم چتورنگ سے بھی چوپڑ کا تعلق رہا ہے۔ کئی قدیم تصویروں میں میرا کو کرشن کے ساتھ چوپڑ کھیلتے دکھایا گیا ہے۔ آئینِ اکبری میں نہ صرف چوپڑ کا نقشہ دکھایا گیا ہے بلکہ یہ بھی ذکر ہے کہ چوپڑ کھیلنے میں راجپوتوں کو بڑی مہارت حاصل ہے۔

آج کل کی طرح چوپڑ اس دور میں بھی الگ الگ رنگ کی ۱۶ گوٹوں سے کھیلا جاتا تھا۔ ایک رنگ کی چار گوٹیں ہوتی تھیں۔ عام طور پر چار کھلاڑی دو دو کی جوڑی بنا کر کھیلتے ہیں۔ ہر کھلاڑی چار گوٹوں سے کھیلتا ہے جنہیں وہ پانسہ پھینکنے کے بعد چوپڑ کے نقشے پر چلاتا ہے۔ آج کل کوڑیاں پھینکی جاتی ہیں۔ گوٹیں کالے، پیلے، ہرے اور لال رنگ کی ہوتی تھیں۔ کالی پیلی اور ہری لال کا جوڑا ہوتا تھا یعنی دو ساتھی کالی پیلی گوٹیں رکھتے تھے اور دوسرے دو ہری لال۔ چار الگ الگ آدمی بھی چوپڑ کھیل سکتے تھے۔

چوپڑ کی شکل کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ دو دو متوازی خطوط ایک دوسرے کو زاویۂ قائمہ پر کاٹتے ہیں۔ چاروں خطوط کے ایک دوسرے کو کاٹنے سے وسط میں ایک مربع شکل اور چار مستطیل بنتے ہیں جو اس مربع کے چاروں خطوط سے ملے ہوتے ہیں۔ مرکزی مربع کو چھوڑ کر چاروں مستطیلوں کو چوبیس مربعوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر مستطیل پر

آٹھ آٹھ مربعوں کی تین لائنیں ہوتی ہیں۔

چوپڑ کا کھیل ہندوؤں میں خاص طور پر مقبول تھا۔ راجپوت اسے بہت پسند کرتے تھے۔ مغل بادشاہ اکبر نے بعد میں چوپڑ کے اجزا کی بجائے انسانی شکلوں سے کھیلنے کو رواج دیا۔ اس کا ذکر بھی آئینِ اکبری میں ملتا ہے۔ اس قسم کے چوپڑ کو چنڈل منڈل کہا جاتا تھا۔

چوپڑ کے عام کھیل میں قرص یا پانسہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عموماً ہاتھی دانت کا بنا ہوا چار پہلوؤں کا ٹکڑا ہوتا تھا۔ مغلیہ دور میں چوپڑ کے ذریعے جوئے بازی صرف ادنیٰ طبقے تک ہی محدود نہ تھی۔ گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ جب شاہی خاندان کابل میں تھا تو ہمایوں شرط لگا کر ہی کھیلوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ ہر کھلاڑی کو بیس بیس اشرفیاں تقسیم کرتا تھا جو شرط کی ضمانت کے طور پر رکھی جاتی تھیں۔

چوپڑ خوشحال اور امیر گھرانوں کے مقابلے میں عام لوگوں کا کھیل زیادہ تھا۔ انگریزوں کے عہد میں انیسویں صدی کے آخر میں بلکہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھی دلی کے عوام میں چوپڑ بڑا مقبول تھا۔ اسے دلی کے دکانداروں سے لے کر پھیری والے، تانگے والے اور مزدور تک کھیلتے دیکھے گئے ہیں۔ گرمیوں میں درختوں کے سایے میں، باغات میں، گلیوں میں چارپائیوں پر، دکانوں کے چبوتروں پر لوگ چوپڑ کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ بلاشبہ عوام میں یہ جوئے بازی کا مشغلہ اور ذریعہ تھا۔

فرشِ پچیسی

فتح پور سیکری میں محلِ خاص اور دیوانِ خاص کے بیچ میں ایک پتھر کا بڑا فرش ہے جو پچیسی کا فرش کہلاتا ہے۔ یہ دیوانِ خاص کے فرش سے بلند اور محلِ خاص کے فرش سے نیچا ہے۔ اس کے مشرقی اور مغربی کناروں پر دالان در دالان تھے جن کا اب بہت تھوڑا حصّہ باقی رہ گیا ہے۔ فرش کے درمیان ایک بہت بڑا نقشۂ پچیسی کا بنا ہوا ہے۔ اس کے بیچوں بیچ لال پتھر کا ایک معمولی تخت بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ اس تخت پر بیٹھ کر پچیسی کھیلا کرتے تھے اور خانوں میں گوٹوں کی بجائے لونڈیاں سرخ، سبز، زرد اور سیاہ لباس میں

ہوتی تھیں جو اشارہ پانے پر ایک خانے سے دوسرے خانے میں منتقل ہوتی رہتی تھیں۔

نرد

اندرونِ خانہ کھیلوں میں نرد کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے مگر دلی میں اسے کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ کھیل ایرانی چوسر سے ملتا ہے اور اس کی ابتدا ہندوستان میں ہی ہوئی اگرچہ کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ نرد ایران سے ہندوستان میں لایا گیا تھا اور اس کے عوض ہندوستان سے شطرنج کی ابتدا ایران میں کی گئی تھی۔ مگر منتخب التواریخ کے مطابق ملک کا فورنری کا کھیل کھیلتا تھا جو ایک قسم کی نرد ہی تھی۔ نرد کے تختے اور اجزا بڑی نفاست سے بنائے جاتے تھے۔ یہ کھیل لکڑی کے ایک تختے پر کھیلا جاتا تھا جو مربع شکل کا ہوتا تھا اور اسے چوبیس مساوی مربعوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ پندرہ پندرہ کے تیس اجزا کی مدد سے اسے کھیلتے تھے اور ہر دو کا رنگ جداگانہ ہوتا تھا۔

دیگر کھیل

مغلوں کے عہد میں، خاص طور پر اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں، دلی میں اندرونِ خانہ کچھ اور کھیلوں کا آغاز بھی ہوا، مثلاً "مغل پٹھان"، "لم ترکی" اور "بھیڑ بکری"۔ یہ کھیل مختلف اشیا، مہروں اور کوڑیوں کی مدد سے کھیلے جاتے تھے۔ مگر ان میں دلچسپی انہماک اور توجہ اتنی نہیں پیدا ہوتی تھی جتنی شطرنج، گنجفہ یا چوپڑ میں۔ اسی لیے یہ کھیل صرف ایک چھوٹے طبقے تک محدود رہے اور آہستہ آہستہ معدوم ہو گئے۔

داستان گوئی کا فن

تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بہت قدیم زمانے میں، خاص طور پر مشرقی ملکوں میں، مشکل فلسفوں اور گہری مذہبی تعلیمات کو صرف زبان سے بیان کیا جاتا تھا اور صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح سے انسان کا تہذیبی سرمایہ ذہن ودماغ کے راستے سے، بغیر کسی تحریر کے، ایک سے دوسرے کو پہنچتا رہا۔ جب اتنی بڑی بات انسانی پہنچ سے باہر نہیں تھی تو داستانوں کو اس طرح زبانی بیان کرنا اور محفوظ رکھنا تو ایک معمولی بات تھی۔ پرانے وقتوں میں جہاں شام کا دھندلکا چھاتا تو بچے اپنی دادی ماں کے گرد کہانی سننے کے لیے اکٹھے ہوجاتے۔ اکثر چھوٹے بچے کہانی سنتے سنتے ہی سو جاتے۔ یہ کہانیاں لمبی بھی ہوتی تھیں اور چھوٹی بھی مگر سب کی سب دلچسپ ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے بچے لمبی کہانیاں سننا ہی پسند کرتے تھے جس میں ان کے اس جذبے کی کہ "آگے کیا ہوگا" کبھی تسکین نہ ہو یا بہت دیر سے ہو۔ بچے بار بار پوچھتے — "تو پھر کیا ہوا؟" جب کہانی ختم ہوجاتی تھی تو بچے انگڑائی لے کر مسکرا اٹھتے تھے لیکن دل میں یہ خیال چٹکیاں لیتا رہتا کہ کاش کہانی ابھی ختم نہ ہوتی۔ اس وقت کی دلی کی گھریلو زندگی کا یہ بڑا خوشگوار پہلو تھا۔ اور پھر یہ کہانیاں بچوں کو یوں ہی بے مقصد نہیں سنائی جاتی تھیں بلکہ ان کے ذریعے بچوں کو دنیا داری، پیار محبت، بہادری اور دلیری، نیکی اور اپنے مذہب اور ریت رواجوں کی جانکاری اور تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کہانیوں کا قدرتی طور پر بچوں پر بڑا اثر پڑتا تھا اور بچے بعد میں بھی جب آپس میں کھیلتے تو ان



قصہ گو

کہانیوں کے بادشاہ، شہزادوں اور پریوں وغیرہ کا ذکر کرتے اور بعض مرتبہ ان کے جیسی ہی اداکاری کرتے۔ ان کہانیوں کو سننے کے لیے صرف بچے ہی نہیں بلکہ گھر کے نوکر اور نوکرانیاں اور اکثر محلے کا چوکیدار تک آ جاتا تھا۔

قصہ گوئی انسان کی فطرت کا ایک حصّہ ہے۔ ہم دن رات چھوٹے چھوٹے قصے ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں، کچھ اصلی، کچھ من گھڑت اور کچھ سنے سنائے ایسا شروع سے ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ داستان گوئی ایک فن اور پیشے کا روپ اختیار کر گئی۔ ہندوستان کے کونے کونے میں، آج بھی دیہات اور چھوٹے قصبوں میں بھانڈ، نقّال اور فقیر شہر میں اور گا گا کر پرانے قصے سناتے ہیں۔ مگر چونکہ دلّی ادب اور تہذیب کا گہوارہ رہی ہے، داستان گوئی یہاں ایک الگ فن ہو گئی اور داستانوں کے بیان کے لیے اعلیٰ اور سجی ہوئی زبان استعمال ہونے لگی۔ داستان گو بڑے مقبول ہو گئے اور انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ کچھ داستانیں حقیقت پر بھی مبنی ہوتی تھیں، خاص طور پر تاریخی حکایتیں اور کچھ داستانیں محض خیال کی پیداوار ہوتی تھیں جن میں مبالغے سے بڑا کام لیا جاتا تھا۔ یہ جنوں، پریوں اور ایسے بادشاہوں اور شہزادوں کی کہانیاں ہوتی تھیں جو عجیب و غریب طاقتوں کے مالک ہوتے تھے اور جنھیں جنگ میں فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اپنے طلسماتی اور ہوش اڑانے والے واقعات کی بنا پر یہ بے حد دلچسپ ہوتیں۔ سننے والے بڑی لگن اور دلچسپی سے سنتے رہتے اور ایسا محسوس کرتے کہ سارے واقعات ان کے سامنے ہو رہے ہیں۔ بعض مرتبہ تو اُن پر اتنا اثر ہوتا کہ وہ یہ سوچنے لگتے کہ یہ سب کچھ ان پر ہی بیت رہا ہے۔

مغلوں کے زمانے میں داستان گوئی کو بڑا فروغ ملا اور مغل بادشاہوں اور امرا نے اس کی سرپرستی کی۔ فارغ البالی کا زمانہ تھا اور لوگ قدردان تھے۔ کسی شخص میں کوئی خوبی ہوتی تو اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا۔ عمدہ داستان گو اپنے فن کا مظاہرہ شاہی دربار میں بھی کرتے تھے۔ جن داستان گو فن کاروں کی دربار تک رسائی نہ ہوتی وہ عوام کو لطف اندوز کرتے۔ ایسے داستان گو مخصوص مقامات پر اپنے آپ کو جما لیتے تھے، جیسے جامع مسجد

کی سیڑھیاں، یا کوئی چوک چورا یا اور یا کسی امیر کی بیٹھک۔ داستان سننے کے شوقین وقت مقررہ سے بہت پہلے ہی پہنچ جاتے اور داستان گو کے سامنے بیٹھ جاتے۔ جہاں تک معلوم کیا جا سکا ہے کسی داستان گو کو اپنے فن کے مظاہرے سے مالی نفع یا آمدنی مقصود نہیں تھی اور نہ انہیں اس سے کوئی با قاعدہ آمدنی ہوتی تھی جس سے گزر اوقات ہو سکے۔ ہاں شاہی خاندان کے افراد، امیر اور شوقین لوگ داستان کے اختتام پر خوشی سے کچھ نقدی انعام اور دل بڑھاوے کے طور پر دیدیتے تھے جنھیں داستان گو قبول کر لیتے تھے۔ البتّہ شاہی دربار سے وابستہ داستان گو کو ایک باقاعدہ وظیفہ یا تنخواہ ملتی تھی۔

داستان گو اپنی داستان کے لیے ایک دن مقرر کر دیتا تھا۔ عموماً جمعرات کے دن وہ اپنی داستان سناتا اور اس روز ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو جاتی۔ ایک چھوٹے سے چاندی کے پیالے میں گھولوا (افیم سے تیار کیا ہوا) داستان گو کو سب سے پہلے پیش کیا جاتا۔ وہ اس میں سے ایک چسکی لے کر چنیا بیگم کو دوسروں کی طرف بڑھا دیتا۔ اس کے بعد داستان گو اپنی داستان شروع کرتا اور افیم کی چسکیوں کے درمیان یہ داستان صبح کی نماز کی اذان تک چلتی رہتی۔ داستان سننے میں لوگ اتنا کھو جاتے کہ مجال ہے کہ کوئی سننے والا آنکھ بھی جھپک لے۔

داستان گو اپنی داستان کو ایک انتہائی دل چسپ موڑ پر اُس دن کے لیے چھوڑ دیتا اور ساتھ ہی صبح کی نماز کی مسجد سے اذان سنائی دینے لگتی۔ داستان گو ایک انگڑائی لے کر کہتا۔" باقی داستان اگلی جمعرات کو سناؤں گا۔ خدا حافظ۔" لوگ اپنے اپنے کپڑے سنبھال کر گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر سو جائیں گے اور اپنی نیند پوری کریں گے۔ ویسے بھی جمعہ ہے اور یہ دلی میں بازاروں اور سرکاری محکموں کے لیے تعطیل کا دن ہے۔ داستان گو افیم کی ایک چسکی لے کر اپنے آپ کو سمیٹتا ہے۔ سننے والوں کے ذہن میں داستان کا یہ انتہائی دل چسپ موڑ بار بار ابھرتا ہے اور وہ اسی لمحے سے اگلی جمعرات کی شام کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ہر داستان مہینوں چلتی رہتی۔ کئی داستان گو ایک شام کی داستان ختم کرنے کے بعد فارسی میں کہتے۔" باقی داستان فردائے شب را۔"

ہر داستان گو کا اندازِ بیان الگ ہوتا تھا مگر ہر انداز لازماً بڑا پر اثر اور ڈراما ئی ہوتا تھا۔ داستان گو کی آواز بھاری، گونج دار اور بلند ہوتی تھی۔ اگر داستان میں مکالمے آجاتے تو داستان گو کا لہجہ کردار کے مطابق بدل جاتا۔ دوسرے لفظوں میں داستان گو نہ صرف داستان بیان کرتا بلکہ اس میں ضرورت کے مطابق اداکاری سے بھی کام لے لیتا۔ اس کا الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑا وسیع ہوتا اور وہ ہر ممکن طریقے سے داستان کی دل چسپی کو قائم رکھتا۔

ہر داستان گو، داستان گوئی کی حد تک، زبان پر قدرت رکھتا تھا اور جو زبان اور محاورے وہ استعمال کرتا تھا ان کا عوام پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ انہیں عمدہ اور نئے الفاظ سننے کو ملتے تھے۔ داستان گو اپنی داستانوں کو جگہ بہ جگہ مدتوں سناتا رہتا تھا اور وہ اسے زبانی یاد رہتی تھیں۔ کیا مجال ذرا سا بھی کہیں چوک جائے۔ بے وفائی اور بدبختی کے موضوعات پر داستانوں میں وہ اپنے طاقتور بیان سے سننے والوں پر رقت طاری کر دیتا تھا اور لوگ آنسو پونچھتے اور آہ بھرتے تھے۔ تفریح، مزاح اور تمسخر کے لیے وہ دوسرے حربے استعمال کرتا تھا، جن میں پھبتی اور ذومعنی فقروں کا استعمال شامل تھا۔ پھبتی کسنے کا ایک اپنا نرالا فن تھا اور اسے کسی کا مذاق اڑانے کے لیے ایک مہذب اور بے آزار طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ ذومعنی فقرات کو سن کر صرف وہی لوگ لطف اندوز ہوتے تھے جو ان کے دوسرے معنوں کو جو پوشیدہ ہوتے تھے، فوراً سمجھ جاتے تھے۔

موضوع کے اعتبار سے اس وقت کی داستانوں کو نیچے لکھی ہوئی چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ رزمیہ

۲۔ حزنیہ یا نشاطیہ

۳۔ عشق و محبت

۴۔ فریب اور عیاری

اس وقت کی داستانوں کے مقبول ترین مجموعے یہ تھے ـــ داستان امیر حمزہ، جو سب سے پہلے محمد تغلق کے زمانے میں امیر خسرو نے فارسی میں لکھی تھی۔ بعد میں اس کا ترجمہ

شہنشاہ اکبر کی تفریح اور دل جوئی کے لیے فیضی نے کیا تھا۔ طلسم ہوشربا، عمر عیار، بوستانِ خیال (جس کا ترجمہ دہلی کے خواجہ امن نے کیا تھا)، رانی کیتکی، گل صنوبر، اور گل بکاؤلی۔ ان میں سے بیشتر داستانیں اس اسلوب اور اندازِ بیان میں تھیں جس میں الف لیلےٰ کے مشہور قصے تھے۔

ہر داستان عجیب وغریب واقعات کے باوجود انسانی زندگی کے نشیب وفراز کی عکاسی کرتی تھی۔ عموماً داستان کسی ایسے شہنشاہ کے ذکر سے شروع ہوتی تھی۔ جس کے اقبال، شان وشوکت اور طاقت اور دولت کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا مگر جو زمانے کی چیرہ دستیوں سے کھنڈرات میں بدل جاتی ہیں۔ ہر داستان میں ایک سبق پوشیدہ ہوتا تھا جیسے نیکی کی بدی پر فتح، بزدلی اور مکاری کی شجاعت کے ہاتھوں شکست۔ اسلام اور کفر کی ٹکر میں اسلام کی فتح، وغیرہ وغیرہ۔ داستان گو موقعے اور محل کے مطابق اپنی داستان میں اشعار کا استعمال بھی کرتا تھا۔ اس سے تاثر میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا تھا۔ اشعار نثر کی یکسانیت کو توڑنے کا کام بھی کرتے تھے اور داستان کی دلچسپی بنی رہتی۔

داستان گوئی کے فن کو میر باقر علی نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا۔ زبان پر بھی جو قدرت ان کو حاصل تھی اور کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی ایک داستان کا ٹکڑا، فارسی آمیز زبان میں، ملاحظہ کیجیے:۔

"کمترین یہ داستانِ فرحت عنوان یہاں سے گزارش کرتا ہے کہ دختر کوچک باختر و بالا باختر ختم ہو چکا ہے اور لقائے بے بقا راندۂ درگاہ زمرد شاہ باختری مقابلہ جناب آفتابِ عالم تاب دولتِ قاہرہ و ماہتاب جہاں افروزِ سلطنتِ باہرہ۔ شکنندۂ گردنِ گردان، گردن کشانِ عالم، سلطان المعظم امیر المکرم صاحبِ قرانِ عرب وعجم سے بھاگ چکا ہے اور بڑے بڑے مغرور درِ دولت پر سر پُر غرور خم کر چکے ہیں۔ انہی ایام سرور انجام میں ایک روز کا ذکر ہے کہ میانِ بارگاہِ سلیمانی دربار جہاں بانی منعقد ہے اور قریب سو سوا سو طائفہ اربابِ نشاط حاضر۔ تھاپ طبلوں پر پڑ رہی ہے۔ آواز ہو شا ہو ش

و بادہ نوش کے ساتھ سارنگی کا لہرا اور بایئں کی گمک آسمان کو جا رہی ہے۔ طرح طرح کے باجے، الغوزے، بربط، بین، چنگ، دف، ڈھولک، رباب، سرنائی، سرسنگھار، طاؤس، ستار اور نسترن بج رہے ہیں۔ ساقیانِ گل فام جام و صراحی لیے ہوش اڑا رہے ہیں۔ .... اسی ہنگامِ عیش و نشاط میں دفعتاً ایک جوڑی عیارانِ طرّار اور جاسوسانِ ہوشیار کی گرد میں آلودہ اور پسینے میں غرق بہ حضورِ شہنشاہ والا جاہ گیتی، ظل اللہ سلطان سعد بن قباد غازی حاضر ہوئے۔ حدِّ ادب سے زمینِ خدمت کو بوسہ دے کر دست بستہ عرض کیا۔

شاہا بقائے عمرِ تو بادہ ہزار سال — لیکن بہ ایں حساب بصد حشمت و جمال
سالے ہزار ماہ و ماہے صد ہزار روز — روزے ہزار ساعت و ساعت ہزار سال

سرورِ عالم کی عمر دراز ہو۔ خانہ زاد حسبِ حکم عقبِ لقا باختری میں سرگرمِ رفتار تھے کہ ایک درۂ کوہ شل درِ فردوش نظر سے گزرا۔ جب اس سے سربند کیا تو وہ عالم دیکھا کہ ؎

شجر شجر سے ہویدا ہے رنگِ بوقلموں — چمن چمن ہے بنا رشکِ کلبۂ عطار
روش روش پر درختانِ باغ استادہ — قدم قدم پہ صنوبر جدا قطار قطار
بچھا ہے سبزے صحرا میں فرشِ مخمل سبز — کھنچا ہے روئے زمیں سائبانِ ابرِ بہار
ہر ایک غنچے سے پیدا ہے یار کی شوخی — ہر ایک گل سے ہویدا ہے رنگ و بوئے نگار
نسیم مست نکلتی ہے جوشِ مستی میں — لپٹ لپٹ کے جوانانِ باغ سے ہر بار
برنگِ بادہ کشاں مست ہیں وحوش و طیور — مثالِ صوفی سرمست وجد میں شمار

نمک خوار اس کیفیت و بہار میں مصروف تھے کہ سامنے سے ایک گرد تیرہ رنگ بلند ہوئی۔ جب قریب اس گرد کے پہنچے تو دیکھا کہ کئی ہزار فیلانِ کوہ شکوہ مست و سر بلند جن کی جُل ہائے مکلّل تا پاشنہ لٹکتی اور کاٹھیاں پولادی جوہر دار پشتوں پر کسی۔ ان پر دو جوانان زبردست سوار، ہاتھوں میں نشانِ سربلند اور اعلام فلک پیوند سنبھالے ،

پھریرے ہوا ے اڑاتے، گرد و پیش سانٹنے مار بھالے بردار، بان انداز، چرکٹے اگدا گد، بری بری غل مچاتے۔ ان کے بعد سانڈنی سوار، قطار در قطار سانڈنیوں کی گردنیں گودیوں میں لیے چوراسیاں لٹکتیں۔ گھنگرو بجتے، وردیاں شتری بانات کی پہنے۔ بتیا سرمئی سروں پر باندھے۔ پیچھے ان کے نیزہ بردار مرکبوں پر سوار۔ نیزوں سے نیستان پھولا نظر آتا تھا۔ ان کے بعد دو بادشاہ زبردست القاب و انصاف نام، تاجِ زریں برسر، قبائیں شہنشاہی دربر۔ بیچ میں ان کے لقائے بے بقا ایک فیلِ کوہ پیکر سوار۔ عقب میں اس کے یعقوب شاہ بن لقا اور بختیارک بن بختک بن الفش بن جادرش بن سگ سفید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور القا القا سے عرض کرتا جاتا تھا کہ خداوند! میرے نام تقدیر تباہی لشکرِ خدا پرستان فرمائیے۔ لقا نے کہا کہ خداوند! درۂ آذرکوہ اور عنطلیا بادیں تمہارے ہی ہاتھ پر بربادی ان نادیدہ خدا پرستوں کی کئی ہزار برس پہلے تقدیر فرما چکا ہے۔ یہ کہکر دونوں عیار آداب بجا، پچھلے قدموں ہٹ رخصت ہوئے اور یہاں بادشاہِ اسلام نے واسطے روانگی امیرِ کشورگیر کو ارشاد فرمایا۔ صاحبِ قرآن نے پہلوان عادی کو ہراول لشکر کا حکم سنایا۔ پہلوان عادی سلام کر اپنے خیمے پر آئے اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے روز لشکرِ ظفر اثر اور فوجِ دریا موج جناب صاحبِ قران دوراں مع پانچ ہزار پانسو پچپن سردارانِ نامی، بہادرانِ گرامی، دلیرانِ صف شکن اور جوانانِ تیغ زن، تین سو زنگی، چار سو فرنگی، پانسو مدائنی، چھ سو ہندی، سات سو خجندی، آٹھ سو ترکی، ایک ہزار عجمی، بارہ سو باختری، باقی شیرانِ بیشۂ عراق اور شاہ زادگانِ آفاق جو خاص خاندانِ قریش سے تھے مع امیرِ نامدار و بادشاہِ اسلام و مہرِ سپہرِ عیاری، قطبِ فلکِ خنجر گزاری شاہنشاہِ عیارانِ روزگار یعنی خواجہ عمر بن امیہ ضمیری نام دار اور شاگردانِ خاص چار مہتر، چودہ سرہنگ، ایک لاکھ اسی ہزار عیار و قائم مقام مہتر قران و اولادِ عمر روانہ ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدیع الزماں کہ صاحبِ قرانِ کشتی گیراں ہیں انکا دہ عالم ہے کہ ابھی گرد گلِ رخسار کے سبزۂ نو نے نمائش نہیں کی ہے۔ شعلۂ حسن بے درد نظر آتا ہے۔ شجر قامت باغِ نوجوانی میں مائل نوخیزی ہے اور غزالِ چشم شباب میں آمادۂ شوخی ہے ان کے دل میں شکار کی امنگ اٹھی۔ حکم کی دیر تھی

کہ میر شکار نے جانورانِ صید گیر، باز، جرہ، باشین، کوہی، کوہیلا، ترمتی، سیاہ گوش، چیتے وغیرہ کو درست کر درِ دولتِ شاہزادہ پر حاضر ہوئے اور ادھر ایک مرکب صبا رفتار کہ سم جس کے فراخی سپر طبلی بیٹھے ہوئے آنکھیں ابلی ہوئی جلد باریک نعل ہلال عید، غنچے سی تھوتھنی کنوتیاں چھوٹی چھوٹی، کلائیاں شیر کی سی، گردن مور کی، پٹھے ہاتھی کے سے، کمر چیتے کی اور رفتار کا وہ حال کہ ـــ

گر کھڑا ہو مشرق میں اور سامنے ہو اس کے عرب
ٹک اسے راکب کہے اتنا کہ چل تو یاں سے واں
پہنچے پائے صدائے ہاں نہ منھ سے تا بہ لب
پہنچے ہے یہ باد پیماں یاں سے واں اور واں سے یاں "

اس دَور میں امیر حمزہ کی داستانیں بڑی مقبول تھیں۔ ان میں بیان کیے ہوئے واقعات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے اور ان کی دل چسپی آخر تک بنی رہتی تھی۔ داستان گو ان کہانیوں کو اصل کتابوں سے ازبر یاد بھی کر لیتے تھے اور اپنی طرف سے دل چسپی کو بڑھانے کے لیے اضافہ بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کہانیوں کی زبان کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مغل دور میں خواندہ اور ناخواندہ عوام کی فارسی آمیز مشکل اردو کو سمجھنے کی صلاحیت حیرت انگیز تھی۔ امیر حمزہ کی داستانوں کے دو ٹکڑے، جو دلی کے عوام میں مقبول تھیں اور جنھیں داستان گو اکثر سناتے تھے، نیچے پیش کیے جاتے ہیں:۔

داستان دوسری ـــ پیدا ہونا نوشیرواں کا

" جب کہ نو مہینے گزر گئے، ایک روز گھڑی بھر دن چڑھا تھا کہ محل کے اندر سے ایک خواجہ سرا آیا اور کچھ آہستہ سے بادشاہ کے کان میں کہہ کر چلا گیا۔ بادشاہ نے اسی وقت دیوان برخاست کر کے خلوت کیا اور خوا بزرجمہر کو بلوا بھیجا اور فرمایا تم ساعت کو تولد کی سادھو، ہمارے گھر میں لڑکا ہوا چاہتا ہے۔ بزرجمہر نے واسطے دریافت کرنے وقت کے کئی گھڑیاں فرنگی و ہنڈی اپنے نزدیک رکھیں اور اضطراب ستاروں کے معلوم کرنے کو

ایک طرف حاضر کیے تختہ اپنے روبرو رکھا، قرعہ اپنے ہاتھ میں لے کر نیت کی
اور عین تولد کے وقت ڈالا۔ زائچہ لکھ کر طالع میں نظر کی تمام شکلوں کو
خوب سا دیکھ کر بادشاہ کو مبارکباد دی اور کہا یہ بادشاہزادہ ملک ایران
میں ستّر برس بادشاہت کرے گا بلکہ ہفت اقلیم سے خراج لے گا۔ پر ایک
مصاحب بد کے سبب سے سرگردانی بھی بہت سی اٹھاویگا۔ یہ کہہ کر فکر میں
نام رکھنے کی گئے کہ کیا نام رکھیئے۔ وہیں عیار آئے اور انھوں نے بادشاہ
کو بعد دعا کے خبر دی وہ جو چشمہ نوس خاص کئی برس سے سوکھ گیا تھا
آج خود بخود پانی آگیا اور رواں ہوا۔ بزرجمہر نے بموجب اسی خوشخبری
کے نوشیرواں نام رکھا اور بعضے راوی کہتے ہیں تولد کے وقت میں بادشاہ
کے ہاتھ میں جام شراب کا تھا۔ بزرجمہر نے بزبان فارسی بادشاہ سے کہا
اے قبلہ عالم نوش رواں کن اور مطابق اس مژدہ کے نوشیرواں نام رکھا۔
بادشاہ نے خواجہ بزرجمہر کو خلعت مرصع عنایت فرمایا اور حکم دیا کہ نقارخانے
اور توپ خانہ میں خبر دو کہ شلنغ ہو اور شادیانے بجیں۔ جونہی یہ خبر ہوئی توپ
خانے میں لگی مبارکباد کی سلامی دغنے اور نقارخانے میں جہاں تک نقارچی
تھے انھوں نے زربفت کے تھانوں سے نوبت خانے کو مڑھ کر سائبان اور
پردے جا دبے کے باندھے اور سقرلات کی زرنگار کرتیاں گلوں میں پہن کر
زری سرپیچ سروں پر باندھے ہوئے روپہری نقاروں کی جوڑیاں سب نے
اپنے آگے رکھیں اور زر بلونکو سینک کر بم پر پانی چھڑکا۔ مرصع نگار چوبین
اپنے اپنے ہاتھ میں لیں اور لگے بجانے۔ اس کی آواز ہر ایک غنی اور فقیر
نے سنی۔ جہاں تک امرا و وزرا تھے سب نے مبارکباد کی نذریں بادشاہ کو
دیکر تہنیت دی۔ بادشاہ نے نذریں لے کر موافق مرتبے کے خلعت دیا اور
بغداد میں صحبت جشن کی آراستہ ہوئی۔ جہاں تک دعاگو تھے، حاضر ہوئے اور
لگا مجرا ہونے۔ بھانڈ، بھگیتی، کشمیری قوال، ڈھاری، کلاونت سبھی تھے اور

رنڈیوں کے طائفے بھی حاضر ہوئے اور لگا مجرا ہونے۔ قانون، رباب، مردنگ، ستار، طنبورہ، چنگ، مورچنگ، سارنگی، تال، کٹھال، پکھاوج، منڈول، ڈھولکی، نیلادہ، برہ، خنجری لگے بجنے اوران کے سروں کے ساتھ وہ خوش آواز جہاں تک تھے پٹہ، خیال، دھرپت گیت سنگیت، تک چنگل، بند ترانہ، سرگم دستک فارسی، ٹھمری، کہروا، دادرا الگے گانے راگ کا ایک عجیب طرح کا عالم ہوا اور کینچیاں، ڈومنیں، میراثنیں، چونبوالیاں، رام جنیاں، نٹنیاں آئیں۔ ہرایک کا ہرایک طرف لگا ناچ ہونے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس روز اتنا مال وزر انعام میں خرچ کیا کہ ہرایک فقیر اپنے اپنے گھر میں آسودہ ہوگیا۔ ایک برس کی تمام ملک کی تحصیل رعیت کو معاف فرمائی۔

گیارھواں دن نوشیرواں کی تولد کو ہوا تھا کہ بادشاہ کو عین جشن میں خبر ہوئی کہ القش کا نواسہ بختیار کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔ بادشاہ نے سن کر بزرجمہر سے فرمایا یہ لڑکا تیرے دشمن کی اولاد میں سے ہے۔ اس کا نانا بھی تیرا دشمن تھا اور اگر یہ جیتا رہا تو مقرر تجھ سے دشمنی فرمائیگا۔ اس کو مارڈال تا فتنہ باقی نہ رہے۔ اگر جیتا رہا تو بہت سے فساد برپا کریگا۔ بزرجمہر نے ہاتھ باندھ کر عرض کہ بادشاہ کا اختر دولت ہمیشہ تابندہ رہے جوارشاد ہوا سو بجا ہے لیکن ابھی بے گناہ ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس پر مہربانی ہو۔ فرمایا مختار ہے لیکن آخر کو ایذا اٹھانی پڑے گی....''

امیر حمزہ کی ہی ''اکیسویں داستان'' کا یہ انتہائی دل چسپ اقتباس بھی دیکھیے:

''دوشنبہ قصہ کو یہاں تک عرض کیا تھا کہ امیر جشن میں رہے اور گستہم پہلو شکستہ لندہور کے روبرو سے بھاگا۔ ایک پہاڑ کے دامن میں جاکر اترا لیکن ہرروز امیر کی مخبر منگوایا کرتا تھا۔ ان روزوں میں عیاروں نے یہ خبر دی کہ کئی روز سے لندہور نے امیر کی معہ تمام سرداروں ضیافت کی ہے۔ چنانچہ آج لشکر میں کوئی نہیں ہے۔ سوائے مقبل وفادار کے تمام لشکر خالی

ہے۔ یہ نہایت خوش ہوا اور دو کنیزکیں مہرنگار کی ہمراہ اپنے لایا تھا کہ امیر نے ان کو محل میں مہرنگار کے دیکھا تھا۔ اونکو اپنے نزدیک بٹھایا اور شیشے شراب کے منگواکر اونکو پر نقلی مہر مہرنگار کی اور ایک خطا اشتیاق کا ان کو لکھ کر دیا اور کہا تم اپنی صورت مردوں کی بنا کر ہتھیار لگاؤ اور یہ شیشے لے کر حمزہ کے لشکر میں جاؤ۔ مقبل طلایہ میں ہے اوس سے جاکر کہو کہ مہرنگار نے حمزہ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ البتہ لے جائے گا پس کسی طرح یہ شراب امیر کو پلاؤ اور تم جلد چلی آؤ لیکن اس ولدالزنا نے اوس شراب میں کئی مثقال زہر ہلاہل ملایا تھا۔ اگر قطرہ اوسکا دریا میں گرے تو اوس کنارے کی تمام مچھلیاں مر جائیں۔ وہ شیشہ اونکو حوالے کر کے تعظیم کیا اور لشکرِ اسلام کی طرف روانہ کیا۔ یہ دونوں بد ذاتیں گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور لوازمہ مسافری کا اپنے ذات سے لگاکر اوسی شب لشکر میں آئیں۔ طلایہ داروں نے اونکو روکا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آتے ہو۔ جواب دیا کہ ہم ایران سے آتے ہیں اور امیر کے پاس جائیں گے۔ وہ لوگ ان دونوں سواروں کو مقبل کے پاس لے گئے۔ مقبل نے اون سے پوچھا تمہارے آنے کیا سبب ہوا۔ کہا ہم کچھ مخفی احوال رکھتے ہیں خلوت میں کہیں گے۔ مقبل نے اونکو اپنے نزدیک بٹھلایا اور سب لوگوں کو کنارے کیا اور اون کی طرف متوجہ ہوا۔ اون دونوں نے کہا ہم مہرنگار کنیزکیں ہیں، امیر ہمیں پہچانتے ہیں۔ ملکہ نے اپنی شرابِ خاص کی شیشی میں مہر کر کے بھیجی ہے اور یہ خط دیا ہے۔ ہم اوس وقت یہاں کا احوال سن کر قافلے سے جدا ہو کر آئیں ہیں۔ مقبل سن کر نہایت خوش ہوا اور کئی آدمی اونکے پاس بٹھلا کر لندہور کے لشکر کی طرف چلا۔ بارگاہ میں جاکر امیر کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا۔ آتشِ عشق مہرنگار کے سینہ میں مشتعل ہوئی تھی۔ اوس نے دو سوار بھیجے ہیں۔ بے اختیار کھڑے ہو کر خسروِ ہندوستان سے فرمایا تم مجلس اسی طرح رہنے دو مجھے کچھ کام ضروری

ہے۔ ایک ساعت میں آتا ہوں اور عرض کہا تم میرے عوض خسرو ہندوستان کی خدمت میں حاضر رہو کہ ناخوش نہ ہونے پاوے۔ یہ کہہ کر مقبل کے ہمراہ تنہا سوار ہو کر لشکر میں آئے اور خیمے میں جا کر اون دونوں کو بلوایا اور خلوت کی۔ دونوں نے مجرا کیا اور امیر کے روبرو وہ شیشی رکھ کر خط گزرانا۔ امیر نے اون دونوں کو دیکھا کہ واقعی مہر نگار کی کنیزکیں ہیں۔ خط کو لیکر دیکھا اور مہر نگار کی مہر کو لگے بوسے دینے۔ اون دونوں نے عرض کی کہ یہ شراب اپنے پینے کی خاطر بھیجی ہے۔ امیر نے اون شیشوں پر مہر دیکھی کہ لگی ہے۔ ایک شیشہ کا منھ کھولکر شمع کی روشنی کی طرف ملایا اور یاد کر کے مہر نگار کو شیشہ منھ سے لگایا اور پی گئے۔ جونہی وہ شراب حلق سے تلے اوتری ایک ہچکی امیر کو آئی اور گر کر بے ہوش ہو گئے۔ اون دونوں نے دیکھا کہ اس کا کام تمام ہوا کئی میخیں خیمے کی اوکھاڑ کر پچھاڑی کی راہ سے بھاگیں اور یہاں ہر چند امیر نے ہاتھ پاؤں مارے پر کوئی اندر نہ آیا کہ مہر نگار کی کنیزوں کے ساتھ خدا جانے کیا باتیں کرتے ہیں۔ امیر نے یہاں تک بے قراری کی کہ قالین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور زمین میں گڑھے پڑ گئے . . . .“

قوتِ بیان اور روانی کے اعتبار سے میر باقر علی اپنی داستانوں میں جادو نگاری کرتے تھے۔ داستانیں سب پرانی ہی ہوتی تھیں مگر میر باقر علی زیادہ تر اپنی زبان استعمال کرتے تھے اور ان کا طرز بیان بڑا دل نشین ہوتا تھا — یہ دیکھیے ان کی جادو بیانی کا ایک نمونہ' ان کی داستان کے ایک ٹکڑے میں :-

”ابھرا ابھرا سینہ' اٹھتی جوانی' آئینہ سا پیٹ' چیتے کی سی کمر —

برس پندرہ کا یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

کاسنی جوڑا پہنے' جامِ شرابِ گلفام ہاتھ میں لیے' مخمورِ بادۂ نشاط پیچھے دو خواصیں پشہ راں ہاتھوں میں' سامنے کچھ گاتیں ستار' تنبورہ'

ڈھولک کے ساتھ دھیمے دھیمے سروں میں چھوٹے چھوٹے دیس اور بھاگ کے خیال گا رہی ہیں۔ جونہی نگاہ شاہزادے کی اس جادو ادا پر پڑی، مرغ دل تیر نگاہِ ناز کا شکار ہوا۔

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی ۔۔۔ وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ ۔۔۔ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

شاہزادہ شکار کی جستجو میں خود شکار ہو کر واپس آ رہا تھا کہ۔

سامنے سے ناگہاں اک طرفہ باغ آیا نظر
وصفِ شادابی میں ہے جس کی مری قاصر زباں
لغزشِ مستانہ دکھلانے لگا پایۂ خیال
بس کہ اس کی چار دیواری تھی صاف آئینہ ساں

اور قریبِ باغ ایک میدانِ وسیع میں اکثر خیمے، ڈیرے، قناطیں، چھولداریاں استادہ ہیں۔ شاہزادہ بدیع الزماں قریب ان خیموں کے آئے تھے کہ ایک عیار نے آگے بڑھ کر آواز دی۔ "خبردار، ہوشیار۔ یہ لشکر رخشانِ تیغ زن کا ہے۔" شہزادے نے مرکب کو روک کر امیہ بن عمر سے کہا تم جا کر رخشان تیغ زن سے کہو، ہمارے سردار آپ سے ملاقات چاہتے ہیں ۔۔۔۔۔۔

بدیع الزماں مرکب بڑھا داخلِ لشکر ہوئے اور خیمۂ رخشاں پر آ دیکھا کہ ایک جوانِ زبردست جس کا چھاتہ گردن تیار، مچھلیاں بازوؤں کی ابھری ہوئیں، رانیں موٹی، آنکھیں سرخ، قربان میں کمان ہزار تیر کا ترکش شکلِ دُم طاؤس پیچھے پڑا، جوڑی خنجر آبدار کی کمر میں لگی، بڑی شان و شوکت سے بیٹھا ہے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شاگرد نے عرض کی کہ کسرت کا وقت آ گیا ہے۔ یہ سن کر رخشاں نے شہزادے سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔

قریب ہی زیر شامیانہ اکھاڑا ہرا کیا ہوا تھا جس میں پٹڑیاں ہر چہار سمت۔ کسرت اور کشتی کی ہر شے رکھی تھی۔ شاگرد لنگر لنگوٹے باندھے کچھ ڈنڈ

بیٹھکیں لگا رہے تھے اور کچھ دوسری کسرتیں کر رہے تھے۔ رخشاں نے بدیع الزماں کو ایک دنگل پر بٹھایا۔ چند جام شراب پی لباس اتار اکھاڑے میں اترا اور بہایت نخوت سے آواز دی کہ آؤ کون آتا ہے۔ آٹھ دس شاگرد اکھڑے ہوئے اور رخشاں نے بیٹھ کر کہا آؤ چت کرو۔ وہ سب لیٹ گئے مگر رخشاں نے ایک ایک کو اٹھا کر پٹک دیا اور کھڑے ہو کر ہنکارا ـــ کہاں ہیں رستم و سہراب، اسفندیار و گودرز، حمزہ و بدیع الزماں۔ آئیں اور حلقہ میری بندگی کا اپنے کان میں ڈالیں۔ بدیع الزماں کو اس لاف کی کب تاب تھی۔ بولے اے جوان ایسی شیخی بہادروں کو سزاوار نہیں۔ رستم وغیرہ تو خیر اپنی جگہ ہیں اگر آپ کہیں تو ہیں موجود ہوں، ہاتھ مل جائیں۔ رخشاں نے ہنس کر کہا، آئیے۔ شہزادہ سامانِ کشتی سے آراستہ ہو کر سامنے آیا۔ طاقت آزمائی کے بعد بہت دیر تک داؤ پیچ ہوتے رہے۔ شاید ہی کوئی داؤ ایسا ہوا جو نہ کھیلا گیا ہو۔ آخر میں شہزادے نے رخشاں کی کمربند زنجیر میں ہاتھ ڈال ایک ہی قوت میں سر سے بلند کیا اور نعرہ مارا کہ منم سرکردہ کشتی گیراں جہاں بدیع الزماں۔

اب جو شاہزادہ لشکر گاہِ اسلام میں پہنچا، خلوت ہوئی تو عشق نے زور باندھا، معشوقہ طناز کی یاد آئی۔ ہر چند ضبط کیا مگر کہیں عشق و مشک چھپتا ہے۔ ایک ہائے کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو گیا۔

یہ خبر خواجہ عمر بن امیہ تک پہنچی اور انہیں شاہزادے کے عشق میں مبتلا ہونے کی بھی آگہی ہوئی۔ فوراً بدیع الزماں کے خیمے میں پہنچے۔ شہزادے کو ہوش آیا، گھبرا کر پلنگ سے اترا اور شرمندہ شرمندہ سامنے بیٹھ گیا۔ امیر نامدار نے بھی زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ شہنشاہ نے جاتے ہوئے امیر نامدار سے کہا تم جا کر شہزادے کو سمجھاؤ کہ صاحب زادے ہم نے عالم شباب میں ایسے بہت کھیل کھیلے ہیں مگر انجام اس کا سوائے ذلت و خواری کے اور آہ و بے قراری کے کچھ نہ دیکھا کیونکہ معشوقانِ چمن روزگار سفتہ دشنی میں مشاق ہیں۔

دم دلاسے میں لگا لینا دل ان کا کھیل ہے
روز کرنا اک شکار ان کی ہیں ادنیٰ شوخیاں
سن کے نالہ عاشقوں کا کہتے ہیں کیا راگ ہے
ذبح کر کے دیکھتے ہیں سیرِ رقصِ بسملاں "

ہر داستان گو کی اپنی الگ زبان اور اندازِ بیان جدا ہوتا تھا مگر میر باقر علی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ کے ہنگامے کے آس پاس کا زمانہ تھا اور فارسی کی جڑیں اس وقت بھی بڑی مضبوط تھیں۔ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ داستان گوئی کی زبان دلی کے سب لوگ سمجھتے تھے، وہ بھی جو معمولی پیشوں کے آدمی تھے اور جن کا اکتساب علم برائے نام تھا۔ دلی کی یہی فضا، دلی کو علم وادب اور تہذیب کا مرکز بناتی تھی۔ اب تو داستان گوئی دلی کی ثقافتی تاریخ کا ایک بھولا بسرا حصہ بن گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آنے والی نسلیں حیرت سے سوچیں گی کہ ہندوستان میں کبھی اس قسم کا فن بھی عروج پر تھا۔ دلی کے اس وقت کے داستان گو بھی شاید یہ بات کبھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ دنیاوی جاہ وحشمت کے جس عروج وزوال، زمانے کی جن نیرنگیوں اور چیرہ دستیوں کا وہ اپنی داستانوں میں ذکر کر رہے ہیں، ان کا فن کبھی ان کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے تاریخ کی گود میں سما جائے گا!



سُر اور لَے

سُر اور لَے یعنی موسیقی کو ایک جادو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسے روح کی غذا بھی کہا جاتا ہے۔ موسیقی سے زیادہ موثر فن اور شاید کوئی نہیں ہے —— یہی وہ فن ہے جس کا اثر انسانوں پر ہی نہیں بلکہ تمام کائنات پر ہوتا ہے۔ ہندوستانی موسیقی کا آغاز ویدک زمانے سے ہوتا ہے۔ ایک عقیدہ یہ ہے کہ اس کی تخلیق خود برہما جی نے سام وید سے کی اور نارد منی نے مہادیو جی کے سامنے خود گایا۔ ہندوؤں میں موسیقی کو مکتی یا نجات کا راستہ مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موسیقی ایک آسمانی چیز تھی جسے زمین پر لانے کا سہرا بھرت اور نارد منی کے سر پر تھا۔ دھارمک گرنتھوں کے مطابق بھگوان سری کرشن نے کہا تھا —— "اے نارد نہ تو میں بیکنٹھ میں رہتا ہوں، نہ ہی یوگیوں کے دل میں مگر میرے بھگت جہاں گانا گا کر مجھے یاد کرتے ہیں، وہیں میں موجود رہتا ہوں۔" اس سے ظاہر ہے کہ سنگیت شروع سے ہی بھگتی اور عبادت کا سادھن رہا ہے۔ کنفیوشس کا بھی قول ہے۔ "اے موسیقی تو اُس پروردگار کی زبان ہے۔" بھرتری ہری کہتے ہیں "ادب اور موسیقی سے بے بہرہ شخص بغیر سینگ اور دم کا حیوان ہے۔"

ہندوستانی موسیقی پر سب سے پہلی کتاب بھرت رشی نے ہی لکھی تھی جس کا نام "ناٹیہ شاستر" تھا۔ یہ کتاب کس زمانے میں لکھی گئی، اس کے بارے میں مختلف رائیں رہی ہیں۔ مختلف مورخوں نے اسے حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے سو سال پہلے سے چوتھی

صدی عیسوی تک کے زمانے میں لکھی ہوئی بتایا ہے مگر اب کافی چھان بین کے بعد یہ خیال درست مانا جاتا ہے کہ یہ کتاب تین ہزار سال پہلے لکھی گئی۔ اس کتاب میں بھرت نے ان تمام سازوں کو بیان کیا ہے جو اس دور میں استعمال کیے جاتے تھے یعنی وینا، مردھنگم اور کھڑتال وغیرہ۔ بھرت رشی کے عہد میں بھی موسیقی کو چالیس ساز کے آرکسٹرا کی شکل میں پیش کرنے کا رواج تھا۔ اِسے "کُتُوپَہ" کہتے تھے اور "ناٹیہ شاستر" میں بڑے تفصیلی بیان دئے گئے تھے کہ ناٹک میں کونسا ساز کس جگہ اور دوسرے سازوں سے کتنی دور رکھا جائے۔ اُن دنوں موسیقی یا سنگیت کے تین اجزا تھے، گانا، بجانا اور رقص۔ ان تینوں اجزا سے مل کر موسیقی مکمل ہوتی تھی مگر ان میں گانا سب سے افضل مانا گیا ہے۔ بھرت رشی کے "ناٹیہ شاستر" میں موسیقی کے تینوں اجزا کا بیان تھا۔ گانے کو افضل مانے جانے کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ گانے میں سُر، لَے، شاعری یا کویتا کے علاوہ ایک جذبہ ہے جس کو پیغام کی حیثیت حاصل ہے۔

اس کے بعد علمِ موسیقی پر ۵۰۰ سال کے وقفے کے بعد ایک کتاب لکھی گئی جس کا نام "برہد دیشی" تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں تو لکھی گئی ہونگی مگر کوئی محفوظ نہیں رہی۔ صرف دتیلا کی کتاب "دنیلم" دستیاب رہی مگر کئی صدیوں بعد اس کا بھی نام ونشان نہیں رہا۔ کالیداس نے البتہ اپنی کچھ تصنیفات میں مثلاً "شکنتلا" اور "مالویکا مترا" میں اپنے وقت کے سنگیت کی یعنی پانچویں صدی میں، بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ 'واتسائن کے 'کام سوتر' میں بھی اس کے دور میں سنگیت، ناچ، شاعری اور ڈرامے کو جو مرتبہ حاصل تھا، اس کی بڑی موثر جھلکی ملتی ہے۔

پانچویں صدی سے گیارھویں، بارھویں صدی تک بھارت ورش میں سنگیت پھلتا پھولتا رہا اور اس میں نئی نئی جوتیں کی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی میں ستار بھی ایجاد کیا گیا۔ منتگا مُنی کی سنگیت پر مشہور کتاب "برہد دیشی" بھی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ساتویں صدی میں ہی لکھی گئی۔ چھ بڑے راگ گائے جانے لگے اور ان کے ساتھ جڑے ہوئے اور کئی راگوں کا رواج ہوا۔ اس دور کے بعد علمِ موسیقی پر ایک بہت مستند اور اہم کتاب

"سنگیت رتناکر" ہے جسے سارنگ دیو نے لکھا تھا۔ یہ کتاب ۱۲۳۰ عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ سارنگ دیو کشمیر کے باشندے تھے اور علمِ موسیقی کے بہت بڑے عالم تھے۔انہیں یہ استعداد اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد کشمیر کو چھوڑ کر دیوگری جاکر بس گئے تھے جسے اب اورنگ آباد کہتے ہیں۔ انہیں اپنے مطالعے کے لیے جنوبی ہندوستان کا یہ علاقہ پرامن اور سازگار لگا۔ سارنگ دیو اگرچہ پیشے سے ایک اونچے درجے کے حساب کتاب رکھنے والے افسر تھے لیکن سنسکرت اور سنگیت میں ان کی علمیت بے مثال تھی۔ "سنگیت رتناکر" میں انھوں نے ویدک زمانے سے اپنے وقت تک کے سنگیت کا خلاصہ اور اس کے تمام اہم پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ یہ صرف ایک عالمانہ تصنیف ہی نہیں ہے بلکہ اس میں علمِ موسیقی کے چار بنیادی پہلوؤں پر بڑی مفصل اطلاع ملتی ہے، یعنی یہ راگ، تال، جاتی طرز اور ساز پر بڑی عمدہ تفسیر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہمارے سامنے "سنگیت رتناکر" نہ ہوتی تو "ناٹیہ شاستر" کو سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ دوسرے لفظوں میں "سنگیت رتناکر" "ناٹیہ شاستر" کی کنجی اور اس پر ایک عمدہ تبصرہ ہے۔ اس میں ان تمام سازوں کا بھی جو اس وقت استعمال میں آتے تھے، بڑی تفصیل سے ذکر ہے۔ سمدر گپت و کرما دتیہ کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانی سنگیت عرب کے باشندوں نے سیکھا اور یہاں کے فنکار خلیفہ ہارون الرشید کے وقت میں بغداد بلائے گئے گرونانک دیوجی کے ساتھ ان کا مرید بھائی مردانہ (رباب بجانے میں ماہر تھا) بھی تھا۔ گرونانک دیوجی فارس، عرب، اور خاص طور پر مکہ مدینہ بھی تشریف لے گئے۔

ایرانی اثر

"سنگیت رتناکر" کے بعد ہندوستانی سنگیت عظیم تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ غیر ملکی حملوں اور فتوحات نے ہندوستانی فنون اور خاص طور پر سنگیت پر اثر ڈالا۔ اس میں ایرانی اثر سب سے نمایاں تھا۔ طنبور، شہنائی اور چنگ، بربط اور چھوٹا دف ایرانی ساز ہیں جو ہندوستان میں ایران سے آئے۔ ایرانی موسیقی کی بنیاد بارہ "مقاموں"

پر تھی۔ ہندوستان میں ان کی جگہ "سمتھان" استعمال کرنے لگے جو مقام کا لفظی سنسکرت ترجمہ ہے۔ سمتھان کی جگہ بعد میں یہاں کے ساز بجانے والے "ٹھاٹھ" کہنے لگے۔

ایرانی تہذیب اور موسیقی کی ہندوستان کو سب سے بڑی دین امیر خسرو تھے۔ (۱۲۵۲-۱۳۲۴)۔ اگرچہ ان کے والد ایرانی تھے مگر ان کی ماں ہندوستانی تھیں اور وہ اتر پردیش میں پٹیالی ضلع اٹاوا میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے بلبن سے لیکر علاؤالدین خلجی اور غیاث الدین تغلق تک، کئی بادشاہوں کی ملازمت کی۔ انھوں نے ہندوستانی موسیقی میں بڑی دلچسپی لی اور اسے نہ صرف خود سیکھا بلکہ ہندوستانی اور ایرانی راگوں کی آمیزش سے اس میں بیش بہا اضافہ کیا۔ انھوں نے بہت سے مرکب راگ اور تال ایجاد کیے جن میں سے چند کے نام نیچے دئے جاتے ہیں۔

سازگری ۔ ایمن ۔ موافق ۔ فرغانہ ۔ سرپردہ ۔ قول ۔ قلبانہ ۔ نقش و گل کے علاوہ غزل بھی امیر خسرو کے دور میں مروج ہوئی۔

غزل اتنی مقبول طرز ہے کہ عوام اور خواص دونوں اسے پسند کرتے ہیں۔ اس میں عموماً عشق و محبت کے خیالات نظم کیے جاتے ہیں اور یہ زیادہ تر اردو اور فارسی میں گائی جاتی ہے۔ قوالی کا مضمون عموماً نعتیہ ہوتا تھا اور یہ زیادہ تر مزاروں پر عرسوں کے موقعے پر گائی جاتی تھی۔ آج بھی غزل اور قوالی بڑی مقبول ہیں اور قوالوں کی ہر جگہ بڑی مانگ ہے۔ نقش و گل میں بہار کے مضامین پیش کیے جاتے تھے مگر اس کا رواج اب تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ امیر خسرو خود بھی فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ دلی میں نظام الدین اولیا سے انہیں بڑی عقیدت تھی اور انہیں اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ ان ہی کے پہلو میں دفن بھی ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں (آب حیات)۔

"موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے پڑی بجتی رہتی تھی۔ اس لیے دھرپد کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان میں سے اکثر گیت ان کے آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر ہیں۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی ایجاد کیا گیا۔"

فرودست ایک تال ہے۔ یہ ہندوستانی تال چاچڑ یا دیپ چندی کی چودہ ماترا کا ایک دائرہ ہے۔

امیر خسرو ایک ایسے عالم، شاعر اور صوفی تھے جو صدیوں تک پیدا نہیں ہوتے۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالنے میں ان کا بڑا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ ان میں تعصب نام کو بھی نہیں تھا اور انھوں نے ہندوی یعنی ہندی زبان نہ صرف سیکھی بلکہ بڑی فراخدلی سے استعمال کر کے اس وقت کی زبان اور ادب کو مالا مال کر دیا۔ آخر میں وہ تصوف میں ایسے ڈوبے کہ اس کے سوا ہر چیز کو ہیچ سمجھنے لگے۔ وہ ایک باکمال اور باوصف انسان تھے جنھیں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ علمِ موسیقی میں نئی نئی اختراعیں اور ایجادیں کر کے انھوں نے اس کی سطح کو بہت بلند کیا۔

قوالی

قوالی سنتوں، صوفیوں اور اہلِ کرامات کی محفلوں میں پیدا ہوئی، پلی اور پروان چڑھی۔ ہندوستان میں سنگیت کا تعلق بھگتی سے شروع سے رہا ہے۔ سنگیت کی پرورش اور اس کا استعمال زیادہ تر مندروں میں رہا۔ قوالی کی پرورش بلکہ اس کا جنم ہی خانقاہوں میں ہوا۔ پروردگار اور اپنے پیرومرشد کی حمد وثنا کے لیے قوالی کو بہترین ذریعۂ اظہار سمجھا گیا۔ لفظ قوالی "قول" سے ہی نکلا ہے جس کا مطلب بول یا کوئی بات کہنا ہے۔ ہندوستان میں اس کا رواج چشتیہ نظامی صوفیوں سے شروع ہوا۔ التمش کے زمانے میں چشتی خانقاہوں میں قوالی کا گایا جانا ایک لازمی بات بن گئی اور دور دور سے قوال آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ امیر خسرو کے ہاتھوں یہ ایک ایسا فن بن گیا جس کی اپنی ہستی اور انفرادیت تھی۔ شروع شروع میں قوالی کو بغیر سازوں کے گایا جاتا تھا مگر بعد میں نوا ے سازوں کے ساتھ اونچی آواز میں بڑے جوش وخروش سے گایا جانے لگا، یعنی مسلسل تالیوں، ڈھولک، طبلہ، سارنگی اور ہارمونیم کے ساتھ۔ یہ ہندوستانی ہری کیرتن کا اثر ہے جو ویدک زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

قوالی کے اپنی خالص شکل میں چند واضح اصول ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے خدائے برتر کی حمد وثنا کی جاتی ہے، پھر حضرت محمدؐ کی، اس کے بعد حضرت علی اور آخر میں صوفیائے کرام کی توصیف کی جاتی ہے۔ قوالی کو پیش کرنے میں تین ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے یعنی زمان، مکان اور اخوان کی۔ قوالی اُسی وقت گائی جانی چاہیے جب نماز کا وقت نہ ہو (زمان)، اسے ایسی جگہ پر گایا جانا چاہیئے جو پاک صاف اور الگ تھلگ ہو (مکان) اور اسے صرف ان لوگوں کے درمیان گانا چاہیئے جن کے خیالات پاک صاف ہوں نہ کہ غلیظ اور پراگندہ۔ (اخوان) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوالی صرف خانقاہوں اور مزاروں تک محدود تھی۔ اب قوالی ایک تفریح کا ذریعہ بھی بن گئی ہے اور اخوان اور شاید زمان کی بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔

قوالی کے تین مدراج ہوتے ہیں۔ پہلی "کیفیت" جس میں ایک پاکیزہ ماحول پیدا ہوتا ہے اور سننے والے اپنا دھیان دنیاداری سے ہٹا کر خدائے پاک کی طرف لگاتے ہیں، دوسرا "وجد" جس میں قوال اور سامعین متحد ہو کر ایک خود سپردگی کی حالت میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس سطح سے بھی اوپر اٹھ کر قوالی کی تمام محفل ایک ایسی منزل یا درجہ میں داخل ہوتی ہے جسے "حال" کہتے ہیں اور جسے ہندوؤں کی "سمادھی" یا خدائے برتر سے ہم آہنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب قوالی اس سطح پر پہنچتی ہے تو کچھ لوگ اپنے کپڑے تک پھاڑ دیتے ہیں، اپنا سر زمین پر مارتے ہیں اور قوال کی تان اور لے پر سر دھنتے یا رقص کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پروردگار سے ایسی ہم آہنگی وہ معراج ہے جو بندوں کو اپنی زندگی میں بہت کم اور بڑے نصیبے سے ملتی ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، جو اجمیر شریف کے خواجہ معین الدین چشتی کے مرید تھے، اس کیفیت میں مسلسل پانچ دن رہنے کے بعد جاں بحق ہوئے جب کہ قوال پر یہ شعر گاتا رہا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دگر است!

قوالی کی محفل زبانی گانے، اسے تال اور سُر میں دہرانے، تحت اللفظ میں موقع بہ موقع پڑھنے اور گاہ بگاہ رقص پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی محفل ہوتی ہے جس میں قوال اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ سامعین کا گروہ بھی شریک ہوتا ہے۔ بعض دفعہ، اگر سامعین کی "کیفیت" اس کی اجازت دیتی ہے تو قوال کسی خاص شعر یا لفظ کو دہراتا رہتا ہے تاکہ ان کے دلوں پر اثر پیدا ہو۔ بنیادی طور پر قوالی متعدد انسانی آوازوں کے زیر و بم، تالیوں اور جسم کی حرکتوں کی آمیزش ہے۔ یہ تمام عناصر شاعری کو ایک جسم اور روح عطا کرتے ہیں اور اشعار میں ایک چنگاری یا شعلے کی قوت آجاتی ہے۔ اس طرح سے قوالی ایک مکمل فن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ امیر خسرو قوالی کو سنتے سنتے ہاتھ اوپر اٹھا کر رقص کرنے لگتے تھے۔ ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیا نے ایک دفعہ انہیں ہاتھ بند کر کے اور نیچے رکھ کر رقص کرنے کی ہدایت دی کیونکہ۔ "جیسے تم بادشاہ (خدا) کے دربار میں جاتے ہو، تمہارا دنیا سے پھر بھی تعلق رہتا ہے"۔ قوالی ایک ایسا فن ہے جو اپنے آپ کو پرستش، عبادت اور عجز سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ قوالی اگرچہ فارسی اشعار کی پیداوار ہے مگر ہندی اور ہندوستانی سنگیت کو بھی اس نے خوب اپنایا۔ حضرت نظام الدین اولیا راگ پوروی کے شوقین تھے اور ان کی خواہش کے مطابق کم از کم ایک قوالی ان کی خانقاہ میں اس راگ میں گائی جاتی تھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہندوستان میں قوالی کی مقبولیت اتنی بڑھ گئی کہ میلوں، تقریبوں اور نجی محفلوں میں بھی قوالی گائے جانے لگی۔ جہاں صوفیوں کے مزاروں اور خانقاہوں میں عرسوں کے موقعوں پر تو قوالی بدستور ویسے ہی ہوتی ہے وہاں یہ ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں بھی اتنی مقبول ہو گئی ہے کہ اسے سننے کے لیے لوگ بے تاب رہتے ہیں اور سننے سننے ان پر ایک سحر ساطاری ہو جاتا ہے۔

قوال بچے گھرانہ

اگرچہ ہندوستانی موسیقی میں گوالیار گھرانہ سب سے زیادہ اہم اور قدیم سمجھا جاتا

ہے مگر اس سے بھی پہلے خیال اور خیال گائیکی میں قوّال بچے گھرانے کا ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ گھرانہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں شروع ہوا اور اس کے بانی دو بھائی ساونت اور بُولا تھے جن میں سے ایک گونگا اور دوسرا بہرہ تھا۔ اس گھرانے کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بانی قوال تھے۔ ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے۔ ایک دن بادشاہ التمش نے ایک محفلِ موسیقی کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اپنے وزیروں کو اس کا انتظام کرنے کا حکم دیدیا۔ وزیروں نے شہر بھر میں اعلیٰ گویّوں کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ لوگوں کو ساونت اور بُولا کی قیمت پر مذاق کرنے کی سوجھی یعنی انہیں آلۂ کار بنا کر وہ تماشہ دیکھنے چاہتے تھے۔ انھوں نے وزیروں کو بتایا کہ ساونت اور بولا مشہور موسیقار تھے اور انہیں اس محفل میں بلایا جائے۔ وزیروں نے دونوں بھائیوں کو حکم بھجوادیا کہ شاہی دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ کے سامنے گائیں۔ دونوں بھائی اپنی معذوری کے سبب بہت پریشان تھے اور مایوس ہو کر انھوں نے اپنے آپ کو خدا کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ انھوں نے خدا سے دعا کی اور مدد مانگی اور خدا نے دعا قبول کی۔ ایک حضرت خواجۂ خواجگان کو اس شرارت کا علم ہوا تو انھوں نے خدا سے التجا کی کہ نہ صرف ان دونوں بھائیوں کی معذوری دور کر دے بلکہ انہیں ایسی عمدہ آواز اور جوہر موسیقی عطا ہو جائے کہ وہ اپنی آبرو بچا سکیں۔ انھوں نے دونوں بھائیوں کو یہ کہا کہ بالکل مت گھبراؤ اور بادشاہ کے حضور میں پیش ہو کر جب حکم ملے، بے خوفی سے گانا شروع کر دو۔

دونوں بھائی حضرت خواجۂ خواجگان کی بات سے حوصلہ پاکر دربار میں پہنچ گئے۔ جونہی انہیں بادشاہ نے گانے کا حکم دیا دونوں بھائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ نہ صرف بول اور سن سکتے تھے بلکہ وہ ایک اعلیٰ موسیقار تھے۔ یہ صرف ایک معجزہ تھا۔ جو صرف اللہ کی نوازش اور مرضی سے ہو سکتا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اتنا عمدہ گایا کہ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور جن لوگوں نے یہ مذاق کیا تھا وہ حیرت اور ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان ہی دونوں بھائیوں سے قوال بچّے گھرانہ شروع ہوا۔

شاہی سرپرستی

ہندوستان کے اکثر حکمرانوں نے فنِ موسیقی میں بڑی دلچسپی لی۔ معزالدین کیقباد، جلال الدین خلجی اور قطب الدین ایبک کا اکثر وقت اسی شغل میں گزرتا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کی ایسی بہت سی تصویریں ملتی ہیں جن میں وہ تخت پر بیٹھا کنیزوں کے گانے سے محظوظ ہو رہا ہے۔ فیروز تغلق کے عہد میں فنِ موسیقی کو بڑی ترقی ملی۔ اس کے زمانے میں علمِ موسیقی پر "معرفت الالحان" اور "غنیۃ المنیہ" جیسی قابلِ قدر کتابیں لکھی گئیں۔ جونپور کی مشرقی حکومت کے تاجدار سلطان ابراہیم کے ایما پر "سنگیت شرومنی" مرتب ہوئی۔ اس کے پوتے سلطان حسین کو اس فن میں بڑی مہارت حاصل تھی اور اس نے کئی راگ ایجاد کیے۔ کشمیر کا سلطان زین العابدین بھی موسیقی کا بڑا سرپرست تھا اور اس کے دربار میں بھی بہت سے ماہرینِ فن جمع ہو گئے تھے۔ مالوہ کا بادشاہ باز بہادر تو خود بھی ایک ماہر موسیقار تھا۔ گوالیار کے مہاراجہ مان سنگھ (تومر) کو تو تمام گویّوں نے اپنا استاد تسلیم کر لیا تھا۔ اسی نے دھرپد کو بہت بڑھاوا دیا تھا اور علمِ موسیقی پر "مانکتوہل" نام کی کتاب لکھی تھی جس پر تمام شمالی ہندوستان کے گویوں کا مدتوں تک مدار رہا۔ اس نے گوالیار میں موسیقی کی ایک درسگاہ بھی قائم کی تھی جہاں سے بڑے بڑے نامی گرامی گویے تربیت پا کر نکلے۔ بخشو نائک جس کی بیٹی سے تان سین نے راگ سیکھا تھا۔ راجہ مان سنگھ کا ہی تربیت یافتہ تھا۔

مغلیہ سلطنت اور موسیقی

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر خود موسیقی کا دلدادہ تھا۔ "تزکِ بابری" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کابل کے باغوں میں دوستوں کے ساتھ لبِ جو بیٹھ کر جام و مینا سے دل بہلاتا تھا تو ہندوستانی موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بابر کو نہ وہ سکون ملا اور نہ اس کی حکومت میں

وہ ٹھہراؤ آیا کہ کوئی بھی فن پنپ سکتا۔ اس کے بیٹے ہمایوں کو موسیقی کا شوق وراثت میں ملا تھا۔ وہ ہفتے میں دو دن محفلِ موسیقی کیا کرتا تھا۔ مانڈو کی فتح کے بعد ہمایوں جنگی قیدیوں کو قتل کروانا چاہتا تھا جن میں سلطان بہادر شاہ گجراتی کا درباری گویا استاد بیجو بھی شامل تھا۔ حسنِ اتفاق سے ایک ہندو راجہ کا اِدھر سے گزر ہوا اور اس نے بیجو کو پہچان کر ہمایوں کے حضور میں پیش کیا۔ راجہ کی سفارش پر ہمایوں نے بیجو کی طرف توجہ کی اور اسے کچھ سنانے کو کہا۔ بیجو نے دھرپد گا کر سلطان اور درباریوں کو بیحد متاثر کیا۔

سلطان پر جو اس وقت سرخ لباس پہنے اور ننگی تلوار لیے بیٹھا تھا اتنا اثر ہوا کہ اس نے سرخ لباس اتار کر سبز لباس پہن لیا اور بادشاہ نے تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیدیا۔ موقع ملتے ہی ہمایوں نے بیجو کو اپنے دربار میں ایک معزز جگہ دی اور اسے انعام واکرام سے نوازا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد بیجو بھاگ نکلا اور اپنے سابق آقا بہادر شاہ گجراتی کے پاس پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی بہادر شاہ نے کہا۔ "میں نے اپنی کھوئی ہوئی دولت پالی"۔ ہمایوں کو جب بیجو کے بھاگنے کی خبر ملی تو اس نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "بدقسمت تھا جو بھاگ گیا۔ اگر ہماری خدمت میں رہتا تو اتنا پاتا کہ سلطان بہادر شاہ کو بھول جاتا"۔ یہی بیجو "بیجو باورا" کے نام سے مشہور ہے۔

ہمایوں کی جلاوطنی کے دوران ہندوستان میں شیر شاہ، اسلام شاہ اور محمد عادل شاہ ایک دوسرے کے بعد تخت پر بیٹھے۔ محمد عادل شاہ موسیقی کا سرپرست بھی تھا اور ایک اعلیٰ گویا بھی۔ اس نے گوالیار میں راجہ مان سنگھ تومر کی روایت کو زندہ رکھا اور گویوں کی تربیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میاں تان سین نے بھی اس سے تربیت حاصل کی تھی۔

اکبر کا دربار تو موسیقی کا گہوارہ تھا۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق چھتیس گویے اور سازندے دربارِ شاہی میں ملازم تھے۔ ان میں میاں تان سین، سبحان خاں، صاحب خاں، چاند خاں، تان ترنگ خاں، سرور خاں اور میاں لال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تان سین کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے "گزشتہ ہزار برس میں اس جیسا گویا پیدا نہیں ہوا۔" ابوالفضل کے والد شیخ مبارک خود موسیقی کے نامور استاد تھے۔ اکبر کے زمانے میں ایک اور ماہر موسیقی ملّا عبدالقادر بدایونی تھا۔ وہ "منتخب التواریخ" کا مصنف تھا اور ہندوستانی اور ایرانی موسیقی پر پوری دسترس رکھتا تھا۔ خود بھی اعلیٰ درجے کا بین نواز تھا۔

تان سین کا اصلی نام ترلوچن داس تھا۔ وہ ذات کے گوڑ برہمن تھے۔ ان کے والد مکرند پانڈے گوالیار کے رہنے والے تھے۔ موضع بھینٹ جو گوالیار سے سات میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف ہے، تان سین کی جائے پیدائش ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تان سین موضع چوبرجی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۵۲۱ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ مکرند پانڈے کا یہ بچہ بڑی عمر میں حضرت محمد غوث کی دعا سے پیدا ہوا تھا۔ پیر صاحب نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بچہ دنیا میں امر ہو جائے گا۔ پیدائش کے ایک دو سال بعد ہی مکرند پانڈے نے اسے حضرت غوث کو نذر کر دیا کہ آپ نے ہی اسے دیا ہے، آپ ہی اسے اپنی حفاظت میں لے لیں۔ اس طرح سے تان سین بچپن سے ہی حضرت محمد غوث کی دیکھ بھال میں پلتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انھوں نے مذہبِ اسلام قبول کر لیا اور دنیائے موسیقی میں میاں تان سین کے نام سے مشہور ہوئے۔

تان سین کو گویے علمِ موسیقی کا بادشاہ گردانتے ہیں۔ آپ نے علمِ موسیقی کی تعلیم گوالیار کے مدرسۂ موسیقی میں حاصل کی تھی۔ انھوں نے بابا ہری داس سے متھرا میں بھی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے بخشو نائک کی لڑکی سے بھی کچھ نکات موسیقی سیکھے مگر اس نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ان میں خداداد صلاحیتیں تھیں۔ وہ نائکِ موسیقی کے علاوہ ایک درویش بھی سمجھے جاتے تھے۔ دیپک اور ملہار راگوں میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ تان سین نے بہت سے تصرفات بھی کیے اور ایک راگ درباری کانہڑا اکبر کے سامنے پیش کیا اور اساوری اور گندھاری کو ملا کر لفظ جوگیا

بڑھایا اور ملہار ہیں کا نہڑے کو داخل کر کے میاں کی ملہار نام رکھا۔ میاں کی توڑی اور میاں کی سارنگ بھی تان سین کے تصرفات ہیں جو بڑے مشہور ہیں۔

تان سین اور بیجو باورا کے مقابلے کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ بیجو باورا نے تان سین کو نیچا دکھانے کی ٹھان لی اور گوالیار پہنچ گئے۔ تان سین اپنے گھر موضع بھینٹ میں تھے۔ ان تک پہنچنے کے لیے ندی کو پار کرنا پڑتا تھا۔ ندی پر دھوبنیں کپڑے دھو رہی تھیں اور بیجو باورا کو بھی اپنے میلے کپڑے دھلوانے کا خیال آ گیا۔ ایک دھوبن سے دریافت کیا تو اس نے پوچھا کہ کپڑے "حال" کے پانی میں دھلواؤ گے یا "پال" کے۔ دھوبن نے بتایا کہ "حال" کے پانی سے مراد وہ پانی ہے جو ابھی آسمان سے برسے اور "پال" کے پانی سے مراد یہی ندی کا بہتا ہوا پانی ہے۔ بیجو باورا نے "حال" کے پانی میں کپڑے دھونے کی فرمائش کی۔ دھوبن نے ملہار راگ چھیڑ دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پانی برسنے لگا۔ جب کپڑے دھل گئے تو دھوبن نے گانا بند کر دیا۔ دھوپ کھل گئی اور دھوبن نے کپڑے سکھا کر بیجو باورا کے حوالے کر دئے۔ بیجو باورا دنگ رہ گئے اور انھوں نے دھوبن سے پوچھا کہ تم کس کے کپڑے دھوتی ہو۔ جواب ملا کہ تان سین کے۔ بیجو باورا نے سوچا کہ جب تان سین کی دھوبن ایسا گاتی ہے تو تان سین کا کیا کمال ہوگا۔ انھوں نے سوچا کہ چلو اب آئے ہیں تو تان سین سے مل ہی لیں۔ ان کے مکان پر پہنچے۔ تان سین نے عزت اور احترام سے بٹھایا اور بیجو باورا کی فرمائش پر گانا سنایا۔ بیجو باورا کو گانا اتنا نہیں جچا جتنی تان سین کی تعریف سنی تھی اور ان کے دل میں مقابلہ کرنے کی خواہش پھر پیدا ہو گئی۔ انھوں نے جواباً ایک راگ چھیڑ دیا جس سے جنگل کا ایک ہرن مستی کی حالت میں آ کر بیجو باورا کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور سر جھکا دیا۔ بیجو باورا نے جوش میں آ کر اپنی مالا ہرن کے گلے میں ڈال دی اور گانا بند کر دیا۔ ہرن گانا بند ہوتے ہی چوکڑیاں بھرتا ہوا جنگل کی طرف لوٹ گیا۔ بیجو باورا نے تان سین سے کہا کہ بابا میں آپ کی نگری میں آ کر لٹ گیا اور میرے گرو کی دی ہوئی مالا ہرن لے گیا۔ تان سین بولے اس میں میری نگری کا کیا قصور ہے، آپ کے گانے کے اثر سے ہرن آیا تھا اور اپنی مالا آپ نے پہنا دی تھی۔ مگر بیجو باورا تو تان سین کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔

انھوں نے الزام تان سین پر ہی دھرا۔ تان سین بھی جوش میں آ گئے اور انھوں نے گانا شروع کر دیا۔ بہت سے ہرن ویسی ہی مالا گلے میں پہنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ تان سین بیجو باورا سے بولے کہ اپنی مالا پہچان کر اتار لو۔ بیجو باورا حیران رہ گئے کہ کس ہرن کے گلے میں سے مالا اتاریں کیونکہ سب نے ایک سی ہی مالائیں پہن رکھی تھیں۔ جب بیجو باورا بے بس ہو گئے تو تان سین نے اپنا گانا بند کر دیا جس پر مالا والے ہرن کے سوا سب ہرن چلے گئے۔ بیجو باورا سے بولے کہ آپ کی یہ مالا ہے اتار لیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تان سین کا مقابلہ بیجو باورا سے نہیں ہوا بلکہ گوپال کا مقابلہ بیجو باورا سے مہاراجہ جموں کے دربار میں ہوا اور گوپال مات کھا گیا۔ مہاراجہ نے گوپال کو سزائے موت کا حکم دے دیا۔ لیکن بیجو نے مہاراجہ سے یہ کہہ کر سزا معاف کرا دی کہ گوپال میرا ہی شاگرد ہیں۔

تان سین کی تاریخ وفات بیشتر مورخوں نے ۱۵۸۸ بتائی ہے۔ آپ کا مقبرہ گوالیار میں ہے۔ مقبرے کے قریب ایک املی کا درخت ہے جس کے پتے "گویے اور طوائفیں اس عقیدت سے کھاتے ہیں کہ ان کی آواز میں سریلاپن آ جائے اور بطور تبرک بھی باہر لے جاتے ہیں۔

جہانگیر نے بھی موسیقی کی سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں استاد محمد نائی، یاقیا، شوقی طنبورہ نواز، جہانگیر داد، چتر خاں، حافظ عبداللہ اور رحیم داد خاں جیسے ماہرین فن موجود تھے۔ "تزکِ جہانگیری" میں ان میں سے اکثر کا ذکر ملتا ہے۔ جہانگیر قوالی کا بھی دلدادہ تھا۔ اس کی مجلسِ سماع میں صوفیوں کو وجد آ جاتا تھا۔ ایک بار دلی کے قوال اس کے حضور میں قوالی پیش کر رہے تھے اور جب انھوں نے امیر خسرو کا یہ شعر پڑھا ـــــ

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

تو ملا احمد مہرکن کو وجد آ گیا۔ انھوں نے بھی اپنی ٹوپی ذرا ترچھی کر لی اور تڑپ کر زمین پر گر پڑے۔ جہانگیر نے لپک کر ان کا سر اٹھایا تو وہ جان بحق ہو چکے تھے۔

شاہجہاں کے عہد میں موسیقی کو بڑا عروج ملا۔ اس کا حسنِ ذوق فنِ تعمیر میں آشکار ہوا۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار بادشاہ بھی تھا اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز کبھی قضا نہیں کی۔ اس نیکی اور تقوے کے باوجود وہ فنِ موسیقی کا بڑا سرپرست تھا۔ سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ شاہجہاں کی اپنی آواز بڑی سریلی تھی اور بادشاہ نے خود کئی ہندی راگ ایجاد کیے تھے۔ "قواعد السلطنت شاہجہانی" میں لکھا ہے کہ شہنشاہ کو ایرانی، کشمیری اور ہندوستانی راگ راگنیوں سے خاص لگاؤ تھا اور وہ حرم سرا میں ہر روز دو تین گھنٹے تک موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ رات کو محفلوں میں گانے بجانے پر کنیزیں مامور تھیں اور دربارِ شاہی میں استادانِ فن موسیقی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ نائک بخشو کو فوت ہوئے ایک زمانہ گزر چکا تھا لیکن شاہجہاں اس کا بڑا معترف تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وقت گزرنے کے ساتھ لوگ نائک بخشو کو نہ بھول جائیں اس نے اپنے ماہرینِ فن کو حکم دیا کہ وہ بخشو کے گائے ہوئے دھرپد راگ جمع کریں۔ انھوں نے بڑی محنت کے بعد "ہزار دھرپد نائک بخشو" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ابھی تک بوڈلین لائبریری آکسفورڈ یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ شاہجہاں کے ذوقِ موسیقی کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ لال قلعے کے نوبت خانے میں گویے موجود رہتے تھے جو دن کے پہروں کو راگوں اور راگنیوں میں بتایا کرتے تھے۔

شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں شادی بیاہ کی تقریبات میں موسیقی کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے۔ جب شہزادہ دارہ شکوہ کا عقد نادرہ بیگم سے ہوا تو اس موقعے پر "مطربانِ ہفت کشور" موجود تھے اور انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ شہزادہ شجاع کی شادی کے موقعے پر بھی مشہور و معروف گویوں نے موسیقی کا پروگرام پیش کیا۔ جب اورنگ زیب کا عقد دل رس بانو سے ہوا تو موسیقاروں نے ایسا رنگا رنگ پروگرام پیش کیا کہ بقول عبدالحمید لاہوری "آسمان والوں نے کئی روز تک زمین سے سوائے نغمات کے اور کوئی آواز نہیں سنی۔"

سیف خاں نے "راگ درپن" میں عہد شاہجہاں کے جن ۳۲ موسیقاروں کا ذکر کیا ہے ان میں صوفی بہاؤالدین سر فہرست ہیں۔ آپ بلند پایہ موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک درویش کامل بھی تھے۔ آپ ترانہ اور خیال بہت اچھا گاتے تھے اور رباب اور بین بجانے میں آپ کا جواب نہیں تھا۔ کلاونت بھی شاہجہاں کا درباری گویا تھا اور اپنے فن کا ماہر تھا۔ وہ بھی اپنا اکثر وقت اللہ والوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ شیخ شیر محمد بھی اس دور کا ایک نامور موسیقار اور درویش ہوا ہے۔ انھوں نے نغمہ میں بڑی ترقی کی۔ وہ خیال بھی خوب گاتے تھے اور ان کے گانے میں بڑا درد ہوتا تھا۔

جگن ناتھ کلاونت شاہجہاں کا درباری گویا تھا اور اسے شاہجہاں نے کوی رائے کا خطاب دے رکھا تھا۔ سیف خاں نے لکھا ہے کہ تان سین کے بعد اس کے پایے کا کوئی دوسرا گویا نہیں ہوا۔ وہ شاہجہاں کے نام پر راگ مرتب کیا کرتا تھا اور دھرپد راگ گانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ دوسرے ہندو موسیقاروں میں جنار دھن بیکانیری، تاراچند کلاونت، سورداس پکھاوجی، دھرم داس کلاونت، تلسی رام کلاونت، سالم چند ڈاگر اور سندر رگھن قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کے بارے میں سیف خاں لکھتا ہے کہ وہ بادشاہ کے منظورِ نظر تھے۔ اسی طرح "پادشاہ نامہ" میں محمد وارث نے ایک اور ہندو موسیقار والی رام کا ذکر کیا ہے جسے شاہجہاں نے کابل میں دو ہزار روپے دئے تھے۔

دربارِ شاہجہاں کے موسیقاروں میں لال خاں کلاونت کا مرتبہ بڑا اونچا تھا۔ لعل خاں ابھی نوعمر ہی تھا کہ وہ تان سین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تان سین نے بڑی توجہ سے اس کی تربیت شروع کی مگر ابھی یہ سیکھ ہی رہا تھا کہ تان سین راہئ ملکِ عدم ہوئے۔ ان کے بیٹے بلاس خاں نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا اور اپنی بیٹی کی شادی اس سے کردی سیف خاں نے اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا دھرپد گائیگ بتایا ہے۔ لعل خاں کلاونت تان سین کی جگہ پر کھڑا ہوکر اپنا راگ پیش کیا کرتا تھا۔ شاہجہاں اسے ہر جشن کے موقعے پر انعام واکرام سے نوازتا تھا۔ ایک بار بادشاہ نے اس کا راگ سن کر اسے ایک ہاتھی بطور انعام عطا کیا اور ایک دوسرے موقعے پر اسے "گُن سمندر" کا خطاب دیا۔ لعل خاں

کلاونت کے بیٹے خوش حال خاں اور بسرام خاں بھی دربارِ شاہی کے گویے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد اس کا منصب خوشحال خاں کو ملا اور اسے بھی تان سین کی جگہ پر کھڑے ہو کر گانا گانے کا شرف حاصل رہا۔

موسیقاروں اور سازندوں میں سیّد خاں بن سبحان خاں، میر عماد الہداد، رحیم داد خاں، سیّد طیب بڈھا، فیروز ڈاڈھی، ظاہر ڈاڈھی، محمد رس بین، ابوالوفا، بخت خاں گجراتی اور بایزید خاں کلاونت کا شمار بھی ماہرینِ فن میں ہوتا تھا۔ ایک اور گویا گن خاں کلاونت بھی مشہور درباری گویا تھا۔ شہزادہ شجاع کو اس کا راگ بہت پسند تھا اور اس نے شاہجہاں سے اسے مانگ لیا تھا۔ گن خاں کی بقیہ عمر شہزادے کی مصاحبت میں ہی بنگال میں گزری اور وہ وہیں فوت ہوا۔ بایزید ربانی، محمد باقی اور شیخ سعداللہ بھی بڑے اچھے گویوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن بعد میں ان کے گلے افیون خوری کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے۔

عہدِ اورنگ زیب

جہاں شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں فنِ موسیقی نے دوسرے فنون کے ساتھ نمایاں ترقی کی، اورنگ زیب کے عہد میں لکھی ایسی بہت سی کتابیں ہیں جن میں عالمگیر بادشاہ کی خوبیوں کا دھرپد گائین میں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک دھرپد میں اورنگ زیب کو اولیا اور زندہ پیر بھی کہا گیا ہے۔

آئیو آئیو رے مہابلی عالم گیر
ساہی میں ساہی اولیا زندہ پیر

بسنت کے تہوار پر ایک دھرپد میں ایک منگلا " مکھیا " کہتی ہے۔ " شاہ اورنگ زیب تم ہمارے ساتھ بہت برسوں تک (ہولی) دھمار کھیلتے رہو۔ لیکن اورنگ زیب نے گیارھویں سال جلوس میں تمام موسیقاروں اور سازندوں کو اپنے دربار سے نکال دیا۔ تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں یہ قصہ درج ہے کہ ایک دن دربار سے نکالے ہوئے

اہلِ فن ایک جھوٹ موٹ کا جنازہ لے کر شاہی محل کے قریب سے آہ و زاری کرتے ہوئے گزرے، تو اورنگ زیب نے اپنے ایک مصاحب سے دریافت کیا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ موسیقی کا۔ اس جواب پر اورنگ زیب ہنس دیا اور اس نے موسیقاروں کو کہلوا بھیجا کہ اس مردے کو خوب گہرا دفن کرنا تاکہ کہیں پھر نہ باہر نکل آئے!

اورنگ زیب کا موسیقی کی طرف یہ رویہ اس کی مذہب پرستی، انتہائی سادگی اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے تھا اور تخت نشینی کے کئی سال بعد ظہور پذیر ہوا۔ تخت نشینی سے پہلے اورنگ زیب کو بھی اس فن سے بڑی دلچسپی تھی۔ علاء الملک تونی اورنگ زیب ہی کی مجلسِ وزرا میں سے تھا جو اپنے وقت کے ماہروں میں سے تھا۔ حقیقت تو یہ ہے اور اسے بہت سے مورخوں نے تسلیم کیا ہے کہ بادشاہ ہونے کے دس برس بعد تک اورنگ زیب موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ۱۳ مئی ۱۶۵۹ کو اورنگ زیب گدی پر بیٹھا تھا اور اس نے مشہور موسیقار خوشحال خاں کو اپنے دربار میں بھی مناسب مرتبہ دیا۔ اسی طرح اس نے حیات سرس نین نام کے ایک موسیقار کو بھی انعام و اکرام سے نوازا۔ کرپا نام کے مرونگ بجانے والے کو "مرونگ رائے" کا خطاب دیا۔ بہت سے دھرپد ایسے ملے ہیں جن پر اس کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ان میں جو بھاؤ باندھے گئے ہیں وہ عالمگیر کی شان و شوکت، اقبال، سالگرہ اور دبدبے کے بارے میں ہیں اور ان میں سے کئی میں ہولی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اورنگ زیب کے ایک مصاحب مرزا روشن ضمیر نے "سنگیت پارہ جات" کا ترجمہ کیا۔ فقیر اللہ نے اورنگ زیب کو پیش کرنے کے لیے "مانکتوہل" کا ترجمہ "راگ درپن" کے نام سے کیا۔ عباد محمد کامل خانی نے "رسالۂ کامل خانی" "اساسی سُر" اور "رسالہ در عملِ بین و ٹھاٹھ راگنی" جیسی بلند پایہ تصنیفات اورنگ زیب کے زمانے میں ہی لکھیں۔ کئی مورخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے کئی سال بعد تک حرم سرا میں موسیقی کی محفلیں ہوتی رہیں۔ اورنگ زیب نے پچاس سال کی عمر میں اپنے آپ کو ایک پرہیزگار مسلمان ثابت کرنے کے لیے یہ حکم دیا کہ موسیقار دربار

میں حاضر تو ہوں لیکن گانا نہ گائیں۔ اگرچہ دربار میں گانا بجانا بند ہوگیا مگر محلسرا کی محفلوں اور رنگ رلیوں میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ بیگموں اور شہزادیوں کے لیے گانے والیوں کی تقرری خود اورنگ زیب کرتا تھا۔ مرزا اکرم خاں صفوی نے جو فنِ موسیقی کا ماہر تھا اورنگ زیب سے سوال کیا کہ نغمہ و سرود کے بارے میں حضرت کی کیا رائے ہے تو آنحضرت نے فرمایا کہ جو اس کے اہل ہیں ان کے لیے حلال ہے۔ مرزا نے عرض کیا کہ پھر حضرت اہل ہونے کے باوجود کیوں اس سے پرہیز فرماتے ہیں۔ حضرت نے جواب دیا کہ تمام راگ راگنیاں بغیر مزامیر اور خصوصاً پکھاوج کے نہیں دیتیں اور مزامیر بالاتفاق حرام ہیں۔ اسی لیے میں نے نفس سرود سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔

محمد شاہ رنگیلا

موسیقی کی دنیا میں محمد شاہ رنگیلے کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ سدارنگ، ادارنگ اور اچھا برس جیسے بلند پایہ خیال گائک اور نائک اسی کے عہد میں ہوئے۔ اسی کے زمانے میں ستار بطور ساز کے بہت مقبول ہوا۔ یہ سہرا سدارنگ کے چھوٹے بھائی خسرو خاں کے سر پر ہے۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد سے پہلے ستار بجانے والوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ درگاہ قلی خاں نے کہا ہے کہ خسرو خاں تین تار والے ایک ساز پر راگ راگنیاں پیش کرتا ہے۔ اس ساز میں ضرورت کے مطابق تاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک مورخ کا یہ بھی خیال ہے کہ نام کی مطابقت کی وجہ سے لوگ خسرو خاں کو علاؤالدین کے زمانے والے امیر خسرو سمجھ بیٹھے۔ بادشاہ نامے میں خیال گائیکی کو حضرت امیر خسرو کی اختراع قرار دیا ہے مگر کچھ لوگ جون پور کے آخری بادشاہ اور فنِ موسیقی کے ماہر سلطان حسن شرقی کو خیال گائیکی کا موجد مانتے ہیں۔ لیکن نعمت خاں سدارنگ نے خیال گائیکی کی دنیا میں چار چاند لگادیے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ محمد شاہ رنگیلے نے کسی بات پر خفا ہوکر سدارنگ کا دربار میں آنا بند کردیا۔ سدارنگ نے دو بچوں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے ایسا تیار کیا کہ جب ان بچوں نے بادشاہ کے دربار میں سدارنگ کی بندشوں کو پیش کیا تو بادشاہ نہایت

مسرور ہوا اور سدا رنگ کو پھر دربار میں آنے کی اجازت دیدی۔

گھنانند ذات کے کائستھ تھے اور محمد شاہ کے میر منشی تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ گانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ایک بار انہیں محمد شاہ کے دربار میں گانے کا حکم ہوا۔ کسی نے کہا یہ اس وقت تک نہ گائیں گے جب تک سبحانی طوائف ان کے سامنے نہ ہو طوائف طلب کی گئی اور انھوں نے اس کی طرف منھ اور بادشاہ کی طرف پیٹھ کر کے گانا شروع کیا۔ بادشاہ اور درباری گانا سن کر خوش ہوئے۔ مگر بادشاہ نے بے ادبی کی سزا دی اور شہر بدر کر دیا۔ انھوں نے سبحانی طوائف سے اپنے ہمراہ چلنے کے لیے کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ انکار سے گھنانند کا دل ٹوٹ گیا اور یہ فقیر بن کر بندرابن چلے گئے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد قزلباشی سپاہی متھرا پہنچ گئے اور گھنانند کو ڈرا دھمکا کر ان سے زر مانگا۔ لیکن منشی گھنانند کے پاس کچھ نہ تھا۔ جب قزلباشیوں نے زر زر کا شور مچایا تو انھوں نے اسی لفظ کو الٹ کر رز، رز، رز کہا اور دو تین مٹھی خاک پھینکی کہ اس کے سوا اُن کے پاس کچھ نہیں ہے۔ سپاہیوں نے غصہ میں آکر اُن کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔

آخری مغل بادشاہ کا تاجدارِ موسیقی

دورِ اکبری سے ہی موسیقی میں تان کو زبردست اہمیت حاصل رہی ہے۔ جس کی تان جتنی زوردار اور سریلی ہوتی تھی اس کو اتنا ہی بڑا موسیقار سمجھا جاتا تھا۔ ایک تان کا بادشاہ، تان سین، مغلیہ عہد کے عروج میں اور دوسرا مغلیہ عہد کے زوال میں ہوا۔ تان کے یہ دوسرے بادشاہ دہلی کے قریب موضع ڈاسنا کے قطب بخش تھے۔ میاں قطب بخش اپنے والد سے موسیقی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دہلی آئے۔ وہ اس فن میں اتنے ماہر اور کامل تھے کہ آخری مغل بادشاہ۔ بہادر شاہ ظفر نے انہیں قلعے کے لیے چن لیا اور وہ سب سے بڑے شاہی موسیقار ہو گئے۔ بادشاہ نے انہیں "تان رس" کا خطاب دیا۔ انہیں عزت سے تان رس خاں صاحب کہتے تھے۔ تان رس خاں، مشہور موسیقار میاں اچپل کے شاگرد تھے۔

تان رس میں اتنی غیر معمولی خصوصیات تھیں کہ وہ بادشاہ کے بہت قریب آ گئے۔ وہ ہفتے میں چھ دن قلعہ معلّیٰ میں ہی رہتے تھے۔ بادشاہ کے ناشتے میں سے ہی انہیں ناشتہ ملتا تھا۔ تان رس کی شادی کے موقعے پر بہادر شاہ ظفر نے ہزاروں روپے خرچ کر دئے۔ جس وقت تان رس دولہا بن کر بادشاہ کو سلام کرنے گئے تو خود بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے موتیوں کا سہرا باندھا اور سوا پانچ سو اشرفیاں عنایت کیں۔

دلی کا ایک مشہور محلہ چاندنی محل ہے۔ یہ بادشاہ نے خاں صاحب کو دیدیا۔ اس میں کئی حویلیاں تھیں۔ یہ لاکھوں روپے کی جائداد تھی۔ اِس میں گلی کا نام ابھی تک "گلی تان رس خاں" ہے۔ ان کا حلیہ تھا — اوسط قد، لمبے ہاتھ، بڑی غلافی آنکھیں گندمی رنگ "کشادہ پیشانی، دوہرا بدن، لباس میں انگرکھا زیادہ پہنتے تھے اور چوگوشیہ ٹوپی لگاتے تھے۔ مہاراجہ الور کے دربار میں دلی کی ۱۸۵۷ کی تباہی کے بعد پہنچے۔ وہاں مہاراجہ نے بڑی قدر کی۔ دوسری ریاستوں میں بھی بلائے جاتے تھے اور ایک مرتبہ نیپال مہاراجہ نے بھی طلب کیا۔ ان کے کمال سے خوش ہو کر نیپال مہاراجہ نے ایک زیور "بھج ڈنڈ" اپنے بازو سے کھول کر انہیں دیا جس کی قیمت آج سے پچاس سال پہلے بمبئی میں اسّی ہزار روپے لگی تھی۔ اِس کے علاوہ سوا لاکھ روپے اور خلعت وغیرہ مع چند گھوڑے بھی عطا کیے۔

نیپال سے لوٹنے کے بعد تان رس نظام حیدر آباد کی طلبی پر حیدر آباد چلے گئے اور تقریباً سو سال کی عمر میں وہیں فوت ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں علی بخش اور فتح علی خاں اور حسین بخش نے بہت شہرت پائی۔ تان رس اتنے بڑے کے کار تھے کہ اپنے دَور کے بادشاہِ موسیقی مانے جاتے تھے۔ ترانہ گانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آواز میں بلا کی کُوک تھی۔ ان کی وفات کے بعد دلی میں چالیسویں کا جلسہ کیا گیا جو مسلسل پندرہ دن تک چلتا رہا۔ اس میں ملک کے نامور موسیقار شامل ہوئے۔

موسیقی مغلیہ دربار میں آخر دم تک قائم رہی۔ بہادر شاہ اور ان کے والد

اکبر شاہ ثانی کے دربار میں بہت سے اربابِ موسیقی تھی جن میں ہمت خاں اور راگ رس خاں یکتائے روزگار تھے اور اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔

دلی گھرانہ

دلی گھرانے کی ابتدا تان سین سے ہوتی ہے لیکن کچھ پرانے استادوں کے مطابق دلی گھرانے کی بنیاد انیسویں صدی میں میاں اچپل نے ڈالی۔ دلی جو صدیوں تک مختلف شاہی نسلوں اور خاندانوں کی راجدھانی رہی قدرتی طور پر موسیقی اور فنون کا ایک اہم مرکز بھی تھی۔ شاہی سرپرستی کی وجہ سے ہندوستان کے دوسرے حصوں کے موسیقار بھی یہاں آکر بس جاتے تھے۔

میاں اچپل کا اصل نام اور جائے پیدائش کسی کو نہیں معلوم۔ مرحوم استاد ولایت حسین خاں کے مطابق وہ ایک بہت قابل موسیقار تھے اور دلی کے قریب ہی کسی جگہ کے رہنے والے تھے۔ اپنے زمانے میں وہ ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ خیال، ترانہ اور چترنگ گانے میں بہت ماہر تھے۔ وہ خود اپنی بندشیں بناتے تھے اور یہ ہمیشہ بڑے مشکل راگوں میں ہوتی تھیں: پچیس، تیس سال پہلے تک آگرہ، دلی اور پٹیالہ گھرانوں کے موسیقاران کی بندشیں گاتے تھے۔ راگ سادرہ، بہار، لکشمی توڑی اور ایمن میں گائے ان کے گیت بہت مقبول تھے اور پرانے استاد انہیں اکثر گاتے تھے۔ وہ استاد بڑے چانگے خاں کے ہم عمر تھے اور کئی درباروں میں انہیں عزت و تکریم حاصل تھی۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے جنھوں نے بڑی شہرت پائی لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز تان رس خاں تھے میاں اچپل کا سنِ وفات ۱۸۶۰ بتایا جاتا ہے۔

دلی گھرانے کے کچھ دوسرے عظیم موسیقار یہ تھے۔ صادق خاں، بہادر خاں، دلاور خاں، بابا نصیر احمد، پنالال گوسائیں، گوسائیں سری لال، نور خاں، وزیر خاں، علی بخش خاں، محمد صدیق خاں، اور نثار احمد خاں۔ یہ گھرانہ اور بہت سے موسیقاروں پر بھی اپنے سے وابستگی کا دعویٰ کرتا تھا جو دلی کے آس پاس کے علاقوں میں رہتے تھے۔

پنالال گوسائیں برندابن کے گوسائیں گھرانے سے تھا لیکن یہ دلی آکر بس گئے تھے۔ پنالال گوسائیں ستار نواز تھے اور ہندوستان کے مشہور بین کار اور ستار نواز ان سے اصلاح تھے اصلاح

لینے والوں میں برکت اللہ خاں اور بمبئی کے بین کار مانگیش اور تلنگ جیسے نامی فنکار تھے۔ گوسائیں سری لال وغیرہ گانے میں اپنا جواب نہیں تھا۔ ان کی بنائی ہوئی درت کے ٹھمریاں اس قدر مقبول ہوئیں کہ بڑے بڑے فنکاروں کے علاوہ ناٹک کمپنیوں اور فلموں میں بھی گائیں۔۔۔ مثال کے طور پر۔
باٹ چلت نئی چنر رنگ ڈاری رے اور راگ بہار کی رچنا سگن بن لگن پون چلت پروائی مائی

ممّن خاں کا دلی گھرانہ

ایک دلی گھرانہ ممن خاں کا بھی۔ اس کے بانی سنگی خاں سارنگی نواز تھے۔ مشہور موسیقار بندو خاں، رمضان خاں، چاند خاں اور ان کی اولاد اور شاگرد اسی دلی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس خاندان میں عمدہ گویے اور سازندے پیدا ہوئے مگر ممن خاں اور بندو خان نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔



مکتب میں مولوی صاحب ہندو اور مسلمان لڑکیوں
کو پڑھا رہے ہیں ۔

تعلیمی ادارے

ہندوستان میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع سے چلتا آیا ہے۔ دلی میں بھی تاریخِ تعلیم بڑی پرانی ہے۔ ہندوستان میں تہذیبی تاریخ کی ابتدا آریوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے اور یہ تین ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ آریوں کا زمانہ ویدک دور کہلاتا ہے اور اس دور میں سنسکرت پھلی پھولی۔ اس زمانے میں تعلیم ویدوں کے مطالعے تک محدود تھی اور بچپن سے نوجوانی تک طالبِ علم وید پڑھتے تھے۔ اس مطالعے کو زندگی کو مفید بنانے کے لیے مکمل سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں برہمن عالم، علمِ حکمت، موسیقی، علم ہندسہ اور علم تاریخ وغیرہ بھی ایجاد کر چکے تھے۔ پڑھنے پڑھانے کے لیے آشرم قائم تھے جہاں طلبا رہتے تھے اور اور بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ گورو اور چیلے کی روایت تھی اور گورو کی سیوا پرم دھرم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی آگیا نہ ماننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ شروع شروع میں درختوں کی چھال اور روئی سے بنے سخت کپڑے کو کاغذ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

تیسری صدی قبل عیسوی میں پراچین ہندوستان میں ٹیکسلا علوم وفنون کا ایک بڑا مرکز تھا جسے ایک یونیورسٹی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ طبقوں کے تمام بچے، جن میں راجوں مہاراجوں کے لڑکے بھی شامل تھے اس میں ہندی علوم وفنون اور علمِ طب میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس وقت ذریعہ تعلیم پراکرت یا مگدھی تھا مگر کوئی دو سو سال بعد مہاراجہ بکرماجیت کے زمانے میں سنسکرت کو پھر عروج حاصل ہوا اور کالی داس جیسے عظیم شاعر پیدا ہوئے۔

بعد میں بدھ مت کے پیروکاروں نے تعلیم کو پھیلانے میں بڑا عظیم کام کیا اور نالندہ کی خانقاہ میں ایک بڑا تعلیمی مرکز قائم کیا جو تمام مشرق میں سب سے بڑی یونیورسٹی سمجھی جاتی تھی۔ اس میں اٹھارہ مدرسے تھے جن میں دس ہزار طالب علم عبادت کرتے تھے اور علم طب، فلسفے اور مذہب میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چینی سیاح فاہیان نے بھی چندر گپت بکرما جیت کے عہد میں، خانقاہوں میں تین سال سنسکرت کے مطالعے میں صرف کیے۔ وہ اس دور کے حالات یوں بیان کرتا ہے ـــــ

" بدھ مذہب کے پنڈتوں کو بڑا آرام تھا اور اپنے مذہب کی کتابوں کو پڑھنے کی بڑی فرصت تھی۔ مدرسے اور پاٹھ شالے جا بجا تھے۔ جانوروں کی قربانی بہت کم ہوتی تھی۔ گوشت صرف قوم چنڈال بیچتے تھے۔ جب وہ بازاروں میں نکلتے تھے تو ہاتھ میں ڈنڈے بجاتے تھے تاکہ وہ کسی کو نہ چھو جائیں۔ کوڑیوں کا چلن تھا اور لوگ متمول، رحمدل اور انصاف پسند تھے۔"

دلی میں تومر اور چوہان راجاؤں کے زمانے میں بھی تعلیم کا بڑا دور دورہ تھا۔ بڑے بڑے مٹھوں میں پاٹھ شالائیں قائم تھیں جن میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ پرتھوی راج چوہان کے مرنے کے بعد مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی اور مدرسے اور مکتب قائم ہوئے سلطانوں کی حکومت میں مسجدوں کے ساتھ مدرسے قائم ہوئے جہاں تعلیم دی جانے لگی۔ مذہبی تعلیم کے لیے ان مدرسوں میں عربی پڑھائی جانے لگی۔ تاریخی کتب میں ایک مدرسۂ معزی کا ذکر ملتا ہے جسے سلطان شمس الدین التمش نے قائم کیا تھا۔ اس نے اس کا نام سلطان معزالدین کے نام پر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسے کی دیکھ بھال اچھی طرح نہیں ہو سکی اور مرمت پر توجہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں صرف اس کے کھنڈرات باقی تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا اور صندل کے دروازے لگوائے۔ دوسرا مدرسہ دہلی میں ناصریہ کے نام سے قائم ہوا۔ یہ مدرسہ التمش کے بیٹے سلطان ناصرالدین کے نام پر قائم ہوا تھا جو بڑا متقی، پرہیزگار اور عابد بادشاہ تھا۔ مدرسۂ ناصریہ کے مہتمم اور نگراں مشہور عالم اور بزرگ ابو عمر منہاج السراج تھے۔

دلی میں گھروں پر بھی تعلیم دینے کا رواج تھا۔ جب حضرت نظام الدین اولیا دہلی تشریف لائے تو انھوں نے مسجد ہلال طشت دار کے پاس قیام فرمایا۔ خواجہ شمس الدین خوارزمی اس وقت اپنے حجرے میں تعلیم دیتے تھے اور وہ مدرسہ درسگاہ خواجہ شمس الدین خوارزمی کہلاتا تھا۔ حضرت نظام الدین بھی اسی مدرسے میں تعلیم پانے لگے۔ ان کے ساتھ ہی مولانا قطب الدین ناقلہ اور مولانا برہان الدین عبدالباقی بھی اس مدرسے میں تعلیم پاتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں بھی روحانی تعلیم دیتے تھے اور قرآن مجید کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔

محمد تغلق کے زمانے میں دہلی میں ایک ہزار مدرسے اور مکتبے تھے۔ زیادہ تر مدرسے مسجدوں کے ساتھ وابستہ تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں بھی تعلیم کو بڑی ترقی ملی۔ بہت سے نئے مدرسے قائم ہوئے اور مولویوں، استادوں اور اہلِ علم و دانش کے رہنے کے لیے عالی شان مکان بھی بنوائے گئے۔ فیروز شاہ نے اپنی تالیف فتوحاتِ فیروز شاہی میں مدرسوں کی تعداد تیس، خانقاہیں بیس اور شفا خانے پانچ لکھے ہیں۔ دوسرے تاریخ دانوں نے پچاس مدرسے تحریر کیے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مدرسہ، مدرسہ فیروز شاہی ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا تھا۔ اسے مدرسے کے متولی اور مدرسِ اعلیٰ مولانا جلال الدین رومی تھے۔

تغلقوں اور لودھیوں کے زمانے میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ سلطان سکندر لودھی نے ہندوؤں کو بھی فارسی سیکھنے کی ترغیب دی مگر شروع میں کائستھوں کے سوا اور کسی نے بادشاہ کی بات نہیں مانی مگر دھیرے دھیرے ہندوؤں نے بھی فارسی سیکھنی شروع کر دی اور مسلمانوں نے ہندی شاعری اور ادب میں بڑا نام پایا۔

مغلوں کے عہد میں ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں شیخ حسین مدرسِ اعلیٰ تھے۔ اس مدرسے میں ریاضی، نجوم اور جغرافیے کی تعلیم دی جاتی تھی ہمایوں کے مقبرے کی چھت پر بھی ایک مدرسہ تھا جس میں دور دور سے طلبا آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس وقت کا یہ ایک اہم تعلیمی ادارہ تھا۔ شہنشاہ اکبر کی دودھ پلانے والی انّا

ماہم انگا نے بھی ۱۵۶۱ میں پرانے قلعے کے سامنے ایک مدرسہ بنوایا تھا جس کے کھنڈر ابھی تک موجود ہیں۔ شاہ جہاں نے دلی میں جامع مسجد کے پاس ایک شاہی مدرسہ قائم کیا مگر وہ ۱۸۵۷ کی تباہی سے بہت پہلے ہی نیست و نابود ہوگیا۔ مگر شاہ جہاں کے زمانے میں بہت سے مدرسے بڑی کامیابی سے چل رہے تھے۔ شاہجہاں کے شاہی مدرسے کا نام دارالبقا تھا اور اس کے مہتمم مولانا صدرالدین تھے۔

مغلیہ عہد کے چند مشہور مدرسوں کی تفصیل، جن میں شاہی مدرسہ یعنی دارالبقا بھی شامل ہے، نیچے دی جاتی ہے۔

دارالبقا

یہ مدرسہ بلکہ کالج شاہجہاں نے تعمیر کرایا تھا اور جامع مسجد کے شمال میں دارالشفا کے برابر میں تھا۔ اس کے مدرسِ اعلیٰ مولانا ابو یوسف بیا بانی تھے جو فقہ اور حدیث کے مشہور عالم تھے۔ اس میں طلبا کی تعداد بڑی کثیر تھی۔ جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت خستہ ہوگئی اور یہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تو مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی نے بڑا پیسہ لگا کر اسے پھر تعمیر کرایا مگر ۱۸۵۷ کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے اسے منہدم کرادیا۔

مدرسہ درگاہ رسول نما

درگاہ رسول نما میں ایک مدرسہ حضرت سید حسن رسول نما نے قائم کیا تھا۔ آپ ایک کامل ولی اور صاحب کرامت بزرگ تھے اور اسی نسبت سے رسول نما مشہور ہوئے۔ یہ مدرسہ بھی اپنے وقت میں تحصیلِ علم کے لیے دور دور تک مشہور تھا۔ عالمگیر کے عہد میں دلی آئے تھے۔ ۱۱۰۳ ہجری میں فوت ہوئے اور اپنے مدرسے کے صحن میں دفن ہوئے۔ ان کی موت کے بعد مدرسہ بھی خالی ہوگیا۔

مدرسۂ شاہ ابوالرضا

شاہ ابوالرضا کی ساری زندگی درس وتدریس میں گزری۔ شروع شروع میں انھوں نے اپنے مدرسے میں طلبا کو ہر قسم کے علوم اور فنون کی تعلیم دی لیکن آخری عمر میں طبیعت قرآن اور حدیث کی طرف ایسی مائل ہوئی کہ ان کے سوا اور کسی علم کا درس نہیں دیا۔ صاحب کرامات تھے اور ہر بڑے چھوٹے کے دل میں ان کے لیے بے پناہ توقیر تھی۔ آپکا انتقال ۱۱۰۲ھ میں ہوا اور آپ کی قبر درگاہ بستی حضرت نظام الدین اولیا میں ہے۔ اپنے پیچھے طلبا کی ایک بڑی تعداد چھوڑ گئے جن میں سے کچھ فضل وکمال کے اعتبار سے خود بھی اعلیٰ درجے کے عالم ہوئے۔

مدرسۂ رحیمیہ

مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے عالمگیر کے عہد میں قائم کیا تھا۔ اس میں بھی علوم دینی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مدرسے کی اتنی شہرت ہوئی کہ دور دراز کے علاقوں سے طلبا حدیث کے مطالعے کے لیے آنے لگے۔ یہ مدرسہ مہندیوں میں قائم ہوا تھا اور آخر تک وہیں رہا۔ شاہ عبدالرحیم کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ نے مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم دینی شروع کردی۔ مدرسے کی شہرت اور بھی زیادہ ہوگئی اور محمد شاہ رنگیلا تک قائم رہی۔ محمد شاہ نے کلاں محل کے پاس ایک عالی شان مکان تعمیر کرایا اور اس میں ایک مدرسہ قائم کردیا۔ اس مدرسے کے قائم ہونے کے بعد مدرسہ رحیمیہ ختم ہوگیا۔

مدرسۂ اکبرآبادی

یہ مدرسہ اکبرآبادی مسجد میں تھا جو فیض بازار کے مشرق میں تھی لال پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ مسجد میں عبادت کے علاوہ درس وتدریس کا کام بھی ہوتا تھا اور اس پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا جس پر "طلبا علم رسانند" لکھا ہوا تھا۔ اس مدرسے میں دور دراز سے

طلبا دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ ۱۸۵۷ کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد اکبر آبادی مسجد کو بھی بغاوت کا ایک مرکز سمجھ کر انگریزوں نے تباہ وبرباد کر دیا تھا۔

مدرسہ روشن الدولہ

یہ مدرسہ چاندنی چوک میں کوتوالی کے قریب (جسے اب سکھوں کو سونپ دیا گیا ہے) سنہری مسجد میں تھا۔ سنہری مسجد کو اُس وقت روشن الدولہ مسجد کہا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ نے دلی کے قتلِ عام کا حکم اسی مسجد میں بیٹھ کر دیا تھا۔ اس مدرسے میں طلبا دور دور سے آکر تعلیمِ حدیث لیتے تھے۔

مدرسہ شرف الدولہ

مسجد شرف الدولہ میں تھا۔ مسجد و مدرسہ نواب شرف الدولہ نے محمد شاہ کے عہد میں بنوایا تھا۔ دریبہ کلاں میں یہ مسجد تھی۔ اُس میں کافی عرصے تک طلبا کو دینی تعلیم دی جاتی رہی۔ مسجد کی پیشانی پر ایک کتبہ تھا جس میں مدرسے اور مسجد دونوں کا ذکر ہے۔

مدرسہ محتسب

اسی نام کی مسجد میں تھا جو پھاٹک حبش خاں میں کوچہ مولوی ہاشم میں محمد شاہ کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس مسجد کے بانی دہلی کے محتسب ابوسعید تھے۔ مسجد بھی بڑی وسیع و عریض تھی اور مشرقی جانب طالب علموں کے لیے حجرے اور مدرسہ تھا۔ مدرسے میں علم فقہ حدیث اور تفسیر کی بیش بہا کتب پڑھائی جاتی تھیں۔ طلبا کو کھانا خواجہ محمد عاقل کے لنگر سے مفت ملتا تھا جو اس مدرسے میں تعلیم بھی دیتے تھے۔

مدرسہ شاہ غلام علی

شاہ غلام علی خاں، جن کے والد پنجاب سے دہلی آکر بسے تھے خانقاہ مظہریہ میں قیام

کرتے تھے اور ایک باکمال بزرگ تھے۔ آپ تفسیر اور حدیث کی تعلیم دیتے تھے اور آپ کو سننے کے لیے خانقاہ میں ایک جم غفیر اکٹھا ہو جاتا تھا اور حاضرین پر ان کے وعظ سے ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کے انتقال کے بعد مدرسے میں تعلیم دینے کا کام شاہ ابوسعید صاحب اور ان کے صاحبزادے شاہ احمد سعید نے جاری رکھا اور ان دونوں کی حیات تک یہ مدرسہ تعلیم حدیث کا ایک بڑا مرکز رہا۔

مدرسہ نواب قطب الدین

مسجد نواب قطب الدین جس میں یہ مدرسہ قائم تھا بلبل خانہ بھوجلہ پہاڑی پر ۱۷۴۵ عیسوی محمد شاہ کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ مدرسے کا مکان اب نیست و نابود ہو گیا ہے مگر قیاس کیا جاتا ہے کہ اس مدرسے میں بھی ایک صدی تک تعلیم حدیث اور تفسیر دی جاتی رہی۔

مدرسہ میر جملہ

یہ مدرسہ لال کنواں پر تھا اور عالمگیر کے عہد میں میر جملہ نے بنوایا تھا۔ اس مدرسے کا اب کوئی نام و نشان باقی نہیں مگر مدرسہ میر جملہ کے نام سے ایک گلی اب تک موجود ہے۔

مدرسہ غازی الدین خاں

اس مدرسے کی عمارت ۱۷۱۰ سے پہلے شاہ عالم بن عالمگیر کے عہد میں مکمل ہو گئی تھی۔ اسے غازی الدین خاں فیروز جنگ نے بنوایا تھا۔ شروع میں اس میں صرف نو طلبا تعلیم پاتے تھے۔ یہی مدرسہ بعد میں دلی کالج بنا۔ کئی دفعہ اجڑا اور بسا۔ دلی کے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی تاریخ اس سکول سے بہت وابستہ رہی۔

مدرسہ شیخ کلیم اللہ

یہ مدرسہ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی نے جو مشہور عالم تھے اور حدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ ۱۶۸۰ میں جامع مسجد کے قریب بازار خانم میں قائم کیا تھا۔ عالمگیر کا عہد تھا اور اس مدرسے کو حکومت کی مدد حاصل تھی۔ طلبا کی ایک کثیر تعداد اس مدرسے میں رہتی اور تعلیم حاصل کرتی تھی۔ ان کو کھانا اور کپڑا حکومت سے ملتا تھا۔ ذریعۂ تعلیم فارسی تھا۔

انگریزوں نے ۱۸۱۲ - ۱۸۱۳ میں یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دیں مگر اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ ۱۸۲۵ میں انگریزوں نے اجمیری دروازے کے باہر بنے مدرسۂ غازی الدین کو انگریزی کالج میں بدل کر اس کا نام دہلی کالج رکھا۔ یہ کالج بعد میں کچھ عرصے کے لیے اینگلو عربک کالج کہلایا اور پھر آزادی کے بعد دہلی کالج ہو گیا۔ انگریزوں نے تعلیم کے پیمانے ڈھنگ بدلنے شروع کر دئے اور عربی اور فارسی کی تعلیم کو نقصان پہنچا۔ دینی مکتب ایک ایک کر کے بند ہونے لگے اور مذہبی تعلیم صرف چند مسجدوں تک محدود رہ گئی۔ شروع شروع میں تو ہندوستانیوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کیا تھا مگر آہستہ آہستہ انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ اس زمانے کے نامی پروفیسروں اور شاگردوں میں ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال آشوب، منشی کریم الدین، مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، منشی بھیروں پرشاد، مولانا حسین آزاد، مکندلال ماتھر اور پنڈت من پھول شامل تھے۔ مگر جہاں تک دلی کے عوام کا تعلق تھا، انہیں انگریزی سے رغبت نہیں تھی اور ان کے سینے میں ایک۔، آگ بھڑکتی رہی۔

دلی میں طاقت حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے مشنریوں کے ذریعے دلی کے تعلیمی اداروں میں زیادہ مداخلت شروع کر دی تھی۔ مسٹر ٹیلر دلی کالج کے پرنسپل تھے اور ماسٹر رام چندر جو کائستھ تھے عیسائی مذہب قبول کر کے عیسائیت کے پراپیگنڈے میں پیش پیش تھے۔ رام چندر علم ریاضی کے ماہر تھے اور انھوں نے ایک کتاب انگریزی میں

"سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے ہندسوں کے مسائل" لکھی تھی۔ ۱۸۴۱ سے ۱۸۵۶ تک دلی کالج کشمیری دروازے کے پاس داراشکوہ کے کتب خانے میں (جہاں آج انجینئرنگ کالج ہے) چلتا رہا۔ مرزا غالب کو بھی اس کالج میں پڑھانے کے لیے حکام نے نوکری دینی چاہی تھی لیکن جب غالب پالکی میں بیٹھ کر کالج پہنچے تو انگریز پرنسپل انہیں لینے کے لیے دفتر سے باہر نہیں آیا۔ اس پر مرزا ناراض ہو گئے اور واپس گھر چلے آئے۔ جب انہیں سمجھایا گیا کہ آپ ملازمت کے لیے گئے تھے، آپ کو خود پرنسپل کے پاس جانا چاہیئے تھا تو مرزا بولے ـــــ "پرنسپل میرا دوست ہے۔ ایسی نوکری کس کام کی جس میں دوستی بھی نہ رہے۔"

لالہ مکند لال ماتھر کا شمار دلی کی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا تھا۔ نہایت ذہین اور باوصف آدمی تھے۔ دلی میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی مگر بعد میں انگریزی علم طب کا شوق ہو گیا اور میڈیکل کالج کلکتہ میں داخلے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اُن دنوں ریل نہیں تھی۔ طرح طرح کی سواریوں میں سفر کر کے اور صعوبتیں اٹھا کر اور آخر میں دریائے گنگا میں بذریعہ کشتی سفر کر کے کلکتہ پہنچے۔ ۲ جون ۱۸۵۰ کو کلکتہ پہنچ کر انھوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور کئی سال کی پڑھائی کے بعد ڈاکٹر بن گئے۔ انھوں نے ڈاکٹر کے طور پر بڑی عزت حاصل کی اور گورنر جنرل کے آنریری سرجن مقرر ہوئے۔ کئی اعزاز پائے اور کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو بھی بنائے گئے۔ انھوں نے اپنے کلکتہ کے سفر نامے کے حالات بھی لکھے جو فوائد الناظرین کے ۲ جولائی ۱۸۵۰ کے شمارے میں شائع ہوئے۔ ان کی طبی تصنیفات ان کی غیر معمولی استعداد کا ثبوت ہیں۔

منشی بھیروں پرشاد دہلی کے کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ منشی جی نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ بڑے ہونہار اور لائق تھے۔ بی۔ اے کے امتحان میں فرسٹ آئے تھے۔ آرنلڈ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا تھا۔ دہلی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر بن گئے تھے۔ سانولے رنگ کے تھے اور عینک پہنتے تھے۔ جاڑے میں مخمل کی اچکن اور گرمی میں کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ سر پر عمامہ ہوتا تھا اور ازار بند اکثر لٹکتا رہتا تھا۔ پینے پلانے

کے بھی شوقین تھے۔ اہلِ علم و دانش ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور طلبا تو ان کی پرستش کرتے تھے۔

منشی بھیروں پرشاد ۱۸۶۵ میں گورنمنٹ ہائی سکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے تھے۔ ان کو زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور ان کی تحریر میں بلا کی روانی تھی۔ دلی والے ہونے کے ناطے سے اردو ان کی لونڈی تھی۔ کائستھ ہونے کی بنا پر فارسی پر بھی قدرت حاصل تھی۔ جب ۱۸۷۷ میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ دلی کالج بند کیا جائے گا تو منشی بھیروں پرشاد نے اس کے خلاف ہوئے احتجاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جو وفد اس سلسلے میں وائسرائے سے ملا تھا اس میں اور مشہور ہستیوں کے ساتھ منشی بھیروں پرشاد بھی تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے دہلی میں ایک لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس سوسائٹی نے اردو کی بڑی خدمت کی۔ ایک اندازے کے مطابق ماسٹر بھیروں پرشاد کا انتقال ۱۹۱۲ء میں دہلی ہی میں ہوا۔

قدیم دہلی کالج کے کارہائے نمایاں ہندوستان کی تعلیم و تمدن کی تاریخ میں ممتاز جگہ رکھتے ہیں۔ دہلی کالج نے نہ صرف ملکی زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں بلکہ اردو نثر کو بھی مالا مال کر دیا اور اسے نئی قدریں عطا کیں۔ اس طرح سے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی۔ مشرق اور مغرب کا وہ امتزاج اور سائنسی نقطۂ نظر کا وہ اولین احساس دہلی کالج نے ہی پیدا کیا تھا۔ پیارے لال آشوب قومی یک جہتی کے دلدادہ تھے۔ ان کے بھتیجے لالہ سری رام مولف تذکرۂ خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں :-

" دہلی سوسائٹی کا ظہور آشوب صاحب کی تحریک اور مساعی کا نتیجہ تھا۔ وہ اس کے سکریٹری اور روحِ رواں بنے رہے۔ اس سوسائٹی کے اول جلسے میں مرزا غالب باوجود ضعیف العمری کے تشریف بھی لائے اور ایک مضمون بھی پڑھا۔ جب مرزا صاحب جلسے میں پہنچے تو سب حیران تھے کہ علالت اور ضعف کی وجہ سے کہیں جاتے نہیں تھے آج کیسے تشریف لائے۔ استفسار پر مرزا غالب نے مسکرا کر پیارے لال آشوب کی طرف اشارہ کیا اور کہا ـــ

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہست "

۱۸۵۷ میں جب مغلوں کی سلطنت عملی طور پر ختم ہی ہوگئی تو انگریزوں نے اپنے ڈھنگ پر تعلیم دینے کے لیے مشن سکول کھولے۔ ان اسکولوں میں انگریزی کے علاوہ بائبل یا انجیل بھی پڑھائی جاتی تھی۔ دلی والے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں بھیجتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ عیسائی نہ بنادئے جائیں۔ مگر دھیرے دھیرے یہ ڈر مٹتا چلا گیا۔ پھر بھی دلی میں بہت عرصے تک ہندوستانی اور انگریزی دونوں ہی ڈھنگ کی پڑھائی چلتی رہی، اگرچہ مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں بچوں کی تعداد گھٹتی رہی۔ ہندو بیوپاریوں اور سیٹھوں کے بچے چھ سات سال کے ہوئے تو پاٹھ شالاؤں میں چلے جاتے تھے جہاں برہمن ماسٹر ہندی، سنسکرت اور حساب پڑھانے پر زور دیتے۔ یہ پاٹھ شالائیں کسی محلے کی بیٹھک یا کسی بیوپاری کی حویلی میں لگتیں۔ مکتب یا مدرسے میں اردو یا فارسی پڑھائی جاتی اور کہیں کہیں عربی کے پڑھانے کا انتظام بھی ہوتا۔ یہ مدرسے بھی کسی امیر کی حویلی یا کسی بڑے مکان کے دالان میں ہوتے تھے۔

۱۸۵۷ کے بلوے میں نہ صرف دلی کالج کو جلا دیا گیا تھا بلکہ اس کے پرنسپل مسٹر ٹیلر، ہیڈ ماسٹر مسٹر رابرٹس اور سیکنڈ ماسٹر مسٹر سٹوآرٹ کو بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ بعد میں فارسی کے استاد مولوی امام بخش کو بغاوت کے جرم میں مار کر ختم کر دیا گیا تھا۔ کئی سالوں تک دلی کالج میں فوجیں پڑی رہیں۔ ۱۸۷۲ میں اس کالج کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے پھر شروع کر دیا گیا مگر پہلی اپریل ۱۸۷۷ سے اسے لاہور کالج کا حصہ بنا دیا گیا۔ مگر اسے الگ کالج کے طور پر قائم کرنے کی کوشش جاری رہی۔ ۱۹۲۴ میں انٹرمیڈیٹ کالج کے طور پر قائم ہوگیا۔ بعد میں اس میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی کلاسیں شامل کر دی گئیں۔ البتہ ۱۹۲۴ سے ۱۹۴۷ تک اس کالج کا نام اینگلو عربک کالج رہا۔ ۱۹۴۷ کے فرقہ وارانہ فسادات میں اسے پھر تباہی کا سامنا کرنا پڑا لیکن ۱۹۴۸ میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوششوں سے اپنے پرانے نام دلی کالج کے ساتھ پھر شروع کر دیا گیا۔ اس کے پرنسپل مشہور ادیب

اور عالم مرزا محمود بیگ (مرحوم) مقرر ہوئے تھے۔

مشن کالج (سینٹ سٹیفنز) کیمبرج مشن دہلی کے اہتمام میں ۱۸۸۱ میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ کالج حکومتِ پنجاب کی خصوصی درخواست پر شروع کیا گیا تھا تاکہ دلی شہر کے لیے اونچی تعلیم کی وہ سہولتیں مہیا ہو سکیں جو ۱۸۷۷ میں دلی کالج کے بند ہو جانے سے ختم ہو گئی تھیں۔ ۴۰ سال تک سینٹ سٹیفنز کالج پنجاب یونیورسٹی سے ملحق رہا کیونکہ دلی یونیورسٹی کا قیام ۱۹۲۲ میں ہوا تھا۔ یہ کالج آج بھی دلی کا ایک چوٹی کا کالج ہے اور دلی کی ثقافتی اور تمدنی زندگی میں اسے ہمیشہ ایک اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے مایۂ ناز طلبا میں ایس۔کے۔ رودرا، جو بعد میں کالج کے پرنسپل بھی بنے' ایس کے بوس، ڈاکٹر تارا چند اور مرزا محمود بیگ وغیرہ شامل ہیں۔

ایک مشن ہال سکول چاندنی چوک میں تھا جو مشن کالج کی ہی شاخ تھی۔ اس کا پچھلا پھاٹک دریبے کی طرف کھلتا تھا۔ ماسٹر جانکی ناتھ اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ لڑکے ان کو جلاّد کہتے تھے۔ جو لڑکا شرارت کے لیے سزا پانے کے لیے ان کے سامنے پیش ہوتا تھا اس کی پانی سے بھیگی ہوئی بید سے خبر لیتے جس کے نشان جسم پر کئی دنوں تک نہ مٹتے۔ مدرسہ کھلنے پر یہاں بھی صحن میں دعا اور اس کے بعد لیکچر ہوتا تھا۔ علاوہ اور سب ماسٹروں کے ایک دو ماسٹر سزا دینے کے لیے بھی مقرر ہوتے تھے۔ یہ کرسچن ہوتے تھے اور لڑکے کا قصور دریافت کر کے اسے توبہ کرنے کی ہدایت دیتے تھے۔ اگر کسی کا قصور قابلِ معافی نہ ہوتا تو بید سے مارتے تھے اور بعد میں توبہ اور قسم دلاتے تھے۔ بید مارتے ہوئے زبان سے یہ کہتے ــ" میں یسوع مسیح کو حاضر ناظر جان کر تمہیں بغیر کسی جانبداری کے مناسب سزا دیتا ہوں " مشہور مفکر اور عالم لالہ ہردیال جو کائستھ ماتھر تھے اور جنہوں نے امریکہ جا کر غدر پارٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی اسکول میں پڑھے تھے۔ مشن اسکول کے سب سے ہر دلعزیز ماسٹر امیر چند تھے۔ یہ غریب لڑکوں کی کتابوں کاپیوں سے بھی مدد کرتے تھے اور کپڑے تک بنوا دیتے تھے۔ جب ۱۹۱۲ میں لارڈ ہارڈنگ کی سواری پر بم کا گولہ پھینکا گیا تو ان کو بھی پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ ان کے دو تین اور بھی ساتھی شہید ہو گئے تھے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ یہ لالہ ہردیال کی غدر پارٹی کے بانیوں

میں سے تھے۔ مشنریوں نے انہیں چھڑوانا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہوئے تھے۔ سب دلی والوں کو ان کے پھانسی دئے جانے پر بہت رنج ہوا۔

مشن کالج کے بعد ہندو کالج اور پھر راجس کالج کھل گئے۔ لیکن آج کی دلی میں پڑھائی کا بول بالا ہے۔ اتنے اسکول، کالج اور مدرسے جگہ جگہ کھلے ہوئے ہیں کہ ان کی گنتی بھی مشکل ہے۔ جتنے سرکاری سکول ہیں اس سے زیادہ غیر سرکاری سکول ہیں۔ انگریزی نے ہندوستان میں بھی پورے عروج پر ہے۔ ہر آدمی اپنے بچے کو انگریزی سکول میں پڑھانا چاہتا ہے۔ جتنی تعداد پڑھنے والے لڑکوں کی ہے، اتنی ہی لڑکیوں کی ہے۔ انگریزی سکولوں میں ہر بچے کا خرچہ اوسطاً ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے۔ دل کش، خوشنما وردی پہنے چہچہاتے اور مسکراتے ہوئے بچے اپنا ٹفن اور پانی کی بوتل لیے سکول جاتے نظر آتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ایک بالکل ہی مختلف منظر نصف صدی پہلے دلی میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ بیتے دنوں میں پردہ بہت تھا اور لڑکیاں گھر سے باہر پاؤں نہیں رکھتی تھیں۔ مسلمان لڑکیاں گھر میں یا کسی پردے دار زنانہ مدرسے میں کچھ اردو، فارسی یا عربی پڑھ لیتی تھیں اور ذرا سیانی ہوئیں تو گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر امورِ خانہ داری میں اپنی ماؤں کی مدد کرتی تھیں۔ زیادہ تر ہندو لڑکیوں کا بھی یہی حال تھا کہ پڑھنے بٹھا دیا تو چار جماعت تک پڑھ گئیں اور پھر گھر میں کڑھائی بنائی اور رسوئی کا کام سیکھنے لگیں۔ ایک اوسط درجے کے گھر میں شادی بیاہ کے لیے یہ مانگ نہیں تھی کہ لڑکی بہت پڑھی لکھی ہو۔ معدودے چند خوشحال گھروں کے، لڑکوں کی تعلیم بھی دسویں جماعت تک محدود تھی۔

پہلے لڑکے روتے مچلتے، چیختے چلاتے پڑھنے جاتے تھے۔ بعض کو ان کے بڑے بھائی یا کوئی چچا ڈنڈا ڈولی کر کے لے جاتے تھا۔ ناک، منھ اور کپڑوں کی صفائی کی طرف برائے نام دھیان دیا جاتا تھا۔ عموماً چھ سات برس کی عمر میں لڑکا سکول جاتا تھا اور کیونکہ اس زمانے میں چار پانچ سال کا لڑکا بھی دن بھر گھر سے نکل کر اپنی گلی اور سڑک پر کھیلتا تھا اور صرف بھوک لگنے پر یا بلائے جانے پر ہی گھر میں آتا تھا وہ سکول میں قید ہونے اور مار کھانے کی قدرتی طور پر مزاحمت کرتا اور زبردستی کیے بغیر سکول نہ جاتا۔

جس روز بچہ پہلے پہل سکول جاتا تو پنڈت جی یا مولوی صاحب کو 'شروع کرائی' ملتی اور لڑکوں کو شیرینی بانٹی جاتی۔ مولوی صاحب کسی مسجد میں یا کسی گھر میں دس بارہ لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔ مولوی صاحب کو محنتانہ کے علاوہ 'تہواریاں' بھی ملتی تھیں۔ ہندو مسلمان لڑکے اپنے اپنے تہواروں پر گھروں سے کچھ نہ کچھ لاکر دیا کرتے تھے۔ جمعراتی، عیدی لکھوائی، کن چھیدن اور مونڈن وغیرہ کی رسموں پر بھی نذر دی جاتی تھی۔

پرائمری سکول کے بچوں کے بستے میں سلیٹ، پنسل، کتاب اور نیزے یا سرکنڈے کی قلم رکھی رہتی تھی۔ سلیٹ پر سیل کھڑی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے یا "بتی" سے لکھا جاتا تھا۔ بچے بستہ بغل میں مار کر اور ہاتھ میں کالی سیاہی کی مٹی کی دوات اور تختی لے کر مدرسے جاتے تھے۔ مدرسے میں بچے ٹاٹ پر بیٹھتے تھے اور جب تک ماسٹر جی یا مولوی صاحب نہ آتے، خوب شور اور دنگا مچائے رکھتے تھے۔ بہت سے بچے سیاہی سے اپنے ہاتھ، منھ اور پیر کالے کر لیتے تھے اور قلم سے دوات میں اس طرح ڈوبا بھرتے تھے کہ سیاہی میں پڑا پھونسڑا قلم میں اٹک کر باہر آجاتا جس سے بچھا ہوا ٹاٹ، کلاس کا فرش اور دیواریں بھی گندی ہو جاتی تھیں۔

امتحان کے وقت اگر کوئی بھولے سے قلم پر قلم کو قط لگا لیتا تو بدشگونی سمجھی جاتی۔ لڑکے جب پاس ہوتے تو جماعت چڑھنے پر ایک دوسرے کے خوب چپت اڑاتے اور کہتے۔ "آؤ بے لڑکو کھچڑی پکا ہیں"۔ جب گھر پہنچتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے اور سب سے کہتے "مار دیا پاپڑ والے کو" گھر والے خوش ہو کر دعائیں دیتے۔ اگر کوئی بچہ کتاب سے جی چراتا تو سب بہت ڈانٹتے تھے اور کہتے تھے کہ بیٹا پڑھو لکھو گے نہیں تو بڑے ہو کر بھٹے بھونو گے، گھاس کھودو گے اور جوتیاں چٹخاتے پھرو گے۔ اُن دنوں سیکھ کے طور پر بڑے بچوں کو یہ شعر سنایا کرتے تھے۔

پڑھو گے، لکھو گے ہو گے نواب
کھیلو گے، کودو گے ہو گے خراب

لیکن شریر بچے بعد میں اپنے ساتھیوں کے درمیان نواب کی جگہ خراب اور خراب کی جگہ نواب

کہہ کر شعر پڑھتے تھے۔

ان دنوں کے بچے کلاس میں پڑھائی کی بجائے شرارت کی طرف دھیان دیتے اور طرح طرح کی چھیڑ خانی اور شرارت کرتے۔ ماسٹر جی یا مولوی صاحب بھی خوب ٹھکائی کرتے۔ بچوں کو سب کے سامنے کان پکڑوا کر مرغا بنا دیتے اور انہیں بڑی دیر تک اسی حالت میں رہنا پڑتا اور تکلیف کے مارے ٹانگوں کو ہلاتے رہتے۔ ایک ٹانگ پر کھڑے کر دئے جاتے اور دوسری ٹانگ زمین پر لگی نہیں کہ تڑ سے ڈنڈا یا قمچی لگتی۔ تھپڑ، مکوں، بید اور ڈنڈے (گول رُولر) سے بھی خوب مرمت کی جاتی۔ پیٹھ پر اتنے زور سے قمچی مارتے کہ کبھی کبھی کھال ادھڑ جاتی۔ ایسا چانٹا جماتے کہ پانچوں انگلیوں کے نشان منھ پر پڑ جاتے۔ بھول چوک پر ایسی کراری چٹکی بھر لیتے کہ نانی دادی یاد آجاتی۔ بچے بلبلا اٹھتے اور دوہرے تہرے ہو جاتے مگر ضبط اور ماسٹر سے خوف کا یہ عالم تھا کہ بڑی جماعتوں کے تگڑے لڑکے بھی نہ مزاحمت کرتے، نہ ماسٹر کے خلاف کچھ کرنے کی جرأت کرتے۔ ماسٹر جی یا مولوی صاحب پھسڈی اور پڑھائی میں کمزور بچوں کو اکثر کہا کرتے۔ مارتے مارتے بھرکس نکال دوں گا، الٹی کھوپڑی کا، ٹانٹ میں کچھ بیٹھتا ہی نہیں، سر میں گوبر بھرا ہے اس کے۔

کچھ ایسے بھی ماسٹر ہوتے تھے جو بن بات کے بچوں کو پیٹ دیتے تھے۔ کام ٹھیک بھی کیا ہو تو ایک آدھ گھونسا جما دیتے تھے۔ سکول کے مولوی صاحب ماسٹروں کی مار کی صفائی میں کہا کرتے۔ جورِ استاد بہ زمہرِ پدر۔ ماسٹروں کے ڈنڈے کو سب 'مولا بخش' کہتے تھے۔

مکتب کے مولوی صاحب تو بچوں سے پان بھی منگواتے، چلم بھرواتے اور پنکھا بھی جھلواتے تھے۔ دلی کے ایک مکتب میں ایک لڑکا جس کا نام سلیمان تھا بہت ہٹا کٹا اور ڈیل ڈول والا تھا۔ لڑکے اسے لم ٹنگو اور لم ڈھینگ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا ایک دوست مہتاب رائے تھا، بہت موٹا اور پھپھس۔ اسے اگڑ دھوں دھوں کہتے تھے۔ دلی میں کٹرہ خوشحال رائے میں، مہتاب رائے کے باپ لالہ خوشوقت رائے نے یہ مکتب اپنے

مکان میں ہی کھول رکھا تھا۔ ایک اللہ میاں کی گائے جیسے سیدھے سادے مولوی صاحب کو بچوں کے پڑھانے کے لیے رکھ لیا تھا۔ ان مولوی صاحب کو نیند بڑی آتی تھی۔ ایک دن سو رہے تھے۔ لم ٹنگو پنکھا جھل رہا تھا۔ مولوی صاحب کو عادت تھی کہ سو کر اٹھتے ہی پہلے پانی پیا کرتے تھے۔ ایک جھجّر ان کے پاس رکھی رہتی تھی۔ گرمی کا موسم، ٹھنڈی جگہ دیکھ کر ایک چھوٹی سی چوہیا اس جھجّر سے لپٹی جا رہی تھی۔ لم ٹنگو کے دل میں شرارت سوجھی اور اس نے چوہیا کو دُم سے پکڑ کر جھجر میں ڈال دیا۔ مولوی صاحب کی جو آنکھ کھلی تو اٹھتے ہی جھجر منہ سے لگا لی۔ چوہیا جو منہ میں آئی تو جھٹ سے فرش پر کلی کر دی۔ لم ڈھیک تو چپ رہا لیکن اگڑ دھوں دھوں کی ہنسی نکل گئی۔ بس پھر کیا تھا مولوی صاحب نے اس کی پیٹھ پر ایسے ڈنڈے برسائے کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ رات دن کی ایسی ہی شرارتوں سے تنگ آ کر آخر لالہ خوش وقت رائے نے یہ مکتب ہی بند کر دیا۔

زیادہ تر ہشیار بچوں کو ہی کلاس کا مانیٹر بنایا جاتا تھا۔ لیکن کوئی کوئی ماسٹر اپنے بھروسے والے اور شریر بچوں کو بھی مانیٹر بنا دیتے تھے تاکہ ماسٹر کی غیر حاضری میں امن چین رہے۔ مانیٹر کو حکم دیا جاتا کہ ایک پتلی لمبی ہری قمچی درخت پر سے توڑ کر لاؤ کیونکہ آج ان سب بدمعاشوں نے ایکہ کر لیا ہے کہ سبق کے مشکل الفاظ کے معنی نہ سنائیں۔ مانیٹر قمچی توڑ لاتا تو اسے ہی تمام لڑکوں کے دو دو مارنے کا حکم دیتے۔ یا نیٹر اگر کسی دوست اور جان پہچان کے لڑکے کو جان کر قمچی آہستہ سے مارتا تو اس کے ہاتھ سے قمچی لے کر خود لڑکوں کو زور سے مارتے اور ساتھ ہی کہتے ”ابے اس طرح مارتے ہیں، اس طرح۔ تو تو پھول چھوا رہا ہے۔“ مگر بچے کیا تھے آفت کے پرکالے تھے، قمچی کھا کر بھی باز نہ آتے۔ ماسٹر صاحب ذرا سی دیر کو باہر جاتے تو جماعت میں کچھریاں سی بکنے لگتیں۔ لڑکے کا ئیں کا ئیں کر کے کھوپڑا چاٹ جاتے۔ کلاس بھنگڑ خانہ اور کبوتر خانہ بن جاتی۔ آپس میں آپا دھاپی ہوتی، بستے پھینکے جاتے۔ ایک کلاس سے اٹھ کر باہر جاتا اور ایک اندر آتا۔ ایک دوسرے کی پیٹھ پر چڑھتے اور اترتے۔

چھوٹی جماعتوں کے بچے جب سبق یاد کرتے تھے تو زور زور سے ہل ہل کر پڑھتے تھے۔

گنتی اور پہاڑے بھی اونچی آواز میں بول بول کر یاد کرتے تھے۔ تختی (پٹی) پر املا ہر روز ہی لکھوائی جاتی تھی اور خوش خطی پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ کالی سیاہی سکھانے کے لیے تختی پر ریت ڈالی جاتی تھی اور تختی کو پانی سے دھوکر اس پر پھر ملتانی مٹی پوت کر دھوپ میں سکھا لیتے تھے۔ ہجّے یاد کرنے پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ بچے امتحانوں کے دنوں میں خوب رٹّا لگاتے تھے۔ اردو اور فارسی پڑھنے کا بہت زور تھا۔ بچوں کو لمبی لمبی نظمیں خوب یاد ہو جاتی تھیں۔ بیت بازی کا بچوں کو بڑا شوق تھا اور گھنٹوں شعر و شاعری کرتے رہتے۔ اردو کا قاعدہ اور مولوی محمد اسماعیل کی اردو کی پہلی دوسری کتاب پڑھائی جاتی۔ چھٹی یا آٹھویں جماعت میں محمد حسین آزاد کی قصص ہند بھی پڑھائی جاتی۔ بچوں کو فارسی کی کتاب گلستاں بھی پڑھائی جاتی تھی اور خالق باری کا گھوٹا لگایا جاتا تھا۔

ذرا سوچیے کہ وہ دلی کیا ہوگی جس میں اتنے باکمال اور خدا رسیدہ بزرگ موجود تھے۔ اور وہ دور کیا ہوگا جس میں ہزارہا طلبا کو یہ باکمال ہستیاں دینی اور دنیاوی تعلیم دیتے ہونگے۔ دلی میں، اس وقت کی دلی میں جو اب تاریخ کا حصّہ بن گئی ہے، ایسے تعلیمی اداروں، مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں کی کمی نہیں تھی جہاں تعلیم کو عبادت سمجھا جاتا تھا۔ استاد کا جو مرتبہ اس زمانے میں تھا، وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ وقت بھی، جب بچے بری طرح پٹ کر بھی سکولوں سے کندن بن کر نکلتے تھے، شاید اسی دور کی خصوصیت تھی۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جدید تعلیم اور استاد اور شاگرد کا نیا رشتہ قابلِ اعتراض ہیں۔ شاید نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئے ڈھنگ زیادہ موزوں ہوں۔

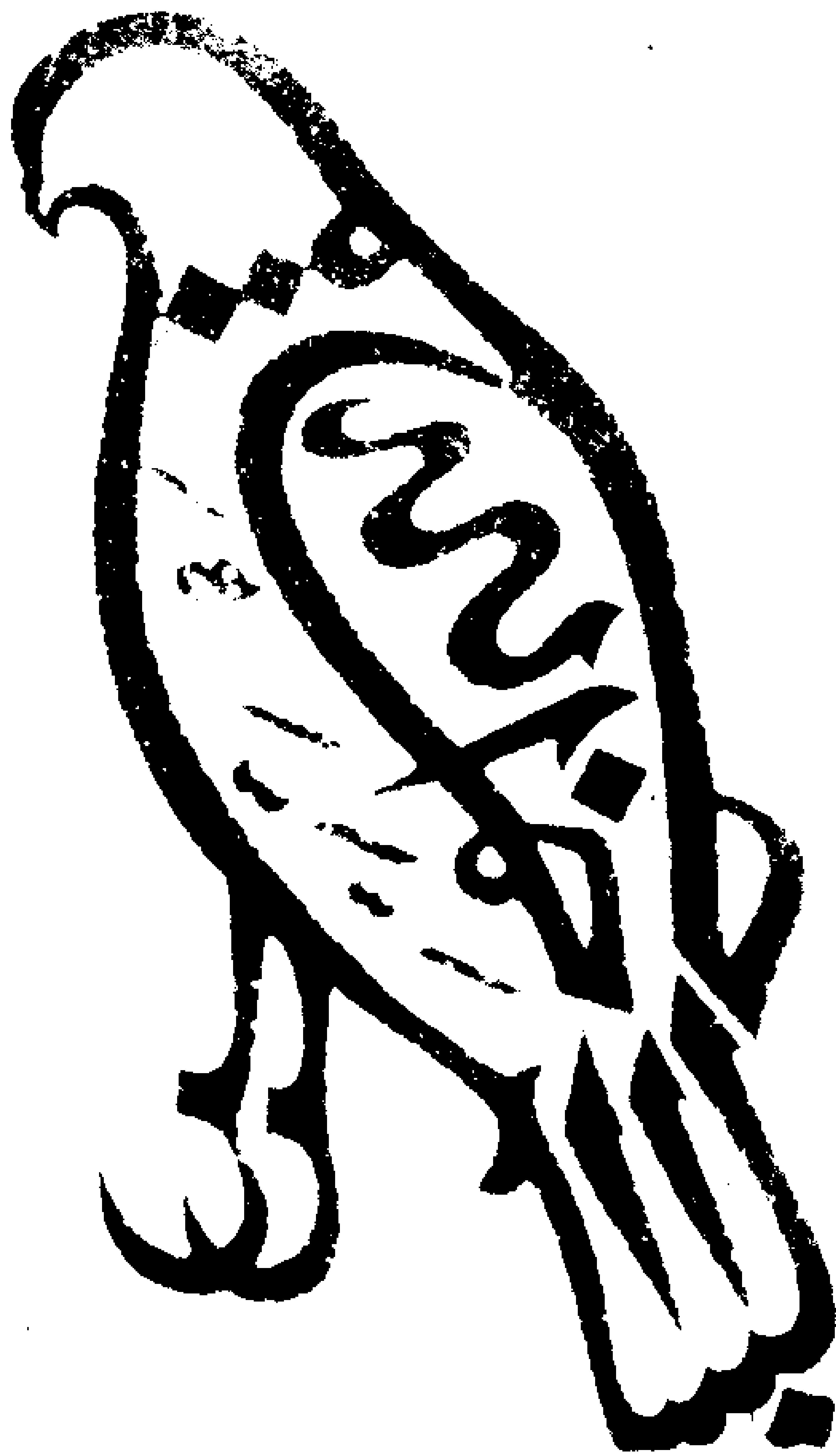
فنِ خطاطی

۱۸۳۲ء میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ اس سے اردو کا مرتبہ اونچا ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی یہ دن بدن سنورتی اور نکھرتی رہی اور نئے نئے الفاظ کا اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اردو کے حروفِ ابجد وہی ہیں جو عربی اور فارسی کے ہیں مگر ان میں کچھ تبدیلیاں اور اضافے صوتی اثرات کے لیے کر لیے گئے جو اردو کے لیے اس ملک کی مقبول زبان بننے کے لیے ضروری تھے۔ اہلِ علم اور عوام دونوں اسلامی ممالک میں رائج پرانے رسم الخط میں لکھتے رہے۔

صدیوں تک اسلامی تمدن ہمارے ملک میں انسانی سرگرمی کی ہر شاخ کو متاثر کرتا رہا ہے۔ مگر فنِ خطاطی اور خوش نویسی پر خصوصیت سے اس کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے اور اس ملک میں یہ فن انتہائے عروج پر پہنچ گیا۔ آج علمِ خطاطی اور خوش نویسی پر ہماری لائبریریوں میں بڑے نادر اور بیش بہا مسودات اور کتابیں ملتی ہیں جن میں نہ صرف اس پر مفصل تبصرے شامل ہیں بلکہ ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک کے ایسے نادر نمونے ملتے ہیں کہ آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں۔ ان مسودات پر شاہی لائبریریوں کی مہریں ثبت ہیں اور کئی پر حکمرانوں کے دستخط ملتے ہیں جن سے اس فن کے عروج اور اس کی قدر و قیمت کا پتہ لگتا ہے اور اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ بادشاہ اور اہلِ علم و دانش اس فن میں اور کتابوں کی طباعت میں کتنی گہری دل چسپی لیتے تھے۔ مشہور خطاطوں اور خوش نویسوں



لاڈو بیگم کی خطاطی کا نمونہ جہاں آرا بیگم کی مہر کے ساتھ



بسم اللہ طغرا میں عقاب کی شکل میں

کی تحریروں کے نادر نمونے، بادشاہوں، نوابوں اور عالموں کے ذاتی ذخیروں اور دنیا بھر کے عجائب گھروں اور لائبریریوں میں بھی ملتے ہیں۔

اتمان ترکوں نے خطاطی کا استعمال فنِ تعمیر، پتھروں پر کھدائی، اینٹوں اور ٹائلوں کی آرائش اور لکڑی اور دھات کے کاموں میں بھی بکثرت کیا ہے۔ ہندوستان میں بھی حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے اور خاص طور پر مغلوں نے اس کا تتبع کر کے اس فن کو ایسے ہی استعمال کیا۔ خطاطی کے چھ روایتی اسلوبوں میں سے "شش قلم" کا جو بڑا مزین اور عمدہ اسلوب ہے، دلّی کی قطب مینار کی دیواروں پر استعمال کیا گیا ہے۔ اسی خط کا استعمال دلی کی قلعہ کہنہ کی مسجد کی محرابوں میں بھی ملتا ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی خوش نویسوں نے اس میں اپنی کچھ خوشگوار تبدیلیاں کرلیں اور شیر شاہ سوری کے زمانے میں بہاری رسم الخط کی ترویج اور توسیع کی گئی۔

پندرھویں صدی میں ایران میں ایک اہم بات یہ ہوئی کہ "تعلیق" کی ایک اور خوشنما قسم دریافت کی گئی۔ خود تعلیق رقاع اور توقیع خطوں سے متاثر ہوا۔ اس نئے اسلوب یا خط کو "نستعلیق" کا نام دیا گیا اور میر علی تبریزی اس کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے پیشتر ایران میں ہی توقیع اور رقاع کی آمیزش سے ایک ساتواں اسلوب ایجاد کیا گیا تھا۔ تعلیق اسی ساتویں خط کا نام تھا۔ یہ ہفت قلم یا ہفت خط بھی کہلاتا ہے۔ اب سات خطوں کے نام یہ تھے۔ ثلث، ریحان، توقیع، محقق، نسخ، رقاع اور نستعلیق۔ اگر تعلیق کو ایک الگ خط کے طور پر مانا جائے تو آٹھ خطوط رائج سمجھے جائیں گے۔ خطِ معقلی اور خطِ کوفی تو بنیادی خطوط اور ان ساتوں خطوں کی جڑیں ہیں۔

خطاطی کی بہترین مثالوں میں جو آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں، مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

دیول رانی، امیر خسرو کا خضر خاں، بابر نامہ، تزکِ بابری کا فارسی ترجمہ، جہانگیر کی سوانح عمری تزکِ جہانگیری، اور تاریخ خاندانِ تیموریہ۔

نستعلیق کے علاوہ، ہندوستانی خوش نویسوں نے اپنے ایجاد کیے ہوئے نئے اسلوب

بھی اختیار کیے۔ ان خطوں یا قسموں کے نام یہ ہیں۔ غبار، طغرا، زلفِ عروس، شکستہ اور گلزار۔ کہتے ہیں کہ امیر خسرو نے قرآن شریف نقل کرنے کے لیے ایک ماہر فن خوش نویس کو لگایا۔ اسنے اسے غبار یعنی مٹی کے ذرّوں سے لکھا اور حروف اتنے چھوٹے بنائے کہ سارا قرآن شریف ایک مہر بند چھلّے میں آگیا۔ لیکن امیر خسرو نے اسے قبول نہیں کیا اور اس کا دل ٹوٹ گیا۔ طغرا کا استعمال اتمانوں نے بہت کیا۔ مغلوں نے بھی اس کا استعمال آرائشی تخلیقات اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے عقاب کی شکل بنانے میں کیا۔ ہندوستانی خوش نویسوں نے زلفِ عروس کے خط کو خوب نکھارا اور سنوارا اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں حروف موٹی لکیریں میں لکھے جاتے تھے اور آخر میں انہیں کسی دلہن کی زلفوں کے چھوٹے چھوٹے گھنگرووں کی طرح موڑ دیا جاتا تھا۔ ان میں سب سے اہم خط شکستہ تھا۔ اس کا اصل بانی ہرات کا ایک خوش نویس شفیع بتایا جاتا ہے مگر ہندوستان میں اس کو اتنا سنوارا اور نکھارا گیا کہ اسے ہندوستانی خوش نویسوں کی اختراع کہنا بھی بہت غلط نہ ہوگا۔ گلزار خط کی خصوصیت یہ تھی کہ حروف کو اوپر اور نیچے لمبی اور موٹی لکیریں ڈال کر بنایا جاتا تھا اور بیچ کی خالی جگہ میں نقش و نگار بنا دئے جاتے تھے جیسے پھول اور پتیاں، جیومٹری کی طرح کی شکلیں اور نمونے، شکار کے مناظر، تصویریں، اور دوسرے رسم الخط اور نقوش۔

مغل خوش نویسوں کی بڑی سرپرستی کرتے تھے اور ماہرینِ فن کو خطابات سے نوازتے تھے۔ بیشتر مغل بادشاہ خود بھی اعلیٰ پایے کے خوش نویس تھے۔ مغلوں کے دور کے چند خطابات یہ تھے۔ یاقوت رقم، شیریں قلم اور جواہر قلم یاقوت وغیرہ۔ دراصل جواہر قلم یاقوت خلیفہ عباسی کے دربار میں خطاط تھا اور اس نے ایک نیا خط جس کا نام یاقوتی تھا، ایجاد کیا۔ وہ اپنے قلم کے خط کو اس طرح تراشتا تھا کہ الفاظ ٹیڑھے لکھے جاتے تھے اور ان میں ایک نیا اور خوبصورت انداز پیدا ہوتا تھا۔ یاقوت رقم اعلیٰ ترین خطاب سمجھا جاتا تھا۔ اور سب سے پہلے یہ شاہجہاں کے دربار کے خوش نویس عبداللہ کو ملا تھا۔ اس کے بعد یہ خطاب بہادر شاہ کے دربار کے خطاط محمد عارف کو ملا تھا۔

مسلم مشہور خوش نویسوں کے علاوہ بہت سے ہندو خوش نویس بھی ہوئے ہیں۔ خاص طور پر دلی میں ان کی تعداد ہر دور میں کافی زیادہ رہی۔ ان میں زیادہ تر کشمیری پنڈت اور کائستھ ہوتے تھے۔ یہ دونوں اردو اور فارسی کے بڑے شوقین ہوتے تھے اور ان کا مسلمانوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی بہت تھا۔ لچھی رام، سکھ رام، محبوب راج اور اورنگ زیب کے دربار میں کسل سنگھ صرف چند ہندو ممتاز خوش نویسوں کے نام ہیں۔

فنِ خوش نویسی اور خطاطی بعد کے مغلیہ عہد میں بڑا پھلا پھولا۔ دراصل ہندوستان میں یہ فن مغلوں کے ساتھ ہی آیا۔ بیشتر مغل بادشاہ خود اعلیٰ پائے کے خطاط تھے۔ اکبر کے دور میں اس فن نے بڑی ترقی کی۔ اس کے زمانے کے مشہور خوش نویسوں میں ملاّ عبدالرحیم عنبریں رقم، خواجہ عبدالصمد شیریں رقم، محمد حسین کشمیری زریں رقم قابلِ ذکر ہیں۔ جہانگیر کے دور میں محمد شریف شیریں رقم، قاضی احمد غفاری اور احمد علی ارشد مشہور معروف خوش نویس تھے۔ شاہجہاں اس فن کا بڑا قدر دان تھا۔ وہ خود بھی خط نستعلیق کا ماہر تھا۔ اس کے عہد میں فنِ خطاطی نے غیر معمولی ترقی کی۔ اس کے وزیرِ اعظم سعد اللہ خاں نے خط شکستہ میں امتیاز حاصل کرلیا تھا۔ دلی کے لال قلعہ کے شاہ محل یا دیوان خاص میں سنگ مرمر کی تختیوں پر سعد اللہ خاں کا مشہور کتبہ نامور خوش نویس رشید کا لکھا ہوا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

حرم کی عورتوں میں بھی بڑی عمدہ خوش نویس ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک لاڈو بیگم تھی جس کی سرپرستی جہاں آرا بیگم کرتی تھیں۔ جہاں آرا خود لاڈو بیگم کی تحریروں پر دستخط کرکے انہیں شاہی لائبریریوں میں رکھوا دیتی تھیں۔ دراصل اب وہ دور آگیا تھا کہ کسی بھی صاحبِ ثروت کا خوش خط ہونا اس کی اعلیٰ تہذیب اور شائستگی کا نشان سمجھا جاتا تھا شاہجہاں کے اس وقت تک کے جانشین دارہ شکوہ کا خط بھی بہت خوشنما تھا اور اس کے ہاتھ کی تحریریں جو بڑی نادر ہیں لال قلعے کے عجائب گھر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سادگی پسند اور درویش طبیعت اورنگ زیب بھی خطِ نسخ کا ماہر تھا اور اس نے قرآن مجید کو اسی اسلوب

میں نقل کیا تھا۔ شاہجہانی عہد کے خوش نویسوں میں عبدالباقی یاقوت رقم، میر مراد کشمیری محمد مومن اور چندر بھان برہمن شامل تھے۔ اورنگ زیب نے اپنی نقل کردہ قرآن شریف کی جلدیں مسجد نبوی میں بطور نذر رکھوادی تھیں۔ اس کے زمانے کے خوش نویسوں میں حاجی محمد اسماعیل روشن قلم اور مرزا محمد قابل ذکر ہیں۔

بعد کے مغل بادشاہ، فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلا، عالمگیر ثانی، شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی بھی فنِ خطاطی کے سرپرست رہے ہیں۔ ان کے عہد کے خوش نویسوں نے ہر اسلوب میں لکھا۔ شکستہ میں اور نسخ، تعلیق، نستعلیق، ثلث، شفیعہ اور ریحان میں۔ ان کی تحریروں کے نمونے ہمارے عجائب گھروں اور کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ثانی ایک بلند پایہ عالم اور خطاط تھا۔ اس نے خط گلزار میں کمال حاصل کیا۔ اس کے معکوس اسلوب میں خطاطی کے نمونے، جنھیں آئینے کی مدد سے پڑھا جاتا ہے، آنکھوں کو نور عطا کرتے ہیں۔ یہ عمدہ خط محمد امیر رضوی نے جو کئی فنوں کا ماہر تھا اور میر پنجہ کش کے نام سے زیادہ مشہور ہے، ایجاد کیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر بھی بلند پایہ خوش نویس تھا اور خطِ نسخ کا ماہر تھا۔ اس وقت کے دلی کے بیشتر خوش نویسوں نے اس سے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا اور اس کے اپنے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔

مغلیہ عہد کے چند ممتاز خوش نویسوں کا، جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر بھی آیا ہے۔ مختصر خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

میر محمد صالح کشفی

دلی کا باشندہ تھا۔ اکبر اور جہاں گیر کے دربار سے وابستہ تھا۔ سب لوگ اس کی خوش نویسی کے معترف تھے۔ خط سواد میں خاص طور پر مہارت تھی۔ شاہجہاں نے اس کی سرپرستی کی تھی اور اس کی عسلت کے ایام میں مالی مدد دی تھی۔ اپنے عہد کے ممتاز ترین خوش نویسوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

چندر بھان برہمن

شاہجہاں کے دفتر میں میر منشی کے عہدے پر فائز تھا۔ فارسی کا ممتاز شاعر تھا اور اس زبان میں شعر کہتا تھا۔ نستعلیق اور شکستہ خطوں میں مہارت حاصل تھی۔ شاہجہاں کا وزیر اعظم سعد اللہ خاں بھی اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ دارہ شکوہ اس کا بڑا پرستار تھا۔ دارہ شکوہ کی موت کے بعد بنارس چلا گیا اور وہیں ملک عدم کو سدھارا۔

ہدایت اللہ خاں دہلوی

فنِ خطاطی میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی غیر معمولی دسترس سے متاثر ہو کر اسے شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ نسخ اور نستعلیق خطوں میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ "زریں رقم" کا خطاب پایا۔ اس نے اورنگ زیب کے لیے دیوانِ حافظ کے نسخے بھی لکھے۔

مرزا محمد باقر دہلوی

اورنگ زیب کا درباری خوش نویس تھا۔ اورنگ زیب اس کا بڑا مداح تھا۔ کئی شہزادوں کا اتالیق بھی تھا۔ نسخ اور نستعلیق میں بڑی مہارت پائی۔

شیخ بقا اللہ بقا

بہت عمدہ خوش نویس اور اردو اور فارسی کا اعلیٰ درجے کا شاعر تھا۔ نستعلیق خط میں بڑی مہارت تھی اور اس میں ایک عجیب ندرت پیدا کر دیتا تھا۔

حافظ محمد علی

شاہی خطاط تھا اور نسخ اور نستعلیق میں ماہر تھا۔ شاہ عالم کے لڑکے مرزا جواں بخت بہادر کا استاد تھا۔

محمد حفیظ خاں

محمد شاہ کے عہد کا بڑا مشہور خوش نویس ہو گزرا ہے۔ متعدد خطوں میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ قرآن مجید کے کئی نسخے لکھ کر بادشاہ کو پیش کیے۔ اس کے بے شمار شاگرد تھے جن میں محمد تقی، منشی لچھمن سنگھ، منشی محبوب رائے، منشی کسل سنگھ، لچھمی نرائن پنڈت اور مولوی غلام محمد دہلوی جیسے مشہور خوش نویس بھی شامل تھے۔

رائے پریم ناتھ

دلی کا پرانا کھتری رئیس تھا۔ نواب مرید خاں کی شاگردی قبول کی۔ خطِ شکستہ میں مہارت حاصل تھی۔ فارسی اور اردو کا شاعر بھی تھا اور آرام تخلص کرتا تھا۔

قاضی عصمت اللہ خاں

شاہ عالم ثانی کے عہد کا خطاط تھا۔ خط نسخ میں جو مہارت اسے حاصل شاید ہی کسی کو ملی ہو۔ اس خط میں کئی دل پذیر ایجادیں کیں۔ اس کے خاندان کے دوسرے افراد بھی مشہور خوش نویس تھے۔

شاہ وارث الدین وارث

بڑا درویش صفت انسان تھا اور سلسلۂ نسب شیخ فریدالدین گنج شکر سے ملتا تھا۔ کھاری باؤلی میں مکان تھا۔ عالمگیر ثانی اس کا شاگرد تھا۔ زمرد قلم کا خطاب پایا تھا۔ کوئی خط ایسا نہیں تھا جس میں مہارت حاصل نہ ہو۔

مولوی غلام محمد راقم دہلوی

عربی اور فارسی کا عالم تھا اور اردو فارسی کا اچھا شاعر تھا۔ فنِ خطاطی میں غیر معمولی

مہارت رکھتا تھا۔ ساتوں ہی خطوں میں کمال حاصل تھا اور ہفت قلم کا خطاب پایا تھا۔
اس نے خوش نویسوں کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔

منشی لچھمن سنگھ غیور

ذات کا اگروال تھا مگر فارسی اور عربی میں ملاّؤں کے بھی کان کاٹتا تھا۔ فارسی کا اعلیٰ پایے کا انشا پرداز تھا خوش نویسی کی طرف طبعی رجحان تھا اور اس میں کمال حاصل کیا تھا۔ نسخ، نستعلیق اور شکستہ پر بڑا عبور حاصل تھا۔ مسلمانوں سے شیر و شکر ہو کر ملتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ کتابیں بیچنے کے لیے لکھنؤ گیا تو کسی کی سفارش سے انگریزوں نے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ دینا منظور کر لیا مگر یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے ہمیشہ مسلمانوں کا نمک کھایا ہے' انگریزوں سے مدد لینا حرام سمجھتا ہوں۔

مرزا سہراب بیگ

دلی کا پرانا باشندہ تھا اور ایک مغل تھا۔ خطِ نسخ کا بڑا ماہر تھا۔ گوہر رقم خطاب پایا تھا۔ دلی میں بہت لوگ اس کے شاگرد تھے۔

منشی دیپ چند

ذات کا کھتری تھا اور دلی میں مدت سے رہتا تھا۔ فارسی کا عالم تھا۔ نستعلیق اور شکستہ خطوں میں بڑی مہارت تھی۔

میر سید محمد غافل

خط نستعلیق کا ماہر تھا۔ دلی کالج میں طلبا کو خط نستعلیق سکھانے پر ملازم تھا۔ شاعر اور تاریخ دان بھی تھا۔

میر جمیل الدین ہجر

نستعلیق نویسی میں بڑی مہارت تھی۔ شاعری کا شوق بھی تھا اور ذوق کی شاگردی کی تھی۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں دلی کے جریدے "صادق الاخبار" کا مدیر تھا۔ اور انگریزوں نے اس پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا اور اسے تین سال کی قید بامشقت کی سزا ملی۔

سید محمد امیر رضوی پنجہ کش

یہ کئی فنون کا ماہر تھا مگر پنجہ کش کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ ایک بلند پایہ خطاط تھا۔ اس کا مسودہ گلستانِ سعدی جو مہاراجہ الور نے لکھوایا تھا بڑا نظر افروز ہے۔ بہت شاگرد تھے جن میں مولوی حیات علی اور پنڈت شنکر ناتھ نے خوش نویسی میں خاصی شہرت حاصل کی۔ فنِ خطاطی لوگوں میں اتنا مقبول ہوگیا تھا کہ لوگ اپنے گھروں کی دیواروں کو عمدہ تحریروں کی وصلیوں سے سجاتے تھے۔ ان وصلیوں میں اشعار، قطعات، رباعیات اور مذہبی اقوال بہت ہی عمدہ خط میں لکھے ہوتے تھے۔ سید محمد امیر رضوی پنجہ کش کے مکان پر خوشنما "عاقبت بخیر" لکھا رہتا تھا۔ اپنے مکان کی کڑیوں پر بھی اسنے "یا فتاح" اور "بسم اللہ" لکھ رکھا تھا۔ خط ثلث میں جرمنی میں سب سے پہلے اس کی حمائل چھپی۔ دل کا غنی تھا اور کوئی بھی ضرورت مند آتا تو اسے کچھ لکھ کر دیدیتا جو بازار میں فوراً بک جاتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اسے خوش نویسی کا آخری تاجدار مانا جاتا ہے۔ ایران کے کتب خانے میں اس کی بہت سی تحریریں محفوظ ہیں جن کی قیمت کروڑہا روپے کی ہوگی۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں ۹۴ سال کی عمر میں فرنگیوں کی گولی کا نشانہ بنا۔

بدر الدین مہر کن

ہر قسم کا خط بڑی عمدگی سے لکھتا تھا اور مرصع رقم کا خطاب پایا۔ مہر کنی میں اس کا کوئی

مقابلہ نہیں تھا۔ بہادر شاہ ظفر اور انگریز حکام دونوں اس کے مداح تھے۔ گورنر نے خوش ہوکر ایک خلعت بھی عطا کی تھی۔ خطِ نستعلیق لکھنے میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔

محمد جان

خوش خطی میں بے جوڑ تھا۔ خط نستعلیق اور شکستہ کا ماہر تھا۔ اپنے وقت کے مشہور ترین خوش نویسوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

مولوی حیات علی

ایک صاحبِ طرز خوش نویس تھا۔ شکستہ اور نستعلیق میں بڑی مہارت حاصل تھی بلکہ ان میں نئی طرزیں ایجاد کیں۔

پنڈت شنکر ناتھ مودب

اپنے وقت کا بڑا امتیاز خوش نویس تھا۔ اردو شاعری کا شوق تھا اور مودب تخلص کرتا تھا۔ خط شکستہ اور نستعلیق دونوں کا صاحبِ طرز خطاط تھا۔

اب یہ فن اپنی اس شکل میں معدوم ہی سمجھا جائے گا۔ اب صرف کاتبوں کی صورت میں دلی میں خوش نویس ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بھی گھٹتی جارہی ہے۔ پھر وہ پہلے سا معیار، نظرا فروز تحریریں، وہ گولائی اور خوشنمائی اب کہاں دیکھنے میں ملتی ہے۔ کاتبوں کے لیے یہ دھندے روزی کا ذریعہ ہے مگر گزر بسر اس میں آرام سے کہاں ہوتی ہے۔ چنانچہ فنِ خطاطی، جو گزشتہ دور کا ایک تہذیبی نشان تھا اس دَور کے ساتھ ہی چلا گیا۔ خدا نہ کرے کہ وقت کی سرد مہری اور اس کے دو چار تھپیڑے کاتبوں کی صورت میں رہے گئے چنے خوش نویسوں کو بھی اس فن کو جسے اب ہنر کہنا زیادہ موزوں ہوگا ترک کرنے پر مجبور کردیں۔

سادہ کار، مرصّع کار

دلی شروع سے ہی ہنر اور دستکاری کا مرکز رہی ہے۔ راجدھانی ہونے کی وجہ سے اس نے ہمیشہ باہر کے ہنرمندوں اور دستکاروں کو بھی کھینچا جن کے خاندان کے خاندان دوسرے علاقوں سے آکر یہیں بس گئے اور پھر دلی سے باہر نہیں گئے۔ ایسے دستکاروں کو سادہ کار اور مرصّع کار بھی کہتے تھے۔ پھر دلی میں ان لوگوں کے لیے روزی کمانے کے جو مواقع میسر تھے وہ دوسری جگہوں پر نہیں تھے۔ مگر دلی سیاسی طور پر اتھل پتھل ہوتی رہتی تھی۔ کبھی امن کا دور ہے تو کبھی جنگ و جدل اور تباہی کا۔ حکومت اگر کمزور ہوتی تو اقتصادی حالت بھی بگڑ جاتی۔ جہاں خوشحالی کے دور میں دستکاروں کا کام چلتا رہتا اور وہ اپنی روزی کما سکتے وہاں بدامنی اور افراتفری کے دور میں پیٹ بھرنے کے بھی لالے پڑ جاتے۔ مگر حالات کیسے بھی ہوتے دلی کے سادہ کار دلی نہ چھوڑتے اور تنگی ترشی میں گزر کر لیتے۔ اس کے علاوہ جب تک کہ ان کو براہِ راست کام نہ مل جاتا، یہ لوگ دکانداروں کا کام اجرت پر کرتے تھے۔ اجرت ہمیشہ کم ہوتی اور دکاندار کا منافع بہت زیادہ۔

عہدِ سلاطین میں ہمیشہ کارخانوں کا ایک سلسلہ قائم رہا ہے جن میں طرح طرح کی اشیا تیار ہوتی تھیں۔ جو بڑے کاریگران کارخانوں کی نگرانی کرتے تھے انہیں داروغہ کہا جاتا تھا۔ ان کارخانوں کی دو قسمیں ہوتی تھیں، ایک جنھیں سرکاری سرپرستی



ایک مخصوص کاریگر

حاصل تھی اور دوسرے وہ جو نجی انتظام اور سرپرستی میں تھے۔ ان کارخانوں میں روزمرہ میں کام آنے والی اشیا بھی تیار ہوتی تھیں اور آرائشی سامان اور فن پارے بھی، جیسے کہ ریشم کی مختلف قسمیں، زردوزی کا سامان اور لباسوں کے لیے چھپے ہوئے اور سادہ کپڑے۔ کچھ کارخانے سونے چاندی کا آرائشی سامان اور ظروف وغیرہ بھی تیار کرتے تھے۔ فنِ خطاطی میں استعمال کیے جانے والے مخصوص اور عمدہ کاغذ بھی کئی کارخانے تیار کرتے تھے۔ کچھ کارخانوں میں غالیچے اور شالیں تیار ہوتی تھیں اور خیموں اور گھوڑوں کی کاٹھیوں کے لیے خاص کپڑے بنتے تھے۔ کئی کارخانے چینی کے عمدہ ظروف بناتے تھے۔ کئی سرکاری کارخانے ہتھیار بنانے کے بھی تھے۔ اس عہد کے خنجروں کے دستے اور ہتھیار بڑے مشہور تھے۔ سلطانوں کے عہد کی وہ سب اشیا آج بڑی نایاب ہیں اور صرف بڑے بڑے عجائب گھروں میں ایک دو اشیا مل جاتی ہیں۔ علاؤالدین خلجی کے عہد کا "کھانڈا" بڑا مشہور تھا۔ سلطانوں کے بعد مغلوں نے بھی کارخانوں کا نظام قائم رکھا اور وہی نظام بہت حد تک آج بھی قائم ہے۔ مغلوں کے عہد میں تیار کردہ اشیا بھی بڑی نادر تھیں اور مختلف عجائب گھروں میں ان کے نمونے محفوظ ہیں۔

سادہ کاری کا کام حسن، تزئین اور تکمیل پر مشتمل ہوتا ہے۔ پھول پتیوں کی بناوٹ، مصوری اور خطاطی بھی اس کے پہلو ہیں۔ ایک عمدہ سادہ کار وہی ہے جو اپنے فن کے تمام پہلوؤں پر دسترس رکھتا ہو اور ابتدا سے آخر تک اپنا کام خود پورا کرے۔ مرصع کاری، نگینہ گری، بندھائی، جڑائی یہاں تک کہ لوہارا اور نجاری کے بعض کام بھی سادہ کاری کے فن میں شامل ہیں۔ دلی کے بہت سے سادہ کار لاہوریوں کے نام سے مشہور تھے مگر یہ لوگ لاہور کے پنجابی نہیں تھے۔ دراصل سادہ کاروں کا یہ خاندان کوٹلی لوہاراں کا رہنے والا تھا اور وہاں سے دلی آکر بس گیا تھا۔ کوٹلی لوہاراں ظروف سازی کی صنعت کے لیے مشہور تھا اور یہ لوگ بھی دلی میں تانبے کے برتنوں پر بڑی عمدہ کھدائی اور مرصع کاری کرتے تھے۔ بعد میں اس خاندان کے افراد نے اور دستکاریوں میں

بھی دسترس حاصل کرلی۔

سادہ کار دلی میں زیادہ تر مغلوں کے عہد میں آباد ہوئے تھے۔ دلی میں آزادی سے قبل ایک اندازے کے مطابق ان کی آبادی تقریباً ساڑھے تین ہزار تھی۔ کوئی ڈیڑھ ہزار سادہ کار پاکستان کے قیام کے بعد وہاں چلے گئے۔ دلی میں یہ لوگ زیادہ تر چاہ رہٹ، کوچہ رائے مان، پہاڑ گنج، کوچہ استاد حامد اور کوچہ نٹواں میں رہتے تھے۔ آج بھی اِن کی زیادہ آبادی ان ہی علاقوں میں ہے۔ ان لوگوں کو خود بھی اپنے خاندان اور اپنے پیشے کی تاریخ کا علم نہیں ہے۔ کم از کم وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ سوچ سوچ کر غیر یقینی طور پر کہتے ہیں کہ وہ مشہور استاد حامد اور استاد حامد جامع مسجد اور لال قلعے کی اولاد ہیں اور شاہجہاں کے عہد میں دلی آکر آباد ہوئے تھے۔ شاہجہانی تواریخ "عمل صالح" اور "بادشاہ نامہ" محمد وارث میں احمد اور حامد دو معماروں کا ذکر ملتا ہے جن کی نگرانی میں دلی کی تاریخی عمارات تعمیر ہوئی تھیں۔ مولانا سلیمان ندوی مرحوم کے کئی مقالوں میں بھی ان دونوں معماروں اور احمد کے لڑکے عطاءاللہ رشیدی کا ذکر ملتا ہے۔ احمد اور حامد دونوں بھائی تھے اور لاہور کے رہنے والے تھے۔ اگر دلی کے کچھ سادہ کاروں کے اس دعوے کو تسلیم کرلیا جائے کہ وہ احمد اور حامد کے جانشین یا وارث ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ واقعی لاہور کے باشندے تھے۔ لیکن مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی مولف فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وراں کی تحقیق کے مطابق یہ سادہ کار کوٹلی لوہاراں کے باشندے تھے اور یہ بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

یہ سب کے سب سادہ کار اپنے ہنر اور فن میں اتنے طاق تھے کہ عوام اور خواص تو ایک طرف رہے، بادشاہ تک ان کی قدر دانی کرنے لگے۔ شاہی سرپرستی اور قدر دانی کی وجہ سے انہیں بڑی شہرت نصیب ہوئی اور یہ شہرت دلی تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ اس وقت کے چند مشہور سادہ کاروں کے نام جو کوچہ استاد حامد میں رہتے تھے یہ تھے۔ عبدالستار، چودھری نیاز الدین،

یوسف عبداللہ، دلاور خاں اور فیض محمد ولد الٰہی بخش۔ مرزا بختاور شاہ ابن مرزا خدا بخش گورکانی سادہ کاری، کارچوبی، سوزنی کا کام اپنے ہاتھ سے خوب بناتے تھے. چھالیہ کی انگوٹھی، چھلّے ڈبیاں وغیرہ بھی بڑی محنت سے بنا کر تیار کرتے تھے۔

دلی سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے زیورات کا ہمیشہ ایک بڑا مرکز رہی ہے۔ دلی کے لوگوں کے علاوہ دور دور سے دلی میں لوگ آکر زیورات بنواتے اور خریدتے تھے۔ یہاں کے سادہ کار اور مرصع کار نگینہ سازی، قیمتی پتھروں کے جڑنے اور ان کے تراشنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے فن اور ہنر سے زیورات میں وہ دلکشی پیدا کر دیتے تھے کہ گاہک عش عش کر اٹھتا تھا۔ مشہور ترین کاری گر بلاشبہ سب کے سب مسلمان تھے۔ نگینہ سازی میں وہ روایتوں کو تو ملحوظ رکھتے ہی تھے مگر اپنے ذہن اور دماغ سے وہ ندرت بھی پیدا کرتے تھے اور ایسے نئے نئے ڈیزائن پیدا کرتے تھے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ اسی وجہ سے دلی میں زیورات خریدنے کے لیے لوگ باہر کے ملکوں سے بھی آتے تھے۔ دلی کا چاندنی چوک اور دریبہ کلاں جوہریوں کے مشہور بازار تھے۔ آج چاندنی چوک میں جوہریوں کی دکانیں بہت کم ہیں مگر مغلوں کے عہد میں ان کی تعداد بہت تھی۔ سالار جنگ اول نے جو دلی میں تقریباً سوا دو سو سال پہلے آیا تھا، اپنی مشہور کتاب "مرقعِ دلی" میں (اصل متن فارسی) چاندنی چوک اور اس کے جوہریوں کا بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"چاندنی چوک سے زیادہ بڑا اور خوبصورت بازار مجھے اور کہیں نظر نہیں آیا۔ جوہریوں کی دکانیں آنکھوں کو چکا چوند کیے دیتی ہیں۔ دکانیں بہت ہی بڑی ہیں جنھیں بڑے عمدہ ذوق سے سجایا گیا ہے۔ جواہرات کے وہ وہ نادر نمونے اور سونے اور قیمتی پتھروں سے جڑے ہوئے ایسے خوبصورت زیورات ان دکانوں میں ملتے ہیں کہ آنکھیں دنگ رہ جاتی ہیں. ہر نمونہ کاریگری کا عجیب و غریب شاہکار ہے۔ زیورات کے علاوہ ان دکانوں میں نادر اشیا بھی موجود ہیں، مثلاً جواہرات جڑا ہوا زرہ بکتر آرائشی

حقے، سونے چاندی کی کشتیاں اور ظروف، شراب کے جام و مینا اور دوسری بلند پایہ فنی تخلیقات جن کا جواب اس روئے زمین پر ملنا مشکل ہے۔"

دلی کے جوہری جن قیمتی پتھروں کا استعمال کرتے تھے ان میں کشمیر کا نیلم اور پنّا اور گولکنڈا کے ہیرے شامل تھے۔ ان جوہریوں کو قیمتی پتھروں اور ہیروں کی چوراسی اقسام کے بارے میں مکمل واقفیت تھی اور وہ محض چھوکر اور دیکھ کر انہیں پرکھ لیتے تھے۔ ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے قیمتی پتھروں کا انتخاب اور استعمال علم نجوم کے اصولوں کے مطابق اور راشی کو دیکھتے ہوئے کیا جاتا تھا۔ یہ عقیدہ عام تھا کہ سیّاروں کا انسانوں کی زندگی پر اثر پڑتا ہے اور اچھے اثر کو جلد لانے اور برے اثرات سے بچنے کے لیے نجومیوں اور پنڈتوں کی رہنمائی میں قیمتی پتھروں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ آزمائش کے طور پر، ایک دو دن منتخب پتھر کو، خاص طور پر نیلم اور سبزے کو، پہن کر دیکھ لیتے تھے اور اگر ان کے پہننے سے کوئی نقصان یا بری بات ہوتی تھی تو اُسے اتار دیا جاتا تھا۔

اگرچہ ہر جوہری جوہر شناسی ہوتا تھا مگر وہ احتیاط کے طور پر کوئی بھی کچا پتھر (ناتراشیدہ) خریدنے سے پہلے اپنے "نگینہ ساز" سے ضرور صلاح لیتا تھا۔ نگینہ ساز کیوں کہ پتھروں کو انگوٹھیوں اور زیورات میں بٹھاتا تھا اس لیے وہ یہ رائے دے سکتا تھا کہ تراشنے کے بعد پتھر کتنا آبدار بنے گا اور اس کی کیا قیمت ہوگی۔ نگینہ ساز پتھر کو تراش کر اسے شکل و صورت اور جلا دیتا تھا مگر اس کے فن کا کمال اسی میں ہوتا تھا کہ خام پتھر کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں کاٹنے میں نقصان کم سے کم ہو۔ سب سے پہلے سادہ کار کاغذ پر ایک واضح نمونہ یعنی ڈیزائن بناتا تھا۔ پھر تانبے کے سانچے تیار کرتا تھا اور ان میں باریک تفصیلات مٹی یا ڈھلے ہوئے لوہے کے چھوٹے چھوٹے فریموں کی صورت میں مہیا کر دی جاتی تھیں۔ دلی کے سادہ کار کام کرنے کے لیے ایک لکڑی کا سٹینڈ استعمال کرتے تھے۔ یہ سٹینڈ ایک خاص پتھر کے

بنے ہوئے بڑے برتن میں لگا ہوتا تھا، جس میں ایک پیتل کا چھلّا لگا ہوتا تھا تاکہ پگھلا ہوا سونا یا بھرنے والی کوئی اور شے برتن سے باہر نہ گرے۔ سادہ کار چھوٹے چھوٹے ریزوں کو بھی اتنی احتیاط سے اٹھاتا اور رکھتا تھا کہ ایک ریزہ بھی گم نہیں ہوتا تھا۔ سادہ کار بہت ایماندار ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک لالہ نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر ایک "پرزہ" یعنی ایک زیور تیار کرنے کی ذمے داری ایک مشہور سادہ کار کو سونپی۔ جب لالہ اور وہ سادہکار ڈیزائن کی تفصیلات پر بات چیت کر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک بڑا قیمتی پتھر جسے زیور میں جڑا جاتا تھا غائب تھا۔ لالہ کو سادہ کار پر اور سادہ کار کو لالہ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دوسرے پر شک کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ دونوں بڑے شش و پنج میں پڑ گئے اور تین دن تک زیور پر کام شروع نہ ہو سکا۔ چوتھے دن جب لالہ کے منیم نے گھر میں رکھے ہوئے پیتل کے قلمدان کو دوات صاف کرنے کے لیے اٹھایا تو دوات میں سے سیاہی میں لتھڑا ہوا ایک پتھر کا ٹکڑا نکلا۔ جب اسے دھویا گیا تو وہ ہی گم شدہ قیمتی پتھر نکلا۔ لالہ کو یاد آیا کہ وہ جب ہیرے جواہرات کا پیکٹ سامنے رکھ کر سادہ کار سے ڈیزائن کی بات کر رہے تھے تو ان کا پوتا وہیں کھیل رہا تھا اور اس نے وہ قیمتی پتھر اٹھا کر دوات میں ڈال دیا ہوگا۔ جہاں اس زمانے میں سادہ کار کی دیانتداری مسلمہ تھی وہاں آج کے سنار بلکہ جوہری کو بھی ایمانداری سے کوسوں دور سمجھا جاتا ہے۔

زیور کا ایک بھاری اور عمدہ ٹکڑا کئی ہاتھوں کی کاریگری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کوئی تراشتا ہے، کوئی ٹانکا لگاتا ہے، کوئی صاف کرتا ہے۔ کم از کم ایسا اس زمانے میں تھا کیونکہ ہر ایک کام کا الگ الگ ماہر ہوتا تھا۔ مغلوں کے محلوں میں زیورات کی تعمیر کے لیے ایک مکمل محکمہ یا عملہ ہوتا تھا۔ زیورات کے تیار کرنے کی تمام منزلیں یہاں پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھیں۔ جو ریزے اور ذرّات بچتے تھے، انہیں جھاڑو سے باہر پھینکا نہیں جاتا تھا بلکہ ایک کونے میں احتیاط سے اکٹھے کر لیے جاتے تھے اور کاریگروں میں بانٹ دئے جاتے تھے۔

اس تعلق میں بہادر شاہ ظفر کے ایک بھنگی کی کہانی بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ یہ سن کر کہ اس بھنگی نے شہر میں تین مکان بنوا لیے تھے اور ایسا صرف بے ایمانی کی کمائی سے ہی ہو سکتا ہے بادشاہ سلامت نے اس سے پوچھا "تم نے دو روپے ماہوار کی تنخواہ پر یہ سب کچھ کیسے کر لیا؟" مہتر نے دست بستہ جواب دیا۔ "میں جو عالم پناہ کا فضلہ اکٹھا کرتا رہا ہوں اسے میں سکھا کر نیاریوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ اس میں سے سونا نکلتا تھا کیونکہ آپ سونے کا کشتہ کھاتے ہیں۔ میں نے مکان اسی آمدنی سے بنائے ہیں اور یہ ہر لحاظ سے میری جائز آمدنی ہے۔

مغلوں کے عہد میں سونے، ہیرے، جواہرات، موتی اور پنّے کے عورتوں کے لاکٹ اور سر میں لگانے کے بروچ وغیرہ بنانے کا بڑا رواج تھا۔ اس کے علاوہ خنجروں کے دستے، چھڑیوں کے دستے اور حقوں میں نَے کے اوپر کش لگانے والا دھات کا ٹکڑا، یہ بھی سونے اور ہیروں جواہرات اور قیمتی پتھروں کے جڑے ہوئے بنائے جاتے تھے۔ محلوں اور امرا کے گھروں میں یہ اشیا عام دیکھنے میں آتی تھیں اور ان میں کاری گری کا کمال دیکھتے ہی بنتا تھا۔

فنِ سادہ کاری سے جڑی ہوئی بلکہ اس کا ہی حصہ، مندرجہ ذیل صنعت کاریاں ہیں۔

پیشہ نیاری

نیارئے کا کام کیمیاوی طریقے سے دھاتوں کو میل اور کھوٹ وغیرہ سے صاف کرنا اور انہیں اس قابل بنانا ہے کہ زیور سازی میں کام آسکیں۔

پیشہ سناری

زیورات کو مسالوں سے دھونا، صاف کرنا اور چمکانا یا اُن پر ملمع کرنا سنار کا کام تھا۔ جڑاؤ زیورات کو صاف کرنے میں سنار کو بڑی ہوشیاری سے کام لینا پڑتا تھا۔

چیتی کاری

یہ ایک قسم کی نقاشی ہوتی تھی۔ برتنوں اور زیورات کی سطح پر دھات کے قلم کی نوک سے خوبصورت خطوط اور پھول پتے کندہ کیے جاتے تھے۔

مرصّع کاری

اس پیشے کو نگینہ گری بھی کہتے تھے۔ جواہرات کو سان پر گھس کر پہلے ان کے ڈول ڈالے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کے پہل اور گھاٹ تراشنے کے بعد ان پر جلا اور چمک پیدا کی جاتی تھی۔ جواہرات کے سان کا چکلہ یا چاک لاکھ اور چینی مٹی کے مرکب سے بنایا جاتا تھا۔

میناکاری

ایک قسم کی پچی کاری کا کام تھا جو سونے چاندی کے برتنوں اور زیورات پر کیا جاتا تھا۔ زیور یا برتنوں کی سطح پر پھول پتیاں اور نقوش کندہ کیے جاتے تھے۔ اور پھر ان میں کچ لون یعنی کانچ کے بنے ہوئے رنگین مسالے یا ایک مرکب سیاہ دھات بھرتے تھے۔ اس عمل سے گل بوٹے طرح طرح کے رنگ کے نظر آتے تھے۔

بندھائی

اس پیشے میں موتیوں اور دیگر جواہرات میں نہایت مہین سوراخ کرتے ہیں۔ اس کے کاریگر بندھیرے کہلاتے تھے۔ بندھائی کا کام کافی مشکل ہوتا تھا۔ موتی بیندھنے میں چٹخ کر ٹوٹ جاتے تھے تو بے کار ہو جاتے تھے۔ اس لیے کاریگر کا یہ کمال ہوتا تھا کہ موتی ٹوٹیں نہیں۔ اسی پیشے سے یہ مثل مشہور ہوئی۔ "بندھ گیا تو موتی نہیں تو کنکر"

جڑائی

اس پیشے کے کاریگروں کو جڑیا بھی کہتے تھے اور سادہ کار بھی۔ سدھائی بھی اسی عمل کا نام تھا۔ زیورات میں جواہرات جڑنے کا کام اس پیشے کے کاریگر کرتے تھے۔

پیشہ لوہار

اس پیشے کے کاریگر نہائی، ہتھوڑے اور ہتھوڑیاں، سون، ٹھپے، پانسہ گھوڑی، بنک نال اور دیگر اوزار جو زیور سازی میں کام آتے تھے لوہے اور پیتل کے بناتے تھے۔

نجاری

اس پیشے کے کاریگر اوزاروں کے دستے، کمانیاں، سونے چاندی کے تار کھینچنے کی گھوڑیاں، لکڑی یا گتے کے مخملی بکس جن میں تیار زیورات کو سجا کر رکھا جاتا ہے، بناتے تھے۔

مندرجہ بالا کاموں کے علاوہ سادہ کار کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا تھا کہ وہ نقاش، خطاط اور مصور بھی ہوتا کہ زیورات کے خوش نما نمونے پیش کر سکے، اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ سونے اور چاندی کی مختلف اقسام سے واقف ہو۔ اس زمانے میں سونے کی پانچ قسمیں مروج تھیں۔ بارہ پانی سونا جو سب سے اعلیٰ اور عمدہ قسم کا ہوتا تھا جس میں کسی قسم کی کوئی کھوٹ اور ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی میں اسے ۲۴ کیرٹ گولڈ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد پاسے کا سونا ہوتا تھا۔ یہ کان سے تازہ نکلا ہوا اصلی سونا ہوتا تھا جو جوہریوں کو بیس تولے کی مستطیل ٹکڑیوں کی صورت میں ملتا تھا۔ پھر روے یا پاٹلے کا سونا تھا جو پرانے سونے کے زیورات کو گلا کر اور صاف کر کے

ڈلی کی صورت میں بنایا جاتا تھا۔ نقلی سونے میں جرمنی کا سونا مشہور تھا۔ اس میں سونے کی مقدار بالکل نہیں ہوتی تھی، صرف پانچ حصّے تانبہ اور ایک حصہ جست ہوتا ہے۔ امریکن سونے میں صرف ایک ماشہ سونا، نو ماشہ تانبہ اور دو ماشے چاندی ہوتی تھی۔ یہ کالا نہیں پڑتا تھا اور اسے رولڈ گولڈ بھی کہتے تھے۔ چاندی دو قسموں کی ہوتی تھی، بست بسوہ چاندی جو خالص بے کھوٹ ہوتی تھی اور ڈلوں کی صورت میں ملتی تھی اور پترے کی چاندی جو پرانے گوٹے اور پرانے چاندی کے زیورات کو گلاکر اور میل اور آلائش کو نکال کر تیار کی جاتی تھی۔ یہ چاندی عموماً پتروں کی شکل میں کوٹ کر رکھ لیتے تھے۔

جوہری کی دکان بھی بڑی سجی سجائی ہوتی تھی۔ یا تو دکان میں سفید چاندی کا فرش ہوتا تھا اور دکان کا مالک اپنے دائیں بائیں چھوٹی آہنی الماریاں رکھ کر اور اپنے سامنے ایک صندوقچہ رکھ کر خود ایک مخملی گدے پر بیٹھا رہتا تھا، یا پھر پوری دکان ایرانی قالینوں، اعلیٰ کرسیوں، گدے دار صوفوں اور شیشوں اور آلات سے سجی رہتی تھی۔ خوش نما گلاس کیسوں اور الماریوں میں مختلف مخملی ڈبوں میں زیورات چمکتے اور دمکتے رہتے۔ جوہری کا پیشہ اور تجارت ایسی ہے کہ نمود و نمائش گاہکوں کو کھینچنے اور بکری کے لیے ضروری ہے۔ جہاں زیورات کی فروخت سے جوہری ہزاروں لاکھوں روپے کماتے تھے، غریب سادہ کار پسِ پردہ ہی رہتا تھا اور گاہک کبھی ان کی شکل نہیں دیکھتے جن کے فن کارانہ ہاتھوں اور جن کی محنت نے یہ زیورات کو یہ حسن بخشا تھا۔

یہ اس دور کے بادشاہوں، راجاؤں اور نوابوں کے بے پناہ شوق اور سادہ کاروں کی اعلیٰ کاریگری کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہم سر سے پاؤں تک کے سینکڑوں قسم کے زیورات پاتے ہیں۔ بہت سے زیورات تو خود بیگمات اور شہزادیوں کی ایجاد تھیں۔ نسوانی حسن اور گہنے لازم و ملزوم ہیں اور حسین سے حسین عورت کو زیورات کی چاہ ہوتی ہے۔ زیورات کے بغیر عورت کا حسن پھیکا لگتا ہی ہے مگر بیاہ شادی کا

لطف بھی زیورات کے دم سے ہی ہے۔ اگرچہ شادی بیاہ کے موقعے پر کپڑے کی خریداری اور نئے نئے سلمے ستارے، بیل بوٹے اور ریشم سے سجے نسوانی لباسوں کی بھی اپنی بہار اور کشش ہے لیکن جو دلچسپی عورتوں کو زیورات کی خرید اور ان کے بنوانے میں ہوتی ہے وہ اور کسی بات میں نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ عورتیں کتنے بھی عمدہ اور زرق برق والے لباس کیوں نہ پہن لیں، اگر زیورات نہیں ہونگے تو حسن پر رنگ نہیں چڑھے گا۔ سونا اصل میں عورت کی جان ہے اور زیورات اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ امیر خسرو نے بھی زیور کی پہیلی بوجھی ہے۔

فارسی بولی آئینہ
ترکی ڈھونڈی پائینہ
ہندی بولوں آرسی آئے
خسرو کہے کوئی نہ بتائے

دلی میں کچھ اور ایسی صنعتیں بھی فروغ پا رہی تھیں جن کا تعلق اگرچہ زیورات کے بنانے سے نہیں تھا لیکن آرائش، سجاوٹ اور حسن کاری سے بہت تھا۔ بہت سے سادہ کاران پیشوں کے ماہر تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں دلی میں سادہ کاری اور مرصع کاری وسیع معنوں میں بہت سے پیشوں کا احاطہ کیے ہوئی تھی۔ چند ایسے مخصوص پیشوں کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

زردوزی

یہ دلی کی بڑی قدیم صنعت ہے۔ مغلوں کے عہد میں اسے خاص طور پر فروغ ملا۔ ابتدا میں زردوزی دو قسم کی ہوتی تھی، ایک دوختہ، دوسری مروڑی۔ دوختہ کا کام کلابتوں کا ہوتا تھا۔ اسے سوت کے اوپر پھیلا کر پھول پتے بنائے جاتے تھے۔ اس کام کے شاہی شامیانے، پردے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ مسندیں، ہاتھیوں کی جھولیں اور گھوڑوں کی گجریاں بھی اسی کام کی بنتی تھیں۔ شاہی زمانے میں اس فن کی بڑی قدرومنزلت

تھی۔ مروڑی کا کام بھی کلابتوں سے ہی تیار کیا جاتا تھا لیکن یہ کام دوختہ کی طرح سوت پر نہیں ہوتا تھا۔ اس کام میں پھول پتے بڑے باریک بنائے جاتے تھے اور صرف کپڑے پر پھیلا دئے جاتے تھے۔ بیگمات کے لباس اسی کام سے مزین ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ زردوزی کے کام میں مقیش کو بھی داخل کر دیا گیا۔ اس سے زردوزی میں اور جان آگئی۔ پھر ایک کام وصل کے نام سے شروع کر دیا گیا۔ یہ کام کاغذ کے نیچے گتے پر کلابتوں پھیلا کر اور پھول پتے بنا کر کیا جاتا ہے۔ وصلی کے کام سے صرف مخملی جوتیاں تیار کی جاتی تھیں۔ پھر زردوزی نے ایک اور کروٹ لی اور سلمے ستارے کا کام بھی اس میں شامل ہو گیا۔ اسے چکی کا کام کہا جاتا تھا۔

چکن سازی

شاہی زمانے میں چند مغل میوہ فروش ہندوستان آئے اور دہلی میں آکر انھوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ اس کام میں ململ اور وائل پر سفید ریشم سے ہلکے پھول بنائے جاتے تھے اور اس کا نام چکن سازی پڑ گیا۔

کامدانی سازی

یہ پیشہ بھی بڑا قدیم ہے۔ باریک تاروں کو کوٹ کر ذرا چپٹا کر لیتے تھے اور سوئی میں پرو کر دوپٹوں میں باریک پھول بناتے تھے۔ یہ پھول ریشمی دھاگوں سے بنائے جاتے تھے۔ کامدانی سچا کام عوام اور خواص دونوں میں مقبول تھا۔

تارکشی

مغلوں کے عہد میں مولوی قسم کے لوگ اس کام کو کرتے تھے۔ موٹے تاروں میں سے باریک اور ہلکے تار بنا لیتے تھے۔ ان کے پاس ایک لکڑی کا کندہ ہوتا تھا جس کے دونوں کونوں پر چھوٹی بڑی دو چرخیاں ہوتی تھیں۔ چرخیوں کے بیچ میں ایک آہنی

ٹکڑا ہوتا تھا جس میں موٹے اور باریک دونوں سوراخ ہوتے تھے۔ پہلے تار کو موٹے سوراخ اور پھر باریک سوراخ میں سے کھینچ کر تار کو باریک سے باریک کر لیتے تھے۔

پٹوہ علاقہ بندی

اس کام کے کاریگر ہندو مسلمان دونوں ہوتے تھے۔ زیورات میں بندھن باندھ کر ان کو پہننے کے لائق بنا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مختلف قسم کی جھالریں بھی بناتے تھے اور دوسرا نازک آرائشی کا کام بھی کرتے تھے۔

سلمہ اور گوٹہ سازی

یہ کام عموماً مسلمان عورتیں اپنے گھروں میں کرتی تھیں۔ کئی قسم کے تار انہیں مہیا کر دئے جاتے تھے۔ ان سے چھوٹے چھوٹے ستارے اور سلمہ تیار کرتی تھیں۔ ایک چھوٹے سے کرگھے نما دستی آلے پر گوٹہ بھی تیار کر لیتی تھیں۔

ہاتھی دانت کا کام

یہ کام بھی شاہی زمانے میں بڑے عروج پر تھا۔ ہاتھی دانت کو حسب ضرورت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر کھلونے، آرائشی سامان اور زیورات بنائے جاتے تھے۔ سینکڑوں قسم کے جانور، کشتیاں مع ملاحوں اور پورے ساز و سامان کے، تانگے، بیل گاڑیاں اور اسی قسم کی ہزاروں چیزیں بنائی جاتی تھیں۔ زیورات میں کانوں کے بندے، ہار اور ہاتھوں کی چوڑیاں اور دست بند بنتے تھے۔ شطرنج کے مہرے تک ہاتھی دانت کے بنائے جاتے تھے۔ جس چیز کو بھی دیکھو یہ گمان ہوتا تھا کہ کاریگر نے اس کو بنانے میں اپنی زندگی صرف کر دی ہو گی۔

سنگ تراشی

مغل زمانے میں بادشاہوں کو عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ یہ لوگ پتھر میں اپنی چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے نہایت دل کش نقش ونگار بناتے تھے۔ پتھر کو حیات بخشنے میں ان فن کاروں کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے کام کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ غیر تربیت یافتہ اور عموماً ناخواندہ کاریگر ایسے شاہکار کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ اگرچہ سنگ تراشی کے ماہر اب بھی دلی میں موجود ہیں لیکن مغلوں کے عہد کا پتھر میں مرصع اور منقش کام اب کہاں ہوتا ہے۔ وہ فن کی اپچ، وہ باریکی، وہ لطافت جو شاہی زمانے کے کاریگروں میں ملتی تھی، اب دیکھنے میں نہیں آتی۔ پھر اب تو سب ہی صنعتوں میں جن میں اوپر لکھی ہوئی دستکاریاں بھی شامل ہیں، حتیٰ کہ زیور سازی بھی مشینوں کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہونے لگا ہے۔ آج کاریگری میں جو حسن دیکھنے میں ملتا ہے، اس میں کاریگر کے ہاتھ سے کہیں زیادہ مشینیں اور کلیں کار فرما ہیں۔

دلی کے بانکے

مغلوں کے عہد میں دلی میں لوگوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ ایسا بھی تھا جس سے دلی کی زندگی گل وگلزار بنی رہتی تھی۔ یہ دلی کے بانکے تھے۔ بانکا اس آدمی کو کہتے تھے جو خوبرو، جواں مرد، نفاست پسند اور نرالی سج دھج کا ہو۔ بانکوں کی شخصیت اور ان کا لباس بڑا منفرد ہوتا تھا۔ وہ کمزوروں اور غریبوں کی مدد بھی کرتے تھے اور غنڈے ان سے خوف کھاتے تھے۔ سارے علاقے میں ان کی دھاک جمی ہوتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ہر وقت متعدد شاگرد رکھتے تھے۔ کسی غنڈے کی خبر لی، کسی کمزور اور بے کس کو بچایا اور ان کی شہرت آناً فاناً پھیل گئی۔ ہر ایک بانکے کا اپنا جداگانہ طریقہ، اطوار، لباس اور چال ڈھال ہوتی تھی اور دُور سے دیکھ کر ہی، چاہے اِس طرف اس کی پیٹھ ہی کیوں نہ ہو، یہ پتہ لگ جاتا تھا کہ فلاں بانکا ہے۔ کوئی بانکا اپنا سر منڈوا لیتا مگر گھنی داڑھی بڑھا لیتا۔ دوسرا آدھی مونچھ صاف کروا کر آدھی اتنی لمبی بڑھا کر لٹکا لیتا کہ اسے اپنے کان کے گرد کئی بٹ دے کر باندھ سکتا تھا۔ تیسرا ایسا پاجامہ پہنتا جس کی ایک ٹانگ صرف گھٹنے تک آتی اور دوسری ٹخنے تک لٹکی ہوتی اور یہ پاجامہ اطلس یا کمخواب کا بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ بانکے شاہی ہرکارے کا لباس پہن کر گھومتے اور کچھ اپنے کندھے پر ہنومان کی طرح گدا اٹھائے چلتے، کوئی کھانڈا، کوئی برچھی، کوئی بھالا اور کوئی تیر کمان لیے پھرتا۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں بانکوں کے وارے نیارے تھے انہیں شاہی سرپرستی حاصل تھی اور عوام بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور ان کی خوب تعریف کرتے تھے۔


FIROZ

دلی کے بانکے عام طور پر اچھے گھرانوں کے ہوتے تھے۔ کچھ رئیسوں کے لڑکے بھی بانکے بن کر گھومتے تھے۔ سب بانکے کسی نہ کسی لڑائی کے فن میں طاق ہوتے تھے اور اس کے لیے وہ باقاعدہ کسی استاد سے تربیت لیتے تھے۔ بانکے جن فنون میں دلچسپی لیتے تھے وہ تھے، پھکیتی، پٹے بازی، بنوٹ، بانک، برچھا، بانا، تیر اندازی اور کشتی۔ ہر بانکا چھڑی، ڈنڈا یا کوئی خفیہ ہتھیار ضرور رکھتا تھا۔ وہ اپنی طاقت اور فن کی استادی کی وجہ سے دو تین غنڈوں کی مرمت تو اکیلا ہی کر سکتا تھا۔ مگر عام طور پر اس کی نوبت نہیں آتی تھی کیونکہ بانکا تنہا شاذ ہی گھومتا تھا اور اس کے دو چار شاگرد ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تھے۔

بانکے اپنا رعب جمانے اور اپنی نمود و نمائش میں یقین رکھتے تھے۔ سخت جاڑوں میں جب گرم کپڑے پہنے ہوئے لوگ بھی کپکپاتے پھرتے تھے اور بتیسی بجتی تھی تو بانکے باریک سے باریک ململ کے کرتے ہیں، سینے کے بٹن کھولے اور آستینیں چڑھائے رکھتے تھے۔ کوئی کوئی بانکا تو اپنے ململ کے کرتے پر پانی بھی چھڑک لیتا تھا۔ اگر بانکے کسی لڑائی اور جنگ میں بھی حصہ لیتے تو ڈھال یا زرہ بکتر اپنے دفاع کے لیے پہننا کسر شان سمجھتے۔ بہت سے بانکوں کو کسی جنگ یا مہم کی صورت میں ہنگامی طور پر بلا لیا جاتا تھا۔ بانکوں کی ایک شان یہ بھی تھی کہ چوٹ پر چوٹ یا زخم سہتے مگر اف تک نہ کرتے۔

بانکوں کا تذکرہ پرانی داستانوں میں بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ یورپ کی قدیم تاریخ میں بھی، بانکوں کی قسم کا ایک گروہ وہاں کے جاگیردارانہ نظام میں بھی نظر آتا ہے جن کے طور طریقے بالکل ہی یہاں کے بانکوں کی طرح تھے۔ انہیں "نائٹ" کہا جاتا تھا۔ یہ ایک قسم کا خطاب تھا جو وہاں کے امرا ایسے مصاحبوں کو عطا کرتے تھے۔ انگلینڈ میں ابھی تک ایسے خطابات کا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے دلی کے بانکوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ـــ

" دربارِ دہلی میں بکثرت قندھاری آ آ کر فوج میں نوکر ہوتے۔ وہ لوگ چونکہ بہت بہادر سمجھے جاتے تھے اس لیے یہاں کے عام سپہ گروں میں ان کی وضع لباس اور عادات اور خصائل رواج پانے لگے اور یہ انہیں کی

برکت اور صحبت کا اثر تھا کہ دہلی میں بانکے بڑے بڑے کلیوں دار پائچوں کے پیجامے پہنتے تھے۔ دہلی کے آخری عہد میں بانکوں کی وضعداری اور شجاعت اس قدر پسندیدہ ہوگئی کہ صدہا شریف زادوں نے بانکوں میں داخل ہو کے ان کی وضع اختیار کرلی اور شرفا جن میں اکثر اعلیٰ وضع پر تھے سب بانکے بنے ہوئے تھے۔"

بانکے بڑے ہٹیلے اور اپنی آن پر مر مٹنے والے ہوتے تھے۔ کسی سے کوئی وعدہ کرلیتے تو ضرور پورا کرتے۔ اپنی بے عزتی ذرا بھی برداشت نہ کرتے۔ ان کے قول پر بھی سب لوگ یقین کرتے تھے۔ اگر کوئی بانکا کسی مہاجن کے پاس کچھ روپے ادھار لینے جاتا تو اس کا وعدہ کہ فلاں تاریخ تک واپس کردونگا پتھر کی لکیر سمجھا جاتا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی مشہور ہے۔ ایک بدمعاش نے ایک روز یہ دیکھ لیا کہ ایک بانکے نے اپنی مونچھ کا ایک بال توڑ کر ایک مہاجن کو ضمانت کے طور پر دیا اور اس سے کئی صد روپے ادھار لے گیا۔ ان دنوں بانکے بروقتِ ضرورت مہاجنوں سے ہزاروں روپے صرف اپنی مونچھ کا ایک بال رکھ کر لے جاتے تھے۔ بدمعاش کو یہ طریقہ بڑا آسان نظر آیا اور اگلے دن وہ ایک بانکے کا سوانگ بھر کر اس مہاجن کے پاس پہنچا اور اس سے قرضہ مانگا۔ عہد کے طور پر اس نے بانکے کی طرح اپنی دائیں طرف کی مونچھ سے ایک بال توڑ کر اسے دیدیا۔ مہاجن کو اس آدمی کی بات چیت کے ڈھنگ سے شبہ ہوگیا کہ وہ بانکا نہیں ہے۔ آزمائش کے طور پر مہاجن نے بدمعاش سے کہا کہ مجھے بائیں طرف کی مونچھ کا بال چاہیئے" یہ بال تم واپس لیلو۔ اس پر بدمعاش نے دوسری طرف کی مونچھ کا بال توڑ کر اسے دیدیا اور مہاجن کی تسلی کے لیے کہنے لگا کہ ایک دو بال اور چاہیئں تو وہ بھی توڑ دیتا ہوں۔ مہاجن کو پتہ لگ گیا کہ وہ آدمی بانکا نہیں ہے۔ مہاجن نے اس آدمی کو قرضہ دینے سے انکار کردیا اور اسے شرمندہ کرتے ہوئے بولا کہ یہ جعلسازی کہیں اور کرنا' تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر میں کسی اصلی بانکے سے مونچھ کا دوسرا بال طلب کرتا تو اس وقت میرا سر اس نالی میں تڑپتا ہوتا۔

محمد شاہ رنگیلے کے دور میں مغلیہ سلطنت کی حالت کافی ابتر ہوگئی تھی۔ بادشاہ اپنا تمام

وقت رنگ رلیوں میں گزارتا تھا جس کے نتیجے کے طور پر دلی میں بھی بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور شریف زادیوں کی عزت اور ناموس بھی خطرے میں تھی۔ دلی کے کچھ بدمعاشوں نے یہ حرکت شروع کردی کہ اگران کے محلے سے کہار ڈولی لے جاتے تو اس میں بیٹھی جوان شریف زادی کو غائب کردیتے۔ ان وارداتوں کے سرغنہ ایک ہی خاندان کے تین بھائی تھے جو ہر وقت اپنے مکان کے سامنے اسی تاک میں بیٹھے رہتے کہ کوئی نوجوان عورت ڈولی میں بیٹھ کر نکلے اور وہ حملہ کرکے اسے اغوا کرلیں۔ جب اس کی اطلاع ایک بانکے کو ملی تو اس نے اس گروہ کا قلع قمع کرنے کی ٹھان لی کیونکہ بانکوں کا یہ شیوہ تھا کہ لوگوں کو ظلم و تشدد سے نجات دلائیں۔ اس بانکے نے ایک روز زنانہ لباس پہنا اپنے آپ کو قیمتی زیورات سے آراستہ کیا، ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگائی اور تمام اسلحہ زیب تن کرکے کہاروں سے کہا کہ ڈولی اس راستے سے لے کر چلو جہاں وہ بدمعاش بیٹھے رہتے ہیں اور اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ پہلے تو کہاروں نے اُدھر جانے سے انکار کردیا مگر انعام و اکرام کے لالچ سے اور جان کی حفاظت کے بانکے کے وعدے پر چل پڑے۔ "بیگم" نے ڈولی میں سے تاکنا جھانکنا شروع کردیا۔ بانکا کبھی کبھی اپنا ہاتھ باہر نکال کر اپنے زیورات کی نمائش بھی کرتا تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ لگ جائے کہ کسی نوجوان عورت کی سواری ہے۔ جب ڈولی بدمعاشوں کے مکان کے سامنے سے گزری تو انھوں نے اس پر حملہ کردیا۔ حملہ کرنا تھا کہ بانکا ڈولی سے کود پڑا اور تلوار چلانی شروع کردی۔ چونکہ بانکا فن سپہ گیری میں ماہر تھا اس نے ان تینوں بدمعاشوں کو ٹھنڈا کردیا۔ بانکے کی مدد پالکی برداروں نے بھی کی۔ جب اس واقعے کی خبر محمد شاہ رنگیلے کو ہوئی تو اس نے اس بانکے کو طلب کیا۔ بانکا اسی زنانہ لباس میں بادشاہ کے پاس پہنچا جسے پہن کر وہ بدمعاشوں کی سرکوبی کے لیے گیا تھا۔ بادشاہ نے کُل واقعہ سننے کے بعد بانکے کی تعریف کی اور اسے انعام و اکرام سے نوازا اور چلتے وقت کہا کہ اب اس زنانہ لباس کو اتار دو۔ اس پر بانکے نے دست بستہ عرض کی کہ چونکہ میں نے اس لباس میں شریف زادیوں کو نجات دلائی ہے، اس لیے مجھے اسی لباس میں رہنے

کی اجازت دی جائے۔ اسی دن سے یہ بانکا شہر میں "بیگم" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ جب بعد میں بادشاہ کی فوج نے کرنال میں بغاوت کو فرو کرنے کے لیے کوچ کیا تو بیگم بانکا ہراول دستے میں تھا اور جنگ میں مارا گیا۔ بادشاہ کو اس بانکے کی موت کا بڑا دکھ ہوا۔ محمد شاہ رنگیلا یوں بھی بانکوں کا سرپرست تھا اور اس کے عہد میں بانکوں کا بڑا زور تھا۔ بلکہ یہاں تک مشہور تھا کہ وہ زنانوں اور بانکوں کی ایک باقاعدہ فوج رکھتا تھا۔ زنانوں کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اگرچہ وہ بہادر تھے مگر تلوار کی ہر ضرب مار کر عورتوں کی طرح "اوئی" کہتے تھے۔ جہاں تک بانکوں کا تعلق تھا ان کا کام اپنی نرالی شان اور قوت کا مظاہرہ کرنا ہوتا تھا۔ ان کی سج دھج کتنی بھی مضحکہ خیز ہوتی مگر کسی کی یہ مجال نہیں ہوتی تھی کہ مسکرا بھی دے کیونکہ اس کا مطلب جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ بانکے امرا اور بادشاہ تک کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آن اتنی تھی کہ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ اور کسی کی بات نہیں سہتے تھے۔ نواب سعادت علی کے زمانے کے مشہور نکٹے بانکے جہانگیر بیگ نے جن کی تصویر لال قلعے میں اب تک موجود ہے' اپنی ناک ذرا سی بات پر کاٹ کر پھینک دی تھی۔ ان کے والد نواب صاحب کے مصاحب تھے۔ نواب صاحب جہانگیر بیگ کی کسی بات پر برافروختہ ہوگئے اور ان کے والد سے ان کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اپنے بیٹے سے کہہ دیجیے کہ اپنے بانکے پن پر نہ جائے۔ ان کی ناک نہ کٹوا دی تو میرا نام سعادت علی نہیں۔ جہانگیر بیگ کے باپ نے گھر آکر بیوی کو ساری بات بتائی اور جہانگیر بیگ کے گھر آتے ہی ماں نے ساری بات انھیں بتائی کہ نواب صاحب ایسا ایسا کہتے ہیں۔ اس پر جہانگیر بیگ کو طیش آگیا اور جب شام کو ان کے والد گھر آئے تو انھوں نے تلوار سے اپنی ناک کاٹ کر باپ کی طرف پھینکتے ہوئے کہا — "بس اسی ناک کو کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے تھے۔ لیجیے یہ ناک حاضر ہے ان کو دے دیجیے۔"

نواب سعادت علی خاں کے زمانے کا ایک اور واقعہ مشہور ہے جس سے

بانکوں کی دلیری اور حوصلہ مندی کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ ایک بانکے نے اپنی ننگی تلوار اپنی ڈیوڑھی پر ٹانگ رکھی تھی اور اعلان کر رکھا تھا کہ ہر وہ شخص جو ادھر سے گزرے بغیر سلام کیے نہ جائے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ بڑے بڑے شرفا اور امرا کا راستہ وہی تھا اور سب پریشان ہوگئے۔ نواب سعادت علی تک یہ بات پہنچی تو انھوں نے حکم دیا کہ ہماری سواری اس راستے سے لے کر چلو۔ جب ان کا جلوس اس سڑک کے نکڑ پر پہنچا جہاں سے بانکے کے مکان کو سڑک مڑتی تھی تو چوراہے کے موڑ پر وہی بانکا ان کے ہاتھی کے سامنے سر برہنہ آکر کھڑا ہوگیا۔ بادشاہ نے سواری رکواکر پوچھا کہ یہ کون ہے تو مصاحبوں نے بتایا کہ یہ وہی بانکا ہے جس نے اپنے دروازے پر تلوار ٹانگ رکھی ہے۔ بانکے نے شاہانہ آداب بجالاتے ہوئے دست بستہ عرض کی کہ حضور جلوس کا رخ دوسری جانب موڑدیں ورنہ اگر جلوس ادھر سے گزرا تو یہ غلام جہاں پناہ پر سے قربان ہوجائے گا اور گھر پر مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔ نواب سعادت علی خاں فوراً اس کا مطلب تاڑ گئے اور حکم دیا کہ جلوس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا جائے۔ اگلے دن بانکے کو دربار میں بلاکر اسے انعام واکرام دیا اور بانکے نے بھی ازخود تلوار اپنی ڈیوڑھی سے ہٹانے کی رضامندی دیدی۔

ان بانکوں کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ یہ ادنیٰ درجے کے سپاہیوں سے لڑنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ صرف اپنے برابر کے آدمیوں سے مقابلہ کرتے اور اگر مقابلے میں حریف کمزور پڑتا تو فوراً ہاتھ روک لیتے اور اس کے زخمی ہونے پر اگر گھر جانے میں اسے تکلیف ہوتی تو اسے سہارا دیکر اس کے گھر پہنچا آتے۔

اورنگ زیب کی حکومت کے بعد مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوگئی تھی۔ اس کی طاقت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ کیونکہ محمد شاہ رنگیلے کی حکومت مقابلتہً کافی دیر تک قائم رہی کچھ اجتماعیت اور ٹھہراؤ بنا رہا، اگرچہ دلی میں کافی لاقانونی رہی۔ تاہم محمد شاہ

رنگیلے کا دربار، اپنی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ایک تہذیبی مرکز بنا رہا۔ اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو تخریبی طاقتوں نے سر اٹھایا اور شاہی سرپرستی کی عدم موجودگی میں بہت سی تہذیبی قدریں اور علامتیں، جو ابھی تک توانا اور زندہ تھیں ختم ہونے لگیں۔ دلی کے بانکوں کو تو کئی نسلوں سے شاہی سرپرستی حاصل تھی اور جب یہ سرپرستی ہی جاتی رہی تو بانکے بھی بدحالی کا شکار ہو گئے اور وہ وقت بھی آگیا جب ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں رہا۔ اسی زبوں حالی پر شاید کسی نے یہ شعر کہا ہے ؎

دلی کے بانکے جن کی
جوتی میں سو سو ٹانکے!


FIROZ
87

بنوٹ، بانک اور پٹے بازی وغیرہ

دلی کے اکھاڑوں میں کشتیاں تو کی ہی جاتی تھیں لیکن بعض اکھاڑوں میں کئی مشرقی کھیلوں یا کرتبوں کی، جن کا تعلق جسمانی قوت اور چستی سے تھا باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی تھی۔ ان کا مدعا بھی انفرادی قوتِ دفاع کو فروغ دینا تھا اور ضرورت پڑنے پر حملہ آور کے حملے کو ناکام بنانا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں پنجہ کشی، بنوٹ، بانک، پٹے بازی، بینٹی، غلیل بازی، تیر اندازی اور بندی خاصے مقبول فنون تھے۔ شرفا اور امرا کے بچے بھی ان اکھاڑوں میں جاکر یہ ہنر سیکھتے تھے۔ مغل بچوں میں ان کا خاص طور پر شوق تھا۔ شام کے وقت موتیاکھان پر قدم شریف کے قریب مغل بچوں کی ایک بھیڑ ہوجاتی تھی۔ وہاں سارے فنون کے استاد ہوتے تھے۔ ہندو مسلمان دونوں ہی اس اجتماع میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں ایک میٹھے پانی کا کنواں بھی تھا جس کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہوتا تھا۔ اس پانی میں ٹھنڈائی تیار ہوتی اور بادام پستے اور ان کا شربت تیار ہوتا۔ ساتھ ہی پہلوانوں اور ان کے کمالات پر تبصرہ ہوتا رہتا۔ پنجہ کشی، بنوٹ، بانک اور پٹے بازی پر رائے زنی ہوتی رہتی۔ اس جگہ ایک اچھا خاصا میلہ لگ جاتا۔ پنجہ کشی، بنوٹ اور پٹے بازی کے ایسے ایسے استاد دلی میں موجود تھے کہ ان کی نظیر نہیں ملتی۔

پنجہ کشی دراصل بانک اور بنوٹ کی پہلی کڑی ہے اگرچہ بظاہر ان میں کوئی سیدھا تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں دونوں فریق اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو ایک دوسرے کے

خلاف جوڑ کر انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے ایک شکنجے میں موڑ لیتے ہیں اور پھر طاقت آزماتے ہیں اور ایک دوسرے کی کلائی اور پنجے کو مروڑتے ہیں۔ اتنا زور لگاتے ہیں کہ یا تو مخالف کا پنجہ مڑنے لگتا ہے اور اگر اس میں زیادہ طاقت اور مہارت ہے تو اپنا ہی پنجہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔ اگر دونوں یکساں طاقت کے مالک ہوتے تو گھنٹوں تک پنجے الجھے رہتے مگر کسی کا پنجہ بھی ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ایسے میں دونوں کا چہرہ سرخ انگارہ ہو جاتا، گردنوں کی رگیں اُبھر آتیں اور پسینہ پھوٹ پڑتا۔ جس کا پنجہ مڑنے پر مڑتا چلا جاتا اور وہ تکلیف سے چلاّنے لگتا تو اس کی ہار مانی جاتی۔ بعض مرتبہ پنجہ کشی شرط لگا کر بھی ہوتی اور اس میں خاصی رقمیں اور اشیا داؤ پر لگادی جاتیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ کئی پنجہ کش فنِ خوش نویسی کے ماہر بھی تھے۔ عموماً خوش نویسی کے لیے سبک انگلیوں کا تصور ہوتا ہے نہ کہ پنجہ کش کی پتھر کی طرح سخت اور کھردری انگلیوں کا۔ آخری مغل بادشاہ کے زمانے میں ایک میر پنجہ کش بڑے مقبول تھے۔ ان کا اصل نام سیّد محمد امیر رضوی تھا اور خوش نویسی میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ ان کے کمال کا یہ حال تھا کہ ان کے پہلے ہی حرف الف میں دیکھنے والوں کو قدِ جاناں کا عکس نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود پنجہ کشی میں انھوں نے وہ شہرت پائی کہ لوگ انہیں میر پنجہ کش ہی کہنے لگے۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی ان کے شاگردوں میں سے ایک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ میر صاحب لوہے پنجے سے زور کیا کرتے تھے اور اپنی طاقت سے اسے موڑ دیا کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر خصوصی احترام کرتے تھے۔ میر صاحب پنجہ کشی کے علاوہ بانک اور بنوٹ کے بھی ماہر تھے۔ ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی میں بھی انھوں نے اپنے طور پر جو کچھ ہو سکتا تھا کیا اور اس کی وجہ سے فرنگیوں کی گولی کا نشانہ بنے۔ اس وقت ان کی عمر ۹۶ سال کی تھی۔ ان کی قبر پہاڑی املی میں ان کے مکان کے اندر ہی بنی جو آج تک محفوظ ہے۔ اب اس مکان میں ایک اسکول کھلا ہوا ہے۔

میر پنجہ کش کے ایک شاگرد مرزا علی بیگ تھے۔ جب مرزا علی بیگ کی عمر اسّی سال سے تجاوز کر گئی اور وہ دستوں سے بیمار رہتے تھے تو ان کے پاس میرٹھ کا ایک پہلوان

آیا جوان سے پنجہ کشی کا فن سیکھنے کے لیے بڑا مشتاق تھا۔ مرزا نے اپنی پیری اور علالت کے سبب معذرت چاہی بلکہ اپنی کلمے کی انگلی کی طرف بھی جو ٹوٹی ہوئی تھی اشارہ کیا۔ لیکن پہلوان مصر تھا اور ان سے ہی یہ فن سیکھنا چاہتا تھا۔ ناچار مرزا علی بیگ بستر ہی اٹھ کر بیٹھ گئے اور انھوں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ پہلوان کے سامنے کر کے اسے دعوت دی کہ وہ اپنا پنجہ ان کے پنجے سے ملائے۔ ساتھ ہی انھوں نے اسے یہ بھی کہا کہ میرے بڑھاپے اور نقاہت کا خیال رکھنا اور ایسا نہ ہو کہ میری انگلیوں کی ہڈیاں چُر مُرا جائیں پہلوان نے پنجہ ملایا اور کوئی دس منٹ تک اس میں اور مرزا صاحب میں زور آزمائی ہوتی رہی۔ پھر مرزا نے اپنی ایک چال "قینچی" استعمال کی اور پہلوان کی کلائی کو ایک جھٹکے سے موڑ دیا۔ یہ جھٹکا اتنا اچانک اور شدید تھا کہ پہلوان دور سے کراہتا ہوا پلنگ پر سے فرش پر گر پڑا۔ قینچی فنِ پنجہ کشی میں بڑا کارگر حربہ تھا جس سے بعض مرتبہ مخالف کی انگلیاں ہمیشہ کے لیے بیکار تک ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ آج بھی نوجوان لڑکے اور کچھ لوگ شوقیہ پنجہ لڑاتے ہیں مگر وہ فن تو اب معدوم ہی ہو گیا ہے۔

۱۹۳۰ کی دہائی میں دلی میں ایک مضبوط جسم کا رفوگر تھا جو پنجہ کشی میں مہارت رکھتا تھا اور کافی مشہور ہو گیا تھا۔ ایک دن حوض قاضی میں ایک چھوٹا ہوا بیل قابو سے باہر ہو گیا اور وہ راہگیروں پر حملہ کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ لوگ افراتفری میں بھاگ کر جہاں جگہ ملی چھپ گئے۔ رفوگر نے شور سنا تو دکان سے نکلا۔ وہ بیل کے پیچھے گیا اور جب اس نے مڑ کر اس پر حملہ کرنا چاہا تو رفوگر نے اپنے پنجوں سے مضبوطی سے بیل کو سینگوں سے پکڑ لیا۔ اس نے پوری طاقت لگا کر بیل کو نیچے گرا دیا اور اسے اسی حالت میں رکھے رہا۔ یہاں تک کہ پولیس آ گئی اور بیل کو ٹانگوں سے باندھ کر وہاں سے لے گئی۔ اس زمانے میں کچھ لوگوں کے پنجوں کی قوت کا یہ حال تھا۔

بنوٹ تو قدیم دلی کا ایک ایک مقبول ترین فن تھا۔ اس کی باقاعدہ مشق کرنے والے پراثر نتائج حاصل کر لیتے تھے۔ اس میں جو ہتھیار یا حربہ استعمال ہوتا تھا وہ ایک رومال تھا جس کے کونے میں ایک سکّہ بندھا ہوا ہوتا تھا۔ اس کو تیزی سے گھما کر

مخالف کی کسی ہڈی یا جوڑ پر ایسی ضرب لگائی جاتی تھی کہ اس کا ہتھیار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرتا تھا اور وہ درد کے مارے بلبلا اٹھتا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ ضرب اتنی شدید ہوتی کہ اس سے موت تک ہو جاتی۔ امداد صابری نے ۱۸۸۱ میں ہوئے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے۔ ایک قوی ہیکل قیدی جس پر قتل کے الزام کا مقدمہ چل رہا تھا پولیس کی حراست سے ہتھکڑیاں توڑ کر بھاگ نکلا اور جاتے ہوئے اپنے محافظ سپاہی سے اس کی تلوار چھین کر بھی لے گیا۔ وہ تلوار گھماتا ہوا عدالت کے احاطے سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا اور جو کوئی اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا تو اس کو موت کے گھاٹ اتارنے کی دھمکی دیتا۔ بلکہ وہ لوگوں کو خود بھی للکارتا کہ کسی میں ہمّت ہو تو آگے بڑھے۔ اس سنگین صورتِ حال کو دیکھ کر حکاّم نے فیصلہ کیا کہ اگر قیدی تلوار نہ پھینکے تو اسے گولی ماردی جائے۔ اس موقعے پر ایک میر صاحب جو بڑے کمزور سے اور پستہ قد تھے سامنے آئے اور انھوں نے قیدی کو پکڑنے کی ذمے داری لی۔ قیدی ان کو دیکھ کر ہنسا اور حقارت سے بولا کہ میاں کیوں اپنی جان پر کھیلتے ہو، چڑیا کی جان لیے پھرتے ہو، جاؤ آرام سے بیٹھو۔ میر صاحب کے ہاتھ میں ایک رومال تھا، انھوں نے اپنی جیب میں سے تانبے کا ایک پیسہ نکالا اور اسے رومال کے کونے میں باندھ لیا۔ پھر قیدی کے اور قریب پہنچ کر بولے کہ تیری خیریت اسی میں ہے کہ تلوار زمین پر پھینک دے۔ قیدی کی آنکھوں میں تو پہلے ہی سے خون اترا ہوا تھا۔ یہ سن کر لال پیلا ہو گیا اور تلوار سے مرزا صاحب پر زور سے وار کیا۔ مرزا چھلاوے کی طرح کود کر ایک طرف ہو گئے اور پھر آگے آکر انھوں نے قیدی کی کلائی پر وہ ضرب لگائی کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔ اس طرح قیدی زندہ پکڑا گیا۔

اس کارنامے سے متاثر ہو کر دلی کے ڈپٹی کمشنر نے میر صاحب کو ایک پیشکش کی۔ بلکہ یہ ایک قسم کا چیلنج ہی تھا۔ اس کے مطابق ڈپٹی کمشنر پستول تان کر مرزا کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور مرزا کو دو منٹ دیں گے جس کے اندر انہیں ان کے ہاتھ سے پستول گرانی ہوگی۔ لیکن اگر مرزا پستول کو گرانے میں ناکام رہے تو ڈپٹی کمشنر انہیں گولی ماردیں گے۔

شاید یہ گولی مارنے والی بات تو مرزا کی ہمت کو پست کرنے کے لیے کہی گئی ہوگی مگر مرزا نے یہ مقابلہ منظور کر لیا۔ صرف چند ہی سیکنڈ میں مرزا نے اپنی بنوٹ کی ضرب سے ڈپٹی کمشنر کی پستول ان کے ہاتھ سے دُور جا گرائی اور صاحب بہادر درد سے بڑی دیر تک کراہتے رہے۔

بنیٹی ایک لمبی چھڑی ہوتی ہے جو دونوں سروں سے چھوٹی سی مُٹھی کی طرح گول ہوتی ہے۔ اس کو بیچ میں سے پکڑ کر تمام سمتوں میں گھمایا جاتا ہے تاکہ کوئی مخالف پاس نہ آسکے۔ تفریح تماشے کے لیے بنیٹی کے دونوں سروں پر مٹی کے تیل میں بھگو کر کپڑا باندھ دیا جاتا ہے اور اس میں آگ لگا کر بنیٹی کو گھماتے ہیں۔ بنیٹی والا بہت دیر تک جلتی ہوئی بنیٹی کو اپنے سر کے اوپر اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے گھماتا ہے مگر شعلوں کی زد سے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ اس وقت دلی کا شاید ہی کوئی جلوس یا میلہ ایسا ہو جس میں بنیٹی کا کرتب نہ دکھایا جاتا ہو۔ جہاں بنیٹی گھمائی جاتی بچوں اور بڑوں کی ایک بھیڑ اُسے دیکھنے کے لیے اکٹھی ہو جاتی۔

بانک بھی اسی طرح کا ایک کھیل یا کرتب ہے۔ اس میں ایک دھات کی سلاخ استعمال کی جاتی ہے جو پانچ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اسے بانا کہتے ہیں اور کھلاڑی اسے بھی چاروں طرف تیزی سے گھما کر حریفوں کو دور رکھتا ہے۔ اگرچہ بنیٹی اور بانک پہلے کی طرح اب مقبول نہیں ہیں بلکہ مٹتے جا رہے ہیں مگر کسی کسی جلوس میں ابھی تک اس کا مظاہرہ دیکھنے میں آجاتا ہے۔ ارنا اُچھال (پلٹا کھا کر اپنے شانے سے حریف کے ہاتھ کو ٹھوکا دیکر وار کرنا) اور اسپینا (ہاتھ پکڑ لیے جانے پر پھرتی سے گھوم کر حریف کی پشت پر نکل کر وار کرنا) اس کے مشہور داؤ تھے۔

غلیل بازی کو عام طور پر بچوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے یا باغوں میں مالی غلیل کا استعمال کر کے پرندوں کو بھگاتے ہیں تاکہ وہ درختوں کے پھل نہ اجاڑیں۔ لیکن قدیم دلی میں بہت سے شوقین لوگوں نے غلیل کو ایک فن یا مشغلے کے طور پر اپنا لیا تھا اور اِسے دشمنوں کے خلاف یا شکار کرنے کے لیے استعمال کیا۔ بہادر شاہ ظفر کا لڑکا مرزا

شاہرخ بہت عمدہ شکاری تھا۔ ایک صبح اس نے آسمان میں پرندوں کی ایک ڈار اپنی طرف آتی ہوئی دیکھی۔ شہزادے نے نشانہ باندھا اور جھنڈ کے آخر میں ایک پرندے کو گولی مارنے ہی والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وہ پرندہ اچانک پھڑپھڑایا اور زمین پر گرنے لگا۔ کیونکہ اردگرد کوئی بھی آدمی نظر نہیں آیا جس نے پرندے کے گولی ماری ہو اس نے حکم دیا کہ اس آدمی کی تلاش کی جائے جس نے پرندے کو مار کر نیچے گرایا ہے۔ شہزادے کے آدمی چاروں طرف دوڑے مگر انہیں صرف ایک گھسیارا ملا۔ اس سے پوچھے جانے پر اس نے تسلیم کیا کہ اس نے ہی پرندے کو مارا تھا۔ اسے شہزادے کے پاس لے جایا گیا۔ شہزادے نے اسے حیرانی سے دیکھا اور پوچھا "لیکن تم نے اسے کیسے مار گرایا۔ تمہارے پاس نہ بندوق ہے، نہ تیر کمان۔" گھسیارے نے دست بستہ جواب دیا۔ "جناب والا پرندوں کو مارنے کے لیے بندوق یا تیر کمان کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے لیے تو صرف ایک غلیل کافی ہے۔ اور یہ رہی میری غلیل۔"

پٹے بازی، لٹھ بازی اور بنوٹ بھی ان دنوں عوام کے مرغوب مشغلے تھے، شہری علاقوں میں بھی اور دیہات میں بھی۔ ان میں استعمال ہونے والا ہتھیار لکڑی کا ڈنڈا یا چھوٹی لاٹھی ہوتی جس کی لمبائی سوا گز ہوتی تھی۔ تجربے کار آدمی کے ہاتھوں میں مسلح لوگوں سے مقابلہ کرنے کے لیے یہ بڑا کارگر ہتھیار تھا۔ اس سلسلے میں ایک مشہور ڈاکو کا قصہ سننے میں آتا ہے۔ یہ ڈاکو بڑا لیم شحیم اور طاقت ور تھا اور ہر وقت اپنے ساتھ لوہے کی ایک بھاری سلاخ رکھتا تھا جس کا وزن ایک من تھا۔ اس ڈاکو نے دور دور تک دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ دن دھاڑے ڈاکہ ڈالتا۔ مگر اس میں ایک خوبی بھی تھی وہ یہ کہ وہ سب کو بتا کر اور سب کے سامنے سے اعلانیہ چوری کا مال گٹھڑی میں باندھ کر لے جاتا تھا بلکہ چیلنج دیتا تھا کہ کوئی روک سکتا ہے تو روک لے۔ ایک دفعہ وہ ڈاکہ ڈالنے کے لیے دلی کے باہری علاقے میں پہنچ گیا اور ایک فوجی سپاہی کے گھر میں گھس گیا۔ یہ فوجی گھر پر نہیں تھا مگر اس کا علم ڈاکو کو نہیں تھا۔ گھر میں اس وقت فوجی کی بیوی اور اس کی ماں تھی۔ وہ بے چاری چھپ کر

بیٹھ گئیں۔ ڈاکو نے اطمینان سے گھر میں جو مال، نقدی اور زیور تھا اکٹھا کیا اور اسے آنگن میں بیٹھ کر ایک گٹھڑی میں باندھنے لگا۔ جب باندھ چکا تو اپنی عادت کے مطابق زور سے بولا۔

"میں یہ مال لے جا رہا ہوں۔ کسی میں ہمت ہو تو روک لے۔"

"آج اگر میرے وہ گھر پر ہوتے تو تو یہ مال یہاں سے نہیں لے جا سکتا تھا۔"

"کہاں گیا ہوا ہے وہ؟" ڈاکو نے عورت کی ہمت پر حیران ہو کر پوچھا

"وہ اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔ ایک ہفتے کے بعد گھر آنے والے ہیں۔" عورت بولی

"تو کوئی بات نہیں۔" ڈاکو بولا "میں یہ سامان ابھی چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد لے جاؤں گا۔ یہ بھی دیکھ لوں گا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔"

ڈاکو ایک ہفتے کے بعد اپنے ہتھیار سے لیس پھر فوجی کے گھر آیا۔ فوجی آ چکا تھا اور اسے سارے ماجرے کا پتہ لگ گیا تھا۔ ڈاکو نے گٹھڑی میں پھر سارا مال باندھا اور آنگن میں کھڑے ہو کر فوجی کو جو سو رہا تھا للکارا کہ مال لے جا رہا ہوں، ہمت ہے تو روک لے۔ فوجی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا اور اپنی لاٹھی اٹھا کر باہر آ گیا۔ اس نے ڈاکو کو کہا کہ وہ گٹھڑی وہیں رکھ کر فوراً گھر سے باہر نکل جائے۔ اس پر ڈاکو زور سے ہنسا اور بولا کہ آج تک کسی مائی کے لال میں مجھے روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنی جوان بیوی پر رحم کھا اور مجھ سے ٹکر نہ لے۔ مگر فوجی نے اسے حقارت سے دیکھا اور بولا کہ تیرے جیسے ڈاکو میں کئی دیکھ چکا ہوں۔ اس پر ڈاکو کو طیش آ گیا اور اس نے اٹھ کر اپنے لوہے کے ڈنڈے سے فوجی پر ایک بھرپور وار کیا۔ فوجی نے کمال پھرتی سے اس وار کو بچایا۔ ڈاکو نے پھر زیادہ غصّے سے وار کیا مگر یہ وار بھی خالی گیا۔ فوجی بولا کہ دو وار تیرے ہو چکے ہیں، ایک وار اب میرا بھی ہو جائے۔ یہ فوجی لٹھ بازی کا ماہر تھا۔ اس نے لاٹھی کا ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ ڈاکو چشم زدن میں بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔ ان دنوں لاٹھی کے بارے میں یہ کہاوت مشہور تھی۔

لاٹھی میں گن بہت ہیں سدا رکھیے سنگ
گہری ندی، نالہ، جہاں تہاں بچاوت انگ
تہاں بچاوت انگ، جھپٹے کتے کو مارے
دشمن دوا گیر ہوتے ہوں کو جھاڑے
کہے گردھر کبیرائے بات باندھو یہ گانٹھی
سب ہتھیار کو چھوڑ و، ہاتھ میں راکھو لاٹھی

لاٹھی کی بھی کئی قسمیں ہوتی تھیں مگر لکٹی اور لٹھ لوہ بند زیادہ مقبول تھے۔ تیل پلا کر اور مسالے لگا کر تیار کی ہوئی لاٹھی کو لکٹی کہتے تھے اور ایسا لٹھ جس کے سروں پر لوہے کے لٹو چڑھے ہوں اور پوروں پر تار کی بندش کی ہوئی ہو، لٹھ لوہ بند کہلاتا تھا۔ لٹھ لوہ بند کے ایک وار سے آدمی ہلاک ہو سکتا تھا۔

میرزا سنگی بیگ خاندانِ میر حامد علی خاں کے مشہور پھکیت تھے۔ نواب مرزا داغ نے فنِ پھکیتی اور علی مدد ان سے ہی سیکھی تھی۔ ان جیسی ونھپکی، اور کوئی نہیں مار سکتا تھا۔

گھوڑ سواری میں مغلوں اور راجپوتوں کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ دلی میں مغل گھوڑ سواری کو باقاعدہ سیکھتا تھا اور ان پر طرح طرح کے کرتب دکھانے کا رواج بھی تھا۔ سجن خاں اور بندو خاں شاہی چابک سوار تھے۔ قلعے میں بہت سے شہزادے ان کے شاگرد تھے۔

اگرچہ تیر اندازی عوام میں زیادہ مقبول نہیں تھا مگر پھر بھی دلی میں اس کے کئی استاد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بادشاہ اور دربار کے امرا اس کا شوق رکھتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو تو تیر اندازی میں کافی مہارت حاصل تھی۔ بادشاہ جوانی میں جب وہ ولیعہد تھے تیر اندازی کی مشق باقاعدہ کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے دیوانِ خاص میں ایک جرِ ثقیل لگا رکھی تھی۔ اس سے کئی من چنوں کی بھری پوٹ نیچے لٹکا دی جاتی تھی۔ بادشاہ اس پر نہ صرف خود مشق کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی سکھاتے تھے۔ ایک اطلاع کے مطابق

مرزا محمد قادر بخش نے تیر اندازی میں بادشاہ کی باقاعدہ شاگردی اختیار کرلی تھی۔ بعد میں وہ خود تیر اندازی کے ایک بڑے ماہر بن گئے تھے۔

دلی کے یہ سب پرانے فنون یا مقبولِ عام ہنر اب مٹ سے گئے ہیں۔ تیر اندازی تو اب ایک بین الاقوامی کھیل ہے مگر اس کی نوعیت بدل گئی ہے اور وہ تیر کمان بھی اب کہاں۔ شاید ان فنون کو اس وقت کی دلی کی زندگی راس آئی تھی جب فرصت بھی تھی اور بغیر جھنجھٹ والی فارغ البالی بھی اور انسان کا ہاتھ کل پرزے سے بہتر تھا۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ ایک دو ہنر میلے تماشوں میں کبھی کبھی دکھائی دے جاتے ہیں مگر وہ بھی کے دن کے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ صرف تغیر کو دوام حاصل ہے۔

جادو، ٹونا

توہم پرستی انسانی فطرت میں ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ انسانی زندگی اچھے اور بُرے واقعات کا مجموعہ ہے اور جب کوئی بری بات ہوتی ہے تو انسان کو وہم ہو جاتا ہے کہ ایسا اس لیے ہوا ہے کیونکہ فلاں بات ہو گئی تھی۔ اس لیے کئی باتیں برے واقعات سے وابستہ ہو گئیں اور کئی نشانات خوش بختی اور کامیابی کا پیش خیمہ سمجھے جانے لگے۔ پھر قسمت بدلنے اور کامیابی حاصل کرنے اور مخالف کو زک پہنچانے کے لیے جادو ٹونے کا رواج شروع ہو گیا۔ جادو ٹونا بھی اوہام پرستی کی ہی پیداوار ہے۔ کسی خوبصورت چیز کو "نظر لگ جانے" کا وہم بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود انسان۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی بچوں کی "نظر" اتاری جاتی ہے اور انہیں اور خوبصورت عورتوں کو "نظر بد" سے بچانے کے لیے کالا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ بچوں کی نظر اتارنے کے لیے مرچیں پھونکی جاتی ہیں۔

توہم پرستی کے لیے ایک اعتقاد یہ بھی ذمے دار ہے کہ انسان کی زندگی پر اور اس کی کامیابی اور ناکامیابی میں ستاروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ستاروں کی موجودگی اور سیّاروں کی گردش ہماری قسمت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس اعتقاد نے نجومی اور جوتشی پیدا کیے جو انسان کا ہاتھ اور جنم پتری دیکھ کر اس کی زندگی کے حالات کی پیش گوئی کرنے کا دعویٰ کرنے لگے۔ کونسا انسان اپنی زندگی کے آنے والے واقعات

کے بارے میں نہیں جاننا چاہے گا۔ اس لیے نجومیوں کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔

محمد شاہ بادشاہ کے دربار سے بہت سے نجومی وابستہ تھے اور اس نے نجومیوں کو جاگیریں بھی عطا کی تھیں۔ مشیر خاں، منجم خاں اور مرزا محسن اس کے دربار کے مشہور نجومی تھے۔ دلی کے مشہور بازار چاندنی چوک میں نجومیوں کی ٹولیاں اپنی دکانیں سجائے بیٹھی رہتی تھیں۔ درگاہ قلی خاں اس کا آنکھوں دیکھا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ــــ

"آگے بڑھیے تو آپ کو رمّالوں، نجومیوں اور جوتشیوں کی جماعت کا جال بچھا ہوا نظر آئے گا، جن کے پھندے سے نکل جانا مشکل بات ہے۔ یہاں خلقت اپنی تقدیر کے نوشتے کو معلوم کرنے کے لیے بیٹھی ہے۔ کوئی ہے جو خوش آئند واقعات سن کر مسرور ہو رہا ہے اور کوئی ہے جو آئندہ کی پریشانیوں کو سن کر متفکر ہے۔ نجومیوں کی آمدنی اس بازار میں بہت کافی ہوتی ہے۔" (مرقعِ دلی)

میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے نجومیوں کو طلب کیا جاتا تھا اور ان کی بتائی ہوئی مبارک گھڑی میں کوچ کا نقارہ بجتا تھا۔ آہستہ آہستہ ہر اہم کام کو شروع کرنے سے پہلے نجومیوں اور جوتشیوں سے صلاح کرنے لگے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس فن میں مہارت رکھتی تھیں۔ مشہور تاریخ داں جیمس فاربیس نے لکھا ہے کہ ایسی عورتیں دلی میں بھی کافی تعداد میں تھیں اور جوان عاشق مزاج ان سے دریافت کرتے تھے کہ ان کو اپنی محبوبہ مل جائے گی یا نہیں۔ فال دیکھنے کا بھی عام رواج تھا۔ منوچی نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب بھی اس پر عقیدہ رکھتا تھا اور دیوانِ حافظ سے فال دیکھا کرتا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے ایک موقعے پر کہا تھا ــــ "نقل مشہور است کہ آنچہ بود دزد برد و آنچہ از دزد باقی ماند رمّال گرفت۔" جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نجومیوں کی آمدنی کافی تھی۔

جادو ٹونے کی ابتدا کب ہوئی، یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا کافی ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی جادو ٹونے کا رواج عام تھا۔ محمد فرخ سیر

بادشاہ کے عہد میں تقی نامی بھگتیہ ایک مشہور جادوگر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد امین خاں وزیر محمد شاہ کا انتقال جادو کے اثر سے ہوا تھا۔ طباطبائی نے اس واقعے کا ذکر یوں کیا ہے کہ محمد فرخ سیر بادشاہ محمد حسین جادوگر کی خدمت میں ایک عقیدت مند سائل کی طرح پیش ہوتا تھا۔ اس جادوگر کو نمود وانمود بھی کہتے تھے اور وہ بڑی طاقت حاصل کر چکا تھا۔ محمد امین خاں نے اس کو گرفتار کرنے کے لیے سپاہی بھیجے۔ کہتے ہیں کہ ابھی سپاہی اس کے تکیئے پر ہی تھے کہ نمود وانمود نے محمد امین خاں پر کوئی جادو کر دیا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب سپاہیوں کو خبر ملی کہ وزیر کی حالت نازک ہو گئی ہے تو وہ لوٹ گئے۔ وزیر کے لڑکے نے نمود وانمود کی خدمت میں نذر بھیجی اور تعویز کی درخواست کی مگر نمود وانمود نے جواب دیا۔ "تیر از شست جستہ وآب از جوی رفتہ باز نمی آید" آخر میں محمد امین خاں اس جادو کے اثر سے فوت ہو گیا۔

دیوالی کے تہوار کے زمانے میں عام طور پر جادو اور ٹونے ٹوٹکوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ مرزا قتیل نے "ہفت تماشہ" میں لکھا ہے کہ "اس زمانے میں لیموں بھی بچوں کے گلے میں ڈالتے تھے۔ یہ عمل اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ ان دنوں اور راتوں کو اکثر جادوگر اپنے دشمنوں کے لیے جادو ٹونا کرتے تھے اور مختلف قسم کی چیزیں مثلاً کیڑا، یا مسور کی دال، زیرہ اور زرد چوب یا اسی قبیل کی کچھ چیزیں یا آٹے کا ایک پتلا بناتے تھے جسے بزعم خود اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ پھر اسے رات کی تاریکی میں کسی گلی کے کونے میں یا سرِ بازار گاڑ دیتے تھے تاکہ دشمن وہاں سے گزرے تو بلا میں مبتلا ہو جائے۔ یا کسی مرض میں گرفتار ہو جاتے۔"

رشتے کی بات چیت شروع ہونے سے پہلے، دلی کے مسلمان گھرانوں میں بھی، لڑکے اور لڑکی کا باپ شگون نکلواتا تھا۔ میر حسن دہلوی کے مطابق کاغذ کے کئی پرزے کاٹے جاتے تھے اور ان میں سے آدھے پرزوں پر "ہونا" اور باقی نصف پر "نہ ہونا" لکھ دیا جاتا تھا۔ پھر ان تمام پرزوں کو خلط ملط کر کے جانماز کے نیچے رکھ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح بابا فرید کے پوڑہ کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ شادی میں بابا فرید کا پوڑہ نہ ہو تو

ممکن نہیں کہ شادی خیر و عافیت سے ہو جائے، یہ عام لوگوں کا عقیدہ تھا۔

روپے پیسے نچھاور کرنا بھی نظرِ بد سے بچانے اور غیر متوقع مصائب سے محفوظ رکھنے کا رواج تھا۔ جب نئے بادشاہ کی تخت نشینی کی رسومات ادا ہوتی تھیں یا وہ کسی مہم کو فتح کر کے خیر و عافیت سے واپس آتا تھا تو اس موقع پر نچھاور کر کے رقم غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے جشن کے موقع پر بھی یہ رسم کی گئی تھی۔ "مآثر عالمگیری" میں لکھا ہے ـــ "بے شمار روپے اور اشرفیاں بادشاہ پر نچھاور کی گئیں اور لوگوں کو انعام واکرام عطا ہوا۔" سید عبداللہ خاں کے مقابلے میں جب محمد شاہ بادشاہ شاہی محل میں داخل ہوا تو مستورات نے دروازے پر اس کا خیر مقدم کیا، مبارکباد دی اور روپوں سے بھری تھالیاں اس کے سر پر وار کر کے روپیہ غریبوں میں بانٹ دیا گیا۔

پرانے وقتوں میں "نظرِ بد" کو بندوق کی گولی سے بھی زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ گھر میں کوئی بچہ اچانک بیمار پڑ جاتا تو گھر کی بڑی بوڑھیاں فوراً مرچیں بھون کر آگ میں جھونک دیتیں، نالی پر مٹی کا دیا جلاتیں، گائے کو یا کالے کتے کو روٹی کھلاتیں۔ مسلمان عورتیں گنڈا تعویز کرتیں، کسی بزرگ کے مزار پر نذر چڑھاتیں۔ توہم پرستی اس حد تک ہو گئی کہ باہر جاتے ہوئے کوئی چھینک پڑتا تو واپس آجاتے، کالی بلی یا کوئی بھی بلی راستہ کاٹ جاتی تو اسے منحوس سمجھا جاتا اور یہ یقین کیا جاتا کہ کامیابی تو در کنار کوئی مصیبت آنے والی ہے اور تو اور، کوئی بڑھیا بھی سامنے سے آتی نظر آجاتی تو اسے بدشگنی سمجھا جاتا۔

"کالے جادو" کا بڑا چلن تھا مگر عموماً اَن پڑھ اور جاہل گھرانوں میں، اگرچہ بعض اوقات اونچے گھرانوں کے لوگ بھی اس پر عمل کرتے تھے۔ کچھ چالاک آدمی لوگوں کو بیوقوف بنانے اور پیسے کمانے کی خاطر "کالے جادو" کا دھندا کرتے تھے۔ یہ لوگ ایسا لباس پہنتے جس سے لوگ انہیں جادوگر سمجھیں۔ گلے میں کئی کئی کنٹھے اور منکوں کی مالائیں پہنتے، ڈھیلے ڈھالے لبادے پہنتے اور داڑھی اور زلفیں رکھتے۔ عموماً "کالے جادو" کا استعمال محبوبہ کو حاصل کرنے، دولت حاصل کرنے، دشمن کو ختم کرنے اور زمین جائداد کو حاصل کرنے

اور کبھی کبھی اولاد پانے اور کسی کو بس میں کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا کوئی مخصوص طریقہ نہیں تھا۔ کبھی روپے پیسے اور کوئی زیور کسی سنسان جگہ میں گڑوا دیا جاتا، کبھی رات کے سناٹے میں قبرستان میں جاکر مخصوص جگہ پر کئی دن تک چراغ جلانا اور زمین کھود کر روپے رکھنے پڑتے، کبھی کسی اُلّو یا دوسرے پرندے کو ذبح کرکے اس کے خون میں کسی کپڑے کو بھگو کر ایک زیور کے ساتھ زمین میں گاڑنا پڑتا تھا اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں کی جاتیں تھیں۔ یہ توہم پرستی کی بدترین شکل تھی جس سے کامیابی تو کجا بعض دفعہ بڑا نقصان بھی ہو جاتا تھا۔

"تقویۃ الایمان" میں لکھا ہے کہ مسلمانوں میں صفر کے مہینے میں تیرہ دن منحوس تصور کیے جاتے تھے۔ منحوس دنوں میں منگل اور سنیچر بھی شامل تھے۔ سر پر چوٹی رکھنا بھی اس وقت کی توہم پرستی تھی۔ شاہ مدار یا کسی دوسرے بزرگ کے نام کی چوٹی بچوں کے سر پر رکھی جاتی تھی۔ یہ عمل بطور منّت ہوتا تھا۔ جب منّت پوری ہو جاتی تھی تو اس بچے کو لے کر اس بزرگ کے مزار پر جاتے تھے اور وہاں وہ چوٹی ترشوالی جاتی تھی۔ اسی طرح کسی بزرگ کے نام کی بدھی (ریشم کی بُنی ہوئی ڈوری) بچوں کے گلے میں اور پیروں میں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں جو بڑے پیر کے نام کی ہوتی تھیں۔ جن دنوں چیچک کی وبا پھیلتی تھی تو مسلمانوں کے گھروں میں بھی طرح طرح کے ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے تھے۔ مثلاً مالن پھول لے کر گھر میں آتی تھی۔ ان دنوں گوشت نہیں پکتا تھا۔ اس موقعے پر عام طور پر ہندوؤں کی طرح سیتلا دیوی کی پوجا کی جاتی تھی۔ مظہر جان جاناں "معمولاتِ مظہری" میں لکھتے ہیں ؎

"در وقتِ عروض مرض جدری (چیچک) کہ بزبانِ ہندی سیتلا مصروف است ومشہور است، کم زنے باشد کہ از دقائقِ ایں شرک خالی بود و بہ رسمے از رسومِ آں ننماید۔"

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ایک صاحبِ قدرت عورت ہے جس کے اختیار میں بچوں کی موت و حیات ہے۔ اس کا نام ادب سے لیتے تھے بلکہ اسے ماتا کہتے تھے۔ اس کی کمی کو اس کے روٹھنے سے اور کثرت کو عنایتِ مادرانہ سے تعبیر کرتے تھے۔ دربانوں اور

باغبانوں کے ساتھ بڑی توقیر سے پیش آتے تھے کیونکہ ان کے بارے میں یہ خیال تھا کہ انھیں ماتا کا قرب حاصل تھا۔ جب تک چیچک بچے پر "مہربان" ہوتی اس وقت تک گھر میں مسور اور گیہوں کی روٹی کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں پکائی جاتی تھی۔

بلاؤں سے بچانے کے لیے بچوں کے گلے میں تانبے یا چاندی کی ہنسلی ڈالی جاتی تھی۔ اسی غرض سے بعض دفعہ شیر کے ناخن دھاگے میں باندھ کر گلے میں ڈالے جاتے تھے۔ بچوں کو ولادت کے دن سے ہی تعویز گنڈوں سے مسلح کر دیا جاتا تھا۔ لوگوں کو تعویز گنڈوں پر بے حد عقیدہ تھا اور ہر بلا اور مرض کے دفع کے لیے تعویز ملتا تھا مثلاً تعویز برائے طفل، تعویز برائے زچہ، تعویز برائے دفع تپ لرزہ، تعویز برائے دفعِ روگ چشم وغیرہ۔

ارواحِ خبیثہ کے اثرات پر عقیدہ رکھنے کا جتنا رواج ہندوستان میں پایا جاتا تھا، شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ہو۔ اہلیہ میر حسن علی لکھتی ہیں ــــ

> "یہاں علما اور جہلا دونوں بعید از قواعدِ طبی، ارواح کے اثر انداز ہونے پر اتنا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کسی کو دورہ پڑ جائے تو ناظرین کو اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ اس مریض پر کسی ناپاک روح کا اثر ہے۔
>
> اگر اچانک کوئی بیمار پڑ جائے اور ڈاکٹر مرض کی تشخیص میں ناکام رہے تو یہی خیال غالب آتا ہے کہ مریض پر کوئی بھوت پریت چڑھ آیا ہے۔"

"ہفت تماشہ" میں لکھا ہے کہ عورتوں کے عقیدے کے مطابق "شیخ سدّو" اور سات "عورتیں" معاملات کو بگاڑنے اور بنانے کی قدرت رکھتی ہیں اور شیخ سدو کی روح عورتوں میں داخل ہو کر بگاڑ کرتی ہے۔ اس کی خلاصی کے لیے "بیٹھک" ہوتی تھی۔ تمام رات عورتیں گاتی بجاتی رہتی تھیں، مٹھائیاں تقسیم ہوتی تھیں اور بکرے کی قربانی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ سات "عورتوں" کے نام یہ تھے ــــ لال پری، سبز پری، سیاہ پری، زرد پری، آسمان پری، دریا پری، اور نور پری۔

جس طرح ہندوؤں میں کسی خوشی کے موقعے پر ست نارائن کی کتھا کی جاتی تھی، اسی طرح مسلمانوں میں منت کے طور پر "سیدہ" کی کہانی کا رواج ہو گیا تھا اور

بڑی دل چسپ بات یہ تھی کہ ست نارائن کی کتھا اور جناب سیدہ کی کہانی کے بعض اجزا بالکل یکساں تھے۔

اُن دنوں دلی میں فقیروں اور درویشوں کی بھرمار تھی۔ جھاڑ پھونک، جادو ٹونے اور جنتر منتر سے علاج کرنے والوں کا بڑا زور تھا اور وہ منھ مانگے دام مانگتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مرادیں پوری کرا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ مردہ "روحوں" سے ملاقات بھی کروا دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جنوں اور بھوتوں کو اپنے بس میں کر سکتے ہیں۔ جن اور بھوت، ان کے قول کے مطابق، ان کے اشاروں پر ناچتے تھے اور وہ جو کام چاہتے ان سے کروا لیتے تھے۔ شہر کے لوگ اور قلعے والے سب ہی ان کے پیچھے دیوانے تھے۔ یہ لوگ تعویز، گنڈے، انگوٹھی، چھلّے دیکر بڑی رقمیں بٹورتے تھے۔ سب لوگ ان سے ڈرتے تھے اور ان کی کرامتوں اور عجیب وغریب طاقتوں پر یقین رکھتے تھے۔ لونڈیاں، باندیاں، بیگمیں اور شہزادیاں، امیر، وزیر، شہزادے اور بادشاہ تک ان کی مٹھی میں تھے۔ ان لوگوں نے دلی کے عوام میں یہ بات بھی بٹھا دی تھی کہ جس گھر، حویلی یا مکان میں چالیس دن تک چراغ نہیں جلے گا، وہ جنوں اور بھوتوں کا مسکن ہو جائے گا۔

مغل شہزادہ دارہ شکوہ بھی توہمات میں یقین رکھتا تھا۔ ایک موقعے پر دارہ شکوہ نے اپنے محل میں کچھ موسیقاروں اور جادوگروں کو بلوایا ہوا تھا جو اپنے فن سے شاہی افراد کو محظوظ کر رہے تھے۔ جادوگروں میں شیخ نذیر بھی تھا جو اپنی کرامات کے لیے دور دور تک مشہور تھا۔ اچانک اس پر ایک عجیب مستی طاری ہو گئی اور اس نے ایک گلاس پانی طلب کیا۔ شیخ نے تھوڑا سا پانی پیا اور گلاس دوسروں کے آگے کر دیا۔ حاضرین میں سے جس نے بھی اسے پیا انھوں نے بتایا کہ وہ خالص شہد تھا۔ شاہی افراد میں بادشاہ سلامت بھی موجود تھے اور وہ اس معجزے پر حیران رہ گئے۔ شہزادے دارا شکوہ اور قاضی محمد اسلام نے بادشاہ کو بتایا کہ آگرے میں شیخ نے ان کی موجودگی میں ایک موقعے پر پانی کے ایک برتن کو اور ایک دوسرے موقعے پر ایک رومال کو ایک پھڑپھڑاتے ہوئے کبوتر میں تبدیل کر دیا تھا۔ انھوں نے جہاں پناہ کو یہ

بھی بتایا کہ ایک مرتبہ شیخ نے ان کے ہاتھ پر گھاس کی ایک پتی رکھی جو ایک کیڑا بن کر ہاتھ سے اتر گئی۔

مجموعۂ نغز اور وقائع عالم شاہی کے حوالے سے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ مرزا جہاندار شاہ دہلی سے رات کو چھپ کر نکلے تو جینا بیگم (نواب قتلق سلطان بیگم، ولی عہد کی شریکِ حیات، شریک مشورہ تھیں مگر ان کے ساتھ جا نہ سکیں۔ پھر شاہ عالم ثانی نے نہ جانے دیا اور ان کو قلعہ میں بند کر لیا۔ یہ اپنے شوہر سے بے حد مانوس تھیں۔ کہتی تھیں — "لاکھوں صرف ہو جائیں مگر کسی طرح ان کے پاس چلی جاؤں۔" عورتیں تعویز گنڈوں کو زیادہ مانتی تھیں۔ اس زمانے میں ایک مکّار فقیر دہلی میں آیا ہوا تھا۔ بیگم نے اس سے رجوع کیا۔ اس نے کہا — "آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آپ کو موکلوں کے ہاتھ لکھنؤ بھجوا دونگا۔" بیگم بے چاری کہنے میں آگئیں۔ وہ کمبخت سال بھر تک انھیں بہلاتا رہا اور ہزاروں لاکھوں روپے اینٹھ لیے۔ ایک دن تعویز بھیجا اور کہا کہ "آج آدھی رات گئے یہ عمل پڑھ کے بالا خانے پر پلنگ بچھا کر اور زیور وغیرہ قیمتی سامان بقدر گنجائش پلنگ پر رکھ کر بیٹھ جائیے اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کس طرح موکل آپ کو منزل مقصود پر پہنچاتے ہیں۔" رات ہوئی تو بیگم نے اس مکّار کے کہنے پر عمل کیا۔ خدا جانے بیگم کے وہم کا اثر تھا یا کیا کہ انھیں گز بھر کے قریب پلنگ اٹھتا ہوا معلوم ہوا مگر پھر نیچے آگیا اور دوبارہ نہ ہلا۔ صبح کو یہ ماجرا فقیر سے کہلوایا تو اس نے کہا۔ "شاید آپ نے ہدایت پر پورا عمل نہیں کیا۔ خیر میں آپ کی خاطر ایک چلّہ اور کھینچوں گا اور آپ کو لکھنؤ بھیج کر رہونگا۔ اس کے بعد دس دن کی اجازت لے کر ایسا غائب ہوا کہ کہیں کھوج نہ ملی۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک اور شاید آج بھی، مسلمان اور ہندو گھروں میں بچوں کے اس طرح کے نام رکھ دئے جاتے تھے —

پگّا خاں، پونگا میاں، بونگے مرزا، مرزا گونگے، ٹکا میاں، چھنگو، کوڑا مل، گھسیٹا، کانا، بدھو، کلو، کٹرے خاں، چتکبرے خاں، بھینگے میاں، وغیرہ وغیرہ۔

ان ناموں کے رکھنے کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ ارواح خبیثہ یہ سمجھ کر کہ یہ بچے کسی کام کے نہیں ہیں، انہیں تنگ نہ کریں۔

تیرہ کا عدد ہمیشہ خراب سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس سے بچتے تھے۔ تین کے عدد کو بھی لوگ بد شگنی کی علامت سمجھتے تھے۔ کسی کو تین چیزیں دینا برا سمجھتے تھے۔ گھر سے اگر کسی کام کے لیے لوگ نکلتے اور ان کی تعداد ضرورت کے مطابق تین بنتی تو اسے گھٹا کر دو یا بڑھا کر چار کر لیتے۔ مغربی ملکوں میں بھی تیرہ کے عدد کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔ مگر کچھ لوگ تیرہ کے عدد کو خوش بختی کا نشان بھی مانتے تھے۔

اس وقت کے جادو ٹونے کے دور کی کچھ مقبول اصطلاحیں یہ تھیں۔

۱۔ سیانا یا اوجھا یا کامل۔ بھوت اور آسیب اتارنے والا

۲۔ سنکٹ ۔ بھوت پریت سے متاثر، آسیب زدہ ہونے کی کیفیت

۳۔ ہنومان۔ سنکٹ ہرنا (ہنومان کو سنکٹ موچن اِن ہی معنوں میں کہا جاتا ہے)

۴۔ یم اور بھیروں۔ بھوت پریت اتارنے والے دیوتا

۵۔ ٹاپر۔ کالا جادو

۶۔ چھڑی یا ڈنڈا۔ درخت سے توڑی ہوئی موٹی شاخ جس سے اوجھا یا کامل آسیب کو مار مار کر مریض کے جسم میں سے نکالتا ہے۔

توہمات کی وجہ کچھ بھی ہو، یہ انسانی سرشت کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ توہم پرستی اور جادو ٹونا صرف مشرقی ممالک میں ہی نہیں بلکہ اعلیٰ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں بھی ہیں۔ آج جب سائنس اور ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے تب بھی انسان کی اوہام پرستی ختم نہیں ہوئی ہے۔ شاید اس کی اصل وجہ وہ مافوق الفطرت قوتیں ہیں جن کی وجہ سائنس بھی نہیں پیش کر سکتی۔ وقتاً فوقتاً انسانی زندگی میں حیران کن، عجیب و غریب، عقل سے بعید واقعات ہوتے ہیں جن کی بظاہر کوئی وجہ، جواز نہیں ہوتی۔ پھر انسان میں خوف کا مادہ ہے اور وہ اپنے رشتے داروں، عزیزوں وغیرہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ناگہانی بلا اس کے صبر و سکون کو چھین لے۔ اور جب اسے کوئی تدبیر یا علاج نہیں سوجھتا تو وہ دوسرے سہارے ڈھونڈتا ہے اور یہی تلاش بلکہ بے بسی توہم پرستی اور جادو ٹونے کو جنم دیتی ہے۔



رسی کا کھیل

چھو منتر!

ہندوستان میں قدیم زمانے سے بازی گری کے فن کا رواج رہا ہے۔ یہاں مختلف قسم کے بازی گر، جادوگر، شعبدہ باز، مداری اور نٹ پائے جاتے تھے۔ نٹوں کا ذکر تو منو نے بھی کیا ہے۔ اس کے مطابق یہ لوگ کشتری فرقے کی ایک شاخ تھے۔ نٹ ایک سنسکرت لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "ڈرامہ کرنے والا"۔ ہندوستان کے نٹ کھڑی ہوئی لکڑی اور تنی ہوئی ڈوریوں پر کرتب دکھاتے تھے۔ ان کی عورتیں نٹنی کہلاتی تھیں اور جب ان کے مرد اپنا فن دکھاتے تھے تو نٹنیاں گانا گاتی اور ڈھولک بجاتی تھیں۔
البرونی نے اس پیشے کے لوگوں کو ایک مستقل اور الگ ذات مانا ہے۔ مرزا قتیل مصنف ہفت تماشہ لکھتے ہیں ــ "نٹ ایک فرقہ ہے۔ یہ سب ہندو مذہب کے ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اب کچھ لوگ مسلمان بھی ہوگئے ہیں۔" سدھائے ہوئے جانوروں کی مدد سے تماشہ دکھانے والوں کو مداری کہتے تھے۔ مگر سانپوں کو پالنے اور ان سے کھیل تماشہ دکھانے والوں کو آج ہی کی طرح اس وقت بھی سپیرے کہا جاتا تھا۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد اس فرقے کے لوگوں کے لیے 'بازی گر' اور اس فن کے لیے 'بازی گری' کے الفاظ کا استعمال شروع ہوگیا۔ یہ دونوں الفاظ فارسی کے ہیں۔ ابوالفضل کے مطابق یہ لوگ رسی پر کھیل کرتے تھے اور عجیب عجیب تماشے دکھاتے تھے۔ مجیرہ اور ڈھولک ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ

لوگ منتر کے اثر سے تماشائیوں کی نظر باندھ دیتے تھے۔ چنانچہ کبھی کبھی ایسا نظر آتا تھا کہ کھیل کرنے والے کا بند بند جدا ہے مگر کھیل کے بعد وہ پھر اپنی اصل حالت پر آجاتے ہیں اور کبھی ایک بڑا پتھر ان کے کاندھے پر رکھا ہوا نظر آتا تھا۔

دلی قدیم زمانے سے بازیگروں کا مرکز رہی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ دلی حکومت کا مرکز تھی اور دوسری یہ کہ دلی کے لوگ کھیل تماشے کے شوقین تھے اور بازی گروں کی قدر کرتے تھے جس سے بازیگروں کو خاطر خواہ آمدنی ہوجاتی تھی۔ سلاطینِ دہلی کے عہد میں بھی مداریوں کے دستوں کا ذکر ملتا ہے۔ بابر بادشاہ نے بھی ہندوستان کے مداریوں اور نٹوں کی بڑی تعریف کی ہے کیونکہ ہندوستان کے مداریوں اور نٹوں نے اسے ایسے ایسے کرتب دکھائے تھے جو اس کے ملک کے مداریوں میں مفقود تھے۔ ہوا میں گیند پھینک کر، تلوار نگل کر اور اپنے نتھنوں میں چاقو گھسیڑ کر وہ لوگ ایسے ایسے کرتب دکھاتے تھے کہ بابر دنگ رہ جاتے تھے۔ کچھ قلابازوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جو رسی پر اپنے کرتب دکھاتے تھے۔ بابر اور ہمایوں کے زمانے میں اور بعد میں اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں بھی تمام بازی گر اور شعبدہ باز، جن میں دلی سے باہر کے بازی گر بھی شامل ہوتے تھے، دہلی کے شاہی محلسرائے کے قریب بڑی تعداد میں جمع ہوجاتے تھے اور اپنے کرتب دکھاتے تھے۔ کئی بازی گروں کی عورتیں جنھیں بھان متی کہتے تھے، سحر و فسوں کے کرشمے بھی دکھاتی تھیں۔

دربارِ مغلیہ سے نٹوں کا ایک گروہ منسلک رہتا تھا۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے دوسرے علاقوں سے بھی نٹ آکر دربار میں آکر اپنے کرتب پیش کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نٹ اپنے پیروں میں شمشیریں باندھ کر بھی بانسوں پر چڑھتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے:۔

اشک یوں تارِ مژہ پر ہے رواں اے لختِ دل
جوں چڑھے نٹ باندھ کر شمشیر دونوں پاؤں میں

جہانگیر کو بازی گروں کے تماشے دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ دور دور سے بازی گر اور

شعبدے باز اس کے دربار میں حاضر ہوتے اور اپنے کرشمے دکھاتے تھے جن میں رسّی کا کھیل نہایت حیرت انگیز ہوتا تھا۔ رسی کا کھیل دکھانے والے سو سال پہلے تک ہندوستان میں موجود تھے۔ سبحان رائے بھنڈاری اور دیگر مورخین نے جہانگیر کے دربار کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ بنگال کا ایک بازی گر ایک بندر لے کر دربار میں حاضر ہوا۔ اس بندر نے بادشاہ کے سامنے حیرت انگیز داؤ پیچ دکھائے۔ بعدازاں بادشاہ نے اپنی انگوٹھی اتاری اور ایک لڑکے کو دیدی تاکہ وہ اسے چھپالے۔ اس بندر نے فوراً اس لڑکے کا دامن پکڑلیا جس کے پاس انگوٹھی تھی۔ مغلوں کے عہد کے ہی کئی اور تماشوں کا ذکر ہے جنھیں سن کر یا پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اس زمانے کے بازیگروں کے فن اور ان کی مشق کا پتہ لگتا ہے۔

ایک رسی کے کھیل کا حال بھی سن لیجئے۔ آج سے سو سال پہلے کی بات ہے۔ ایک رئیس کی حویلی پر بازیگروں کا ایک گروہ آیا اور انھوں نے اپنے کرتب دکھانے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ لوگ کہیں باہر سے آئے تھے اور ان کے پاس رہنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ رئیس نے اپنے باغ کے ایک حصے میں جہاں بیریوں کا جھنڈ تھا ٹھہرنے کی اجازت دیدی اور تماشے کا دن مقرر ہوگیا۔ ابھی تین چار دن باقی تھے۔ بازی گروں نے بلیاں گاڑ کر ان پر آمنے سامنے دو مچان بنالیے اور ان مچانوں پر اپنا سامان رکھ دیا اور رہنے لگے۔ ایک مچان سے دوسری مچان پر جانے کے لیے انھوں نے مچانوں کے بیچ میں دو پتلی رسیاں باندھ دی تھیں جو دور سے نظر بھی نہیں آتی تھیں۔ بازی گر دن بھر ان رسیوں پر چل کر ایک مچان سے دوسرے مچان میں جاتے رہتے تھے اور ان کے بچے بھی دن بھر ان رسیوں پر دوڑتے بھاگتے رہتے تھے۔ دور سے دیکھنے والوں کو ایسا لگتا کہ یہ لوگ خلا میں ایسے چل رہے ہیں جیسے زمین پر چل رہے ہوں۔ شہر والوں کے لیے یہ بھی ایک تماشہ ہوگیا۔ تماشے کے دن اس رئیس کے باغ میں (اس رئیس کا نام رائے تلسی دھر تھا) ہزاروں تماشائی اکٹھے ہوگئے۔ کھلے میدان کے بیچ میں بازی گر جمع ہوگئے اور زور زور سے ڈھول اور مجیرے بجانے لگے۔ سب سے پہلے ایک بازی گر خالی گملا لایا۔ اسے ٹھوک

بجاکر، الٹ پلٹ کر لوگوں کو دکھایا تاکہ سب کو اطمینان ہو جائے کہ گملا خالی ہے۔ پھر ایک چھوٹا سا ڈنڈا گملے پر گھما گھما کر منتر پڑھا۔ پھر گملے پر ایک کپڑا ڈھک دیا اور منھ ہی منھ میں کوئی منتر پڑھنے لگا۔ جو منتر ختم ہوا تو اس نے زور سے کپڑا کھینچ لیا اور لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ گملے میں ایک آم کا پودا لگا ہوا تھا اور اس میں آم بھی لگے ہوئے تھے۔ بازیگر پھل لگے پودے کو لے کر لالہ رائے تلسی دھر کے پاس پہنچا اور انہیں آم توڑ کر دے دیا۔ لالہ جی نے اسی وقت آم کاٹ کر اپنے دوستوں کو کھلایا۔

اس کے بعد ان بازیگروں نے ایک آدمی کو ایک چھوٹے سے خیمے میں بند کر کے چاروں طرف سے تلواریں گھونپ دیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیمے میں بند آدمی کا بدن تلواروں سے چھلنی ہو گیا ہو گا اور وہ زندہ کیا بچے گا۔ لیکن بازی گر نے خیمے کا ایک سرا اٹھا کر منتر پڑھا اور اس آدمی کو آواز دی۔ آواز دیتے ہی وہ آدمی خیمے سے جیتا جاگتا باہر آگیا اور اچھلتا کودتا تماشائیوں کے بیچ میں سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں بازی گر ایک پرات لے آئے۔ اس کے چاروں طرف کھڑی تلواریں باندھ دی گئیں۔ تلواروں کی تیز دھار والی نوکیں آمنے سامنے تھیں۔ کچھ دیر بعد دس بارہ برس کی ایک لڑکی آئی۔ اس نے جھک کر اپنا سر تلواروں کی نوک پر رکھا اور الٹی کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ بدن سے چپکے ہوئے تھے۔ بازی گر نے تھال لڑکی سمیت زمین سے اوپر اٹھا لیا اور چاروں طرف گھوم کر تماشائیوں کو دکھایا۔ لڑکی اپنی جگہ پر ٹکی ہوئی تھی۔ اشارہ پاتے ہی ایک جھٹکے میں کود کر باہر آگئی۔ دو چار کھیل دکھانے کے بعد بازیگروں نے تماشائیوں کی بڑھتی ہوئی بیتابی کو دیکھ کر اعلان کیا کہ صاحبان جگر تھام کر بیٹھے، اب آپ کو وہ انوکھا اور نرالا کھیل دکھایا جائے گا جس کا آپ کو دیر سے انتظار تھا۔ یہ رسّی کا کھیل تھا۔ تماشہ شروع ہوتے ہوتے جھٹپٹا سا ہو چلا تھا۔ کھلے میدان میں بازیگروں کے ڈھول، تاشوں اور مجیروں کی آوازوں سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ لیکن جونہی بازی گروں کا سردار میدان کے بیچوں بیچ آیا، ڈھولوں کی آواز بالکل مدھم ہو گئی۔ سردار بولا۔

"حضرات، آسمان میں اودھم مچا ہے، سارے جن بھوت جمع ہیں۔ بری طرح چنگھاڑ رہے ہیں اور ان کی آنکھیں زمین پر لگی ہیں۔ اگر وہ اوپر سے اتر آئے تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں۔ اس لیے آج ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ہی ان سے لڑنے کے لیے آسمان میں جائیں گے اور ان کو مار کر ہی دم لیں گے۔ مانا کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ہم ان سب سے نبٹنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے"

چار پانچ بنجارے ایک بہت بڑا موٹا سا رسّہ سر پر اٹھا کر لائے اور اسے زمین پر رکھ کر چلے گئے۔ رسّہ ایک ڈھیر کی شکل میں لپٹا ہوا تھا اور زمین سے یہ ڈھیر کوئی تین فٹ اونچا تھا۔ بازی گر نے رسّے کا ایک سرا ہاتھ میں لے کر تماشائیوں کو دکھایا اور اس پر منتر پڑھ کر بانس کی طرح آسمان کی طرف اٹھایا۔ سردار نے اعلان کیا کہ اب وہ اس رسّے پر چڑھ کر آسمان میں جائیں گے۔ اب ڈھول تیزی سے بجنا شروع ہو گیا۔ جوں جوں ڈھول کی آواز تیز ہوتی جاتی تھی رسّہ اور اوپر اٹھتا جاتا تھا یہاں تک اس کا سرا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین اور آسمان ایک رسّے سے جڑے ہوئے ہیں۔ سردار نے ایک بازی گر کو اپنی فوج کا سپاہی کہہ کر رسّے پر چڑھنے کے لیے اشارہ کیا۔ جب وہ بازیگر بلّی کی طرح سخت رسّے پر چڑھنے لگا تو اس کے پیروں میں بندھی رسیوں میں تلواریں الکا دی گئیں۔ بازی گر دونوں پیر جوڑ کر پھرتی سے رسے پر اچک اچک کر ایسے چڑھ گیا جیسے رسّہ نہیں کوئی کھمبا تھا۔ آن کی آن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ رات ہو چلی تھی۔ مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ لیکن پھر بھی اندھیرا تھا۔ یکایک اوپر سے ایک زور کی چیخ سنائی دی۔ آسمان سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ تماشائی گھبرا گئے۔ ہائے مار ڈالا، ہائے مار ڈالا کی آوازیں آئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے خون سے لتھڑا ہوا ایک ہاتھ کٹ کر نیچے گر پڑا۔ پھر ایک کٹا ہوا پاؤں گرا اور اس کے بعد تو کٹے ہوئے اعضا کی بارش سی شروع ہو گئی۔ بہت سے بنجارے روتے پیٹتے میدان میں آ کر سردار کی دہائی مانگنے لگے پھر اس بازی گر کی بیوی جو اوپر گیا تھا روتی پیٹتی، اپنے خاوند کو یاد کرتی آئی اور سردار کے

پیروں سے لپٹ کر اپنے خاوند کو بچانے کے لیے گڑگڑاتی رہی۔ سردار کو جوش آگیا اور اس نے رسے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ڈھول زور زور سے بج رہا تھا۔ بنجارے نعرے لگا رہے تھے۔ سردار بھی اوپر پہنچ کر غائب ہو گیا۔ مگر تلواروں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی چیخنے اور دھم سے گرنے کی آوازیں بھی آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوپر آسمان میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ پھر اچانک خاموشی چھا گئی اور سردار کی آواز خلا کو چیرتی ہوئی آئی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، سب جن اور بھوت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ فتح کا ڈنکا بجاؤ۔

سردار رسّے سے نیچے اتر رہا تھا تو فکرمند بنجاروں نے نیچے سے پوچھا کہ سردار ہمارا ساتھی کہاں ہے۔ سردار نے زمین پر اتر کر کہا تمہارا ساتھی صحیح سلامت ہے، وہ سامنے جو بھاری سا ٹوکرا رکھا ہے اسے اٹھا کر میرے سامنے لے آؤ۔ بنجاروں نے ٹوکرا اٹھا کر سردار کے سامنے رکھ دیا۔ سردار نے ٹوکرے کا ڈھکّن کھولا تو وہ بازیگر جو تھوڑی دیر پہلے آسمان میں چڑھا تھا اور جس کے اعضا کٹ کٹ کر نیچے میدان میں گر گئے تھے صحیح سلامت ہنستا ہوا ٹوکرے سے باہر نکل آیا۔ اس کی بیوی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور سب بنجارے خوشی سے ناچنے لگے۔ تماشائیوں کی تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ زمین اور آسمان کے بیچ بندھا رسّہ دھیرے دھیرے اترتا دکھائی دینے لگا اور سانپ کی طرح آپ ہی آپ لپٹتا ہوا نیچے ڈھیر ہو گیا۔

نٹوں کے اسی طرح کے دو اور تماشے مشہور ہیں۔ یہ تماشے یہ لوگ سینکڑوں سال سے دکھاتے آرہے ہیں اور ان کا ذکر بہت سے مورخین نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔ ایک تماشے میں بازی گر دو چھوٹے بچوں کو برابر برابر زمین پر لٹا دیتے ہیں۔ بچوں پر دو بنجارے ننگی تلواریں لیے جھک کر کھڑے ہیں۔ لوگ چھو چھو کر بچوں کو دیکھ رہے ہیں کہ اصلی ہیں اور زندہ ہیں۔ اچانک دونوں بنجارے دونوں بچوں کو پیٹ کے بل اپنی تلواروں کی نوکوں پر ہوا میں اچھالتے ہیں مگر ایک قطرہ خون کا نیچے نہیں گرتا۔ تماشائی دم بخود ہیں مگر اچانک انہیں پتہ لگتا ہے کہ یہ بازی گر تو ان بچوں کو ہلاک کرنے

والے ہیں۔ لوگ گڑگڑاتے ہیں اور عورتیں رو رو کر التجا کر رہی ہیں کہ ایسا نہ کرو۔ کئی آدمیوں اور عورتوں نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا ہے کیوں کہ وہ ایسے روح فرسا منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ لوگوں کی التجا کو دیکھتے ہوئے بازی گر مان جاتے ہیں مگر بچوں کو اپنی تلواروں پر اسی طرح اٹھائے ہوئے بھیڑ کو چیرتے ہوتے پیچھے اپنے خیمے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ دوسرا کھیل یہ ہے کہ بازیگروں نے اپنی ایک عورت کو اٹھا کر تلواروں کے ڈھیر پر پھینک دیا ہے اور اب دور کھڑے ہوئے اس پر تلواروں، خنجروں اور چاقوؤں کی بارش کر رہے ہیں مگر عورت کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔

اگرچہ آگ پر ننگے پاؤں چلنا ہندوستانی سادھوؤں اور فقیروں سے مدت مدید سے منسوب کیا جاتا رہا ہے مگر مغلیہ عہد میں بہت سے بازی گر بھی یہ عمل کرتے تھے۔ ایک لمبا چوڑا گڑھا کھود کر اسے لکڑیوں سے بھر کر ایک آگ کا بستر تیار کرتے تھے۔ کچھ بازی گر کچے کوئیلوں کی آگ بھی تیار کرتے تھے۔ بازی گر لوگوں کو دکھانے کے لیے جھوٹ موٹ کے منتر پڑھتے تھے اور پھر لوگوں کو بلاتے تھے کہ وہ آگ کا معائنہ کریں۔ کئی لوگ بازی گروں کے پاؤں بھی دیکھتے کہ ان پر کوئی نظر نہ آنے والی چیز تو نہیں پہن رکھی ہے یا کوئی دوا وغیرہ تو نہیں مل رکھی ہے جس کی وجہ سے پاؤں آگ سے محفوظ رہتے ہوں۔ مگر آگ کا سینک تو دور سے ہی آ رہا ہے اور اس کا معائنہ کوئی کیا کرے گا۔ ہاں آگے بڑھ کر کچھ لوگ بازی گروں کے پاؤں ضرور دیکھتے ہیں مگر انہیں ان میں کوئی بھی بات نظر نہیں آتی۔ بازی گر آرام سے آگ پر آتے اور جاتے مگر ان کے پاؤں ذرا سے بھی نہ جھلستے۔

اب ذرا سپیروں کی بھی سن لیجئے۔ ان کا اپنا الگ فرقہ بھی ہوتا تھا اور کچھ بازیگر بھی سپیرے بن جاتے تھے۔ سپیرے ہر دور میں مقبول رہے ہیں، خاص طور پر بچوں میں۔ فارسی کی تصنیف "اقبال السلاطین" میں ذکر ہے کہ جہانگیر کے دربار میں ایک سپیرا اور ایک بازی گر بنگال سے ہر سال آتا تھا۔ اس نٹ کا یہ کمال تھا کہ وہ جوں ہی

پھینکے ہوتے رسّے پر چڑھنے لگتا تو رسّہ نظر سے غائب ہوجاتا اور ایسا لگتا کہ نٹ ہوا میں اوپر چڑھ رہا ہے۔ سپیرا بنگال کے کالے ناگوں کی ایسی قسمیں لاتا کہ بادشاہ دنگ رہ جاتا۔ سپیرا طرح طرح کے زہریلے سانپ' جن کا زہر نکالا ہوا نہ ہوتا گلے میں ڈال لیتا اور وہ اسے ڈستے رہتے مگر سپیرے کو کچھ نہ ہوتا۔ اس سپیرے کے پاس بمنی بھی ہوتی جو چھپکلی کی طرح پاؤں سے چلتی ہے۔ دلی میں سپیرے پرانے زمانے میں گلی کوچوں میں اپنی پونگی لیے اور ٹوکریاں کپڑے میں باندھے پھرتے رہتے۔ ہر قسم کے سانپ لیے ہوتے' کال کنڈیت' چمیلیا' کوڑیالہ' پدم ناگ اور بمنی۔ زمین پر بیٹھ جاتے۔ ان کی بین کی آواز سن کر مرد' عورتیں اور بچے ان کے گرد حلقہ بنا لیتے۔ سپیرا اکیلا بھی ہوتا اور دو دو بھی ہوتے۔ ایک پدم ناگ بل مارے بیٹھا ہے۔ سپیرا چھالا توڑ کر دکھاتا ہے اور پونگی سے دوسرے سپیرے پر چوٹ کھیلتا ہے یعنی اس کی پونگی بند کرتا ہے اور اسے چوٹ پہنچاتا ہے۔ ناگ کے من کو سب کو دکھاتا ہے۔ من ناگ کا جوہر ہوتا ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ وہ ایک قسم کا نگینہ ہوتا ہے جس سے اندھیرے میں اجالا ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سنسان جنگل میں اندھیری رات کو ناگ یا ناگن اس کو اگلتی ہے اور اس کی روشنی میں کھیلتی ہے۔ اردو کا ایک شعر ہے:۔

جڑاؤ بالیاں یاقوت کی یوں زیر گیسو ہیں
شب تاریک میں جس طرح ناگن من اگلتی ہے

نواب میر غلام حسین خاں طباطبائی لکھتے ہیں:۔

"بازیگر آئے' ان میں سے ایک آدمی باہر نکل کر کھڑا ہوگیا' دوسرا اس کے کندھے پر چڑھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کندھوں پر ساٹھ آدمی چڑھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر ایک آدمی آیا اور اس نے آتے ہوئے لوگوں میں سے پہلے شخص کو دوسرے آدمیوں سمیت اٹھا لیا اور اس پہلے آدمی سے لڑنے لگا۔ پہلے آدمی نے زور لگا کر اپنے آپ کو اس کے پنجے سے چھڑا لیا۔ لیکن انسٹھ آدمیوں کے لیے میدان میں پھرتا رہا۔ کچھ

دیر بعد ایک آدمی کو لایا گیا۔ اس کے تمام اعضا کو ایک دوسرے سے
جدا کر کے زمین پر پھینک دیا گیا اور اُن پر ایک چادر ڈال دی گئی۔ ایک
بازی گر چادر کے اندر گھُسا اور تھوڑی دیر بعد نکل آیا۔ اب اس چادر
کو اٹھایا گیا تو وہ آدمی جس کے اعضا کاٹ دئے گئے تھے صحیح سلامت
باہر نکل آیا۔"

"سیر المتاخرین" میں بازی گروں کے بہت سے کرتبوں کا ذکر ہے جن کو پڑھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ ایک کرتب تھا کہ سات بازیگر ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے اور اس طرح سے بولتے کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا کہ ایک شخص بول رہا ہے یا ساتوں آدمی بول رہے ہیں۔ یہ ہی لوگ تقریباً سو تیر چلاتے تھے اور ان کو ہوا میں قائم رکھ کر سکتے تھے کہ جس وقت حکم ہو ان میں سے کسی ایک تیر کو آگ لگا دیں۔ جس تیر کے متعلق حکم ہوتا ہاتھ میں شمع لے کر اس میں آگ لگا دیتے تھے حالانکہ وہ تیر ان کے سروں کے اوپر تقریباً سو گز سے بھی زیادہ اونچائی پر معلق ہوتا تھا۔ جس قدر آگ لگنے کا حکم ہوتا تیر میں اتنی ہی آگ لگتی۔

ایک مرتبہ بازی گروں نے پچاس پھل دار تیر اور ایک کمان نکالی۔ ان میں سے کسی نے کمان ہاتھ میں لے کر تیر چلایا اور وہ تیر ہوا میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس کے بعد دوسرا تیر پھینکا جو پہلے تیر میں جا کر مل گیا۔ اس طرح سے انچاس تیر ایک دوسرے سے ملحق کر کے ہوا میں لٹکا دئے۔ پچاسواں تیر چٹکی سے چھوڑا اور اس نے سب لٹکے ہوئے تیروں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔

ایک بار بازیگروں نے بیس من گوشت، چاول اور مسالہ دیگ میں ڈالکر چولہے پر چڑھا دیا اور اس میں پانی بھی ڈال دیا۔ حالانکہ چولہے میں بالکل آگ نہیں تھی مگر دیگ خود بخود پکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دیگ کو کھولا اور سو آدمیوں کی خوراک کے برابر انھوں نے اس میں سے کھانا نکالا اور لوگوں کو کھانے کے لیے پیش کیا۔

"اقبال السلاطین" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جادوگروں نے خشک زمین پر ایک فوارہ لگایا اور اس کے چاروں طرف تین چکر لگائے تو یکایک فوارہ چلنے لگا اور دس گز کی اونچائی تک پانی اچھلنے لگا۔ ہر گھڑی فوارے سے نئے رنگ کا پانی نکلتا تھا اور گل افشانی کرتا تھا۔ مگر فوارے کے پانی سے زمین تر نہیں ہوتی تھی۔ ایک گھنٹے تک فوارہ اسی طرح سے چلتا رہا۔ جب فوارے کو علیحدہ کیا تو زمین پر کہیں بھی پانی کا کوئی اثر نہیں پایا گیا۔ زمین پر پھر فوارہ لگایا گیا۔ اس دفعہ فوارے کے ایک طرف سے تو پانی نکلتا تھا اور دوسری طرف سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ یہ تماشہ بھی تقریباً دو گھنٹے تک چلتا رہا۔

آدمی کا زندہ زمین میں دفن ہو جانا اور پھر صحیح سلامت نکل آنا بھی ایک ایسا تماشہ ہے جو صدیوں سے ہمارے ملک میں ہوتا آرہا ہے۔ آج تو ایسا سادھو مہاتما اور یوگی کر رہے ہیں مگر مغلوں کے عہد میں یہ کرشمہ جادوگر اور شعبدے باز دکھاتے تھے۔ اس وقت کے جادوگر اس کھیل کے علاوہ، کانچ کے ٹکڑے بھی دانتوں سے چبا کر کھا جاتے تھے یا کیلیں نگل لیتے تھے اور بڑی موٹی لوہے کی سلاخوں کو دانتوں سے موڑ دیتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حیرت میں ڈالنے والے کھیل کیا واقعی کوئی کرشمہ ہیں۔ یا یہ محض نظر کا دھوکا اور ہاتھ کی صفائی ہے۔ رسّے کی چالوں کا ذکر کرتے ہوئے سائنس دان ولیم سیکبروک نے ۱۹۳۴ میں لکھا تھا کہ لندن میں ہوئے ان کھیلوں کے درمیان اس نے خفیہ کیمرے سے کچھ معلومات حاصل کیں۔ ان سے پتہ چلا کہ جس رسّے پر بازی گر تماشائیوں کے سامنے اوپر چڑھا تھا وہ تو دراصل تمام وقت زمین پر ہی پڑا رہا تھا! اور تحقیقی ٹیموں نے بھی اپنی رپورٹیں پیش کی ہیں۔ یہ سب محقق اس بات پر متفق ہیں کہ بازیگر حقیقت میں رسّی پر نہیں چڑھتے۔ مگر ہوتا کیا ہے، وہ یہ نہیں بتا سکے۔ ایک بات قابلِ یقین ہے کہ حاضرین کے دل و دماغ پر ایسا اثر ہو جاتا ہے کہ وہ وہی دیکھتے اور سنتے ہیں جنھیں بازی گر انہیں دکھانا یا سنانا چاہتا ہے۔ یہ کمال بھی کم نہیں ہے۔ جہاں تک آگ پر ننگے پاؤں

چلنے کا سوال ہے، انگلینڈ کے چند سائینس دانوں کا خیال ہے کہ صرف لکڑی کی آگ پر دو قدم بغیر نقصان کے چلا جا سکتا ہے۔ مگر ہمارے بازیگر تو کئی کئی قدم چلتے تھے اور کوئلوں کی دہکتی آگ پر بھی چلتے تھے۔ پونہ کے ایک ہندوستانی سائیسدان ایم۔ گوکھلے نے صحیح رائے پیش کی تھی کہ "اس قسم کے تماشوں میں ذہن، دماغ اور نظر زیادہ کام کرتے ہیں اور حاضرین کو بھی ایک خاص ذہن اور نظر سے دیکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے"۔

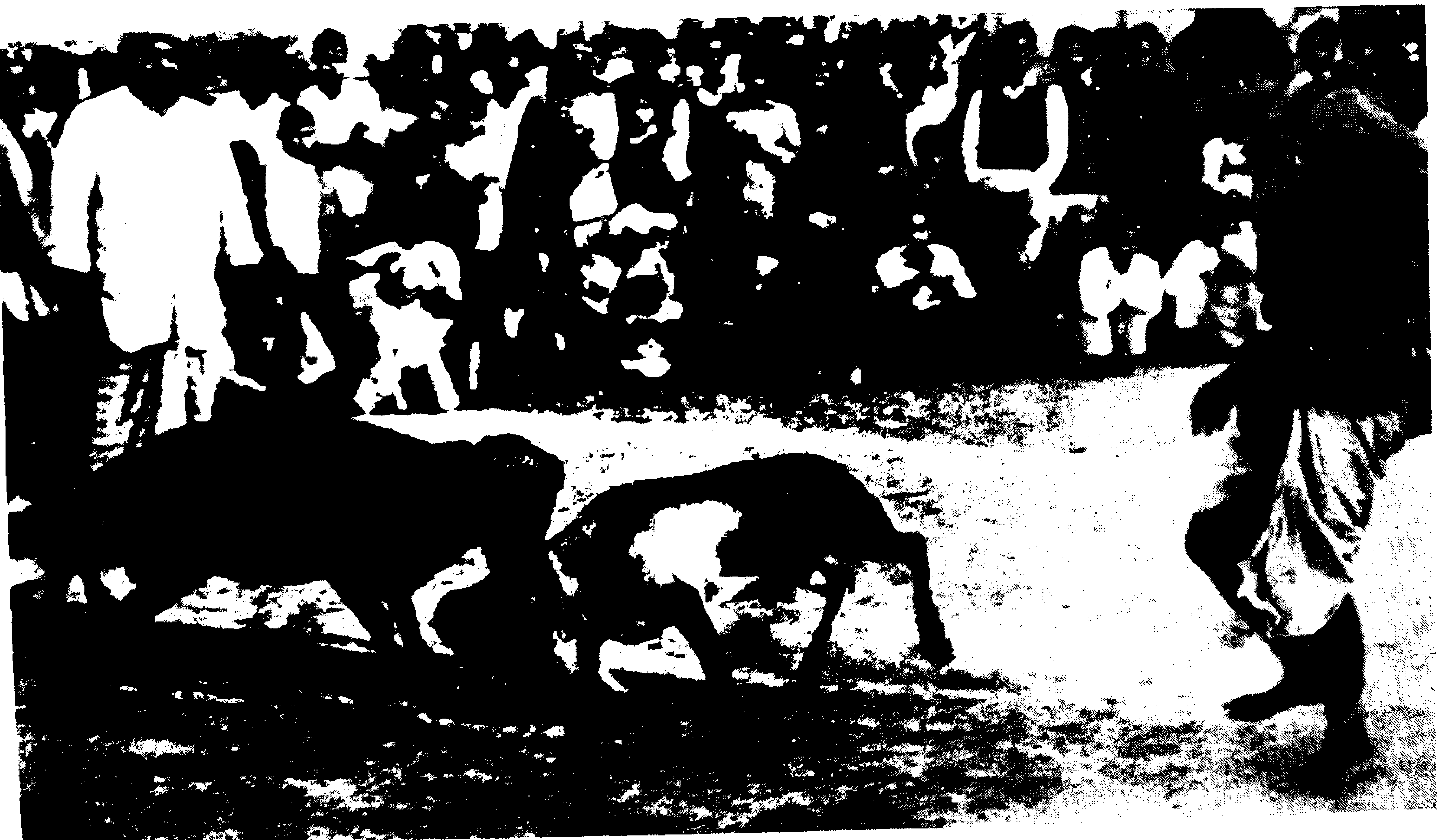
ان عجیب وغریب تماشوں کی وجہ جانے بغیر یہ بنا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ . .

ہندوستانی بازیگر اپنے فن میں بڑے ماہر اور یکتا ہوتے تھے۔ یہ لوگ دلی کی قدیم سماجی زندگی کا ایک خوشگوار حصّہ تھے۔ اُن کے تماشے لوگوں کو حیرت میں تو ڈالتے ہی تھے مگر ایک تفریح بھی مہیا کرتے تھے جن سے زندگی کی اکتاہٹ اور یکسانیت ٹوٹ جاتی تھی۔

رزم سے بزم

انگریزوں کے اقتدار حاصل کرنے سے پہلے مغل بادشاہ اور سلاطینِ دکن اور دوسرے علاقوں کے حکمران جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے۔ ایک تو بادشاہوں کو فتوحات کا شوق تھا اور دوسرے کوئی سردار یا شاہی خاندان کا فرد بغاوت بھی کرتا رہتا تھا۔ اس لیے کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی جنگ چھڑتی رہتی تھی۔ لڑائی چھڑنے کی صورت میں شاہی خاندان کے افراد کا اس میں بری طرح مبتلا ہونا ناگزیر تھا۔ عموماً بادشاہ اور حکمران خود میدانِ جنگ میں دشمن کی سرکوبی کرنے کے لیے یا مزید فتوحات اور توسیع سلطنت کے لیے اپنی فوجیں اپنی سرکردگی اور کمان میں لے جاتے یا اپنے کسی بیٹے کو بھیجتے۔ شاہی خاندان کے ہر فرد کو جنگ کے تمام حربوں سے مکمل واقفیت ہوتی تھی اور بادشاہ اور اس کے شہزادے اعلیٰ گھڑ سوار اور جنگجو ہوتے تھے۔ یہ پُر وقار ہستیاں جس طرف نکل جاتیں، فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیتیں۔ وہ شہنشاہ جو کوندتی بجلیوں سے عشق کیا کرتے تھے، جن کے گھوڑوں کے سموں سے زمین کا سینہ ہر وقت تھرتھراتا رہتا تھا، آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا تھا۔

اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کا ایسا زوال شروع ہوا جو رو کے نہ رکا۔ سلطنت کا ایسا شیرازہ بکھرا کہ آخر کے چند مغل بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے اور ان کی حکومت صرف دلی اور لال قلعے تک محدود رہ گئی۔ شاہی خاندان کے افراد میں خون تو اپنے بزرگوں کا



مینڈھوں کی لڑائی

ہی تھا مگر چونکہ کس بل نکالنے کے لیے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کی نہ طاقت تھی نہ موقعہ اس لیے انھوں نے جانوروں اور پرندوں کو لڑانے کے شوق اپنا لیے۔ جب تک دولت کی افراط تھی، بڑے بڑے جانوروں کو لڑانے کا شوق چلتا رہا مگر جب وہ بات نہیں رہی اور تنگدستی نے آگھیرا تو پرندوں کو ایک دوسرے سے لڑانا شروع کر دیا۔ یہ سب شوق بزم آرائیوں کے ذیل میں آتے تھے۔ اسی دور کے بارے میں کہا گیا ہے کہ رزم سے بزم کا دور شروع ہوگیا۔ آہستہ آہستہ یہ شوق عوام میں پھیل گئے خاص طور پر پرندوں کی لڑائی کے، جن پر خرچ زیادہ نہیں آتا تھا۔ ہاتھیوں کی لڑائی تو صرف شاہی خاندان کے افراد ہی کرا سکتے تھے۔

ہاتھیوں کی لڑائی

جب دلی میں قلعے والے ہاتھیوں کی لڑائی کا اہتمام کرتے تو دریا کی ریتی میں جھروکوں کے نیچے ریت کا ایک بڑا سا پشتہ باندھ دیا جاتا۔ لوگوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ کافی فاصلے پر اکٹھی ہو جاتی اور مسلسل شور مچاتی رہتی۔ پھر دو جنگی ہاتھی جنھیں خاص طور پر لڑائی کے لیے تیار کیا جاتا تھا وہاں لاکر کھڑے کر دئے جاتے۔ اس وقت باندار چرخیاں اور بان، فیلبان بھالے اور برچھے لے کر اور سانٹ مار سانٹے ہاتھوں میں لیے ہاتھیوں کے اردگرد کھڑے ہو جاتے۔ سانٹے مار کر سانٹ مار ہاتھیوں کو چمکا دیتے۔ ایک نہ ایک بڑی پھرتی سے ہاتھی کے پیٹ کے تلے سے نکل جاتا۔ ہاتھی جھنجلا کر اس کا رخ کرتا۔ اتنے میں دوسرا سانٹ مار پینترا کاٹ کے ہاتھی کے برابر آجاتا۔ ہاتھی اس کی طرف مڑتا تو تیسرا لپک کر ہاتھی کے آگے سے نکل جاتا۔ ہاتھی اس کی طرف دوڑتا۔ وہ کاوا دیکر پیچھے آجاتا۔ جب ہاتھی خوب گرما جاتے تو پہلے سونڈیں ملا کر زور کرتے، ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے اور ماتھے ملا کر ریلتے، دھکیلتے اور رگیدتے۔ ان میں جو دل کا بودا ہوتا، دوسرے کا زور اور ٹکر سنبھال نہ سکتا۔ چنگھاڑ مار کر پیچھے ہٹ جاتا۔ دوسرا شیر ہو کر اس پر دوڑتا۔ فیلبان بھالے لیکر دوڑتے، دونوں کا بیچ بچاؤ کراتے اور یہ کہتے کہتے پرے لیجاتے کہ دیو صفت بہادر و چلو غصہ تھوک دو،

تم تو وہ کالے پہاڑ ہو کہ تم سے رستم بھی ٹکر نہیں لے سکتا۔

لڑائی کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہاتھی تندخو اور اکھڑ ہو یا پھر گرمایا اور چمکایا گیا ہو ورنہ لڑائی پر آمادہ نہیں ہو گا۔ ہاتھیوں کو لڑائی کے لیے چھوڑنے سے پہلے ان کی گردن اور دُم کے گرد ایک رسّہ باندھا جاتا تھا۔ دونوں ہاتھی ایک دوسرے پر اپنی سونڈ اور دُم اٹھا کر اور چنگھاڑ کر حملہ کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا دو پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ ان کے جسموں کے موڑ توڑ اور ان کی چنگھاڑوں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اپنے مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے وہ کتنی طاقت لگا رہے ہیں۔ دونوں ہاتھیوں کی یہ کوشش ہوتی کہ اپنے دانتوں سے اپنے مخالف کا جسم چیر کر رکھ دیں۔ اگر ہارے ہوئے ہاتھی کے پیچھے بھاگتے ہوئے فاتح ہاتھی کو روکا نہ جاتا تو فاتح ہاتھی اس ہاتھی کو پکڑ کر زمین پر گرا دیتا تھا اور اس کا پیٹ پھاڑ کر اسے ختم کر دیتا تھا۔ یہ ایک بڑا خوف ناک منظر ہوتا تھا۔

ہاتھی اور بگھیلے کی لڑائی

کبھی کبھی لال قلعے کے جھروکوں کے نیچے بادشاہ ہاتھی اور بگھیلے کی لڑائی کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ بگھیلے کے دوسرے نام لکڑ بھگا، باگھ اور تیندوا بھی ہیں۔ بادشاہ کی بات پر تو اس کا اطلاق خاص طور پر ہوتا تھا۔ چشم زدن میں سارے شہر میں یہ خبر اڑ جاتی اور ہر ایک سیلانی میں آنے کے لیے اپنی پوشاک ٹھیک کرنے لگتا کہ شاید بادشاہ کی نظر اس پر پڑ جائے۔ صبح ہی شہر کے تمام لوگ ریتی میں جانے شروع ہو جاتے۔ شاہی جھروکوں کے نیچے تماشائیوں کے لیے تمام بندوبست بادشاہ کی طرف سے ہوتے۔ ان کی حفاظت کے لیے نجیب، سپاہی اور بہت سے سوار کھڑے ہو جاتے تاکہ کوئی جھپٹ میں نہ آ جائے۔

میدان کے دھر بیچ میں فیلبان ہاتھی کو لے کر آتے۔ ہاتھی جھومتا جھومتا، مست چال سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا ان کے ساتھ آیا۔ ارد گرد بھالے بردار، بان بردار کھڑے تھے۔ شکاری بگھیلے کو لے کر آئے اور اس کو ہاتھی کے سامنے کھڑا کر کے اس کی رسیاں کھول

بگھیلے نے کھلتے ہی ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ ہاتھی نے داؤں بچا کر اس کا وار خطا کر دیا۔ بگھیلا جھنجلا کر ہاتھی پر پھر جھپٹا۔ ہاتھی نے پھر کترائی دی اور پھرتی سے بگھیلے کو سونڈ میں لپیٹ لیا اور دونوں پاؤں کے نیچے دبا کر سونڈ سے اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ مگر وہ لوٹ پوٹ ہو کر پھر کھڑا ہو گیا اور کلانچیں بھرتا ہوا جھروکوں کی طرف آیا۔ ساری خلقت مارے خوف کے تتر بتر ہو گئی اور بہت سے لوگ گڑھے گڑھولوں میں جا چھپے۔ سارا میدان چشم زدن میں ہی ہو کا عالم بن گیا۔ میر فتح علی جو بادشاہ کے جنگل کے وزیر کہلاتے تھے دونالی بندوق ہاتھ میں لیے ڈٹے رہے۔ بھیڑ کے کچھ آدمی تو دریا میں بھی کود پھاند گئے تھے۔ میر فتح علی اپنی جگہ سے نہ سرکے۔ بگھیلا میر صاحب کو بت بنا کھڑا دیکھ کر ان ہی پر لپکا۔ میر صاحب نے بچاؤ میں اس کے گولی ماری مگر نشانہ خطا گیا۔ اس بات سے بگھیلا بھبک کر غرّاتا ہوا ان پر دوڑا۔ میر صاحب نے اس کے دوسری گولی سرکی، وہ زمین میں دھنس گئی۔ بگھیلے نے میر صاحب کو پنجوں سے دبوچ کر نیچے گرا دیا۔ یہ دیکھتے ہی شکاری، بہیلئے اور پھندیت دوڑ پڑے اور اس موزی کو جوں توں کر کے باندھا۔ میر فتح علی کو شاہی ملازموں نے اٹھوا کر ان کی قیام گاہ پر پہنچوا دیا۔ پنجوں کے زخم گہرے نہیں تھے لیکن صدمے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ بادشاہی حکیم، طبیب، جراح فوراً پہنچ گئے۔ دوا دیکر اور زخموں پر مرہم پٹی باندھ کر چند روز میں اچھا کر دیا۔ تمام شہر میں کئی دنوں تک اس تماشے اور میر فتح علی کی جوانمردی کا چرچا رہا۔ بادشاہ کے ہاں بھی ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

مینڈھوں کی لڑائی

یہ شوق عوام کا تھا۔ دلی کے بے فکرے شوقین شرط لگا کر مینڈھوں کی لڑائی کراتے تھے۔ نواب اور امرا بھی مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کے شوقین تھے مگر خود اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ مینڈھوں کی دیکھ بھال اور لڑائی کے لیے ان کی سدھائی عموماً قصائیوں اور دوسرے نچلے طبقے کے لوگوں کی ذمے داری ہوتی تھی۔ مینڈھے اپنے سر سے وار کرنے کے لیے مشہور ہیں اور دیر تک ایک دوسرے کے سر سے سر بھڑائے طاقت سے ایک دوسرے

کو دھکیلنے کی کوشش میں کھڑے رہتے ہیں۔ اتنی زور سے لگاتار سر کی ٹکر مارتے ہیں کہ مخالف کا سر لہولہان ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ چوک میں ہوئی دو مینڈھوں کی لڑائی میں ایک مینڈھے نے اتنے زور زور سے مسلسل ٹکر ماری کہ مخالف کی کھوپڑی ٹوٹ گئی مینڈھوں کو لڑائی سے پہلے خاص خوراک دی جاتی تھی جس میں بادام بھی شامل ہوتے تھے۔ ہار جیت کا فیصلہ اس بات پر ہوتا تھا کہ کون سے مینڈھا حملے سے بچنے کے لیے یا لہولہان ہو کر پیچھے ہٹتا ہے اور لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔

مرغوں کی لڑائی

یہ دلی کے عوام کا مرغوب مشغلہ تھا۔ مرغے زیادہ تر مسلمانوں میں پالے جاتے تھے اور وہی عام طور پر مرغے لڑاتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی، یہ شوق زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگوں میں تھا۔ اگرچہ ہر مرغا لڑائی کے لیے تیار کیا جا سکتا تھا مگر اصیل نسل کے مرغے کا لڑائی میں کوئی جواب نہیں تھا۔ مرغوں کو لڑائی کے لیے تیار کرنے اور رکھنے کا ایک طریقہ ان کے پنجوں اور ناخنوں کو محفوظ رکھنا بھی تھا۔ ان کی چونچوں کو بھی چاقو سے کھرچ کر تیز اور نوکیلا بنا دیا جاتا تھا۔ لڑائی کے وقت مرغوں کے پنجوں کو کپڑے سے باندھنے کا رواج بھی تھا تاکہ ایک دوسرے کو اتنا نہ زخمی کر دیں کہ جان جانے تک کی نوبت آ جائے۔ جب لڑائی کے لیے دو مرغوں کو آمنے سامنے چھوڑا جاتا تھا تو ان کے مالک اپنے اپنے مرغے کے پیچھے کھڑے ہو جاتے تھے اور آواز لگا لگا کر اسے اکساتے تھے کہ پہلا وار کرے۔ جب مرغے ایک دوسرے پر اپنی چونچوں اور پنجوں سے حملہ شروع کر دیتے تھے تو ان کے مالک چلاتے رہتے تھے "شاباش پٹھے" "کر حملہ" میرے بیٹے" میرے رستم" بڑھ آگے اور کر وار۔"

جب دونوں مرغے، بغیر ہار جیت کا فیصلہ ہوئے، دیر تک لڑتے لڑتے زخمی ہو جاتے تھے تو ان کے مالک باہمی رضامندی سے لڑائی روک کر انہیں اٹھا لیتے تھے۔ اسے مرغ بازی کی اصطلاح میں "پانی" کہا جاتا تھا۔ مالک اپنے مرغ کے زخم دھوتے اور گرم گرم دودھ پلاتے اور جب مرغوں کی طاقت بحال ہوتی تو پھر انہیں لڑنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ "پانی" کا طریقہ

چلتا رہتا اور لڑائی پورے پورے دن چلتی رہتی۔ جب کوئی مرغا اندھا ہو جاتا یا اتنی بری طرح زخمی ہو جاتا کہ کھڑا ہی نہ ہو سکے تو وہ شکست خوردہ سمجھا جاتا۔

تیتر اور بٹیر کی لڑائی

ان پرندوں کو بھی عموماً نچلے طبقے کے لوگ پالتے تھے اور وہی انہیں لڑاتے تھے یہ پرندے پنجروں میں رکھے جاتے ہیں اور ان کے پرندے بڑے مضبوط، اونچے، خوشنما اور ہوا دار ہوتے تھے۔ لوگ اپنے تیتر یا بٹیر کو ایک ڈوری سے اپنے ہاتھ باندھ کر بھی پھرتے تھے۔ ان کے نام بھی ان کی صفات پر رکھ دیے جاتے تھے مثلاً "رستم"، "خلیفہ" "گردن توڑ" وغیرہ۔ ان کو لڑائی کے لیے تیار کرنے میں پانی سے گیلا رکھا جانا اور گھنٹوں ہاتھ میں رکھنا بھی شامل ہے۔ اس سے ان کا حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ خوش و خرم رہ کر بولتے رہتے ہیں۔ پھر ان کو کچھ دن بھوکا رکھا جاتا ہے اور جلاب دے کر پیٹ بھی صاف کر دیا جاتا ہے۔ رات کو ان کے مالک ان کے کان میں زور سے چلا کر "کو" کہتے ہیں جسے "کوکنا" یا "چابی دینا" بھی کہتے تھے۔ اس عمل سے یہ پرندے چست اور چھریرے ہو جاتے ہیں اور بدن میں طاقت آ جاتی ہے۔

تیتر اور بٹیر کی لڑائی کے لیے زیادہ بڑی زمین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ لڑائی گھر میں ہی یا کسی کمرے میں یا اندر اور باہر دو تین گز کھلی زمین پر کرائی جا سکتی ہے۔ ان کی چونچیں بھی چاقو سے کھرچ کر تیز کی جاتی ہیں۔ ان کی لڑائی بھی مرغوں کی لڑائی کی طرح ہی ہوتی ہے اور یہ بھی اپنے مخالف پر پنجوں اور چونچوں سے حملہ کرتے ہیں۔ لڑائی میں نہ صرف یہ بری طرح زخمی ہو جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے پر تک اکھاڑ دیتے ہیں۔ لڑائی شروع کرانے سے پہلے فرش پر ان کے لیے دانہ بھی بکھیر دیا جاتا تھا۔ ہار جیت کا وہی طریقہ تھا کہ یا تو بٹیر یا تیتر زخمی ہو کر لیٹ جائے گا اور پھر نہیں اٹھے گا اور مالک بیچ بچاؤ کر کے علیحدہ کر دیں گے اور یا شکست خوردہ پرندہ اس جگہ سے بھاگ کھڑا ہوگا۔

کبھی کبھی تیتر یا بٹیر کی لڑائی میں ناجائز طریقے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگ اپنے پرندے کو کوئی نشیلی چیز کھلا دیتے تھے اور وہ نشے میں دھت لڑتا رہتا تھا مگر اس میں اس کے یا مخالف کے مارے جانے کا بہت خطرہ تھا۔ اسی طرح بہت سے اپنے پرندے کی چونچ میں زہریلا تیل لگا دیتے تھے تاکہ مخالف چونچوں کی چوٹ کھا کر اور تکلیف کی تاب نہ لا کر پسپا ہو جائے یا اگر وہ لڑتا رہا تو زہر کے اثر سے اس کی موت یقینی تھی۔ لیکن اگر ان ناجائز طریقوں کا پتہ لگ جاتا تھا تو پرندوں کی لڑائی تو رک جاتی تھی مگر دونوں حریف مالکوں اور ان کے ساتھیوں میں گالی گلوچ اور جوتم پیزار شروع ہو جاتی تھی۔

لوّا اور گلدُم کی لڑائی

دلی میں قدیم زمانے میں تیتر اور بٹیر کی لڑائی کے علاوہ، کہیں کہیں لوگ لوّا اور گلدُم کی لڑائی بھی کراتے تھے۔ دراصل اُن پرندوں کی لڑائی کا رواج لکھنؤ میں تھا مگر وہاں کی دیکھا دیکھی دلی میں بھی یہ شوق شروع ہوا مگر چلا نہیں۔ لوّا ایک تیتر کی قسم ہوتی ہے مگر عام بٹیر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ ان کو لڑائی کے لیے اکسانے کے لیے ایک پنجرے میں بند کر دیا جاتا تھا اور ان کے سامنے ایک مادہ لوّا کا پنجرہ رکھ دیا جاتا تھا جسے دیکھ کر دونوں لڑنا شروع کر دیتے تھے۔ گلدُم بلبل کی طرح کا ایک پرندہ ہوتا ہے جس کی دُم کے نیچے سرخ پیروں کا ایک گچھا ہوتا ہے۔ سِدھائی کے دوران گلدُم بکھرے ہوئے اناج پر لڑتے تھے۔ ان کی لڑائی چڑیوں کی لڑائی کی طرح ہوتی تھی اور لڑائی کے دوران یہ بار بار ہوا میں اچھلتے تھے۔

بیضہ بازی

اس وقت کی دلی میں، شہزادوں کا ایک اور مشغلہ بیضہ بازی یا انڈوں کی لڑائی تھا۔ شہزادوں نے اچھی نسل کی ایرانی سبزوار مرغیاں پالی ہوئی تھیں اور ان کو اور ان کے

مرغوں کو بہت ہی اعلیٰ اور مقوی خوراک دی جاتی تھی۔ ان مرغیوں کے جو انڈے ہوتے تھے وہ بڑے مضبوط اور نوکیلے ہوتے تھے۔ کسی دوسرے انڈے سے ٹکراؤ تو وہ انڈہ فوراً ٹوٹ جائے گا۔ ہر منگل کو قلعے میں شہزادے ایک دوسرے سے اپنے انڈے لڑاتے تھے۔ نوروز کے دن شہزادے انڈوں کو مشک و زعفران سے رنگ کر بادشاہ کے حضور میں لاتے اور انہیں لڑاتے تھے۔ بادشاہ مسند پر آکر بیٹھتے تو مجرے کے بعد شہزادے اور اہلکار ادب سے پیچھے کھڑے ہو جاتے۔ صیدی پانچ پانچ چھنٹے ہوئے مضبوط انڈے نکالتے۔ ہر انڈے پر چنے برابر ڈنک لگا ہوتا۔ کوئی صیدی ایک انڈہ مٹھی میں اس طرح بند کر لیتا کہ صرف ڈنک کھلا رہتا۔ دوسرا اوپر سے انڈے کے ڈنک سے اس انڈے کے ڈنک پر چوٹ مارتا۔ جس کا انڈہ ٹوٹ جاتا وہ شرمندہ ہو جاتا۔ اور جیتنے والے شور و غل کرتے۔ پانچ پانچ انڈوں کی لڑائی کے بعد ہار جیت کا فیصلہ بادشاہ کرتے۔

دلی والے عیش و عشرت کی محفلوں میں سرشار رہنے لگے۔ شراب و ناب کے دور چلتے تھے اور یارانِ زندہ دل رزم کو بھول کر موسیقی اور رقص کے دلدادہ ہو گئے۔ دارفتگیٔ شوق نے مذہبی رسوم، موسمی تہواروں اور شادی وغیرہ کی تقریبات کو عیش و عشرت کے بہانے بنا لیا تھا۔

مگر دلی والوں کے اخلاق، وضعداری، مہمان نوازی اور برتاؤ میں ذرا فرق نہیں آیا۔ ان کا سب کچھ لٹ گیا لیکن محبت اور مروت باقی رہی اور یہی بات ہمیشہ سے دلی کی پہچان بنی رہی۔

ناچ اور مُجرا

مُجرا فارسی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں سلام اور آداب۔ شاہی دور میں جب کوئی آدمی دربار، مجلس یا محفل میں آنا چاہتا تو کہا جاتا کہ حضور فلاں آدمی مجرے کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہے۔ لیکن مغلوں کے زمانے میں جب کوئی طوائف ناچ شروع کرتی تو پہلے جھک کر سلام کرتی اور پھر کہتی ـــ حضور مجرا عرض کرتی ہوں۔ اس طرح سے مجرے کا لفظ ناچ گانے کے لیے استعمال ہونے لگا اور ناچنے گانے والیوں کو مجرے والیاں کہنے لگے۔ ان دنوں عورتوں کا ناچ گانا معیوب سمجھا جاتا تھا اور درباروں اور محفلوں میں طوائفیں ہی گاتی اور مجرے کرتی تھیں۔ جن تقریبات میں عورتیں شامل ہوتیں اور شان وشوکت کے لیے مجرا کرایا جاتا، ان میں عورتیں پردے کے پیچھے ہو کر مجرا دیکھتیں۔ اُن دنوں اچھے اور شریف گھروں کی عورتیں دل بہلاوے کے لیے صرف ڈھولک کے گیت گا لیا کرتی تھیں اور وہ بھی چار دیواری کے اندر۔ بیاہ شادی کے موقع پر اگر عورتیں ناچتیں بھی تو عام طور پر اس وقت جب کوئی مرد گھر میں نہ ہوتا۔ صرف گودی کے بچے یا زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کے لڑکے ہی عورتوں کے ناچ میں بیٹھ سکتے تھے۔ پھر یہ رواج ہو گیا کہ ہر کھاتے پیتے گھر میں خوشی کے موقعے پر چاہے بچے کا جنم دن ہو، شادی کی سالگرہ ہو یا گھر میں شادی بیاہ ہو یا کوئی اور تقریب ہو تو مجرا ضرور کرایا جاتا۔ مجرے کے لیے دُور دُور سے مجرے والیاں بلائی جاتی تھیں۔

ان مجرے والیوں کے ٹھاٹھ باٹ اور ناز و نخرے نرالے ہوتے تھے۔ یہ طوائفیں بھاری بھاری پشوازیں پہن کر، دوپٹہ اوڑھ کر، زیورات سے لدی ہوئی، چوتھی کی دلہن بن کر آتی تھیں۔ ان کے ساتھ نوچیاں بھی ہوتیں اور نائکہ اور بڑی بی بھی ہوتی۔ سازندے بھی ہوتے اور پان اٹھانے والے بھی ساتھ رہتے۔ ان کی مستانہ ادائیں، متوالی چال، شوخی بھری آنکھیں، رنگ روپ اور سج دھج دیکھ کر لوگ مستی میں ڈوب جاتے۔ جس کسی کی حویلی یا گھر پر مجرا ہوتا وہاں بن بلائے لوگوں کی بھی ایک بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی۔ عموماً مجرے کے موقعے پر، جب تک کہ مجرا خاص طور پر حویلی کے اندر مردانے میں صرف صاحبِ خانہ اور اس کے نجی دوستوں تک محدود نہ ہو، لوگوں کو آنے سے نہیں روکا جاتا تھا۔ ان ناچ گانے والیوں پر ہزاروں اور بعض دفعہ لاکھوں روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ اس لیے مجرا امارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔

یوں تو دلی میں شادی بیاہ اور ریت رسموں پر کافی رونق رہتی تھی لیکن مجرے کے لیے تو خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ گھر کے آنگن، دالان اور دالان در دالانوں میں خوب آرائش کی جاتی تھی۔ جھاڑ فانوس اور ہانڈیوں سے اتنی روشنی کی جاتی کہ رات بھی دن معلوم ہوتی تھی۔ مجرے والیاں بڑے اہتمام سے آتیں اور ٹھسّے سے مردوں کے بیچ میں جا کر بیٹھ جاتیں اور ساری رات گانا ناچنا ہوتا رہتا۔ گھر کی عورتیں یا مہمان عورتیں مردوں کے بیچ میں نہیں بیٹھتی تھیں۔ وہ تو ناچ گانے کا تماشہ اوپر سے چھجّوں اور بالا خانوں میں چلمنوں کے پیچھے سے دیکھتی رہتی تھیں۔ اور جب طوائفیں سہرا اور بدھائی گاتیں تو اوپر سے ہی اپنے دوپٹوں اور پلّوؤں میں باندھ کر روپے انعام اور نچھاور کے طور پر نیچے لٹکا دیتیں۔

مجرے والیاں گانے اور ناچنے میں تو ماہر ہوتی ہی تھیں مگر حاضر جوابی کے فن میں بھی طاق ہوتیں۔ ایک بار دو مشہور مجرے والیاں، مشتری اور زہرہ کسی رئیس کی محفل میں بلائی گئیں۔ جس وقت انھوں نے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو ایک منچلے نوجوان نے جو شریکِ محفل تھا ان پر پھبتی کسی ــــ "کیا عمدہ جوڑی ہے!" ان دنوں جوڑی سے

مراد گھوڑیوں کی جوڑی ہوتا تھا اور نوجوان کا اشارہ بھی اسی طرف تھا اور اس نے قصداً یہ فقرہ کسا تھا۔ مشتری نے ابھی پاؤں کی جوتی بھی نہیں نکالی تھی کہ وہیں سے پلٹ کر جواب دیا۔ "ہاں بھئی سائیس کی اولاد خوب پہچانا۔" محفل میں ایک قہقہہ گونج اٹھا اور نوجوان کھسیانہ ہو کر رہ گیا۔ چونکہ وہ نوجوان ان سے مات کھا چکا تھا اس لیے بدلے کے موقعے کی تلاش میں تھا۔ گانا شروع ہونے سے پہلے جب سفردے (سپردے) ساز ملا رہے تھے تو مجرے والیاں اس نوجوان کو جان کر گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں جب نوجوان سے نظریں ملتیں تو بڑی شوخی سے مسکرا دیتیں۔ مگر نوجوان نے ان کی گھورتی نظروں کو بھی دیکھ لیا تھا۔ نوجوان سے نہ رہا گیا اور تڑپ کر بولا۔

"کیوں بی صاحبہ کیا نگل جانے کا ارادہ ہے؟"

اس بار زہرہ کی باری تھی۔ اس نے تنڑسے جواب دیا۔

"ہمارے مذہب میں شوز کھانا حرام ہے۔"

ایک مرتبہ لالہ چھنّامل کے یہاں جو دلی کے مشہور رئیس تھے، محفل جمی ہوئی تھی۔ مشتری غزل گا رہی تھی۔ ردیف قافیہ تھا۔ "ہوا چاہتا ہے۔" مشتری کا شاید پاؤں بھاری تھا اور کسی من چلے نے یہ تاڑ لیا تھا۔ اس نے یہ شعر پڑھ دیا۔

حمل نو مہینے کا ہے مشتری کو
کوئی دم میں لڑکا ہوا چاہتا ہے

مشتری تھوڑی دیر کے لیے تو غصے کو پی گئی مگر جب ناچتی ہوئی ان صاحب کے پاس سے گزری تو اونچی آواز میں یہ شعر گایا۔

کرو کرتے ٹوپی کی اب تم تیاری
کہ ہمشیرہ زادہ ہوا چاہتا ہے

یہ بڑی گہری چوٹ تھی اور وہ صاحب شرمندگی کے مارے زمین میں گڑ گئے۔
کسی نواب صاحب کے یہاں مجرے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ایک پھکڑّ آدمی بھی محفل میں آ کر بیٹھ گیا۔ زبان کا غیر محتاط تو تھا ہی محفل کے آداب سے بھی ناواقف تھا۔ اس نے

بہت بڑھ چڑھ کر محل بے محل بولنا شروع کر دیا۔ کسی صاحب نے مجرے والی سے کہا۔ "بی جان آپ خاموش کیوں بیٹھی ہیں۔ ذرا ان صاحب کی زبان کو لگام دیجئے۔" مجرے والی نے پھکڑ حضرت سے پوچھا۔ "آپ کا اسمِ شریف؟" پھکڑ نے فوراً جواب دیا۔ "خاکسار کو شرافت کہتے ہیں۔" بی صاحبہ یہ سن کر جلسے میں بیٹھے لوگوں سے بولیں۔ "اب آپ ہی غور فرمائیے، ان کے کون منھ لگے۔ ہیں تو شر اور آفت کا مجموعہ۔" محفل قہقہہ زار ہو گئی اور ان حضرت سے پھر نہ بولا گیا۔

ایک بار کوئی نواب صاحب محفل میں تشریف لائے۔ مجرے والی سے ان کا یارانہ تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر اور جھک کر نواب صاحب کو سلام کیا اور پھر ٹھسے سے بیٹھ گئی نواب صاحب نے اس کا کاسنی رنگ کا لباس دیکھ کر کہا۔ "آج تو شربت کاسنی بنی بیٹھی ہو۔" بی صاحبہ فوراً بولیں۔ "میں ہوں بھی تو دوائے دردِ جگر۔ گھول کر پی جانے کا ارادہ ہے کیا؟"

مجرے والیوں میں ڈیرے دارنیاں بہت اونچے درجے کی طوائفیں مانی جاتی تھیں۔ یہ کسی ایک کی پابند ہو کر رہتی تھیں۔ جس کی ہو گئیں، صرف اس کے لیے اور اس کے قریبی دوستوں کے دل بہلاوے کے لیے ناچتی گاتی تھیں۔ یہ طوائفیں ناچنے گانے میں تو کمال کرتی ہی تھیں مگر تہذیب، سلیقہ مندی اور شعر و شاعری میں بھی ماہر ہوتی تھیں۔ ان کے کوٹھے اور حویلیاں تہذیب اور فن کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ اچھے اچھے اور شریف گھرانوں کے بچے ان سے مجلسی آداب اور طور طریقے سیکھنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار کسی رئیس نے اپنے لڑکے کو دلی کی ایک نامی ڈیرے دارنی کے پاس تعلیم کے لیے بھیجا۔ لیکن ان صاحبزادے کو ان کے پاس جاتے ہوئے ابھی دو چار دن ہی گزرے تھے کہ ڈیرے دارنی جو عمر میں ان سے دگنی تھی انہیں بھا گئی اور وہ ہر وقت ان کی طرف دیکھتے رہتے۔ ڈیرے دارنی نے اس لڑکے کے والد کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا:

"ماشاءاللہ آپ کے بیٹے نہایت خوبصورت، ہوشیار اور ذہین ہیں

لیکن ان کے تیور بھلے لڑکوں کے سے معلوم نہیں ہوتے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں شوخی اور شرارت نظر آتی ہے۔ میں ان کی ماں کے برابر ہوں اور مجھے ان کا گھور گھور کر دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ میری باتیں بھی دھیان سے نہیں سنتے۔ مہربانی کر کے کل سے انہیں یہاں نہ بھیجئے۔ میں شکر گزار ہونگی۔"

محمد شاہ رنگیلا کی حکومت میں نواب درگاہ قلی خاں سالارِ جنگ نظام الملک کے ساتھ دلی آئے تھے۔ انھوں نے اپنی فارسی کی تصنیف میں جس کے اردو ترجمے کا نام "مرقع دلی" ہے، اور باتوں کے علاوہ بڑی نامی ناچنے گانے والیوں کا حال اپنی مخصوص لچھے دار اور چٹ پٹی زبان میں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"نور بائی دلی کی ایک مشہور ڈومنی ہے۔ بڑے بڑے امیر اس کی شکل و صورت اور مجرے کے لیے تڑپتے ہیں اور اس کے مکان پر جانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ نور بائی کا مکان ایک عالی شان دربار کی طرح سجا ہوتا ہے۔ رنگا رنگ آرائشی چیزیں ہر طرف نظر آتی ہیں اور اس کی سواری بڑی شان و شوکت سے نکلتی ہے اور آگے پیچھے ملازمین اور چوبداروں کا ہتھیار بند دستہ ساتھ ہوتا ہے۔ جہاں جاتی ہے ہیرے جواہرات سے خاطر کی جاتی ہے اور بے شمار دولت ساتھ لاتی ہے۔ اس کی امیری کا یہ عالم ہے کہ جب اس کو مجرے کے لیے بلایا جاتا ہے تو قیمتی اشیا پہلے ہی بھیج دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناچ گانے کے بعد بھی دولت کا انبار اس کے ساتھ کر دیتے ہیں۔"

نور بائی کے متعلق مشہور تھا کہ جس نے نور بائی سے آشنائی کی وہ تباہ ہو گیا۔ بہت سے امیروں کے گھر برباد ہو گئے تھے۔ لاکھوں کی جائیداد شوقین اور عیاش رئیسوں نے اس کے پیچھے خراب کر دی تھی۔ وہ بڑی ستم گر تھی اور ناگن کی طرح دولت کو ڈس لیتی تھی۔ کمبخت آدمی سے نہیں اس کی دولت سے محبت کرتی تھی۔ جس کے پاس روپیہ تھا، اس کی یار تھی اور جو نادار تھا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ بات یہ تھی کہ وہ بلا کی حسین اور شوخ تھی۔ اس کی بات چیت میں ایک جادو تھا۔ آداب مجلسی سے پورے طور پر واقف

تھی اور بہت ذہین تھی۔ اڑتی چڑیا کو پہچان لیتی تھی۔ باریک سے باریک معاملوں کی تہہ تک فوراً پہنچ جاتی۔ گفتگو میں محاوروں اور مثالوں کا استعمال بڑی عمدگی سے کرتی۔ اس لیے جو امیر اسے دیکھتا اور اس سے بات کرتا اس پر فریفتہ ہو جاتا اور اسے پانے کی آرزو کرنے لگتا۔ اس خواہش کی تکمیل میں وہ اپنا خزانہ لٹا دیتا اور اس کے ایک اشارے پر دولت کا انبار لگا دیتا۔ نور بائی مزید کشش اور اثر پیدا کرنے کے لیے اپنے ساتھ چند حسین و جمیل عورتیں لے جاتی اور ایسا گمان ہوتا کہ چاند ستاروں کے جھرمٹ میں ہے۔

درگاہ قلی خاں نے اس وقت کی ایک اور مجرے والی امیر بیگم عرف ادبیگم کا یوں ذکر کیا ہے ۔

"امیر بیگم دلی کی نامی اور سارے جہاں میں مشہور طوائف ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ محفلوں میں ننگی آتی ہے۔ اس نے اپنے جسم پر چولی اور ٹانگوں پر پاجامے کی نقاشی کروا رکھی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ننگی ہے۔ اس راز کو اس کے گنے چنے یار ہی جانتے ہیں"

درگاہ قلی خاں نے جن طوائفوں اور مجرے والیوں کا ذکر کیا ہے اُن میں چمنی، سر سروپ، چلمک دامنی، رمضانی، زینت، گلاب، رحمٰن بائی، پنّا بائی، کمال بائی، ادا بائی، کنور، اور تنّو شامل ہیں۔ یہ سب کی سب بڑی طرحدار اور دل کو لبھانے والی طوائفیں تھیں جو جانِ محفل سمجھی جاتی تھیں۔ ان کا تذکرہ دور دور تک ہوتا تھا۔ درگاہ قلی خاں ان کا فرداً فرداً نقشہ کھینچنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"آج میں ان عیش کی محفلوں کو یاد کر کے لطفِ عیش حاصل کر رہا ہوں بڑی تمنّا ہے کہ ان باکمالوں کی مجلسوں اور محفلوں میں شرکت کروں لیکن ہائے وہ سوز و ساز کے مزے اب کہاں !"

۱۸۵۷ کی پہلی آزادی کی لڑائی کے بعد جب مغل سلطنت ختم ہو گئی تو چاوڑی بازار میں دونوں طرف کوٹھوں میں طوائفوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ ان میں دلی کی طوائفیں تو تھیں ہی

نگر آس پاس کے علاقوں اور پہاڑوں پر سے بھی معمولی گھٹیا درجے کی بیسوائیں ان کوٹھوں میں آباد ہو گئیں یا لائی گئیں۔ یہ سب بناؤ سنگار کر کے سرِ شام ہی جھروکوں اور برآمدوں میں باریک چلمنیں ڈال کر بیٹھ جاتیں۔ کہیں کہیں جلوہ نمائی کھلے عام بھی ہوتی۔ اپنے طور طریقے اور لباس میں کوئی طوائف عام عورت نہ نظر آتی۔ اس کی سج دھج، اس کے لباس، چال ڈھال اور اشاروں میں ایک کھلا بلاوا ہوتا۔ طوائفیں عام طور پر تمیز سے بولتی تھیں لیکن نچلے درجے کی گھٹیا طوائفیں اگر اپنی پر آ جاتیں تو شہدلے بازی اور گالی گفتار میں لفنگے لچے مردوں کو بھی نیچا دکھا دیتیں۔ طوائفوں کا ناز نخرہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ شوقین مزاج بازار میں گنگناتے پھرتے ــ "بے دانہ مرغِ دل کو، پھنساتی ہیں رنڈیاں!"

دوّنی اور چوّنی جان دلی کی دو نامور مجرے والیاں تھیں۔ انھوں نے اچھے اچھے شوقین نوجوانوں کی چیں بلوا دی۔ سنا ہے ایک بار دونی جان نے مرزا چپاتی سے جو ایک مغل تھے اور تتلاتے تھے کوئی سخت بات کہہ دی۔ مرزا چپاتی کو کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے علاوہ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ان سے دونی جان کی کڑی بات برداشت نہ ہوئی۔ فوراً ایک شعر اپنی توتلی زبان میں پڑھا جسے سن کر دونی پانی پانی ہو گئی۔ وہ شعر یہ تھا:-

دِھتے دِھتے ہو گئی اتنی ملت
تھا ٹَن پیسے کی دونی رہ گئی!

دوّنی جان اور چوّنی جان کی یادگار موتی جان اور نوشابہ جان ۱۹۴۷ تک دلی میں موجود تھیں اور نہایت مہذب طوائفیں تھیں۔

مجرے والیاں اور دوسری طوائفیں تیسرے پہر بیل گاڑیوں، رتھوں، منجھولیوں اور گھوڑا گاڑیوں میں بیٹھ کر نکلتی تھیں۔ شوقین مزاج نوجوان پیدل، گھوڑوں پر، بیچ گاڑیوں اور ٹمٹموں وغیرہ پر بیٹھ کر ان شوخ اور چنچل طوائفوں کو دیکھا کرتے تھے۔ شام کو اس بازار کی رونق اور بھیڑ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی تھی۔ کوٹھوں پر جلوہ نمائی اور باجوں اور گھنگروؤں کی صدا اور طبلے کی تھاپ اور نیچے تماشائیوں کی لہر در لہر بھیڑ، جن کی

نظریں اوپر اٹھی ہوتیں۔ ہونٹوں پر اوپر بھی اور نیچے بھی مسکراہٹوں کی گل پاشی ، آوازے کسنا اور سیٹیاں۔ سارا بازار خوشبوؤں میں نہایا ہوا۔ چھریرے بدن کے بانکے نوجوان' امیر اور امیرزادے بہترین لباس زیب تن کیے، عطر لگائے' سینہ ابھارے' اکڑ اکڑ کر چلتے ہوئے۔ کچھ نوجوان چھپتے چھپاتے کنارے کنارے بھی چل رہے ہیں۔ پان والے اور سگرٹ والے بھی عشاق کی طرح سجے سنورے بیٹھے ہیں۔ وہ ان شوقینوں سے واقف اور شوقین ان سے' کیونکہ ہر روز کا آنا جانا ہے۔ غرضیکہ اس وقت کی چاوڑی شام کو کسی دلہن کی طرح سجتی تھی اور میلوں ٹھیلوں کی بھیڑ اور رونق ہوتی تھی۔ اس رونق اور اس وقت کی طوائفوں کی خوبصورتی اور ناز و ادا کو مشہور شاعر راسخ نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

چاوڑی قاف ہے یا خلدِ بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے یہاں پریوں کے پرے ملتے ہیں

کوٹھوں کا تصور کرتے ہی جام' ساقی اور پیمانے کا خیال آتا تھا کیونکہ ان کے بغیر کوٹھے کیسے۔ ناچنے والی طوائفوں کے ساتھ کسی بھی بدنامی کی بات کو جوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کی رقاصہ اور مغنیہ ہوتی تھیں۔ کچھ طوائفیں خود بھی شعر کہتی تھیں۔ ایک ایرانی پروفیسر نے ایک طوائف سے جب فارسی غزل کی فرمائش کی اور طوائف نے اپنی ہی لکھی ہوئی فارسی غزل سنائی' تو وہ پروفیسر بڑا حیران ہوا۔

مشہور طوائفوں کے کوٹھے خوب سجے ہوتے تھے۔ مسند بچھی ہے۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ پان دان' خاصدان' اور اگالدان قرینے سے رکھے ہیں۔ پیچواں دھرے ہیں۔ دیواروں پر آئینے اور قلمی تصویریں آویزاں ہیں۔ چھت گیریاں لگی ہیں۔ جھاڑ فانوس اور ہانڈیاں لٹکی ہیں۔ شام سے ہی کنول روشن ہو جاتے۔ ہر ذات' برادری' مذہب اور پیشے کا آدمی کوٹھوں پر بے کھٹکے چڑھ جاتا اور ان کے دربار میں حاضر ہو جاتا۔ طوائفوں کی نازبرداری بھی آسان نہ ہوتی۔ ان کی آشنائی کا مطلب اکثر گھر کی بربادی ہوتا۔

نوشابہ جان عرف بی جان ناچنے گانے میں ساری دلی میں مشہور تھی۔ اس کے

مجرے کی محفلوں میں شائقین کی غیر معمولی بھیڑ ہوتی تھی اور حاضرین بھی بڑے ادب سے اس کو سنتے تھے۔ ہنسی مذاق اور شعر خوانی عام بات تھی مگر بے ہودگی کسی سے بھی سرزد نہیں ہوتی تھی۔ نوشابہ جان ترنگ میں آتی تو بہادر شاہ ظفر کا باگیسری بہار کا یہ خیال بھی ضرور سناتی۔

رت بسنت اپنی امنگ سوں
پی ڈھونڈن میں نکلی گھر سوں
ملے تو لال گروا لگا لوں
باگ بندھاؤں پیلی سرسوں
رنگ ہے سبزہ نرگسی یاں کا
کہے شوقؔ رنگ رنگ ہے واکا
ان بھیدن کو کوئی نہ جانے
واقف ہوں میں واکی برسوں

امیر جان، کالی جان، مجیدن بائی، پتلی اور شمشاد بائی بھی اعلیٰ درجے کی گانے والیاں تھیں۔ یہ اپنے ہی ٹھکانوں پر محفلیں کرتی تھیں جن میں شہر کے معزز آدمی شریک ہوتے تھے۔ یہ سب کافی امیر تھیں کیوں کہ اکثر باہر بلائی جاتی تھیں اور کئی ہزار روپے روز سے کم نہیں لیتی تھیں۔ شکل وصورت سے زیادہ حسین نہیں تھیں مگر شوخ اور طرار تھیں اور قد کاٹھ کی اچھی تھیں۔ جب پوری آرائش سے محفل میں آتی تھیں تو یہ گمان ہوتا تھا کہ آسمانی حوریں اتر آئی ہیں۔

آزادی کے بعد دلی میں مجرے کا نام ونشان مٹ گیا۔ چاوڑی بازار تو کافی پہلے ہی ان سے خالی ہو گیا تھا۔ جی۔ بی۔ روڈ آباد ہوئی تو طوائفیں وہاں منتقل ہو گئیں۔ ناچ گانے کی محفلیں جی۔ بی روڈ کے کوٹھوں پر لگنے لگیں۔ نئے دور کی ایک ناچنے گانے والی تارا نامی طوائف بڑی مشہور تھی۔ بلا کی حسین تھی اور غضب کی آواز تھی۔ اس کی ایک چھوٹی بہن اتنی ہی حسین تھی اور دونوں بہنیں جڑواں لگتی تھیں۔ ان کا کوٹھا شام سے ہی

بھر جاتا تھا۔ دونوں بہنیں ساتھ رقص کرتی اور گاتیں اور لوگ ان پر لٹو ہو جاتے۔ پھر طوائفوں کے پیشے پر پابندی لگ گئی تو ناچنے گانے والیوں کے دھندے پر بھی اثر پڑا۔ مجرا ایک گئی گزری اور بدنام تہذیب کا نشان سمجھا جانے لگا۔ دلی میں مجرے کی بحالی کی کچھ کوشش ہوئی لیکن کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ نئے مجروں کی شکل بڑی مختلف تھی اور اس کی آڑ میں عریانی، ذہنی عیاشی اور ہلڑ بازی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مجرے کا وہ ماحول، وہ تہذیب، وہ بے فکری اور شاہ دلی تو اب ایک بھولی بسری بات ہوگئی ہے۔

نوٹنکی، بھگت اور سوانگ

ہندوستان نے اپنے سنسکرت ڈراموں کی شاندار وراثت کو مسلمانوں کے عہد میں کھودیا۔ ۱۹-۱۷۱۳ میں ایک ہندی کوی نواج (نواہ) نے فرخ سیر کے زمانے میں کالیداس کے شہرۂ آفاق ڈرامے شکنتلا کا ترجمہ کرکے سنسکرت ڈرامے کو بحال کرنے کی کوشش کی لیکن اس ترجمے کو جدید معنوں میں کسی بھی صورت میں ڈرامہ نہیں کہا جا سکتا۔ نہ اس میں کردار کی اصلیت تھی نہ سرگرمی اور عمل بھی برائے نام یا نفی کے برابر تھا۔

عوامی تھیٹر میں مذہبی موضوعات پر پرانی مقبول حکایتیں پیش کی جاتی تھیں۔ قدیم عقائد پر مبنی نیم تاریخی یا من گھڑت قصوں کو بھی ڈرامے کا روپ دیدیا جاتا تھا۔ اِن کے پیش کرنے کا طریقہ بھی اتنا بے ڈھب ہوتا تھا کہ انہیں ڈرامہ کہنا غلط ہوگا۔ بے ڈھب سے مراد ڈرامے کے بنیادی اجزا، ضرورتیں اور تکنیکی لوازمات سے ناآگہی ہے۔ انہیں عام لوگوں کی تفریح کے لیے، جن میں گاؤں کے رہنے والوں کی اکثریت ہوتی تھی، کھیل یا تماشے سے زیادہ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تماشے عموماً تہواروں کے درمیان یا ان کے ایک دو دن پہلے پیش کیے جاتے تھے۔ اس دور میں ایسے تماشوں کے لیے جگہ جگہ منڈلیاں بنی ہوتی تھیں جو تماشہ کرتی ہوئی سارے ملک کا دورہ کرتی تھیں۔ زیادہ تر یہ منڈلیاں متھرا اور برندا بن کی تھیں جو بار بار دلی آکر اپنے تماشے دکھاتی تھیں۔ ان کے پاس کوئی قابلِ ذکر سامان نہ ہوتا۔ یہ منڈلیاں کسی بھی مرکزی مقام پر ایک چبوترے نما سٹیج کھڑا کر دیتیں طرح طرح



کی پوشاکیں کپڑے سادھوؤں اور دھوبیوں سے ادھار مانگ کر اکٹھے کر لیتیں۔ شام ہوتے ہی یہ لوگ اپنے چہروں کو لیپ پوت لیتے اور کھیل شروع کر دیتے۔ بعض دفعہ یہ منڈلیاں مشعلوں کی روشنی میں کھیل کرتیں۔ دلی کے گرد و نواح میں بھی دو تین منڈلیاں تھیں۔

مولانا غنیمت نے اپنی مثنوی "نیرنگیٔ عشق" میں ان لوگوں کی بڑی عبرت ناک تصویر کھینچی ہے۔ یہ مثنوی انھوں نے شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں لکھی تھی۔ انھوں نے ان تماشہ کرنے والوں کو "بھگت باز" کہا ہے۔ بھگت باز ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی اور ان کا ایک دوسرے سے گہرا رابطہ تھا۔ شمالی ہندوستان میں دلی کے بھگت باز سب سے زیادہ مشہور تھے اور اپنے فن کے ماہر سمجھے جاتے تھے "ملفوظِ زرّاقی" کے مطابق جب بھگت باز مہابھارت کے واقعات پیش کرتے تھے تو عموماً بھگوان کرشن کے اوصاف اور کارناموں کو دکھایا جاتا تھا۔ تماشے والوں میں سے ہی کوئی آدمی کرشن بن جاتا تھا اور دوسرے کم عمر لڑکے جن کے چہروں پر ابھی سبزہ بھی آیا نہیں ہوتا تھا کرشن کنہیا کی گوپیاں بن جاتے تھے۔ تماشے کے بیچ میں بار بار کبیر کے دوہے گائے جاتے تھے۔

سالار جنگ اول نے "مرقعِ دہلی" میں تقی کے نام کا ذکر کیا ہے جو ایک منڈلی کا سردار تھا۔ تقی کی محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں بڑی قدر اور حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اسے دلی کے امیر اور نواب اپنے محلوں اور حویلیوں میں کھیل دکھانے کے لیے بلاتے تھے۔

اسی دور میں کٹھ پتلی کا ناچ یا کٹھ پتلی کا تماشہ بھی ایک مقبول تفریح کا ذریعہ تھا۔ "کٹھ پتلی" سنسکرت کا لفظ ہے اور اس کا مطلب لکڑی کے بنائے ہوئے ایک چھوٹے انسانی پتلے سے ہے۔ مغل اس کھیل کو شب بازی کہا کرتے تھے۔ کٹھ پتلی کے کھیل یوں تو بڑوں میں بھی مقبول تھے مگر بچے تو اس کے لیے دیوانے ہو جاتے تھے۔ جہاں کٹھ پتلی والے ایک کٹھ پتلی ہاتھ میں لیے اور باقی کی گٹھڑی میں باندھے کسی علاقے میں داخل ہوئے اور بچوں کا غول شور مچاتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کٹھ پتلی والوں کے پاس دکھانے

کے لیے مذہبی موضوعات پر، عشق و محبت کے اور شجاعت کے کارناموں پر بہت ولولہ خیز تماشے ہوتے تھے۔ کیونکہ قصہ ساتھ ساتھ سناتے جاتے تھے اور کٹھ پتلیاں وہی منظر نظروں کے سامنے پیش کرتی رہتی تھیں، سب کو بہت مزہ آتا۔ "سوتر دھار" جس کے لفظی معنی رسیوں یا دھاگوں کو تھامنے والا ہیں ایک کھڑے ہوئے سیٹج کے پیچھے کٹھ پتلیوں کو ہاتھوں میں تھامے بہت باریک رسیوں یا تاروں کے ذریعے حرکت دیتا رہتا تھا۔ سیٹج کے دونوں طرف راستہ کھلا رکھا جاتا تھا تاکہ کٹھ پتلیاں داخل ہوسکیں اور باہر جاسکیں۔ اگر اور کوئی بہتر انتظام نہ ہوتا تو کٹھ پتلی والے پاس کے گھر سے دو چار پائیاں مانگ کر آگے پیچھے کھڑی کر لیتے اور ان پر دری یا چادر ڈال کر سیٹج بنا لیتے۔ دلی میں آئے زیادہ تر کٹھ پتلی والے راجپوتانہ (آج کا راجستھان) کے باشندے ہوتے تھے۔ کٹھ پتلی والوں کا گروہ ایک ہی خاندان کے افراد پر مشتمل ہوتا تھا جیسے کہ باپ، ماں، بیٹے، بیٹیاں اور بیٹوں کی بہویں وغیرہ وغیرہ۔ سب ہی مل کر کٹھ پتلی کا تماشہ کرتے تھے۔ اگر کسی امیر آدمی نے اپنے گھر پر تماشہ کروایا ہوتا تو وہ خود ہی دو چار روپے اور کچھ آٹا یا اناج انہیں دیدیتا ورنہ محلے یا علاقے کے آدمی ہر گھر سے ایک ایک دو دو آنے مانگ کر کٹھ پتلی والوں کو دینے کے لیے اکٹھا کر لیتے۔

ہر ایک گورو اور بھگت کے استاد کا اپنا الگ اکھاڑا ہوتا تھا۔ اکھاڑوں میں آپس میں دوستانہ مقابلہ ہوتا تھا۔ اکھاڑے کا گورو ہی بھگت کھیل کا مصنف، ہدایت کار اور گانوں کی طرزیں بنانے والا ہوتا تھا۔ سیٹج پر گنیش پوجا کا مقدس چراغ جلا کر (جس میں اداکار گنیش خود بھی سیٹج پر رقص کرتا تھا) اصل تماشہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ نوٹنکی میں بھی یہی طریقہ یا رسم ہوتی تھی لیکن نوٹنکی میں اس کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ بھگت میں گنیش پوجا کے فوراً بعد ہی لڑکیوں کے رقص کے ساتھ کھیل شروع کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اصل کہانی پیش کی جاتی تھی۔

۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے بھی بھگت کی عوام میں مقبولیت کے اثر کو محسوس کیا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی بھگت کرنے والوں سے اپنا مقصد پورا

کرنے کے لیے فائدہ اٹھائیں گے۔ عوام میں اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بیدار ہو رہے تھے۔ عوام کی توجہ ان انقلابی خیالات سے ہٹانے کے لیے بھگت کے استادوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ فحش، جنسی جذبات کو ابھارنے والے اور تفریح دینے والے بھگت لکھیں اور کھیلیں۔ اب بھگت کی مذہبی نوعیت صرف گنیش پوجا تک محدود رہ گئی۔ اس کے دیکھنے والے صرف گھٹیا درجے کے لوگ رہ گئے۔ آہستہ آہستہ بھگت کی مقبولیت کم ہوتی گئی اور بعد میں اِن ہی وجوہ سے وہ اتنا زوال پذیر ہوا کہ دو تین دہائیوں میں ہی معدوم ہو گیا۔

بھگت کی جگہ نوٹنکی نے لے لی۔ شروع شروع میں تو یہ تماشہ اکھاڑوں سے ہی وابستہ رہا مگر جوں جوں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اس کی اپنی پارٹیاں اور کمپنیاں بننے لگیں۔ نوٹنکی اپنے تمام اداکاروں کے لیے ایک پیشہ بن گیا۔ جہاں بھگت کرنے والے اکھاڑے خوشحال لوگوں اور امیر آدمیوں سے چندہ اور امداد لیتے تھے وہاں نوٹنکی کا کھیل دکھانے والے تھیٹر کی طرح تماشہ دکھا کر لوگوں سے اجرت کے طور پر پیسے لیتے تھے۔ ہاں بھگت کی طرح نوٹنکی کی کمپنیوں کے ایک دو بڑے آدمی سرپرست ہوتے تھے جو ان کی ساکھ کو قائم رکھنے کی ذمے داری لے لیتے تھے۔

نوٹنکی کا تماشہ تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے بھگت کی طرح ہی تھا لیکن تماشے کی ان دونوں شکلوں میں کچھ اختلافات بھی ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے بھگت کی بنیاد مذہبی جذبات پر تھی۔ نوٹنکی کو بھگت کی ایک تجارتی اور غیر مذہبانہ شکل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ البتہ دونوں میں سٹیج کی تکنیک اور گانے ایک سے ہوتے تھے۔ نوٹنکی نے اپنے پیش کیے جانے والے قصوں کے تنوع میں بھی اضافہ کیا۔

نوٹنکی ایک قسم کا اوپیرا یا موسیقی اور رقص پر مبنی ڈرامہ ہوتا تھا جس میں نثر میں مکالمے بھی شامل ہوتے ہیں۔ نوٹنکی کی موسیقی کلاسیکی نہیں ہوتی اگرچہ اس میں گائے جانے والے گانے پکّے راگوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ نوٹنکی کا بڑا ساز نگاڑا (نقارہ) ہوتا ہے۔ جو دوسرے ساز نوٹنکی میں استعمال ہوتے ہیں وہ ہیں — ہارمونیم، سارنگی،

اور ڈھولک۔ دوہا، چوبولہ، بحر طویل، لدا، دور چھٹی وہ بحریں ہیں جن میں گانے گائے جاتے ہیں۔ ہر ایک دو لائنوں کے بعد نگاڑا پھر اتنی ہی دیر کے لیے بجایا جاتا ہے۔ مگر نوٹنکی میں شروع شروع میں کہانی بیان کرنے کی رفتار بڑی سست رہتی ہے۔ ہر نوٹنکی کی پارٹی کی شہرت کا دار و مدار اس بات پر ہوتا تھا کہ اس کا گویا کس کس قسم کے گانے گا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان دنوں نوٹنکی کے مخصوص لہجے اور طرز میں گانے والے بڑی مشکل سے ملتے تھے اور جو گانے والا بھی شہرت پا گیا اس کے مقابلے میں کھڑا کرنے کے لیے دوسری نوٹنکی کمپنیاں گانے والے کی تلاش میں بڑی بھاگ دوڑ کرتی تھیں۔ جہاں تک نوٹنکی کی زبان کا تعلق تھا، اس کی اپنی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں جو زبان استعمال ہوتی تھی وہ شمالی ہندوستان میں بولی جانے والی بولیوں کا ایک مرکب ہوتی تھی جسے دیہات میں رہنے والے لوگ آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔

نوٹنکی کا تماشہ دیہات کی نوجان ہوتا تھا۔ کئی دن پہلے دُور دُور تک یہ شور مچ جاتا تھا کہ فلاں گاؤں میں نوٹنکی "آنے والی" ہے۔ نوٹنکی کا کھیل عام طور پر تاریخی بہادروں، جنگجوؤں اور عاشقوں کے گرد گھومتا تھا۔ یہ واقعات قدیم زمانے کے ایسے اشعار میں سمو کر، جو عوام کے دل و دماغ کو متاثر کرتے تھے اور ان کی سمجھ سے باہر نہیں ہوتے تھے، پیش کیے جاتے تھے۔ ان اشعار میں سننے والوں کے لیے بڑی کشش اور دلچسپی ہوتی تھی اور انہیں اس طریقے سے ادا کیا جاتا تھا کہ سننے والوں کا شوق اور بڑھ جاتا تھا۔ نوٹنکی میں گانے والوں کی آواز ایسی پاٹ دار ہوتی تھی کہ رات کے سناٹے میں کئی کئی میل دور تک سنائی دیتی تھی۔ اگرچہ نوٹنکی غریب آدمی کا تماشہ ہوتا تھا جو اپنا خرچ خود کما کر پورا کرتا تھا مگر جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کئی زمیندار، امیر اور شہزادے اس کی سرپرستی کرتے تھے اور وہ نوٹنکی کے آدمیوں کو اپنی ملازمت میں رکھ کر ان لوگوں کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کبھی نوٹنکی والوں کو تماشہ کرنے کے لیے کچھ روپے پیسے اپنی طرف سے بھی دے دیتے تھے۔ نوٹنکی کا آغاز عموماً ایک تمہید سے ہوتا تھا جس میں سوتر دھار اور سوتر دھارنی تماشے کی کہانی مختصر طور پر

بیان کرتے تھے۔ یہ دونوں نوٹنکی میں خود بھی کوئی نہ کوئی پارٹ کرتے تھے۔ جہاں ڈرامے کا سب سے بڑا عمل عموماً اشعار کی صورت میں ہوتا وہاں مسخرہ یا جوکر عام طور پر نثر میں بولتا اور ہر وقت کوئی نہ کوئی بات گھڑتا رہتا۔ شہر کے کنجوسوں، بیوپاریوں، امیروں اور طوائفوں کا مذاق اڑاتا اور ان پر پھبتی کستا۔ وہ سماجی برائیوں اور ناانصافیوں پر بھی ہنستا اور طنز کرتا اور رشوت خور افسروں کو تو بالکل نہ بخشتا۔ اِن رشوت خور افسروں کا وہ نام نہ لیتا مگر اِس انداز سے کہتا کہ ان کی شخصیت کھل جاتی۔ مگر وہ اتنا بیوقوف نہیں تھا کہ ان لوگوں میں وہ شہر کوتوال کو بھی گھسیٹ لیتا۔ شہر کوتوال کا ذکر وہ عموماً قانون اور امن کے محافظ کے طور پر ہی کرتا۔

کسی بھی علاقے میں نوٹنکی کی پارٹی کے آنے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی۔ جس روز نوٹنکی شروع ہوتی اس روز بہت پہلے سے ہی نگاڑا بجنے لگتا اور نگاڑا بجنے کا مطلب نوٹنکی کی آمد کا اعلان کرنا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں آدمی، عورتیں اور بچے نوٹنکی والوں کے پڑاؤ کے گرد جمع ہو جاتے اور ان کی نگاہیں نوٹنکی والوں کے آنے کا انتظار کرتی۔ نوٹنکی کی دل چسپی کبھی ختم نہیں ہوتی چاہے کھیلا جانے والا تماشہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو اور تماشائی اسے دیکھ چکے ہوں یا نہیں۔ دراصل کہانی اور گانوں اور مکالموں تک سے آگاہی اور نوٹنکی والوں کا انہیں عمدگی سے پیش کرنے کا مخصوص انداز ہی انہیں تماشے کو پھر دیکھنے پر اکساتا تھا۔ ڈرامہ سلطانہ ڈاکو، امر سنگھ راٹھور اور ستیہ ہریش چندر یا کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ نوٹنکی کے اپنے کچھ مخصوص کھیل بھی ہوتے تھے جنہیں لوگ بے حد پسند کرتے تھے۔ لوگ کھلے میدان میں یا تنبو کے اندر طاقتور نگاڑے کی صدا اور کانوں کو پھاڑنے والی آواز میں مست شام سے سویرے تک بیٹھے رہتے تھے۔

نوٹنکی کے بارے میں یہ خیال کہ یہ جب سے شروع ہوا اپنی شکل و ہیئت میں نہیں بدلا، غلط ہے۔ صدیوں تک پھیلی ہوئی اس مقبول عوامی صنف ڈرامہ میں نئی ضرورتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ نوٹنکی کا پہلا ذکر پندرھویں صدی میں آئینِ اکبری میں ملتا ہے۔ اس میں بھکاری سادھوؤں کے ایک گروہ کا حوالہ دیا

گیا ہے جورات کے وقت اس دور کے مذہبی رہنماؤں کی نقل کرتے ہوئے پرچار کر کے پیسے مانگتے تھے۔ بعد میں ان سادھوؤں نے اپنی نوٹنکی منڈلیاں بنالیں اور سارے شمالی ہندوستان کا دورہ کرنے لگے۔ کچھ عالموں کا یہ کہنا ہے کہ نوٹنکی کا رواج بارھویں صدی میں پنجاب میں تاریخی واقعات کو گاکر سنانے سے شروع ہوا اور بعد میں یہ پارٹیاں مشرق کی طرف چلی گئیں۔ لیکن یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ نوٹنکی کی کسی بھی قسم میں پنجابی زبان کے الفاظ نہیں ملتے اور اس کی زبان' علاقائی اثرات سے قطع نظر خالص ہندوستانی تھی۔

نوٹنکی کے نام کے بارے میں بھی مختلف رائیں ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ نوٹنکی سنسکرت کے لفظ ناٹک سے بنا ہے۔ ایک کہانی جہاں سے اس کا نام نوٹنکی پڑا ہے ملتان کی رانی نوٹنکی کی ہے۔ پڑوس کی ایک ریاست میں دو بھائی بھوپ سنگھ اور پھول سنگھ رہتے تھے۔ بھوپ سنگھ پھول سنگھ سے بڑا تھا۔ ایک دن چھوٹا پھول سنگھ جو بہت خوب صورت اور بہادر تھا شکار سے واپس آتا ہے اور اپنی بھابی کو جلدی سے کھانا دینے کے لیے کہتا ہے۔ اِس پر اس کی بھابی اسے طعنہ دیتی ہے کہ وہ تو ایسے برتاؤ کر رہا ہے جیسے وہ خوبصورت شہزادی نوٹنکی کا شوہر ہو۔ پھول سنگھ کو محسوس ہوا کہ اس کی بھابی نے اس کی بے عزتی کی ہے اور اس کے دل کو چوٹ پہنچائی ہے۔ وہ کھانا کھائے بغیر گھر سے چل پڑا اور یہ قسم کھائی کہ وہ اس وقت تک گھر میں قدم نہیں رکھے گا جب تک کہ نوٹنکی کے ساتھ شادی نہیں کرلے گا۔ اس کا وفادار دوست یشونت سنگھ اس کے ساتھ روانہ ہوجاتا ہے۔ ملتان پہنچ کر ان کی ملاقات محل کی مالن سے ہوجاتی ہے اور وہ اس سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی جھونپڑی میں ٹھہرالو۔ مالن ترس کھاکر مان جاتی ہے اور پھول سنگھ اور اس کا دوست مالن کی جھونپڑی میں رہنے لگتے ہیں۔ یہ مالن ہر روز تازہ پھولوں کا ایک ہار شہزادی کے لیے لے کر محل جاتی تھی۔ پھول سنگھ پھولوں کے ہار اور گلدستے وغیرہ بنانے میں ماہر تھا اور اس نے مالن سے کہا کہ میں ہر روز تمہارے لیے شہزادی کے واسطے ایک خوبصورت پھولوں کا ہار گوندھ دونگا اگر تم اس کے بدلے ہماری روٹی

پکا دیا کرو۔ مالن منظور کر لیتی ہے مگر جب وہ پھول سنگھ کا بنایا ہوا ہار شہزادی کے پاس لے جاتی ہے تو شہزادی کو شک ہو جاتا ہے کہ یہ ہار مالن نے نہیں بلکہ کسی اور نے بنایا ہے اور وہ مالن سے پوچھ تاچھ کرتی ہے۔ مالن کہتی ہے کہ اس کے بھتیجے کی نوجوان بہو کچھ دنوں کے لیے اس کے پاس آئی ہوئی ہے اور وہ ہار اس نے بنایا ہے۔ مگر شہزادی اس کا یقین نہیں کرتی اور اس کو حکم دیتی ہے کہ اس نوجوان عورت کو میرے حضور میں پیش کرو۔ مالن اپنی جھونپڑی واپس آجاتی ہے مگر بڑی پریشان ہے۔ پھول سنگھ اسے تسلّی دیتا ہے کہ وہ بہروپ بھرنے میں یکتا ہے اور اگر وہ زنانہ کپڑے پہن کر ایک نوجوان عورت کے بھیس میں داخل ہوگا تو شہزادی ہرگز یہ نہیں پہچان سکیگی کہ عورت کے لباس میں ایک مرد ہے۔ مالن پہلے تو گھبراتی ہے مگر پھر مان جاتی ہے اور وہ پھول سنگھ کو اپنے بھتیجے کی بہو بنا کر محل میں لے جاتی ہے۔ شہزادی اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر چونک جاتی ہے اور اتنی متاثر ہوتی ہے کہ اسے اپنی سہیلی بنا لیتی ہے۔ وہ ضد کرتی ہے کہ رات کو وہ اس کی مہمان رہے اور اس کے کمرے میں ہی سوئے۔ پھول سنگھ مان جاتا ہے۔ رات کو شہزادی آہ بھر کر کہتی ہے کہ اگر وہ ایک آدمی ہوتی تو اس سے شادی کر لیتی۔ پھول سنگھ یہ سن کر بڑا خوش ہوتا ہے اور شہزادی سے کہتا ہے کہ شہزادی صاحبہ اپنی آنکھیں بند کر لیجئے، اپنے دیوتا کی پوجا کیجئے اور ان سے پرارتھنا کیجئے کہ وہ ہم دونوں میں سے ایک کو مرد بنا دے۔ شہزادی ایسا ہی کرتی ہے اور جب کچھ دیر کے بعد وہ اپنی آنکھیں کھولتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کی ساتھی عورت تو ایک حسین و جمیل مرد میں بدل چکی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور مشغولِ محبت ہو جاتے ہیں۔

صبح کو اس کے محل کی باندی جس نے پھول سنگھ کو دیکھ لیا تھا بادشاہ سے شکایت کرتی ہے کہ اس نے شہزادی کی خوابگاہ میں ایک مرد کو دیکھا ہے۔ بادشاہ آگ بگولہ ہو کر حکم دیتا ہے کہ اس گستاخ نوجوان کو گرفتار کر کے فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ شاہی آدمی پھول سنگھ کو گرفتار کر کے لے جاتے ہیں۔ شہزادی نوٹنکی ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں زہر کا پیالہ لے کر اس جگہ پر پہنچتی ہے جہاں زنجیروں

میں جکڑا ہوا پھول سنگھ اپنی موت کی انتظار میں کھڑا ہے۔ وہ قتل کرنے کے لیے آئے ہوئے سپاہیوں کو وہاں سے بھگادیتی ہے اور اپنے والد سے بھی لڑائی کرنے کے لیے تیار ہے۔ بادشاہ اپنی بیٹی کی دلیری اور حقیقی محبت سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اس کی شادی پھول سنگھ سے کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے پھول سنگھ کی شادی شہزادی نوٹنکی سے ہو جاتی ہے اور وہ ہنسی خوشی اپنی دلہن کے ساتھ گھر واپس آجاتا ہے۔

اس دور میں نوٹنکی کے ساتھ سوانگ بھی ہر خاص و عام کے لیے تفریح کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ سوانگی طرح طرح کے سوانگ بھرتے تھے اور نقل کرنے، بہروپ بھرنے، مذاق اڑانے اور جھوٹ سچ بولنے اور واہی تباہی بکنے میں طاق ہوتے تھے۔ سوانگ کا منبع بھی ڈرامہ ہی ہے۔ سوانگی تہواروں پر اکثر جلوسوں کے ساتھ چلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ سوانگ کا اپنا ایک رنگ ہوتا تھا۔ یہ نوجوانوں اور بڑوں دونوں کے لیے گھٹیا درجے کا مذاق مہیا کرتا تھا اس لیے سوانگ کا درجہ بھگت، شب بازی اور نوٹنکی کے مقابلے میں ہمیشہ بہت کم رہا۔ سوانگ میں جو مذاق کیا جاتا تھا اس کا کوئی برا نہیں مناتا تھا اور نہ اسے قانون کی کوئی خلاف ورزی سمجھی جاتی تھی۔ دلی میں یہ عام رواج تھا کہ بہروپیا، ڈاکیے یا تھانیدار یا کسی انگریز کا بھیس بھر کر تہواروں پر گھر گھر جاتا تھا اور انعام پاتا تھا۔ ایکا ایکی تو گھر کی عورتیں اور بچے یہ پہچان بھی نہیں پاتے تھے کہ دروازے پر کھڑا ڈاکیہ نہیں ہے بلکہ بہروپیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ ایک سوانگ دیکھنے میں مست تھا جب نادر شاہ کی فوجیں دلی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سوانگ کو دو چار بہروپیے مل کر ایک چھوٹے سے ڈرامے کی شکل میں بھی پیش کرتے تھے۔ یہ کھیل زیادہ سے زیادہ بیس پچیس منٹ کا ہوتا تھا اور اس میں بہروپیے جو کردار پیش کرتے تھے عموماً وہ بھی تماشائیوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہوتے تھے اور جنھیں سب پہچانتے تھے۔ سوانگی ایسا بہروپ بھرتے تھے کہ اصلی آدمی ہی معلوم ہوتے تھے۔ پھر ان ہی کی طرح بات کرتے۔ تماشائی بہت ہی خوش ہوتے اور بہروپیوں کو خاطر خواہ انعام دیتے۔ دلی میں بہروپیوں

اور مسخروں کی ایک اور بھی اہمیت تھی۔ جب بادشاہ اپنی رنگ رلیوں میں مست ہوتا یا کوئی تماشہ نجی طور پر دیکھتا ہوا ہوتا تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ اندر جاکر کوئی ناخوشگوار خبر دیتا۔ یہ کام شاہی دربار میں آنے والا مسخرہ یا بہروپیا ہی کرتا۔ محمد شاہ رنگیلے کو بھی نادر شاہی فوجوں کے دلی پر چڑھ آنے کی خبر ایک بہروپیے نے ہی دی تھی۔ سوانگیوں اور بہروپیوں نے بھی بادشاہ اور امرا اور نوابوں کی تفریح کے لیے اپنی الگ الگ پارٹیاں بنالی تھیں۔

دلی میں سوانگیوں اور بہروپیوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو ہر روز ہر طرح کے بھیس بدل کر لوگوں کے سامنے آتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پیشہ ور تھے اور اسی کے ذریعے اپنی روزی کماتے تھے۔ محمد شاہ رنگیلے کے وقت میں بہترین بہروپیا عنایت تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ سلامت کے ذاتی حکیم اور معالج حکیم الملک منھ لٹکائے اور اداس دلّی کے لال قلعے میں آئے اور بادشاہ سے عنایت کی شکایت کی کہ وہ ان کا بہروپ بھر کر دربار میں آجاتا ہے۔ بادشاہ نے ناراض ہوکر حکم دیا کہ اگر آئندہ عنایت حکیم الملک کا بھیس بدل کر دربار میں آئے تو اس کی پٹائی کی جائے اور کوڑے لگانے جائیں۔ یہ بات اگلے کچھ دنوں میں ہی ہوگئی اور "عنایت" کی پٹائی ہوگئی اور دربار سے نکال دیا گیا۔ بعد میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جس نے شکایت کی تھی وہ عنایت تھا اور جسے مار کر دربار سے نکالا گیا تھا وہ خود حکیم الملک تھے!

مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی بہت عرصے تک بہروپیے دلی کی سڑکوں پر نظر آتے رہے۔ اِکّا دُکّا بہروپیہ تو نصف صدی پہلے بھی کہیں کہیں نظر آجاتا تھا۔

بنیادی طور پر نوٹنکی، بھگت، سوانگ اور شب بازی صنف ڈرامہ کی ہی مختلف مگر کم اہم شاخیں ہیں۔ انسان میں جذبۂ اداکاری فطری ہے اور وہ اپنی نظروں کے سامنے کوئی نہ کوئی کھیل ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں تحریری اردو ڈرامے کی بنیاد بلاشبہ امانت کے "اندر سبھا" سے ہی رکھی گئی مگر نوٹنکی، بھگت، سوانگ وغیرہ تو تحریر سے آزاد تھے اور نوٹنکی اور بھگت کی تاریخ تو اردو تحریری ڈرامے سے بہت زیادہ پرانی ہے "اندر سبھا" کے بارے میں یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ اگرچہ لکھنؤ میں یہ سٹیج ہونا ختم ہوگیا کیونکہ

اس کے سرپرست واجد علی شاہ معزول کر دئے گئے تھے مگر دلی کے میلوں میں یہ بہت عرصے تک دکھایا جاتا رہا اور اس کے شو کا ٹکٹ صرف ایک پیسہ ہوتا تھا۔ یہ دلی میں کسی بھی تماشے کا سستے سے سستا ٹکٹ تھا۔

اب دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں نوٹنکی، بھگت اور سوانگ وغیرہ کے لفظ ناآشنا سے ہو گئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ فنون مٹ سے گئے ہیں۔ صرف راجستھان کے کچھ ضلعوں میں ان کی کچھ دھندلی سی شکلیں موجود ہیں۔ ہاں کٹھ پتلی یا شب بازی کا تماشہ بڑا سخت جان ثابت ہوا ہے اور ابھی تک کافی مقبول ہے۔ اب کچھ عرصے سے کچھ شہری ادارے دستانوں اور کاٹھ کی بنی کٹھ پتلیوں سے نئے نئے ڈھنگ کے تماشے پیش کر رہے ہیں مگر ان کے تماشائی گاؤں کے لوگ نہیں، اونچے طبقے کے مرد اور عورتیں ہیں۔ اب تو دیہات کے لوگ بھی جہاں یہ کھیل پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور صدیوں تک ان کا جی بہلاتے رہے شہری زندگی سے متاثر ہو رہے ہیں اور ریڈیو، سینما اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں بی کٹھ پتلی اور نوٹنکی کی کیا بساط ہے کہ اپنی بھونڈی صورتیں دکھائیں۔ جہاں نئی نسل کے لیے یہ پرانے کھیل کوئی معنی نہیں رکھتے، وہاں بزرگوں کے ذہن میں ان کا نام لیتے ہی وہ یادیں جھلملانے لگتی ہیں جو پرانے وقت کے عوام کی سادہ اور ہنسی خوشی سے بھرپور زندگی سے جڑی ہوئی تھیں اور آسانی سے نہیں بھلائی جائیں گی۔



کربلا بھانڈ اور محمد شاہ رنگیلا

بھانڈ اور نقّال

دلی والوں کی شوقین مزاجی اور شاہ خرچی مشہور تھی۔ دلی میں ایک سے ایک منچلا رئیس تھا جن کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے لائق تھے۔ انہیں نت نئی سوجھتی تھی۔ ذرا سا موقعہ ملتا، کوئی محفل سجا لیتے۔ کوئی بھی تقریب ہوتی، بھانڈ، نقّال اور طوائفیں بلائی جاتیں۔ مغلیہ عہد میں بھانڈوں اور نقالوں کی اپنی مخصوص اہمیت تھی اور ان کی قدر خواص اور عوام دونوں کرتے تھے۔ جہاں تقریبات کے موقعوں پر تو بھانڈ اور نقال بلائے جاتے ہی تھے، یہ لوگ خود بھی بازاروں اور کوچوں میں تماشے کرتے پھرتے تھے اور لوگوں کو محظوظ کرتے تھے۔ یہ پتہ لگتے ہی کہ نقال اور بھانڈ کسی بازار میں گھوم رہے ہیں، لوگوں کی بھیڑ ان کے گرد اکٹھی ہو جاتی۔ بھانڈ اور نقال دلی کی قدیم سماجی زندگی کا ایک اہم جزو تھے۔ چاندنی چوک میں تو خاص طور پر شہر کے منتخب نقال اور مسخرے جمع ہو جاتے تھے اور جگہ جگہ اپنی دکان سجا کر ناظرین کو محظوظ کرتے تھے۔

مغلیہ عہد سے پہلے بھی دلی میں بھانڈ اور نقال تھے مگر اس عہد کی کتابوں میں ان کا ذکر کسی تفصیل سے نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اتنا اہم نہیں سمجھا گیا کہ ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے۔ مگر جلال الدین خلجی کے عہد کا ایک واقعہ متعدد سفرناموں اور کتابوں میں ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شام کو بھانڈ اور نقّال دلی کی گلیوں اور سڑکوں پر جلال الدین خلجی کا مذاق اڑاتے پھر رہے تھے۔ جلال الدین خلجی بڑا کمزور بادشاہ تھا اور

اس سے زیادہ نرمی برتنے والا حکمران شاید تاریخ میں نہیں ہوا۔ اسی لیے نقالوں کو اس کا مذاق اڑانے کا حوصلہ ہوا۔ مگر سلطان کے پہرے داروں نے ان سب کو گرفتار کرلیا اور بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ کتنا بھی نرم اور کمزور ہو، آخر بادشاہ ہوتا ہے اور کوئی بھی حکم صادر کرسکتا ہے۔ اس لیے یہ نقال اس ڈر سے کانپ رہے تھے کہ انہیں بادشاہ کی بے عزتی کرنے کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ ان میں سے ایک نقال بادشاہ کے بھیس میں تھا اور دوسرے نقال طرح طرح کے تمسخر آمیز لباس پہنے بادشاہ کے درباری بنے ہوئے تھے۔ جب جلال الدین خلجی نے اپنے پہرے داروں سے ان کا جرم پوچھا تو ایک نے بتایا کہ کس طرح یہ نقال اور بھانڈ سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ کے سامنے بادشاہ اور اس کے درباریوں کے خلاف نازیبا کلمات استعمال کر رہے تھے۔ بادشاہ نے یہ سن کر ان نقالوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے سامنے وہ سب کچھ دوبارہ کرکے دکھائیں۔ نقال یہ سن کر اور بھی گھبرا گئے کیونکہ بادشاہ کے سامنے اس کا ہی مذاق اڑانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ مگر جب بادشاہ کا حکم سختی سے دہرایا گیا تو انھوں نے وہیں "دربار" لگایا اور "درباریوں" نے جو بادشاہ سے بدظن تھے بادشاہ کے خلاف خوب زہر اگلا۔

جلال الدین خلجی اس تماشے سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے نقالوں کو سزا دینے کی بجائے انہیں سونے کی اشرفیاں انعام میں دیں۔ بادشاہ نے اپنے پہریداروں سے بھی کہا کہ یہ لوگ نقال اور بھانڈ ہیں اور نقالی ان کا پیشہ ہے جس سے وہ لوگوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ یہ نقالی گدا سے لے کر بادشاہ تک کسی کی بھی ہوسکتی ہے۔ ان کے عمل سے کسی کی تضحیک اور دل آزاری مقصود نہیں ہے۔

"تذکرۂ عطا الملک" میں لکھا ہے کہ نقال ہندی اور فارسی میں طنزیہ اشعار اور نثر کی صورت میں دلی کے گلی کوچوں میں خانِ دوران خاں کا مذاق اڑاتے تھے کیوں کہ اس نے مرہٹوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ خان دوران خاں کے خلاف اتنا کچھ کہا گیا کہ اس کی دور دور تک بدنامی ہوگئی اور معاملہ شہنشاہ تک بھی پہنچ گیا۔ اس نے

حکم دیا کہ نقالوں کے سردار کو گرفتار کر کے اور اس کا کالا منہ کر کے گدھے پر الٹا سوار کر کے سارے شہر میں گھمایا جائے۔ فولاد خاں کوتوال نے جو حبشی نسل کا تھا بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی۔ جب نقال کو بازار میں سے لے جایا جا رہا تھا تو ایک سپاہی نے اعلان کیا۔" جو آدمی خان دوران کی تضحیک کرے گا، اس کا یہی حشر ہوگا۔" وہ نقال فوراً چلا کر ایسے بولا جیسے اس اعلان کی مزید وضاحت کر رہا ہو۔" یہ سزا اسی کو ملے گی جو مرہٹوں کو چوتھ دیگا اور ان کی اطاعت کرے گا۔"

دلی کا ایک مشہور بھانڈ ہوا ہے جس کا نام "کریلا" تھا۔ وہ محمد شاہ کے عہد کا تھا۔ کسی بات پر ناراض ہو کر محمد شاہ نے حکم دیا کہ اس کی سلطنت سے سارے بھانڈوں کو نکال دیا جائے۔ دوسرے دن محمد شاہ کی سواری نکلی تو ایک جگہ اوپر سے بھانڈوں کے گانے اور ڈھول بجانے کی آواز آئی۔ محمد شاہ نے تعجب سے سر اٹھا کر دیکھا تو کریلا اور چند دوسرے بھانڈ ایک کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے ڈھول بجا بجا کر گا رہے تھے۔ سواری رکوا کر بادشاہ نے غصے سے پوچھا ۔۔۔ یہ کیا گستاخی ہے اور ہمارے حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہوئی؟ اس پر کریلا نے اوپر بیٹھے بیٹھے ہی کہا ۔۔۔" قبلہ عالم! ساری دنیا تو جہاں پناہ کے زیر نگیں ہے۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ اس لیے عالم بالا کا ارادہ کیا اور پہلی منزل ہے۔ یہاں بھی حیات تنگ ہوئی تو اوپر چلے جائیں گے۔" اس جملے پر بادشاہ اور اس کے مصاحبین ہنس پڑے اور بادشاہ نے انہیں معاف کر کے اپنا حکم واپس لے لیا۔

بھانڈوں کا ایک گروہ ناچنے والوں کا تھا۔ یہ باقاعدہ مجرا کرتے تھے۔ ایک نوخیز اور خوش رو لڑکا جس کے لڑکیوں کی طرح لمبے بال ہوتے تھے، رنگین اور زرق برق زنانہ کپڑے پہن کر اور پاؤں میں گھنگرو باندھ کر ناچتا تھا۔ اس کے ساتھ جو ساز بجتا تھا وہ بھی جذبات کو ابھارنے والا ہوتا تھا۔ اس کے ناچ میں غیر معمولی چلت پھرت اور نخرہ اور شوخی ہوتی تھی۔ آواز بھی نسوانی ہوتی تھی جس میں چہک اور لہک دونوں ہوتی تھیں۔ ساز بجانے والوں کے علاوہ چھ سات بھانڈ ایسے موجود رہتے تھے جن کا کام تالیاں

بجانا اور واہ واہ کرنا تھا۔ یہ لوگ بھی ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ لوگ ان کی خلاف تہذیب حرکتوں، اشاروں اور جملوں پر بھی خوب ہنستے تھے۔ جب ناچنے اور گانے والا لڑکا تھک کر کچھ دیر کے لیے رک جاتا تو یہ بھانڈ بیچ میں آجاتے اور نقالی کا کمال دکھاتے۔

دلی کے ایک بگڑے دل رئیس نے جسے لوگ اُس کی فضول خرچی کے سبب "نواب صاحب" کہا کرتے تھے ایک محفل کا اہتمام کیا۔ ان کے دوست، احباب سرِشام ہی پہنچ گئے۔ پہلے کچھ شطرنج اور تاش کی بازیاں ہوئیں۔ پھر دیوان خانے میں کھانا کھا کر سب لوگ کھلی چھت پر چڑھ گئے جہاں پہلے ہی دری چاندنی کا فرش تھا اور گاؤتکیے لگے ہوئے تھے۔ حقے اور پیچواں لگے ہوئے تھے اور چاندی کے خاصدانوں میں پان کی گلوریاں رکھی تھیں۔ چاندنی رات تھی۔ نواب صاحب نے میر کلو کو جو مختارِ کل تھے اشارہ کیا اور پہلو کے کمرے سے سبز رنگ کی پشواز پہنے ایک گوری چٹی حسین عورت نکلی اور اپنے قیامت خیز سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ محفل پر اس نے ایک نظر ڈالی اور پھر نہایت ادب سے مجرا کیا۔ اوہو یہ تو موتی بھانڈ تھا! پیچھے دو سارنگی والے، ایک طبلچی، ایک مجیرے والا اجلی پوشاکیں پہنے آکھڑے ہوئے۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ سارنگیوں پر لہرا شروع ہوا۔ موتی بھانڈ نے گت بھری تو یہ معلوم ہوا کہ اندر کے اکھاڑے کی پری اتر آئی۔ تین سلاموں پر مجرا ختم ہوا تو چاروں طرف سے "سبحان اللہ" کی آواز بلند ہوئی۔ موتی بھانڈ نے تسلیمات عرض کیں۔ پھر کوئی ایک گھنٹے تک کتھک ناچ کے مشکل توڑے سنائے۔ پھرے کی تقسیم ایک سے سولہ تک سنائی۔ آخر میں تتکار کا کمال دکھایا۔ سب نے جی کھول کر داد دی۔ موتی بھانڈ واقعی اپنے فن میں یکتا تھا۔ جب اس نے حاضرین کی فرمائش پر مور کا ناچ بھی دکھایا تو اس کے تھرکنے پر محفل لوٹ لوٹ گئی۔ نواب صاحب نے ناچ ختم ہونے پر اسے بلایا اور بولے: "موتی تم پر یہ فن ختم ہے۔ مور کا ناچ دوسرے بھی ناچتے ہیں مگر جس طرح سے تم ناچتے ہو، یہ اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ بالخصوص ناچتے ناچتے مور اپنے پیروں کو دیکھتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو جس خوبی

اور سچائی سے تم ادا کرتے ہو، وہ تمہارا ہی حصّہ ہے۔" نواب صاحب نے یہ کہہ کر ایک اشرفی اور چند روپے انعام دئے۔ موتی بھانڈ نے انعام لے کر مؤدبانہ تین سلام کیے اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "حضور کی ذرہ نوازی اور فن کی قدردانی ہے، ورنہ میں کیا، میری بساط کیا۔ من آنم کہ من دانم۔" یہ شائستگی، یہ تہذیب صرف دلی کے فن کاروں میں پائی جاتی تھی۔ موتی کے بعد دلی میں نوری اور کلن جیسے بھانڈ رہ گئے تھے جو بھنڈیلوں اور نقالوں کے سہارے زندہ تھے اور کمینوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

ایک نواب صاحب بھانڈوں کے ایک گروہ کے تماشے سے اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے انہیں ایک شال پیش کی۔ یہ شال بڑی پرانی تھی اور بھانڈوں نے دیکھ لیا تھا کہ نواب صاحب انہیں ٹرخا رہے ہیں۔ ایک بھانڈ نے پوچھا۔ "اس شال کا رنگ کیا ہے؟"۔ "زرد" دوسرے نے جواب دیا۔ "تمہیں تو یرقان ہے۔" پہلے بھانڈ نے چڑ کر کہا۔ "بھئی اس کا رنگ ہرا ہے۔" تیسرا بھانڈ بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ساون کے مہینے میں اندھے ہوئے ہو۔ اسی لیے تمہیں ہر چیز ہری نظر آتی ہے۔" پہلا بھانڈ بولا۔ چوتھے بھانڈ نے شال کو ذرا قریب سے دیکھ کر کہا۔ "یہ تو سرخ ہے۔" "تمہاری آنکھیں دکھنے آئی ہیں کہ تم اس شال کو سرخ بتاتے ہو۔" پہلا بھانڈ بولا اور پھر اس نے شال کو ہاتھوں میں پھیلا کر آسمان کی طرف اٹھایا اور بولا۔ "دیکھو اس میں سے تارے صاف نظر آرہے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ نیلے رنگ کی ہے۔" نواب صاحب بھانڈوں کی باتیں سن کر شرمندہ ہوگئے اور انھوں نے ایک نئی اور قیمتی شال منگوا کر ان کو دی۔

بھانڈوں کے اسی طرح کے بہت سے لطیفے اور نوک جھونک مشہور ہے۔ کسی رئیس نے انعام میں ایک بھانڈ کو دوشالہ دیا مگر وہ دوشالہ بوسیدہ اور پرانا تھا۔ ایک نقال نے ہاتھ میں لے کر اسے غور سے دیکھنا شروع کر دیا اور اس پہ گہری نظریں جمادیں۔ دوسرے نے پوچھا دیکھتے کیا ہو؟ وہ بولا دیکھتا یہ ہوں کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ پوچھا آخر کیا لکھا۔ اٹک اٹک کر اس نے بڑی مشکل سے پڑھا۔ لا الٰہ اللّٰہ۔ پوچھا۔ بس اتنا ہی۔ جواب دیا۔ "یہ دوشالہ حضرت محمد الرسول اللّٰہ سے پہلے کا ہے۔"

ایک نواب صاحب گڑھیا والے نواب مشہور تھے' اس لیے کہ ان کے مکان کے قریب ایک گڑھیا تھی۔ ان کے یہاں کسی تقریب میں محفلِ رقص وسرود تھی۔ ایک بھانڈ گھبرایا ہوا نکل کر سامنے آیا اور سب ساتھیوں نے کہا۔۔ اٹھو اٹھو تعظیم کرو۔ سب بولے کس کی تعظیم کریں، کوئی ہے بھی ؟ بولا۔۔ نواب صاحب آتے ہیں اور یہ کہہ کر ایک ہانڈی جو کھولی تو ایک بڑا سا مینڈک اچھل کر بیچ محفل میں بیٹھ گیا۔ اس بھانڈ نے سب سے کہنا شروع کر دیا۔۔ جلدی اٹھو، جلدی اٹھو۔ ساتھیوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ آخر کس کے لیے اٹھیں۔ بولا۔۔ تم نے پہچانا نہیں ؟۔۔ آپ گڑھیا کے نواب ہیں!

ایک مرتبہ کچھ سپاہی کسی نقّال کو پکڑ کر بہادر شاہ اوّل کے سامنے لائے۔ بہادر شاہ نے اس کی مکروہ صورت دیکھ کر حکم دیا۔۔ لے جاؤ اس کو ہمارے سامنے سے اور صبح سویرے پھانسی پر لٹکا دو۔ کیسی منحوس صورت ہے اس کی۔ خدا جانے آج کھانا بھی نصیب ہویا نہیں۔" نقّال ہاتھ جوڑ کر بولا۔"حضور آج آپ نے میری صورت دیکھی تو کھانے کے لالے پڑ گئے۔ اس غلام نے حضور کی صورت دیکھی تو پھانسی پانے کا حکم مل گیا؟" نقال کی بات سن کر بادشاہ کو ہنسی آگئی اور اس نے نقال کی رہائی کے لیے حکم دیدیا۔

بھانڈ ذو معنی بات کہنے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ دلی کے ایک رئیس کے یہاں کسی تقریب کے سلسلے میں محفل منعقد تھی۔ محفل میں رئیس کے چند مہمان نواب عبدالرحمٰن کی مالی حالت کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی نے کہا۔" نواب صاحب کی اگلی سی شان اب کہاں۔ ان کے بڑے صاحبزادے کی شادی کے موقعے پر شہر بھر کی رنڈیاں اور نقالوں کے طائفے بلائے گئے تھے۔ دیکھئے اب چھوٹے میاں کی شادی پر کیا ہو۔" اسی اثنا میں نواب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ مہمان تو خاموش ہو گئے لیکن نقالوں نے اپنی نقل پیش کی۔ ان ہی دنوں مفتی صاحب نے ایک رنڈی رکھ لی تھی جس کے سارے شہر میں چرچے تھے اور مفتی صاحب بہت بدنام ہو گئے تھے۔ نقالوں نے یہ نقل پیش کی۔۔

پہلا نقّال : میاں سنا ہے نواب صاحب کے چھوٹے لڑکے کی شادی ہے؟

دوسرا نقال : ہاں صاحب سنا تو ہے۔ خوب لطف رہے گا۔

پہلا نقال : چھوٹے صاحبزادے کی شادی میں مشتری بائی کا گانا ہونا چاہیئے۔ کیا خیال ہے؟

دوسرا نقال : خیال تو نیک ہے لیکن پانچ ہزار سے کم نہ لے گی۔

پہلا : مشتری نہ سہی، زہرہ کو بلا لیجئے۔ میرا خیال ہے گانے میں مشتری سے کم نہیں۔ دام بھی مناسب لے لے گی۔

دوسرا : جی ہاں، شاید دو ہزار پر مان جائے۔

پہلا : کیا کہا دو ہزار؟ بھئی یہ بھی زیادہ ہیں۔

دوسرا : تو پھر منّی کو بلالو مگر وہ بھی پانچ سو تو لے گی۔

پہلا : نہیں بھئی اتنی بھی گنجائش نہیں ہے۔

دوسرا : تو رنگیلی کیسی رہے گی۔ وہ تو دو سو روپے میں ہی آ جائے گی۔

پہلا : کوئی اس سے بھی سستی نہیں ہے؟

دوسرا : تو پھر مفتی کی بلالو۔

اس پر ساری محفل قہقہہ زار ہو گئی کیونکہ مفتی سے مطلب بغیر دام کی بھی تھا اور مفتی صاحب کی داشتہ سے بھی تھا۔ اتفاق سے مفتی صاحب بھی اس محفل میں بیٹھے ہوئے تھے اور انہیں اس نقل پر کافی خفت کا سامنا کرنا پڑا۔

حافظ چندا، خواصی، مزا، یارو، لذت، سبزہ اور بادل محمد شاہ کے درباری نقال تھے۔ ان کی نسبت مشہور تھا کہ جن رئیسوں اور نوابوں کے یہاں جاتے، ان کی نقل ضرور کرتے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ ان پر چوٹ نہ کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس خوبصورتی اور عمدگی سے اِن نقالوں نے امرا اور روسا کو سبق دیئے ہیں اور ان کی خامیوں اور لغزشوں پر انہیں تنبیہہ کی ہے وہ اور کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ یہ نقاّل جس کی بھی نقل کرتے، کمال کر دیتے۔

کسی رئیس کی محفل میں نقاّل بلائے گئے۔ مجرے سے پہلے دعوت کا اہتمام تھا دعوت بھی بڑی پر تکلف تھی۔ سینکڑوں قسم کے لذیذ کھانے دستر خوان پر چنے جا رہے تھے

ان کھانوں کی خوشبو نے نقالوں کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ بھی بھوک کے مارے بے حال ہو رہے تھے اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ رئیس کے دوستوں اور احباب نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا مگر نقال بچارے منہ دیکھتے رہ گئے۔ ان کے لیے صاحبِ خانہ نے موٹی موٹی روٹیاں اور آلو کی سبزی بھجوا دی۔ سبزی کیا تھی نرا پانی تھا جس میں آلو کے قتلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ جب نقال محفل میں آئے تو انھوں نے یہ نقل پیش کی۔

پہلا نقال : حضور نواب صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ سینکڑوں قسم کے میوے اور لذیذ کھانے دسترخوان پر موجود تھے۔

دوسرا نقال : واللہ پھر تو خوب لطف رہا ہوگا۔

پہلا : جی ہاں، لیکن وہ لذیذ کھانے اور پکوان مہمانوں کے لیے تھے۔ ہم تو گھر والے تھے۔

دوسرا : تو آپ نے کیا کھایا؟

پہلا : نواب صاحب نے از راہِ کرم ہمارے لیے روٹیاں بھجوا دیں۔ لیکن ذرا کچی اور اس قدر موٹی کہ نہ کاٹے کٹیں اور نہ چابے چبیں۔

دوسرا : روٹیوں کے ساتھ سالن کیا تھا؟

پہلا : آلو کی سبزی۔ لیکن اس میں آلو ڈھونڈنے کے لیے ہم نے پہلے اپنی قمیص اتاری، پھر انگرکھا۔ جب جسم کے سب کپڑے اتار لیے تو سبزی کے شوربے میں لاکھ غوطہ لگایا مگر آلو پکڑنے میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ خود ڈوبتے ڈوبتے بچے!

ایک بھانڈ نواب سعادت علی خاں کا بہت منہ چڑھا تھا۔ اس نے ایک دن نواب صاحب سے کوئی مذاق کیا جو نواب صاحب کو شاق گزرا۔ اس پر انھوں نے بھانڈ سے کہا کہ جب جانیں کہ تم جہانگیر بیگ سے کوئی ایسا فقرہ کہو جس پر وہ جھینپ جائے۔ بھانڈ نے کہا بہتر ہے۔ جہانگیر ایک مشہور بانکا تھا اور وہ ترڑی میں آ کر نواب سعادت علی خاں کے طعنہ دینے پر اپنی ناک کاٹ کر نکٹا ہو گیا تھا۔ وہ ایک دن دریا کے کنارے اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ

یہ بھانڈ دریا میں سے نہا کر نکلا اور سلام کر کے جہانگیر بیگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ جہانگیر بیگ نے کہا۔" کہو اچھے تو ہو؟" اس پر بھانڈ بولا " خداوند اچھا ہوں۔" اس کے بعد اس کے چہرے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔" خداوندِ آتنی کٹ گئی ہے اور بھی کٹ جائے گی۔" اس پر جہانگیر بیگ اس کی طرف غصے میں بڑھا مگر وہ بھاگ گیا۔ عرصے تک وہ اور اس کے شاگرد اس کی تلاش میں رہے۔ آخر میں نواب سعادت علی خاں نے بھانڈ کو بلا کر جہانگیر بیگ کے قدموں میں اس کا سر رکھوا کر یہ کہہ کر معافی دلوادی کہ یہ تو بھانڈ ہے اور یہی بھانڈوں کی روزی ہے۔

ایک دن مشہور بھانڈ کریلا، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، ایک محفل میں بلایا گیا۔ اندھے شاعر جرأت بھی موجود تھے۔ کریلا ان کے ساتھ نوک جھونک کرتا رہتا تھا اور جرأت اس کا برا نہ مانتے تھے۔ کریلا نے یہاں بھی نقل کی اور ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر، دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح آگے بڑھا دیا۔ ٹٹول کر پھرنے لگا اور بولا۔" صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے، کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے؟"

پھر کسی محفل میں ایک زچہ کا سوانگ بھرا اور ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھتنا گھس گیا ہے۔ خود سیانا بن کر بیٹھا اور جس طرح جنات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے، اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا۔" ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے۔ جرأت ہے تو باہر نکل آ تاکہ ابھی جلا کر خاک کر دوں۔"

"چونی والوں" کا تھیٹر

ہندوستان میں سٹیج اور تھیٹر کی ابتدا پرتگالیوں کے آنے سے ہوئی۔ پرتگالی ۱۴۹۸ میں تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ ان لوگوں نے اردو زبان کی وہ شکل سیکھی جو ان دنوں رائج تھی اور جسے پرتگالی "اندستانی" کہا کرتے تھے۔ ان کے آنے کے دس بیس سال بعد ہی پرتگالی پادریوں نے دکن اور شمالی ہند میں اردو ڈرامے سٹیج کیے۔ ان ڈراموں کے ذریعے وہ حضرت عیسٰی کی زندگی کے مختلف پہلو پیش کرتے تھے۔ ۱۵۵۰ کے بعد اردو ڈرامے کافی تعداد میں سٹیج کیے جانے لگے۔ پھر جب ہندوستان میں انگریز سوداگر آئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی بنی تو ان کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ بڑے شہروں میں تو اور خاص طور پر بمبئی اور کلکتہ میں ان کی خاصی آبادی ہو گئی۔ جب ان کے پاؤں کچھ جم گئے تو انھوں نے تھیٹر کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے ۱۷۷۰ میں "بمبئی تھیٹر" قائم کیا جو چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ مگر وہ دوبارہ ۱۸۴۴ میں بمبئی میں ہی گرانٹ روڈ پر شروع ہو گیا۔ اس کے لیے مفت زمین وہاں کے جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے دی تھی۔ یہ تھیٹر زیادہ تر انگریز تماشبینوں کے لیے تھا اور کئی سال تک اس میں انگریزی ڈرامے سٹیج کیے گئے مگر بعد میں شنکر سیٹھ کے کہنے پر جو تھیٹر کی انتظامیہ کمیٹی کا ایک ممتاز رکن تھا' اس میں اردو' گجراتی اور مراٹھی ڈرامے بھی پیش کیے جانے لگے۔ اگرچہ یہ تھیٹر آخر کار انگریزوں کی بد دماغی اور بد انتظامیوں کے سبب بند ہو گیا مگر بمبئی میں اردو ڈراموں

"یہودی کی لڑکی" کا ایک منظر





پروفیسر ونسر ر. بہادر شاہ ظفر کے طور پر

کو مقبول بنایا گیا۔ اس کے بعد پارسیوں نے اردو ڈرامے اور سٹیج کی باگ ڈور سنبھال لی اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو میں تھیٹر کی تاریخ کم و بیش پارسیوں کی قائم کی ہوئی تھیٹریکل کمپنیوں کی ہی تاریخ ہے۔ ڈرامے کی جتنی کمپنیاں بمبئی میں قائم ہوئیں اس سے نصف بھی باقی شہروں میں نہیں ہوئیں۔ اس کے علاوہ کلکتہ اور دہلی وغیرہ میں بھی جو کمپنیاں قائم ہوئیں ان میں سے زیادہ تر کے صدر مقام یا تو بمبئی میں تھے یا ان کے انتظام میں پارسیوں کا ہاتھ تھا۔ یہ بات خاص طور پر اس وقت کے مخصوص اردو ڈرامے کی نشو و نما کے دور پر عائد ہوتی ہے۔ اس وقت کی کچھ مشہور پارسی تھیٹر کمپنیاں یہ تھیں۔

پارسی ڈرامیٹک کور، امبروز یا پارسی تھیٹریکل کمپنی، اوریجنل تھیٹریکل کمپنی، پارسی ناٹک منڈلی نمبرا اور نمبر دو، وکٹوریہ ناٹک منڈلی، الفریڈ ناٹک منڈلی، الفریڈ تھیٹریکل کمپنی، ایمپائر تھیٹریکل کمپنی، امپیریل تھیٹریکل کمپنی، رائزنگ سٹار تھیٹریکل کمپنی، انڈین تھیٹریکل کمپنی اور ایمپریس وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی۔

سیٹھ پیسٹن جی فرامجی پارسی سٹیج کے بابا اور بانی تھے۔ ان کی موت پر ان کی اوریجنل تھیٹریکل کمپنی جس نے عوام میں اردو ڈرامے کو مقبول بنانے میں ایک عظیم کام کیا تھا، ختم ہو گئی۔ ان کے دو مشہور اداکاروں بالی والا اور کاؤس جی نے اپنی اپنی علیحدہ کمپنیاں بنا لیں۔ بالی والا نے ۱۸۷۷ میں لارڈ لٹن کے دربار کے موقعے پر دلّی میں وکٹوریہ ناٹک کمپنی قائم کی۔ وہ اپنے زمانے کا ایک باکمال اور بہترین مزاحیہ اداکار تھا۔ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک باوصف پیدائشی اداکار تھا۔ جونہی وہ سٹیج پر آتا تھا، حاضرین قہقہے لگانا شروع کر دیتے تھے۔ اس کے اداکاروں کے گروپ میں مس گوہر بھی تھی جو اپنے وقت کی بڑی مشہور اور حسین اداکارہ تھی۔ ایک انگریز اداکارہ میری فینٹن بھی تھی جس نے سٹیج پر ہندوستانی گانے گا کر کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کاؤس جی نے اس کے مقابلے میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بنالی تھی۔ المیہ اداکاری اور المیہ سٹیج کرنے میں کاؤس جی کا جواب نہیں تھا۔ اس نے دلی

ڈرامہ "قتلِ نظیر" پیش کیا جو اس وجہ سے بہت زیادہ مقبول ہو گیا کیونکہ ان ہی دنوں دلی کی ایک مشہور طوائف بے نظیر کا قتل ہو گیا تھا اور اس کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔

کلکتہ میں بھی انگریزی سٹیج اٹھارویں صدی میں ظہور میں آیا۔ دراصل یہ اس شہر میں انگریزوں کی سماجی زندگی، کلبوں اور رقص گاہوں کی ہی پیداوار تھا۔ لال بازار سٹریٹ میں ایک ڈرامہ گھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنگال کو فتح کرنے سے پہلے ہی قائم تھا۔ ۱۸۵۲ تک اس میں انگریزی ڈرامے پیش کیے گئے۔ کلکتہ میں اردو ڈراموں کو سٹیج کرنے کی کمپنیاں بیسویں صدی کے آغاز میں ہی قائم ہوئیں۔ اس وقت کی چند قابلِ ذکر کمپنیوں کے نام یہ ہیں :-

انڈین آرٹس ایسوسی ایشن کلکتہ — جسے کجن بائی نے ۱۹۲۵ میں قائم کیا۔

ہندوستانی تھیٹرز کلکتہ — ۱۹۴۶ میں فدا حسین مراد آبادی نے قائم کیا۔

میڈن تھیٹرز لمیٹڈ کلکتہ — اس کے مالک پارسی جمشید جی فرامجی میڈن تھے جنہوں نے دھرم تلا سٹریٹ پر کورینتھن تھیٹر کے نام سے ایک پختہ اور عالیشان ڈرامہ گھر تعمیر کرایا۔

لکشمی تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ — ماسٹر چھیلا نے ۱۹۴۸ میں قائم کی تھی۔

کرزن آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی — ۱۹۲۵ میں دھومی خاں جھریا والے نے قائم کی تھی۔

کورینتھن تھیٹریکل کمپنی — ۱۹۳۲ میں محمد اسحاق اور رستم جی دریا والے نے قائم کی تھی۔

شاہجہاں تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ — مانک لال جی نے ۱۹۳۰ میں قائم کی تھی۔

پرستان تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ — ۱۹۳۰ میں قائم ہوئی تھی۔ مالک دیوان چند شرما تھے۔

اگرچہ اردو ڈرامے کی مقبولیت کے اس دور میں، سینکڑوں تھیٹریکل کمپنیاں ملک کے بڑے بڑے شہروں میں سرگرمِ عمل تھیں اور جو عمدہ اور مقبول ڈرامے بھی پیش کر رہی

تھیں اور دوسرے شہروں کا کاروباری دورہ بھی کرتی تھیں مگر بدقسمتی سے بیشتر کمپنیاں دو تین سال کام کرنے کے بعد ہی بند ہو جاتی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ انتظامیہ صلاحیت کی کمی اور حسابات کو ٹھیک طرح نہ رکھنا تھی۔

ہر ایک کمپنی عموماً اپنا ڈرامہ نویس رکھتی تھی۔ اردو ڈرامہ نویسوں کی مانگ دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی اور ان کی اجرت یا معاوضہ زیادہ ہوتا تھا کیونکہ اردو ایک کُل ہند زبان تھی اور اردو کے ڈرامے ہر بڑے شہر میں کھیلے جا سکتے تھے۔ اس دور کے سب سے مشہور اردو ڈرامے لکھنے والے آغا حشر کاشمیری تھے جنھوں نے بڑی تعداد میں اردو ڈرامے تقریباً ہر مشہور کمپنی کے لیے کافی معاوضے پر لکھے اور انھوں نے اپنی بھی ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی تھی۔

ڈرامے میں پارٹ کرنے کے لیے اداکاروں اور اداکاراؤں کا انتخاب نہ صرف ان کی اہلیت، تجربے اور مقبولیت کی بنا پر کیا جاتا تھا بلکہ اس بات پر بھی منحصر ہوتا تھا کہ وہ خود عمدہ گانے والا یا گانے والی ہے یا نہیں۔ ان دلوں کے ایک مشہور میوزک ڈائرکٹر استاد جھنڈے خاں تھے اور گانے والوں میں بھگوان داس، ماسٹر موہن، ماسٹر نثار تھے اور گوہر جان بھی بڑی مقبول تھی۔ جو دو گانے ان دلوں دلی میں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھے وہ یہ تھے ـــ "کہنا مورے من کی بات موہن سے جاکر" جس کا بعد میں ہز ماسٹرس وائس کا ریکارڈ بنا اور "کرم گت ٹارے ناہیں ٹرے"۔ ایک شو میں اِن گانوں کے لیے ۱۶ دفعہ ونس مور یعنی دوبارہ سنوانے کی فرمائش کی گئی۔ دراصل تالیوں، سیٹیوں، قہقہوں اور ونس مور کی تعداد سے ہی کسی ڈرامے کی مقبولیت اور پسندیدگی کو ناپا جاتا تھا اور ان ہی کو سن کر کمپنی کے مالکان اور ڈائرکٹر جو سٹیج پر پس پردہ موجود رہتے تھے خوش ہوتے تھے اور حوصلہ پاتے تھے۔ ان ہی باتوں پر یہ بھی منحصر ہوتا تھا کہ ڈرامہ اس شہر میں کتنے دن تک اور چلے گا۔ تھیٹر کمپنیاں جب کسی شہر میں جاتی تھیں تو بلیّوں کے سہارے ٹین کا کچا یا عارضی منڈوا بنواتی تھیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کے آغاز میں بھی کئی پکّے تھیٹر وجود میں

آتے۔ ان تھیٹروں میں راما تھیٹر (جواب مبجسٹک سینما ہے) بنارسی کرشنا تھیٹر (اب موتی ٹاکیز) اور سنگم تھیٹر (اب جگت ٹاکیز) قابلِ ذکر ہیں۔ ان تھیٹروں میں ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے اور ان میں شہر کے لوگ اپنے جلسے بھی کر لیتے تھے۔ دلی میں قائم ہوئی چند تھیٹر کمپنیوں یا دلی میں جن تھیٹر کمپنیوں نے ڈرامے سٹیج کیے ان کا ذکر درج ذیل ہے:۔

رائل تھیٹریکل کمپنی آف دہلی، دہلی —— ۱۹۲۶ میں بابو موہن لال نے قائم کی تھی اور دہلی اور مضافات کے بہترین اداکار اس میں ملازم رکھے گئے تھے۔

شریمتی منجری تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی، دہلی —— بابو افتخار حسین نے ۱۹۲۰ میں قائم کی تھی چمپا بائی، آشا بائی اور بلو بائی اس کی مشہور اداکارائیں تھیں۔ اس کے تماشے "شریمتی منجری" نے بڑی شہرت پائی تھی۔ یہ کمپنی راما تھیٹر واقع فوارے میں تماشے دکھاتی تھی۔

نیو امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف دہلی، دہلی —— اس کمپنی کے مالک سید ابوالحسن تھے۔ ۱۹۲۷ میں یہ کمپنی قائم ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ڈرامہ "ترکی فرشتہ عرف مظلوم سحر نا" سنگم تھیٹر واقع مچھلی والان میں سٹیج کیا تھا۔ یہ ڈرامہ دلی میں بے حد مقبول ہوا۔

امپریس تھیٹریکل کمپنی آف دہلی، دہلی —— اس کمپنی کو منشی شرافت علی نے شروع کیا تھا۔ ۱۹۲۲ میں قائم ہوئی تھی۔ کمپنی سب پرانے کھیل دکھاتی تھی۔ اس کا اپنا صرف ایک تماشہ تھا "فتح جنگ" جو زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ مس دھنو اور مس ریشم اسی کمپنی میں کام کرتی تھیں۔

پارسی الیگزانڈر تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی، دہلی —— اس کمپنی کے مالک محمد بھائی پارپیا اور حبیب بھائی پارپیا تھے جو اتنے ہم شکل تھے کہ پہچانے نہیں

جاتے تھے۔ اپنی پہچان کے لیے وہ اپنے سینوں پر مختلف قسم کے پھول لگاتے تھے۔ اس کمپنی کا کھیل "وطن" بہت مقبول ہوا۔ اس کمپنی کا نام بعد میں پارسی مون الیگزانڈر تھیٹریکل کمپنی ہو گیا تھا۔

پنجاب تھیٹریکل کمپنی آف لاہور دہلی —— سید دلاور شاہ نے ۱۹۲۰ میں قائم کی تھی۔ اس کمپنی نے چار ڈرامے پیش کیے جن کے نام تھے 'باوفا قاتل'، 'دردِ جگر'، نور کی پتلی اور یہودی کی لڑکی۔ یہ سب ڈرامے مقبول ہوئے۔

راجستھان تھیٹریکل کمپنی آف دہلی —— ۱۹۴۶ میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے مالک بابو مانک لال تھے جنھوں نے خود بھی اس کے لیے ایک ڈرامہ "سپاہی" لکھا تھا۔ کمپنی نے پریڈ گراؤنڈ پر ایک کچا منڈوا بنوا رکھا تھا اور اپنے تماشے اس میں کرتی تھی۔

رائل انڈین تھیٹریکل کمپنی آف دہلی —— اس کمپنی کے مالک بابو روشن لال تھے اور ۱۹۳۸ میں قائم ہوئی تھی۔ ان کا تماشہ 'ہٹلر' جسے ۱۹۳۹ کے آخر میں پیش کیا گیا کافی مقبول ہوا۔

منروا تھیٹریکل کمپنی آف دہلی —— حبیب سیٹھ اور محمد سیٹھ نے رائل تھیٹریکل کمپنی کے بند ہو جانے کے بعد شروع کی تھی۔ صرف ایک تماشے "جوانی کی ہوا" کے سہارے کچھ دیر تک چلی۔ ۱۹۲۴ میں بند ہو گئی تھی۔

وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی آف دہلی —— اس کمپنی کے مالک راجہ رام مظفر پوری تھے اور یہ کمپنی ۱۹۱۹ میں قائم ہوئی تھی۔ شروع میں مارواڑی سٹاف زیادہ تھا مگر ۱۹۲۰ میں اردو

سٹاف زیادہ رکھا گیا۔ کمپنی کا ڈرامہ "خونی تیر" کافی مقبول رہا۔ اس ڈرامے کے مصنف اشرف قصوری تھے۔

انٹرنیشنل تھیٹریکل کمپنی آف انڈیا، دہلی ——— وزیر جان نے اسے ۱۹۱۷ میں قائم کیا تھا۔ یہ خاتون دلی کی ہی تھیں۔ کمپنی کے ڈائرکٹر حافظ محمد ایوب تھے۔ وزیر جان خود اس میں کام کرتی تھیں۔ یہ کمپنی عموماً پرانے ڈرامے دکھاتی تھی مگر اس نے ایک نیا تماشہ "اٹلی کا پھول" بھی پیش کیا۔ اس کمپنی میں دو تین دفعہ آگ بھی لگی مگر وزیر جان ہمت نہ ہارتی تھی اور کمپنی کو پھر از سر نو شروع کر دیتی تھی۔

شائننگ اسٹار تھیٹریکل کمپنی آف دہلی ——— شیریں جان اور اس کے شوہر محمد حسن نے ۱۹۲۳ میں قائم کی تھی۔ شیریں جان خود سٹیج پر کام کرتی تھی۔ کئی کامیاب کھیل پیش کیے جن میں لیلےٰ مجنوں بھی شامل تھا۔

وینس تھیٹریکل کمپنی آف دہلی ——— ایک عیسائی خاتون مسز سہنا نے ۱۹۲۴ میں قائم کی تھی۔ کمپنی کے دو خصوصی ڈرامے تھے، ایک اشرف قصوری کا تحریر کردہ خونی تیر اور دوسرا اسی مصنف کا خونی دلہن۔

یونائٹڈ تھیٹریکل کمپنی آف دہلی ——— اس کمپنی کو اداکارہ چندا بائی نے بابو افتخار حسین کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ چندا بائی بابو افتخار حسین کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ۱۹۲۹ میں اس کمپنی نے دلی میں کئی اچھے تماشے دکھائے۔ کمپنی میں اس وقت کے چیدہ چیدہ ایکٹرس اور ایکٹریس ملازم تھیں۔

آریہ سماج ناٹک منڈلی آف دہلی ——— اس کمپنی کو ۱۹۲۴ میں سیٹھ مانک لال نے قائم کیا تھا۔ یہ کمپنی عموماً پرانے ڈرامے پیش کرتی تھی۔ مشکل سے تین سال چلی ہوگی کہ سرمایے کی کمی کے سبب بند ہوگئی۔

ان دنوں دلی کی پبلک اردو ڈراموں پر جان دیتی تھی اور کوئی اچھا کھیل ہوتا تو اس پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتی تھی۔ ایک ایک شوقین اپنے پسندیدہ تماشے کو کئی کئی بار دیکھتا تھا۔ تفریح کا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا اور تھوڑے سے پیسوں میں آرام سے رات کٹ جاتی تھی۔ پھر دلی والے گانا سننے کے بھی شوقین تھے۔ ایک دلی والے کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ڈرامہ "زورِ قاتل" متواتر سات رات دیکھا کیونکہ اس میں کام کرنے والی بلّوجان اسے پسند تھی اور اس کا گایا ہوا یہ گانا "دیکھنا گلزار پر کالی گھٹا چھائی نہ ہو، مے کی پیالی بن کے دلہن باغ میں آئی نہ ہو" اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ بلا شبہ وہ ایک مخصوص "چوّنی والا" تھا۔

ایک ڈرامے میں ایک المیہ نقطے پر جب تمام تماشائی پوری طرح اثر میں ڈوبے ہوئے چپ چاپ بیٹھے تھے تو گیلری میں ایک عورت کا بچہ رونے لگا۔ ایک "چونی والا" بڑے گھٹیا انداز میں پیچھے مڑ کر چلایا — "دودھ پلا دے۔" اس پر تمام تماشائی قہقہہ مار کر ہنسے اور سٹیج پر بولتے ہوئے اداکار کو اتنا برا لگا کہ وہ پسِ پردہ چلا گیا۔ جب کوئی گڑبڑ ہوتی تھی تو مزاحیہ اداکار یا جوکر سٹیج پر چلا آتا تھا۔ وہ ایک طرف سے نکلا اور زور سے بولا۔ "تو ہی چپ کرا لے سالے!" اس پر پہلے سے بھی زیادہ زور کا قہقہہ پڑا اور وہ "چونی والا" شرم سے پانی پانی ہوگیا۔

ڈرامے میں مزاحیہ اداکار حاضرین کو اپنے الٹے سیدھے اشعار اور تُک بندی سے بھی محظوظ کرتے تھے۔ ایک اسی قسم کی تک بندی ملاحظہ کیجئے —

لے اُڑیگا کوئی دم میں بُلبلی کو بُلبلا
مینڈکی کو خوب مینڈک چاہنے والا ملا

یارو دنیا سے اٹھ گئی کیا
لڑکیوں سے حیا؟
ڈاکٹروں کے ہاتھ سے شفا؟
شریفوں سے تقدیر؟
دعاؤں سے تاثیر؟
محبت ہے کن میں
مرغے مرغی میں!

اس کے علاوہ کسی اداکار کی اپنی ہی خود گفتاری اور تنہا اداکاری اور کورس وغیرہ بھی وقفوں میں تماشائیوں کو محظوظ کیا جاتا تھا۔

دلی میں عموماً ڈرامے رات کو دس بجے شروع ہوتے تھے۔ ایڈوانس بکنگ کا رواج نہیں تھا ہر درجے کے ٹکٹ شو شروع ہونے سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے کھڑکی پر بکنے شروع ہو جاتے تھے۔ اگر حاضری کم ہوتی تو ڈرامہ دیر سے شروع کرتے تھے تاکہ کچھ اور ٹکٹ بک جائیں۔ لیکن وقت ہو جاتا تو بیٹھے ہوئے لوگ بے تاب ہو جاتے اور منہ پر انگلیاں لگا کر تیز سیٹیاں بجاتے اور غل غپاڑہ کرتے۔ ڈرامہ کئی گھنٹوں کا ہوتا تھا اور ان دنوں اس کی طوالت بھی اس کی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ اکثر ڈرامے صبح کے تین ساڑھے تین بجے تک چلتے تھے۔ ہر تماشے کے آغاز میں دعائیہ گیت ہوتا تھا جو پردہ اٹھتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ اس میں عموماً سارے اداکار شریک ہوتے تھے۔

ڈراموں کی زبان عموماً اردو یا ہندی یا دونوں کی آمیزش ہندوستانی ہوتی تھی تماشوں کے موضوعات اور ان کا تنوع لامحدود ہوتا تھا جن کے بارے میں ایک اندازہ ان کی بہت بڑی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے۔ سٹیج کے لکھے ہوئے ڈراموں کی تعداد صرف اردو یا ہندوستانی میں ہی کئی ہزار تھی اور انسانی عمل اور سرگرمی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو ڈرامے کی گرفت سے بچا ہو۔ مذہبی عقائد، روایتی حکایات، تاریخی واقعات، راجوں بادشاہوں کی زندگی، جنگ وجدل، سیر و سیاحت، حسن و عشق، ظلم وستم، رحم و سخاوت، جنوں، پریوں اور دوسرے تحیر آمیز طلسماتی قصے، غرضیکہ کوئی بھی موضوع ایسا نہیں تھا

جس پر اردو میں ڈرامے نہ لکھے گئے ہوں۔ بلاشبہ ان سب ڈراموں کی بنیاد امانت کے "اندر سبھا" سے ہی رکھی گئی۔ ان کے علاوہ انگریزی اور دوسری یوروپین زبانوں کے کئی ڈراموں کے، جن میں شیکسپیئر کے ڈرامے بھی شامل ہیں، ترجمے بھی سٹیج کیے گئے۔

"بلوا منگل" دلی میں کئی ہفتوں تک چلا۔ یہ ان دنوں بڑا مقبول تماشہ تھا جسے دیکھنے کے لیے عورتوں کی ایک بڑی تعداد بھی جاتی تھی۔ اسی دور میں دلی میں کھیلے جانے والے دوسرے مقبول ڈرامے تھے ــ "میٹھی چھری عرف دورنگی دنیا" "خونِ ناحق"، "خوبصورت بلا"، "ترکی حور"، "آنکھ کا نشہ"، "صیدِ ہوس"، "سلور کنگ"، "کرشن سُداما"، "گورکھ دھندا"، "راجہ ہریش چندر"، "گوپی چند" اور "نرسی بھگت"۔ جب میرٹھ کی "بھارت ویاکل کمپنی" اپنے مقبول ڈرامے "بھگوان بدھ" کی کامیابی کے زریں آغاز کے باوجود بند ہو گئی تو دلی کے شائقینِ تھیٹر کو بڑا صدمہ پہنچا کیونکہ میرٹھ کی کمپنیاں اپنے تماشے دلی میں دکھاتی تھیں۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ اردو تھیٹر جسے پارسی تھیٹر بھی کہا جا سکتا ہے اور بعد میں بائیسکوپ کو مالی سہارا دینے میں "چونی والے" تماشائیوں کا ہی ہاتھ تھا۔ تماشائیوں کی یہ کلاس ہال یا منڈوے میں بھری رہتی تھی اور اگرچہ ان کا ٹکٹ سب سے کم ہوتا تھا مگر ڈرامے والوں کو سب سے زیادہ آمدنی "چونی والوں" سے ہی ہوتی تھی۔ اس لیے تھیٹر کے مالک اور ڈرامے کا ڈائرکٹر ان کے "مذاق" اور پسندیدگی کی چیزیں ڈرامے میں جگہ جگہ بھرتے تھے، چاہے ان چیزوں کا ڈرامے سے کوئی سیدھا تعلق نہ ہوتا۔ چنانچہ "چونی والوں" کے لیے تماشے میں کئی جگہ فحش مذاق، گھٹیا درجے کی باتیں اور چھیڑ چھاڑ رکھ دی جاتی تھیں جنھیں دیکھ کر اور سن کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ "چندراول" میں جب پھول بیچنے والی مالن یہ گانا گاتی تھی ــ "دو پھول جانی لیلو" تو "چونی والے" چلّا کر کہتے تھے ــ "ہائے جانی مار ڈالا!"

دلی میں ان دنوں ڈرامہ دیکھنے کا شوق سب کو تھا، شہر کوتوال کو بھی۔ شہر کوتوال کو کمپنی کی طرف سے ہر ڈرامے کا "پاس" بھجوادیا جاتا تھا۔ ویسے بغیر پاس کے بھی وہ جس

روز اور جب چاہے تماشہ دیکھنے آسکتا تھا۔ اسے ہمیشہ سب سے اگلی لائن میں ایک نمایاں جگہ پر بٹھایا جاتا تھا اور اگر کوئی کرسی خالی نہ ہوتی تو یا تو کسی کو پیچھے بھیج دیا جاتا تھا اور یا اس کے لیے ایک خاص کرسی منگوا کر رکھ دی جاتی تھی۔ عموماً شہر کوتوال کمپنی کا مہمان خصوصی ہوتا تھا اور جس روز وہ موجود ہوتا تو کھیل کے درمیانی وقفوں میں زیادہ مزیدار مزاحیہ پروگرام پیش کیے جاتے اور اکثر کوتوال کو خوش کرنے کے لیے اس کا ذکر بھی کسی نہ کسی شکل میں اداکار کر دیتا۔ انٹرول میں عموماً مالک اور منیجر شہر کوتوال کے پاس جاتے اور اس کی لیمن وغیرہ سے خاطر کی جاتی۔

ان دنوں یہ بھی رواج تھا کہ ایک آدمی ڈرامے کے مکالموں کی پوری کتاب ہاتھ میں لیے سٹیج سے چھپا ہوا بائیں یا دائیں طرف کھڑا رہتا تھا اور اداکاروں کی مدد کے لیے مکالمے بولتا رہتا تھا تاکہ کوئی اداکار کسی جگہ پر مکالمہ بھول جائے تو اسے سن کر یاد آجائے۔ اگلی ایک دو لائنوں میں بیٹھے ہوئے تماشائی اکثر اس آدمی کو دیکھ سکتے تھے مگر کسی کو خیال بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ آدمی ڈرامے کے سٹیج کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ باجے والا اور طبلے والا بھی عام طور پر آگے کی طرف ایک کونے میں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ بھی آپس میں کچھ بات کرتے تو اگلی لائن والے سن لیتے۔ کئی دفعہ تو باجے طبلے والے اگلی لائن میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے دیا سلائی مانگ کر اپنی بیڑی سگرٹ بھی سلگا لیتے تھے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ ان دنوں سٹیج کی تکنیکی اور دوسری ضروریات کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ مثلاً کوئی اداکار جو سین میں ہے مگر ابھی اس کے بولنے کی باری نہیں آئی تو کسی ضرورت سے اندر چلا جاتا اور پھر آجاتا۔ ایک دفعہ ایک منظر میں دیوکی اپنے مکالمے بول رہی تھی اور کنس ایک کونے میں کھڑا تھا کہ اس نے اپنا وقت گزارنے کے لیے اپنے آپ سے کچھ کچھ بولنا شروع کر دیا جس کا ڈرامے سے کوئی تعلق نہیں تھا شاید اس کا خیال تھا کہ تماشائیوں تک اس کی آواز نہیں جائے گی مگر اگلی لائن والوں نے تو اس کی بہت سی بے ہودہ باتیں سن لی تھیں!

وقت گزرنے کے ساتھ پارسی تھیٹر یا اردو تھیٹر کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کی

جگہ بائیسکوپ نے لیلی اور خاموش فلموں کا جادو چلنے لگا۔" چونی والے" اب بائیسکوپ کے منڈوے میں سب سے آگے دری یا بنچوں پر بیٹھتے تھے۔ بالکل نئی چیز ہونے کی وجہ سے لوگ جوق در جوق بائیسکوپ دیکھنے جانے لگے۔ الفنسٹن سینما (جس کا نام اب ناولٹی ہے) اور رائل سینما (جو پہلے بنارسی کرشنا تھیٹر تھا) بائیسکوپ کے منڈوؤں اور ہالوں میں ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے خوب دھکے بازی ہوتی تھی۔

مگر دلی والوں کا ڈرامے کا شوق پوری طرح ختم نہیں ہوا۔ کچھ شوقین لوگوں نے اپنے ڈرامہ گروپ بنا لیے اور ڈراموں کو اسکولوں کی عمارتوں اور دھرم شالاؤں میں کھیلا جانے لگا۔ ہر کالج میں ایک ڈرامہ کلب قائم ہو گیا اور ان کلبوں نے مشہور لکھنے والوں کے سماجی اور تاریخی ڈرامے سٹیج کرنے شروع کر دئے۔ جن لوگوں نے دلی میں جدید ڈرامے کی داغ بیل ڈالی ان میں سینٹ سٹیفنز کالج کے پروفیسر اشتیاق حسین قریشی اور ہندو کالج کے پروفیسر بالکرشن داس پیش پیش تھے۔ پروفیسر قریشی نہ صرف عمدہ ڈرامے لکھتے تھے بلکہ ان کی ہدایت بھی کرتے تھے۔ ان کے ڈرامے "ہمزاد" "صیدِ زبوں" اور "نقشِ آخر" بہت مشہور ہیں۔ ان دنوں کالج کے ڈراموں میں لڑکیوں کا پارٹ بھی لڑکے ہی کرتے تھے۔ پروفیسر بالکرشن داس بھی ڈرامے کے فروغ اور طالب علموں میں اداکاری کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ انہیں اردو ڈرامے سے بڑا پیار تھا۔ ان کے وقت کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کا ایک ڈرامہ شروع ہونے والا تھا مگر کچھ دیر پہلے ہی ایلچی کا پارٹ کرنے والا اداکار اچانک بیمار پڑ گیا۔ پروفیسر بالکرشن داس نے پردہ کھینچنے والے طالبِ علم سے کہا کہ بیمار اداکار کی جگہ وہ پارٹ کرے۔ وہ طالب علم گھبرا گیا کیونکہ وہ سٹیج پر جانے سے ڈرتا تھا۔ اس نے پروفیسر صاحب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی کہ اسے پارٹ کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے اسے سمجھایا کہ تمہیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ صرف یہ فرمان لے کر راجہ کے محل میں جانا ہے۔ وہ طالبِ علم بہت دیر تک تو اپنی ضد پر اڑا رہا لیکن جب پروفیسر صاحب نے اسے ڈانٹ کر پارٹ ادا کرنے کا حکم دیا تو مان گیا۔ جب وہ پردہ کھینچنے والا طالبِ علم ایلچی کے طور پر راجہ کے دربار میں پہنچا تو راجہ

کڑک کر بولا۔" تم کس کے حکم سے میرے محل میں آئے ؟" بدلے میں کام کرنے والا اداکار گھبراگیا اور بدحواس ہوکر بولا۔" میں تو ہرگز یہاں نہیں آنا چاہتا تھا مگر کیا کروں پروفیسر بالکرشن داس صاحب نے زبردستی مجھے بھیج دیا۔"

کسی بھی دَور اور تہذیب کو شاید دوام حاصل نہیں ہے۔ دلی کا وہ دور جب منڈوے یا ہال پر کسی مقبول اردو کے تماشے پر دلی کے عوام ٹوٹے پڑتے تھے تاریخ کی گود میں سماگیا ہے۔" چونی والے" جن کا ان کھیلوں سے گہرا تعلق تھا اب صرف یادوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ اردو ڈرامہ ویسے تو اب بھی زندہ ہے اور دلی کے کئی ڈرامہ گروپ وقتاً فوقتاً اردو کے عمدہ ڈرامہ پیش کرتے ہیں مگر ڈراموں کی نوعیت بدل گئی ہے۔ ان کی زبان بدل گئی ہے! تفریح کی جگہ ذہن نے لے لی ہے اور آج کا ڈرامہ عوام کی بجائے اعلیٰ طبقے کا ڈرامہ بن گیا ہے!



کبوتر بازی

کبوتروں کے شوقین

پرانے زمانے سے کبوتر انسان کا دوست، ہمدم اور ہمراز رہا ہے۔ پانڈوؤں کی راجدھانی اندر پرستھ کے محلوں میں بھی کبوتر پالے جاتے تھے۔ راجے مہاراجے سبھی کبوتر پالنے کے شوقین تھے۔ محلوں میں رانیاں اور راجکماری جھروکوں میں بیٹھ کر کبوتروں کا تماشہ دیکھا کرتی تھیں۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو انہیں بھی کبوتر پالنے کا شوق ہوا۔ شروع شروع میں تو یہ شوق سلطانوں اور امرا تک رہا لیکن چونکہ مذہبی رہنماؤں نے کبوتر پالنے کی مخالفت نہیں کی، یہ شوق عام لوگوں میں بھی ہوگیا۔ دلّی کے سلطان علاؤالدین خلجی کے کبوتر خانے میں سب سے نایاب کبوتر تھے جو اسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے دلی میں کوٹلہ بنوایا اور نایاب پرندوں کو پالنے میں بڑی دلچسپی لی۔ اس کے عجائب خانے میں انوکھے پرند اور چرند چن چن کر رکھے گئے تھے۔

فیروز شاہ کی وفات کے بعد جب تغلقوں کی سلطنت ڈگمگانے لگی تو تیمور لنگ ایک بڑا بھاری لشکر لے کر شمال اور مغرب کے پہاڑی دروں میں سے طوفان کی طرح ہندوستان پر ٹوٹ پڑا اور دلی سے بے شمار دولت اور ہزاروں قیدیوں کے ساتھ ساتھ فیروز شاہ کوٹلے کے عجائب خانے کے نایاب جانوروں اور پرندوں کو لے کر اپنے وطن سمرقند واپس چلا گیا۔ مغلوں کے عہد میں کبوتر پالنا ایک فن بن گیا۔ بادشاہوں، شہزادوں اور نوابوں اور امرا سے لے کر ہر چھوٹے بڑے تک کبوتر پالنے کا شوق اتنا

بڑھ گیا تھا کہ بہت وقت اور لاکھوں روپیہ صرف کبوتر بازی پر خرچ کیا جانے لگا۔
شہزادہ سلیم (جہانگیر) اور مہرالنسا (نورجہاں) کی محبت کبوتر ہی کی وجہ سے پروان چڑھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن قلعے میں سلیم مینا بازار کی سیر کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں شیرازی کبوتروں کا ایک جوڑا تھا قلعے کے باغ میں ایک بہت خوشنما پھول کھلا دیکھ کر اس نے اسے توڑنا چاہا۔ اسے سامنے سے ایک الہڑ، شوخ اور حسین لڑکی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آتی ہوئی دکھائی دی۔ سلیم اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور اس نازنین کے ہاتھوں میں دونوں کبوتر تھما کر بولا کہ ذرا ہمارے کبوتر پکڑ لیجیے، ہم وہ پھول توڑ کر ابھی آئے۔ جب شہزادہ لوٹ کر آیا تو اس حسین لڑکی کے ہاتھ میں، جو مہرالنسا ہی تھی صرف ایک کبوتر دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ اس نے لڑکی سے پوچھا ــــ

دیکھو ادھر اے مہ لقا
میرا کبوتر دوسرا
جلدی بتاؤ کیا ہوا
جھٹ بھولپن سے کہدیا
سرکار وہ تو اڑ گیا
بولا کہ ہیں کیونکر اڑا
ایسا تو ہوسکتا نہ تھا
جھٹ دوسری مٹھی جو تھی
کچھ مسکرا کر کھول دی
یوں اڑ گیا عالی جناب
یہ سادگی اف رے غضب
شہزادے کا دل آگیا
پھر جانتے ہو کیا ہوا؟

جہانگیر کے عہد میں کبوتر بازی کو عشق بازی کا نام بھی دیدیا گیا تھا۔ شاید اس کی

وجہ جہانگیر کا نوجوانی میں اپنا عشق اور کبوتروں کے ذریعے محبت کے نامہ و پیام بھیجنا بھی تھی۔ شاہجہاں کو بھی کبوتروں کا بڑا شوق تھا اور اس نے باہر کے ملکوں سے بڑے بڑے نامور کبوتر سدھانے اور اڑانے والے استادوں کو دلی بلوایا تھا۔ بخارا سے علی قلی آئے، سمرقند سے مسیح خاں، بلخ سے حاجی قاسم، شیراز سے حبیب شیرازی، یہ سب بادشاہ کے کبوتر خانے میں ملازم تھے۔ جیسے ہی بادشاہ کی سواری محل سے نکلتی، محل کے پہریداروں کا داروغہ وقت اور موسم کو دیکھ کر ایک رنگین کبوتر ہوا میں اڑا دیتا۔ اس طرح سے سب وزیروں اور اہلکاروں کو بادشاہ کے محل سے باہر آنے کی خبر مل جاتی۔

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں سید وارث علی شاہی کبوتر باز تھے۔ انھوں نے دو سو کبوتروں کی ایک ٹکڑی تیار کی تھی۔ جب بادشاہ سلامت اپنے مولا بخش نام کے ہاتھی پر سوار ہو کر لال قلعے سے نماز پڑھنے عیدگاہ جاتے تھے تو وارث علی اپنے سارے کبوتروں کو ہسکا کر اڑا دیتے تھے۔ کبوتر سواری کے پیچھے پیچھے قطار در قطار اڑتے تھے اور بادشاہ کی سواری پر سایہ کر لیتے تھے۔ یہ ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو کر اڑتے تھے کہ ایک چھوٹا سا بادل بن جاتے اور بادشاہ کو سورج کی چمک اور دھوپ سے بچائے رکھتے۔ ان کبوتروں کی اڑان کا یہ کمال بھی بتایا جاتا ہے کہ سواری سے ذرا دور ہو کر اڑتے تاکہ ہاتھی پر سوار بادشاہ یا فیلبان کے کپڑے نہ خراب ہوں۔ یہ کبوتر آخر تک شاہی سواری پر سایہ کیے اڑتے رہتے۔

دلی کے ایک مشہور کبوتر باز مرزا فخرو یعنی مرزا چپاتی تھے۔ ان کو کبوتر بازی میں پتنگ بازی کی طرح کمال حاصل تھا۔ مرزا نے ایک ٹھیلے پر کبوتروں کی کابک اور اس کے اوپر ان کی چھتری بنا رکھی تھی۔ مرزا فخرو کے بارے میں مشہور تھا کہ جو کام کریں گے نرالا کریں گے۔ اپنے کبوتروں سے بھرے ٹھیلے کو لڑھکا کر بازاروں اور کوچوں میں لے جاتے۔ اور وہیں سے کبوتر اڑانا شروع کر دیتے۔ مرزا چپاتی کا تعلق شاہی خاندان سے تو تھا ہی اس بنا پر بھی اور اپنی گوناگوں خوبیوں کی بھی وجہ سے عوام میں بڑے مقبول تھے اور

جہاں جاتے لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ مرزا وہیں گھیری اڑان کراتے اور پھر تاؤ دیدیتے۔ ان کے سارے کبوتر نہ آشنا تھے اور ایک چکر لگا کر لوٹ آتے۔ مرزا چپاتی چھیپی ساتھ رکھتے تھے اور اس کو ہلا ہلا کر کبوتروں کو اشارے دیتے رہتے تھے۔ ان کی کبوتر بازی میں مہارت کا یہ حال تھا کہ ہوا میں، ایک لوٹے میں پانی بھر کر، ایسے چھینٹے اڑاتے کہ اڑتے ہوئے کبوتروں کو چھینٹوں پر دانے کا شبہ ہوتا اور وہ دھوکا کھا کر نیچے اتر آتے۔

دلی کو وقتاً فوقتاً نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، جاٹوں اور مرہٹوں کے حملوں نے اتنا تہس نہس کیا کہ یہاں کے بہت سے کاریگر اور کبوتر باز لکھنؤ اور حیدرآباد چلے گئے۔ اودھ کے بادشاہ نواب واجد علی شاہ نے دلی کے کبوتر بازوں کی بڑی آؤ بھگت کی جب واجد علی شاہ کو گدی سے محروم کر کے انگریزوں نے کلکتے بھیج دیا تو وہ وہاں مٹیا برج میں رہنے لگے۔ وہاں بھی دن رات رنگ رلیاں مناتے رہے مگر لکھنؤ میں رہ گئے اپنے کبوتروں کو بڑا یاد کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں ان کے کبوتر خانے میں چوبیس ہزار کبوتر تھے جن میں سے بہت سے دلی کے نامور کبوتر بازوں سے کافی قیمت چکا کر حاصل کیے گئے تھے۔ ان میں ایک جوڑا ریشم پرا کا تھا جو بڑا نایاب تھا اور اس کی قیمت پچیس ہزار روپے بتائی جاتی تھی۔ ان کے کبوتر خانے میں دلی ہی سے حاصل کیا ہوا ایک ایسا نادر کبوتر بھی تھا جو لڑکیوں کی چار انگل کی کانچ کی چوڑی میں سے بل کھا کھا کر نکل جاتا تھا۔

دلی کے ایک نواب صاحب، کے پاس دس ہزار کبوتر تھے۔ جب اڑتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی سے بھرے ہوئے بادل آ رہے ہیں یا گھٹا چھا گئی ہے۔ نواب صاحب اپنے کبوتروں کو بڑھیا مالیدہ، کابلی بہی دانہ اور انار کھلاتے تھے۔ انھیں اپنے ہر کبوتر کی شناخت تھی۔ ایک دفعہ انھوں نے صبح سویرے کبوتر اڑا دیے۔ کبوتر شام تک اڑتے رہے۔ جب سب کبوتر واپس آ گئے تو نواب صاحب نے دیکھا کہ ان میں ایک کبوتر نہیں تھا۔ نواب صاحب اس کبوتر کے بارے میں بڑے پریشان ہو گئے۔ کھانا پینا چھٹ گیا۔ ملازموں کو ادھر اُدھر دوڑایا مگر اتنے بڑے شہر میں گمشدہ کبوتر کا ملنا آسان نہیں تھا۔ بڑی کوشش کے باوجود کبوتر کا کوئی سراغ نہیں لگا۔ یہ کبوتر بڑا نایاب تھا۔ ایک دن نواب صاحب منہ لٹکاتے بیٹھے تھے کہ

انہیں کسی نے خبر دی کہ ایک غریب آدمی کے مکان میں ایک چھوٹا سا کبوتر خانہ ہے اور آپ کا کبوتر اسی نے پکڑ کر بند کر رکھا ہے۔ نواب صاحب پالکی میں سوار ہو کر اس آدمی کے مکان پر پہنچے۔ پہلے تو اس نے نواب صاحب کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا کیونکہ گمشدہ کبوتر کٹی ہوئی گڈی ہوتا ہے کہ جس نے لوٹ لی اس کی ہو گئی۔ لیکن جب اس کے انکار کرنے پر نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو اس نے کبوتر انہیں دے دیا۔

دلی میں آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے بھی کبوتر بازی بڑی مقبول تھی۔ گھر گھر کبوتر پلے ہوتے تھے اور ان پر بڑا وقت اور پیسہ صرف ہوتا تھا؛ کیا امیر، کیا غریب، صبح اور شام ہزاروں دلی والے اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھے دکھائی دیتے۔ ہاتھ میں چھیپی ہوتی اور آنکھیں آسمان پر جمی ہوتیں۔ آؤ، آؤ کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، سیٹیاں بج رہی ہیں اور کبوتروں کی ڈاریں پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ کوئی پھڑی دے رہا ہے تو کوئی پتوانسا ٹھیک کر رہا ہے۔ کوئی کھڑی پھڑی دے رہا ہے تو کسی کے کبوتر بلائے جانے پر کندے جوڑے اتر رہے ہیں۔ کچھ کبوتر چھتری پر بیٹھے گونج رہے ہیں تو کچھ ہوا میں پلٹیاں اور قلا بازیاں کھا رہے ہیں۔

کبوتروں کا شوق اور کبوتروں کی مانگ بڑھی تو کبوتر بازوں نے نئی نئی نسلیں تیار کر لیں۔ چوک کی سیڑھیوں پر بائیں طرف ہر قسم کے کبوتروں کے ڈھیروں کھانچے اور پنجرے بھرے رہتے تھے۔ جو نسل آپ پسند کریں، مول تول کر کے لے لیں۔ بیسیوں قسم کے کبوتر ہوتے تھے مگر کچھ مقبول قسمیں یہ ہیں:۔

اصیل یا کابلی	خمیری
ببرے	دو پلکا
بغبغے	سبزہ
بمنے	شیرازی
ماموز	گولے

پٹیت	لقا
پھل سرا	لوٹن
خال	نشاورے

ان میں سے کچھ خوشنمائی کے لیے اور کچھ اڑانے کے لیے پالے جاتے تھے۔ کچھوں کی ٹکڑیاں بنالی جاتی تھیں اور پورے جھلڑ کو ایسے سدھایا جاتا تھا کہ پرا بنا کر دور دور تک ہو آئیں۔ لقا کبوتر گردن اور پیٹ پھلا پھلا کر جب ناچتا ہے تو بڑا لطف آتا ہے۔ سبزہ نیلے یا سبز رنگ کا ہوتا ہے لیکن آنکھ سرخ اور بڑی چونچ چھوٹی اور چکلا سینہ۔ اڑنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ کچھ کبوتروں کی چال میں ایک خاص مستی ہوتی ہے۔ چاندنی رات میں کبوتر کے اٹھلا کر چلنے کو محبوبہ کی چال سے بھی تشبیہہ دی گئی ہے۔

یوں تو سینکڑوں رنگ کے ایک سے ایک انمول کبوتر ہوتے تھے لیکن دلی کے کبوتر بازوں کو کبوتروں کو طرح طرح کے رنگوں میں رنگنے کا بھی شوق تھا۔ پروں میں ایسے رنگ لگائے جاتے کہ سال بھر تک پھیکے نہ پڑتے۔ اس کے علاوہ کبوتروں کے پروں کو اکھاڑ کے دوسرے رنگ کے پر ان ہی سوراخوں میں رکھ کر اس طرح جما دیتے کہ وہ اس کے ہی پر لگتے۔ ایک کبوتر باز نے تو یہ کمال بھی کیا کہ کبوتر کے دو پٹھوں کو لے کر ایک کا داہنا اور دوسرے کا بایاں بازو مکمل کاٹ لیا اور کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ ملا کر وہاں ٹانکے لگا کر ایک دوہرا کبوتر بنا لیا۔ یہ دونوں جڑواں کبوتر ساتھ ساتھ ہی اڑتے۔ اس کے دیکھا دیکھی بہت سے کبوتر بازوں نے دوہرے کبوتر بنانے شروع کر دئے۔ مگر کچھ بزرگ کبوتر بازوں نے اسے خلاف فطرت اور ظالمانہ حرکت کہا اور اس روش کو روک دیا۔

دلی کے کبوتر باز اڑان میں دوسرے کبوتر بازوں سے شرطیں بھی لگاتے تھے۔ اگر کسی کبوتر باز کا کبوتر کسی دوسرے کی ٹکڑی میں بھولے سے آ پھنستا تو ایک دو اشرفیاں دئے بغیر اس کا چھٹکارا نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ جس کا کبوتر ہوتا وہ بڑی خوشامد کرتا۔ پکڑے ہوئے کبوتروں کے پر قینچ کر دئے جاتے۔ لیکن کبوتروں کو اپنے گھر کی اتنی پہچان ہوتی کہ

وہ اس تاک میں رہتے کہ کب آنکھ بچے اور وہ نکل بھاگیں۔ کبوتر باز اپنے جیتے ہوئے کبوتروں کے پاؤں میں سونے کی پینجنیاں ڈالتے اور دوسروں کے پیروں میں چاندی اور پیتل کی پینجنیاں پڑی رہتیں۔ کچھ کبوتر اتنے نازک اندام ہوتے تھے کہ ان کے پاؤں میں پروں کے رنگ کے ریشمی بانے ڈالے جاتے تھے۔

کبوتروں کو بڑے لاڈ چاؤ سے پالا جاتا تھا۔ ان کے رہن سہن کے لیے اچھی سے اچھی کابکیں بنائی جاتی تھیں۔ کابکوں کو اپنے ہاتھ سے صاف کرتے۔ اجلی اجلی چمکدار کٹوریوں میں دانا پانی بھرتے۔ کبوتروں کے نہانے اور پانی پینے کے لیے چھوٹے چھوٹے حوض اور فوارے لگے ہوتے۔ کبوتروں کی صحت کا پورا دھیان رکھا جاتا۔ کبوتر کی آنکھ دیکھ کر ہی پتہ لگا لیتے کہ اس کی طبیعت کیسی ہے۔ ذرا آنکھ گدلی ہوئی یا چونچ اور پاؤں میں کوئی خرابی نظر آئی تو کبوتر باز کی نیند حرام ہو جاتی۔ دوا، علاج فوراً شروع کر دیا جاتا۔ عام طور پر ہر کبوتر باز کو اپنے کبوتروں کی بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج کرنا آتا تھا۔ اگر کسی کبوتر باز کو کوئی بیماری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اپنے کبوتر کو ہاتھ میں لے کر کسی دوسرے بزرگ یا زیادہ تجربے کار کبوتر باز کے پاس لے جاتا اور اس کی صلاح کے مطابق علاج شروع کر دیتا۔ شاہدرے کا کنہیا نامی کبوتر باز اور جامع مسجد پر خلیل نام کا کبوتر بیچنے والا کبوتروں کی بیماریوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ کبوتر کو ہاتھ میں لے کر اس کی آنکھوں، چونچ اور پنجوں کے معائنے سے پتہ لگا لیتے تھے۔ کنہیا کے بارے میں تو یہ بھی مشہور تھا کہ وہ اپنی ایک انگلی سے کبوتر کی چھاتی کو ٹھونک کر دل اور سینے کی بیماری کا بھی پتہ لگا لیتا تھا۔

کبوتروں کی عام بیماریاں یہ ہیں ـــــ الغہ، دل کی بیماری جس کے دورے سے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے، کُھرّا (کھانسی)، ہنکمہ، جسم پر گانٹھوں کا پیدا ہونا جو باجرے کے عادی کبوتر کو گیہوں کھلانے سے ہوتی ہے، رک، معدے کی بیماری کا نام جسے رنج پوٹا بھی کہتے ہیں اور بدی، اس میں کبوتر کے تالو میں زخم ہو جاتا ہے۔ دلی کے یہ نامی کبوتر باز کنہیا اور خلیل کبوتروں کی بیماریوں کی دوا رکھتے بھی تھے اور اس کے بنانے کی ترکیب بھی بتا دیتے تھے۔ کبوتر باز آپس میں کسی بھی صلاح اور دوا کا ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے۔ بعد

میں چاندنی چوک میں جینیوں کے لال مندر سے جڑا ہوا پرندوں کا ایک انوکھا ہسپتال بھی کھولا گیا تھا جو ابھی تک قائم ہے۔ اس ہسپتال میں دور دور سے گھائل اور بیمار پرندے لائے جاتے تھے اور ان کا علاج ہوتا تھا۔ زیادہ بیمار اور گھائل پرندوں کو اس شرط پر داخل بھی کر لیا جاتا تھا کہ ٹھیک ہونے پر انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔

کبوتر پالنے والوں کے مکانوں کی چھتوں پر بنی کبوتروں کے لیے چھتریاں بانسوں سے بنتی تھیں۔ ان میں کھپچیاں اور لوہے کے تاروں کو بھی استعمال کر لیا جاتا تھا۔ ایک چوکور جالی دار ٹٹی کو بانس پر باندھ کر اسے کھڑا کر دیتے اور چھتری تیار ہو جاتی۔ یہ کبوتروں کے بیٹھنے کا اڈہ ہوتا تھا۔ قدیم دلّی میں جب کبوتر بازی کا شوق عروج پر تھا تو گلی گلی کوچے کوچے ان چھتریوں کا جال سا بچھا ہوتا تھا بالکل اسی طرح جیسے آج کل ٹیلی ویژن کے اینٹینا چھتوں پر نظر آتے ہیں۔

کبوتروں کو اپنا گھر، کابک اور کابک میں اپنا خانہ بہت پیارا ہوتا ہے۔ کیا مجال جو کوئی دوسرا کبوتر بھول کر بھی اس کے خانے میں گھس جائے۔ مار مار کر اس کا برا حال کر دیگا۔ کبوتروں کو بلی سے بچانے کے لیے بھی پورا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی بلّی کسی کبوتر کو مار دیتی یا زخمی کر جاتی تو کبوتر باز کا چین آرام جاتا رہتا۔ کبوتروں کے بارے میں ایک یہ بھی اعتقاد تھا کہ ان کی ہوا تپِ دق کے مریض کے لیے بڑی فائدے مند تھی۔ کچھ مسلمان کبوتروں کو "سیّد" کہا کرتے تھے۔

اڑنے والے کبوتر دو طرح کے ہوتے ہیں، گرہ باز اور گولا۔ سنتے ہیں کہ اڑنے والی قسموں میں سب سے پہلے گرہ باز کابل سے لائے گئے تھے۔ پہلے کبوتروں کی یہی قسم اڑائی جاتی تھی۔ گولے بعد میں آئے۔ یہ عجم، عرب اور ترکستان سے لائے گئے تھے۔ گرہ باز کبوتروں کی یہ شان تھی کہ سویرے اڑتے تو گھنٹوں مکان کے ٹھیک اوپر آسمان میں چکر لگاتے رہتے۔ یہ کبوتر دن بھر اڑتے رہتے اور کہیں دن ڈھلے جا کر اترتے تھے۔ گرہ باز اپنے مکان، اپنی کابک اور اس میں اپنے خانے کو برسوں تک نہیں بھولتے تھے۔ ایک عالم نے جسے کبوتر بازی کا شوق تھا، لکھا ہے "میرے یہاں کا ایک گرہ باز کبوتر

کسی دوسرے کی ٹکڑی میں جاکر پھنس گیا۔ وہاں انھوں نے میرے کبوتر کے پر کاٹ دئے۔ تین سال بعد جب اس کے دوبارہ پر نکل آئے تو وہ میرے پاس واپس آگیا اور آتے ہی اپنے خانے میں گھس کر اس کبوتر سے بری طرح لڑنے لگا جسے میں نے اس کے گم ہوجانے کے بعد اس خانے میں رکھ دیا تھا۔"

اڑنے والے کبوتروں کی خاص خاطر کی جاتی تھی۔ گولوں کو گھی ملائی کھلائی جاتی اور گرہ باز دودھ پر پالے جاتے۔ گرہ باز اور گولے جب اڑتے تو آسمان کی خبر لاتے۔ آپ جتنی پھرتی اور تیزی سے انہیں اڑانا چاہیں اڑالیں۔ یہ کبوتر ہر سمت میں اڑتے ہیں اور ان کی اڑان کی نرالی شان ہے۔ سویرے اڑے تو گھنٹوں مکان کا چکر لگاتے رہیں گے۔ آپ اپنے آنگن میں ایک کھلا برتن پانی سے بھر کر رکھ دیجئے۔ ان کبوتروں کی پرچھائیاں پانی میں دکھائی دیتی رہیں گی۔ یہ کبوتر سارا دن اڑتے مگر تھکن نام کو نہ ہوتی۔ کبوتر باز اپنے اڑنے والے کبوتروں کو نشیلی چیزیں بھی کھلاتے۔ ان کے کھانے سے وہ مست ہوکر ہوا میں اڑتے رہتے اور ہمت نہ ہارتے۔ کئی کبوتر بازوں نے انہیں ایسا سدھایا تھا کہ آج اڑے تو تین دن تک اپنی چھتری پر واپس نہ آئے۔ بس اڑتے ہی رہے اور اڑان اتنی اونچی کہ چشم زدن میں ہی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے۔ کبوتر باز بھی بعض دفعہ پریشان ہوجاتے اور ٹکٹکی لگائے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے کہ کبوتر کہاں غائب ہوگئے اور کب لوٹیں گے۔ ایسے کبوتر تنہا بھی اڑائے جاتے اور دوسرے کبوتروں کے ساتھ بھی۔ اگر اکیلا کبوتر آسمان میں غائب ہوجاتا تو پریشانی زیادہ ہوجاتی مگر جب کبوتر باز کا لاڈلا کبوتر واپس آجاتا تو اس کی باچھیں کھل جاتیں۔

کبوتروں کو سدھانے کا کام کافی مشکل اور صبر آزما ہے۔ اٹھائیس دن کی عمر سے ہی انہیں لگاتار سدھانا پڑتا ہے۔ اس سدھائی میں ان کا کابک میں داخل ہونا، اپنے خانے کو پہچاننا اور صرف اسی میں داخل ہونا، کابک کے اوپر چکر لگانا، آسمان میں پلٹیاں کھانا اور اڑان کے بعد کابک میں واپس آنے کی خواہش پیدا کرنا اور آواز دینے پر لوٹنا شامل ہے۔ کبوتر اپنے آپ کابک میں بھوک پیاس کی وجہ سے یا اپنی مادہ سے

ملنے کی خواہش سے ہی واپس آتا ہے مگر اس کے لیے بھی اسے سدھانا پڑتا ہے کہ ان خواہشات پر بھی قابو پائے۔ عمدہ طور پر سدھائے ہوئے کبوتر اڑان کے بعد صرف تھک جانے پر یا بلائے جانے پر ہی لوٹتے ہیں۔ دھند، کہر، بارش اور موسم کی خرابی کی وجہ سے بھی، جب نظر کم آتا ہے، کبوتروں کی اڑان پر اثر پڑتا ہے۔ ان کی عمدہ بے عیب اڑان، ان کی اچھی صحت اور کابکوں اور خانوں کی صفائی اور اچھا دانہ اور صاف پانی ملنے پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ انہیں مشق کے لیے بھی کچھ ایسی اڑانیں کرانی پڑتی ہیں جن کا شمار ان کی روزانہ ورزش میں ہوتا ہے۔

انسان نے کبوتر کو ہمیشہ دو مقصدوں سے پالا ہے، ایک تو اپنے شوق کی تسکین کے لیے یعنی اسے پالتو پرندے کے طور پر رکھنے یا اڑانے کے لیے اور دوسرے اس سے کچھ مفید کام لینے کے لیے۔ اس کے لیے اس کی نسل اور قسم میں کئی اضافے کیے گئے اور نئی قسموں کے نام ان کی خوبیوں اور اپنے شوق کی بنا پر رکھ دیے۔ پیغام رسانی میں کبوتروں کو ہرکاروں سے بھی زیادہ معتبر اور بھروسے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ کبوتروں نے امن اور جنگ میں بھی انسان کا ساتھ دیا۔ عاشق اور محبوبہ کے دلوں کو جوڑنے میں بھی کبوتروں کا ایک نمایاں کردار رہا ہے۔ اب زمانے بھر میں کبوتر کو امن کا نشان سمجھا جاتا ہے اور کئی تقریبات اور کھیلوں کے عالمی اور قومی مقابلوں میں کبوتر اڑانا ایک نیک فال سمجھا جاتا ہے۔

کبوتروں کے پالنے کا اولین ریکارڈ مصر میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تین ہزار سال پہلے ملتا ہے۔ ۱۱۵۰ میں بغداد میں وہاں کے سلطان نے پہلی کبوتر چوکی قائم کی تھی مگر اس وقت کی قائم کی ہوئی ایسی چوکیوں کو ۱۲۵۸ میں منگولوں نے اپنے بغداد کے حملے میں تہس نہس کر دیا تھا۔ ۱۸۴۸ کے فرانسیسی انقلاب میں کبوتروں کو پیغام رساں پرندوں کے طور پر بڑی کثرت سے استعمال کیا گیا۔ ۱۸۱۸ میں کبوتروں کی پہلی لمبی اڑان مقابلے کے طور پر اسی ملک میں کرائی گئی۔ اس کے بعد ۱۸۲۰ میں پیرس سے لیج تک اور ۱۸۳۲ میں لندن سے برسیلز تک کبوتروں کی مقابلے کی اڑان کرائی گئی۔ ایسی کھیل کی اڑانیں

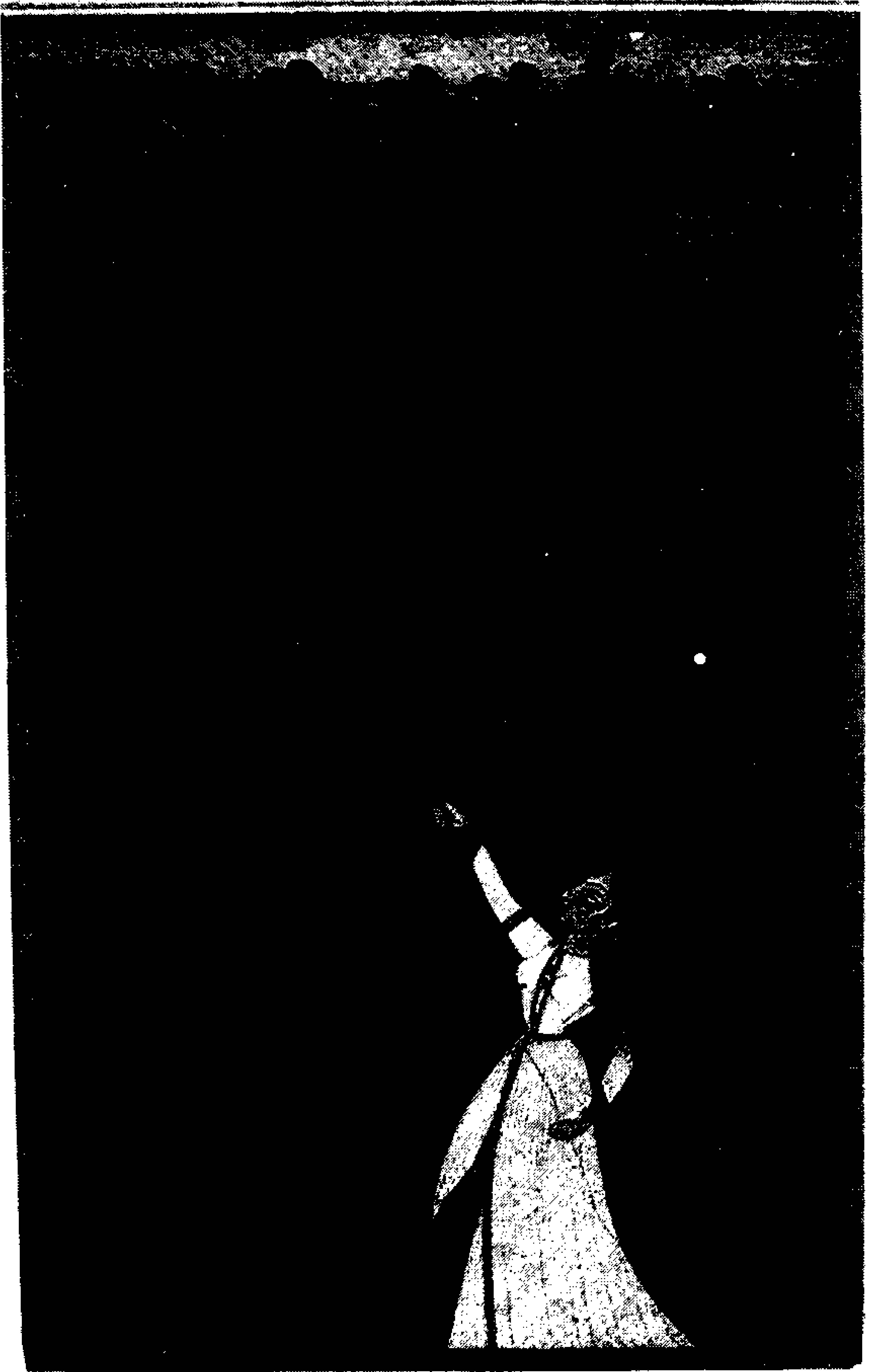
برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں ہمیشہ مقبول رہیں۔ بلجیم میں تو آج بھی ہر گاؤں اور ہر شہر میں کبوتر پالنے والوں کے کلب اور ادارے قائم ہیں۔ دراصل بلجیم کو کھیل کے طور پر کبوتروں کی اڑان کے لیے "گھر" سمجھنا بے جا ہو گا۔

برطانیہ اور دوسرے بہت سے مغربی ممالک میں کبوتروں کی آج بھی بہت اہمیت ہے اور ان سے کئی مفید کام لیے جاتے ہیں۔ سمندری بیڑوں کی حفاظت کے لیے اور خطرے کی صورت میں خبردار کرنے کے لیے کبوتروں کو سدھایا جاتا ہے۔ بلجیم کے علاوہ برطانیہ میں بھی کبوتر پالنے، انہیں سدھانے اور ان کی اڑانیں کھیل کے طور پر کرانے والے کئی ادارے اور کلب ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دراصل تمام مغربی ممالک میں کبوتر پسند کیے جاتے ہیں اور شہروں میں چوک، چوراہوں اور فواروں پر سینکڑوں کبوتر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں اور بڑے اور بچے سب انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی جنگوں میں کبوتروں نے جنگل، پہاڑ اور دریا عبور کر کے خفیہ خبریں دور دور تک پہنچائیں اور لوٹ آئے۔ کیا مجال کہ کسی غلط جگہ پر پہنچ کر اتر جائیں اور خبر دشمنوں کے ہاتھ لگ جائے۔ اور کبوتر کیسے اور کہاں اڑائے جاتے تھے، کسی کو کانوں کان بھی پتہ نہیں ہوتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پیغام پہنچانے میں جو اہم کام جنگوں میں کبوتروں نے کیا، وہ انسانوں کے بس کی بھی بات نہیں تھی کیونکہ آدمیوں کے پکڑے جانے، غلط جگہ پر پہنچنے اور خریدے جانے کا سخت خطرہ ہوتا تھا۔

جہاں تک موجودہ دلی کا تعلق ہے، وہ پہلا سا جوش و خروش اب نہیں رہا۔ چاندنی چوک میں ٹاؤن ہال کی عمارت اور گھنٹہ گھر جواب نہیں ہے ہمیشہ جنگلی کبوتروں کا گھر رہے ہیں۔ آج بھی باہر بے شمار کبوتر ہر وقت غٹرغوں کرتے رہتے ہیں۔ سڑک سے ملی ہوئی پٹڑی پر دو تین بیوپاری دانے کی بوریاں اور لوہے کی رکابیاں لیے بیٹھے رہتے ہیں اور راہ گیر ان سے دانے خرید کر پیچھے بیٹھے ہوئے کبوتروں کے جھنڈ کو ڈالتے رہتے ہیں حتیٰ کہ فرش پر دانوں کی موٹی چادر بچھ جاتی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے مذہبی اور رحمدلی

کے جذبات کارفرما ہیں، نہ کہ کبوتر اڑانے کا شوق۔ کبوتر بازی کی دلی میں اب وہ آن بان کہاں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ زمانے اب لد گئے۔ کوئی کوئی چھوٹا موٹا آدمی کبوتر پالے ہوئے ہے۔ چھتوں پر کبوتروں کی چھتریاں پرانی دلی کے گنجان علاقوں میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ بڑے اور امیر گھروں میں تو یہ شوق ختم ہی ہو گیا ہے۔ آج آپ کسی سے کبوتر بازی کا ذکر کریں گے تو وہ ناک بھوں چڑھائے گا اور مذاق اڑائے گا کہ یہ تو بیکار اور نکھے آدمیوں کا شغل ہے۔ مگر دلی کے کسی عمر رسیدہ آدمی سے اس کا ذکر کریں گے تو وہ آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھے گا اور اس کا ذہن اس کبوتروں سے بھرے آسمان کا تصور کرنے لگے گا جو دلی کی سماجی اور تمدنی زندگی کا ایک نہ بھولنے والا ٹکڑا تھا۔



ایک امیرزادی پتنگ اڑاتی ہوئی

پتنگ بازی

ایک کہانی میں کہوں، سن لے میرے پوت
بنا پروں وہ اڑ گیا، باندھ گلے میں سوت

بوجھو تو جانیں، کسی نے کہا۔ اور بچوں نے کچھ دیر سوچا، آپس میں کانا پھوسی کی اور پھر ایک ساتھ چلا اٹھے— "پتنگ، پتنگ!"

دلی والوں کو پتنگ اڑانے کا بے حد شوق تھا۔ ساون کا مہینہ آیا، پُروّیا چلی اور بچے اور بڑے پتنگ اڑانے کے لیے گھروں کی چھتوں اور چھجوں پر جا ٹنگے۔ بوڑھے چلاتے رہتے تھے —— دھیان رکھنا، کوئی گرے نہیں، نیچے کھلے میدان میں جاکر کیوں نہیں اڑاتے، چھت پر کائی جمی ہے، پاؤں نہ پھسل جائے، مگر بچے سنی ان سنی کر دیتے۔ اور پھر چند منٹ بعد بوڑھوں کو شوق چرّاتا تو خود بھی تماشہ دیکھنے چھت پر پہنچ جاتے۔ اب اوپر کوئی گڈی میں کنّی باندھ رہا ہے، تو کوئی ہچکے یا چرخی میں لپٹی ہوئی ڈور کھول کر کسی لڑکے کو گڈی تھما کر اسے کونے میں جاکر دریائی دینے کو کہہ رہا ہے۔ دریائی مل گئی تو ٹھمکی دے دے کر اڑا رہا ہے۔ تقریباً یہی منظر ہر ایک چھت پر ہے۔ کچھ ہی دیر بعد آسمان کی طرف نگاہ کرو تو سینکڑوں پتنگ چیل کوّوں کی طرح ہواؤں میں منڈلا رہے ہیں۔ دمڑی کی گڈی سے لے کر چھ سات روپے تک کی انسانی قد جتنی بڑی تُکّل اڑ رہی ہیں۔ ان پتنگوں کے نام بھی بڑے عجیب وغریب ہوتے تھے یعنی الفن، بگلا، پری یا پریل، دوپلکا، دوباز، گل زمان،

کلیجہ جلی، کلسرا، مانگ دار، کندے کھلی، کل چڑا، بھیڑیا، چاند تارا، ادھا، ادھیل، پونیا، سانپ، گنڈیری دار، انگارہ، شکر پارہ، ناگ دار اور نہ جانے کیا کیا۔ سینکڑوں طرح کے پتنگ اڑائے جاتے تھے۔ بچکے دو دو تین تین ساتھ رہتے تھے، کسی پر سادی ڈور اور کسی پر مانجھا لپٹا رہتا تھا۔ ایسے بھی پتنگ ہوتے تھے جن پر باریک کاغذ پر لکھے ہوئے عشق و محبت کے شعر لئی سے چپکا دیتے تھے۔ یہ شعر ان دنوں عام دیکھنے میں آتا تھا۔

لڑ چکیں آنکھیں، اب اس قاتل سے لڑتا ہے پتنگ
ڈور کی فرمائشیں ہیں یہ بھی سب پر ڈور ہے

جب کسی عاشق اور محبوبہ کے دل جلتے اور ملاقات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تو یہی ڈور اور پتنگ کام میں لائے جاتے۔ محبت کے پیام آتے جاتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ پتنگ کو محبوبہ کی چھت تک اڑایا جاتا اور پھر جھکائی دے کر نیچے اتار دیا جاتا جہاں محبوبہ پہلے سے آنکھ لگائے ہوتی۔ پتنگ پر پیام پڑھ کر اپنا پیام چپکا دیتی اور مسکرا کر پتنگ کو ہلکی سی دریائی دیدیتی اور دوسرے سرے پر ٹھمکی پر ٹھمکی مار کر پتنگ کو اڑا کر کھینچ لیا جاتا۔

پتنگ نے شاعروں کے حساس دلوں میں بھی محبت کے جذبات جگائے ہیں۔ محبت کے معاملے میں پتنگ کو دل جلوں نے کیسے کیسے استعمال کیا ہے، اس کی اردو شاعری میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مرزا غالب کو بھی بچپن میں پتنگ بازی کا بڑا شوق تھا۔ ان کے یہ اشعار جو منشی صفدر علی صفدر کی تصنیف "حسنِ خیال" میں درج ہیں، پتنگ کا ایک اور ہی رخ پیش کرتے ہیں:۔

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا اے دل ہوائے دلبراں
بس کہ تیرے حق میں کرتی ہے زیاں
پیچ ہیں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈور انجام کار
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں!

پتنگ اڑانے کا مزہ چھت اور چھجوں کے علاوہ میدانوں میں بھی آتا ہے مگر دیکھنے کا مزہ جو کسی حویلی کی اونچی چھت سے آتا ہے وہ نیچے سے نہیں آتا۔ چھت پر پہنچتے ہی "یہ کاٹا' وہ کاٹا" کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ کوئی اچم یا کھچم ہے اور کوئی ڈھلم سے پینچ لڑا رہا ہے یا اس کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی کسی پینچ میں اراٹے کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ جس کا پتنگ نو پتنگ کاٹ کر بھی محفوظ رہتا تو نوشیرواں کہلاتا تھا۔ پتنگ اڑانے اور لوٹنے میں تو مزہ آتا ہی تھا لیکن کسی کا پتنگ کٹنے پر اس کے پیچھے بے تحاشہ بھاگنے کا بھی اپنا مزہ تھا اور شاید لوٹنے سے بھی کہیں زیادہ۔ سینکڑوں لڑکے ننگے پاؤں اچھے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں جگہ جگہ ٹولیوں میں کھڑے ہیں اور آسمان پر نظریں جما رکھی ہیں کہ کب کوئی پتنگ کٹے اور وہ بھاگیں۔ کسی کے ہاتھ میں بانس ہوتا جس کے اوپر جھاڑ بندھا ہوتا۔ کسی نے صرف کسی درخت کی سوکھی ہرن کے سینگوں کی طرح کی ٹہنی اٹھائی ہوئی ہے۔ بعض نے پتلی رسی یا مانجھے کے ٹکڑے میں بھٹوں کی گلیوں کو باندھ کر لنگر بنائے ہوئے ہیں۔ سب کے چہروں پر مسلسل بھاگنے سے ایک تمتماہٹ ہے اور لب سوکھی پپڑی بنے ہیں مگر جوش کا ایک دریا ہے کہ امڈا پڑ رہا ہے۔ ابھی پتنگ کٹا بھی نہیں ہے اور پینچ میں پھنسے پتنگ ایک زبردست ڈھیل میں لڑ جھکتے جا رہے ہیں کہ ان لڑکوں نے بھی ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا ہے کیونکہ دونوں میں سے ایک پتنگ تو کٹیگا ہی اور وہ وقت کیوں کھوئیں۔

جونہی پتنگ کٹا انھوں نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ اب ان کا پاؤں کسی نالی میں پڑتا ہے یا وہ کسی گائے بھینس سے ٹکراتے ہیں، اس سے بالکل بے نیاز وہ دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں۔ کٹا ہوا پتنگ ہوا میں لہراتا، جھومتا اور بل کھاتا جا رہا ہے اور پتنگ لوٹنے والے اس کی طرف نظریں گڑائے اور اپنے بانسوں اور شاخوں کو اچکا اچکا کر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ لٹکتی ہوئی اور تیزی سے سرکتی ہوئی ڈور کو بھی دیکھنے، پکڑنے اور الجھانے کی کوشش بھی ساتھ ہی جاری ہے۔ یہ لیجیے کسی نے پتنگ کا مانجھا لوٹ لیا اور جب کسی کے ہاتھ پتنگ لگ گیا پھر تو مزہ ہی آ گیا۔ ایک بڑے شور و غل کے بعد ایسا سناٹا چھا گیا جو کسی میدانِ جنگ میں لڑائی کے بعد چھا جاتا ہے۔ کسی کے ہاتھ تو صرف پھنٹی لگی ہے تو اس کو انٹی میں لپیٹ لیا۔ مگر وہ بھی خوشی سے پھولا نہیں سما رہا۔ خوش قسمت لڑکے اپنا خزانہ حاصل کر کے بھیڑ سے ایسے کٹ جاتے ہیں جیسے ڈر ہو چھینا جھپٹی نہ ہو جائے۔ جہاں ناکام لڑکے کھڑے ہانپ رہے ہیں اور کسی دوسرے پتنگ کے کٹنے کی انتظار دیکھ رہے ہیں وہاں لوٹنے والوں کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں جیسے پتنگ یا ڈور نہیں، دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

کٹتا ہے جو پتنگ، پھر لوٹنے کے لیے
دو دو ہزار دوڑتے ہیں، چھوٹے اور بڑے
کاغذ ذرا سا ملتا ہے یا ٹکڑے کانپ کے
جب اس طرح کی سیر بھلا آن کر پڑے
پھر سوچیے تو کیا ہے ٹھکانہ پتنگ کا!

یوں تو دلی میں نامی پتنگ بازوں کی کمی نہیں تھی مگر مرزا چپاتی کا تو جواب نہیں تھا۔ وہ ایک باکمال پتنگ باز تھے۔ شاہ عالم کے پڑپوتے تھے اور اگرچہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر شاعری بھی کرتے تھے اور فخرؔ تخلص رکھا ہوا تھا۔ ان کا اصل نام فخرالدین تھا۔ وہ شروع سے تتلاتے تھے۔ ان کے والد بھی شاعر تھے اور عالمؔ تخلص کرتے تھے۔ اسی نسبت سے ان کا نام مرزا چپاتی پڑ گیا۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد مالی طور پر تنگدست رہنے لگے تھے۔ شطرنج،

چوسر، گنجفہ اور پچیسی کھیلنے کے شوقین تھے۔ کبوتر اور بیٹر بازی کا شوق بھی تھا۔ ۱۸۵۷ کے ہنگامے میں قلعے سے نکل کر ایک ساتھی کے ہمراہ جمنا میں تیر کر دلی سے آگرہ پہنچے تھے۔ جب امن بحال ہوا تو دلی واپس آ گئے۔ پتنگ بازی میں ان کا شمار دلی کے مشہور استادوں میں ہوتا تھا۔ مانجھا خود تیار کرتے تھے اور پتنگ بنانے اور بیچتے بھی تھے مٹیا محل کے پاس چیلی قبر میں آخری ایام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

دلی کے علاوہ پتنگ بازی کا دوسرا مشہور مرکز لکھنؤ تھا اور وہاں کے استاد دلی آکر دلی کے استادوں سے مقابلوں میں پینچ لڑاتے تھے۔ میر کنکویا لکھنؤ کے واجد علی شاہ کے پتنگ باز تھے۔ وہ اپنی ٹولی کو لے کر ہر سال بلا ناغہ پتنگ بازی کے مقابلے میں شامل ہونے کے لیے دلی آتے تھے۔ یہ مقابلے پرانی عیدگاہ کے پاس والے میدان میں ہوتے تھے اور لوگوں کا ایک جم غفیر وہاں اکٹھا ہو جاتا تھا۔ دراصل ایک بڑا میلہ لگ جاتا تھا۔ چاٹ والے، پان بیڑی والے اور ہر طرح کے سودے والے اور کھلونے والوں کے ساتھ پتنگ، ڈور، چرخے اور مانجھے والوں کی دکانیں زمین پر ہی لگ جاتی تھیں۔ مرزا چپاتی اور دوسرے استاد بھی اپنی دکانیں لگاتے تھے۔ پتنگ بازی کے مقابلے کے لیے باقاعدہ اصول، قواعد اور دستور ہوتے تھے۔ ان کی خلاف ورزی کرنے والے کو ہارا ہوا قرار دے دیا جاتا تھا اور اس بات کا فیصلہ ثالث کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ایک بازی پانچ روپے کی ہوتی تھی جو ان دنوں خاصی رقم تھی اور ہر جیتنے والے کو اسی وقت اپنے حریف سے پانچ روپے چاندی کے کھنکتے سکوں کی صورت میں مل جاتے تھے۔ جس استاد کا ستارہ بلند ہوتا تھا۔ وہ اندھیرا ہونے تک ستر پچھتر روپے جیت لیتا تھا۔ کوئی پتنگ کٹتا تو تماشائی اتنا شور کرتے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ جس کی پتنگ کٹتی اسے "پیری ہے بھئی پیری ہے" کہہ کر شرمندہ کرتے۔ لیکن ہارنے والے اپنے استاد کا دل ٹوٹنے نہیں دیتے تھے اور استاد سے کہتے ـــــ "اجی ایک پتنگ کٹ گیا تو کیا ہوا۔ یہ تو ہوا کا کھیل ہے۔ ابھی تو کئی ہاتھ اور باقی ہیں۔ اس بار انشاء اللہ آپ کی جیت ہو گی"

جب مقابلے ختم ہو جاتے تھے تو دلی کے پتنگ باز لکھنؤ کے پتنگ بازوں سے گلے

ملتے تھے اور دونوں میں گزشتہ دَور کی باتیں ہوتی تھیں۔ بادشاہ کی پتنگ بازی کے چرچے گھنٹوں تک سنائے جاتے تھے۔ مرزا چپاتی کہتے تھے ــــ" اماں میر کنکوے ہمارے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو لال قلعے کے شہزادوں اور ان کے بھائی بندوں کو پتنگ بازی کا بڑا شوق تھا۔ بادشاہ حکم فرماتے تھے ــــ مرزا یاور بخت آپ جمنا کے اس پار سے اور ناظر صاحب دوسرے کنارے سے پتنگ اڑائیں گے۔ بادشاہ کی سواری آئی۔ مرزا کا پتنگ اٹھا کر ریتی پر سوار کھڑے ہو گئے۔ جمنا کے دوسرے کنارے ریت کے اوپر پتنگ اڑ رہا ہے۔ پتنگ جھپکتا ہوا چلا جاتا' اتنی دور کہ آسمان پر تارا سا دکھائی دینے لگتا تھا۔ اب ناظر کی باری تھی۔ انھوں نے بھی پتنگ اڑایا۔ مرزا نے ڈھیل چھوڑ دی۔ ان کی ڈور دریا کے آر پار لٹکتی دکھائی دی تو سواروں نے بانسوں پر بندھی شاخوں سے ڈور کو اٹھا لیا۔ پینچ لڑے مرزا نے دوہرا باندھا تو ناظر نے قط لگایا۔ سینکڑوں لوگ تماشہ دیکھ رہے ہیں اور ڈور لوٹنے کے لیے بے چین ہیں۔ یہ لیجیے وہ پتنگ کٹا اور ہوا میں لہراتا' جھومتا اور غوطہ لگاتا ہوا شاہدرے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی، شور مچا اور دوڑ شروع ہو گئی۔ جس کے ہاتھ پتنگ اور ڈور لگے گی اس کی چاندی ہو جائے گی کیونکہ یہ پتنگ بھی قیمتی ہے اور مانجھا بھی۔ پتنگ کے پانچ روپے اور ڈور کے وزن سے بیس پچیس روپے سیر کے بھاؤ سے کافی روپے مل جائیں گے۔ غرضیکہ اس پتنگ بازی کا بھی نرالا ہی حال تھا۔"

کسی نے پوچھا ــــ" بادشاہ نے پتنگ نہیں اڑائی ؟"

مرزا چپاتی سٹپٹا کر بولے ــــ" میاں ٹھہرو تو سہی۔ وہ بھی سناتا ہوں۔ بادشاہ پتنگ نہیں تُکّل اڑاتے تھے۔ ان تکلوں کی بھی وہ شان کہ ایک بلی' دو بلی سے نہیں' چار بلی اور پانچ بلی ڈور سے اڑائی جاتی تھیں۔ تمہارے جیسے تو تکل کے ساتھ ہوا میں ہی اڑ جائیں لیکن بادشاہ ستّر برس کے ہوتے ہوتے بھی اپنی جگہ پر ڈٹے رہتے۔ کیا مجال جو پیر کھسک جائے لیکن ہاں ڈور کی دھار ایسی ہوتی تھی کہ ہاتھوں میں مخمل کے دستانے پہن لیتے تھے۔ جان بوجھ کر تکل کٹوا دیتے یا لوگوں کا جی رکھنے کے لیے ہنتے سے ڈور توڑ دیتے

تھے۔ انہیں تکّل کی ڈور توڑنے میں سکون ملتا تھا۔ چاہتے تھے کہ ڈور یا تکّل کسی غریب کے ہاتھ لگ جائے تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ارے بھائی تکّل بنانا آسان کام نہیں تھا۔ یوں تو کاغذ کا ٹکڑا لیا اور کانپ اور ٹھڈا تیار کر لیا۔ لیکن تکّل کو بناتے میں تو کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ پانچ یا چھ فٹ کی تکّل ہوتی تھی۔ جی ہاں مانجھے کے سوتنے کے ڈھنگ بھی نرالے تھے۔ ہر مشہور پتنگ باز کا مانجھے کا اپنا نسخہ اور طریقہ ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ ڈور کو رنگ لیا اور کٹے شیشے کا مسالہ بنا کر چڑھا دیا۔ مانجھا کیا ہوتا تھا تلوار کی دھار ہوتی تھی۔ اب کہاں وہ شاہی باتیں۔ اب تو پتنگ بھی بدل گئے۔ دمڑ چیل اور ادّھے بھی گڈیاں اور کنکوے رہ گئے۔ لنڈورے بغیر دُم چھلے کے"

منشی چھویا بھی بڑے مشہور پتنگ باز تھے۔ ایک ہی وقت میں پانچ پانچ پتنگ اپنی پانچوں انگلیوں میں ان کی الگ الگ ڈور باندھ کر اڑاتے تھے۔ اکثر انٹی کے پھرتے رہتے تھے۔ دلی میں آدم قد کی پتنگیں بھی اڑائی گئیں۔ مگر تھوڑے دن بعد ان پتنگوں کی جگہ چنگ اُڑائے گئے، چنگ کی لمبائی چوڑائی یکساں ہوتی تھی اور اس کو دور آسمان میں اڑا کر سُدھ کر دیا جاتا تھا۔ وہ گڈیوں میں پازیب کی سی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بھی باندھ دیتے تھے جو ہوا کے جھونکوں سے بجتی رہتیں۔ ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ پتنگ کے ٹھڈے میں ایک چھوٹی سی سوئی آر پار کر دیتے تھے اور جھکائی دینے پر ان کی یہ سوئی حریف کے پتنگ کو پھاڑ کر رکھ دیتی تھی۔ مگر یہ خلاف قانون بات تھی۔ تاہم منشی چھویا بڑی ہوشیاری سے کسی کسی مقابلے میں بھی ایسا کر جاتے تھے۔

جس جگہ پر قلعے والوں کی پتنگ بازی ہوتی تھی اسے سلیم گڑھ کہتے تھے۔ اس کا دوسرا نام نور گڑھ تھا۔ یہ لال قلعے کے شمال میں بائیں کونے پر واقع تھا۔ جہاں عصر کا وقت ہوا قلعے والے اپنے سامان کے ساتھ روانہ ہونے شروع ہو گئے۔ بادشاہ تختِ رواں پر آتے۔ ایک طرف بادشاہی پتنگ باز مرزا یاور بخت کی سرکردگی میں اکٹھے ہو جاتے اور دوسری جانب معین الملک نظارت خاں، شاہی ناظر اور ان کے ساتھی ہوتے تھے۔

شہزادہ مرزا یاور بخت جو پتنگ بازی کے ایک بڑے ماہر تھے، بادشاہ سے بھی پنیچ

لڑاتے تھے۔

شہر والوں کی پتنگ بازی گھٹا مسجد کے باہر جمنا کے کنارے ریت کے میدان پر ہوتی تھی۔ جمعے کی نماز کے بعد پتنگ بازوں کا ایک بڑا مجمع لگ جاتا۔ شب برات، عید اور بقر عید کے موقعوں پر تو خاص تیاریاں کی جاتیں۔ میلے لگ جاتے اور جگہ جگہ ڈیرے، تنبو اور شامیانے کھڑے کر دئے جاتے۔ ہندو بھی ان میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتنگ اڑاتے تھے۔ بسنت اور جنم اشٹمی اور مکر سنکرات کے موقعوں پر بھی زبردست پتنگ بازی ہوتی تھی اور مسلمان بھی شامل ہوتے تھے۔ جس شام کو سارا آسمان طرح طرح کی گڈیوں اور پتنگوں سے بھر جاتا تو مسلمان بھی سمجھ جاتے کہ آج جنم اشٹمی کا تہوار ہے۔ تہواروں پر لوگ پتنگوں کو اتنا اونچا اڑا دیتے کہ آسمان سے چپکے لگتے۔ دلی کے پتنگ بازوں کو اتنی مہارت حاصل تھی کہ ذرا پتنگ چکراتا تو کھنچائی کر کے ترنت سدھ کر لیتے۔

اب ذرا پتنگ کی تاریخ پر بھی نگاہ ڈال لیں۔ لغوی اعتبار سے پتنگ سنسکرت کا لفظ ہے اور اڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی عہد میں پتنگ کے ساتھ بازی کا لفظ جوڑ کر "پتنگ بازی" بنا لیا گیا۔ فارسی میں اسے کاغذِ باد کہتے تھے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق سب سے پہلے پتنگ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چار سو سال قبل ٹورنٹم میں ایک شخص آرچی ٹاس نے بنایا تھا۔ لیکن ایشیا کے ملکوں اور قبیلوں میں اس کا رواج اتنا پرانا ہے کہ اس کی مدت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ بہت سے تاریخ دانوں نے پتنگ کو مذہب سے بھی جوڑا ہے۔ پتنگ اڑانے کے ساتھ ساتھ بھجن بھی گائے جاتے تھے جن میں پتنگ کی خوبیوں کا ذکر ہوتا تھا جیسے یہ کسی دیوتا کا روپ یا نشان ہو۔ کہتے ہیں کہ کوریا میں فوج کے ایک کمانڈر نے سینکڑوں برس پہلے اپنی فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اور ان میں ایک نیا جوش پیدا کرنے کے لیے پتنگ کے ساتھ ساتھ ایک قندیل بھی اڑائی تھی۔ اس قندیل کو دیکھ کر اس کی فوج نے سوچا کہ آسمان میں ایک نیا ستارہ ابھرا ہے جو ہماری فتح کا پیغام لایا ہے۔ کوریا کے ایک دوسرے فوجی

سردار کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے پتنگ اڑا کر دریا کے پاٹ کو ناپا اور اسی حساب سے اُس پر پُل تیار کروایا۔ سچ تو یہ ہے کہ کوریا، جاپان اور چین اور سارے مشرقی ایشیا کے ملکوں میں پتنگ بازی کا شوق بہت قدیم زمانے سے رہا ہے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ دن کے وقت کچھ دکاندار اپنا سارا کام چھوڑ کر پتنگ اڑانے لگتے تھے اور اس سے ان کا دھندا بھی چوپٹ ہو جاتا تھا۔ چینی اور جاپانی پتنگ ہمارے ملک کے پتنگوں سے شکل و صورت کے اعتبار سے ہمیشہ مختلف رہے۔ اُن ملکوں میں کسی پتنگ کی شکل کسی پرندے پر کسی کی سانپ اور اژدہے پر، کسی کی کسی چوپائے کے اوپر اور کسی کی مچھلی کی طرح ہوتی تھی۔ چھوٹے پتنگوں کے علاوہ سات آٹھ فٹ تک کے پتنگ بنائے جاتے تھے۔ پتنگ آج بھی ان ممالک میں بڑے مقبول ہیں اور کئی قسموں کے بنائے جاتے ہیں۔ ان کے پلاسٹک کے پتنگ ہر ملک میں بچے پسند کرتے ہیں۔ عام پتنگوں میں کانپ اور ٹھڈّے اور چاروں طرف کی کنیاّں بانس کی بنی ہوتی ہیں اور چاول کے باریک کاغذ یا بہت ہی ہلکے ریشم سے انہیں مڑھ دیا جاتا ہے۔

قدیم چین میں نویں مہینے کا نواں دن پتنگ کا ہی دن کہلاتا تھا۔ اُس دن چھوٹے بڑے، غریب امیر، ہزاروں آدمی اور لڑکے چھتوں، ٹیلوں اور میدانوں میں جا کر پتنگ اڑاتے تھے۔

ملیشیا میں پتنگ بڑا مقبول رہا ہے اور وہاں کے لوگ بھی طرح طرح کے پتنگ بناتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے ہوتے تھے جن میں کوئی دُم چھلا نہیں ہوتا تھا۔ شکاگو میں ہوئی ۱۸۹۶ میں کولمبیا کی ایک نمائش میں ملیشیا کے سلطان نے پندرہ قسم کے پتنگ بھیجے تھے۔

ایشیا کے کئی ملکوں میں، خاص طور پر چین یا جاپان میں ایسے پتنگ بھی بنتے تھے جن کے ٹھڈوں پر بہت باریک سوراخ بنا دئے جاتے تھے اور جب ہوا ان میں سے گزرتی تھی تو ایک موسیقی پیدا ہوتی تھی جو نیچے دور تک صاف سنائی دیتی تھی۔ ان سوراخوں کو عموماً وہی کاریگر بناتے تھے جو لکڑی کے منہ سے بجانے والے سوراخدار ساز بناتے تھے۔

کچھ ملکوں کے وہمی لوگوں کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ پتنگوں سے بھوت پریت اور خبیث روحوں کو دور رکھا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ اپنے پتنگوں کو ساری ساری رات اڑلئے رکھتے تھے تاکہ کوئی بد روح ان کے مکان کے پاس نہ پھٹک سکے۔ تیز ہوا ہوتی تو یہ لوگ آسمان میں پتنگ اونچا اڑا کر ڈور دروازے یا کھڑکی یا چھت کی منڈیر سے باندھ دیتے اور پتنگ خود اڑتا رہتا۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں پتنگوں سے سائینس اور تکنیک کے کئی تجربوں میں بھی فائدہ اٹھایا گیا تھا بنجمین فرینکلین نے بھی بہت سے نئے نئے تجربے کیے۔ پتنگ کی مدد سے اس نے ہوا میں سے بجلی کو پکڑا اور روشنی کی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ انیسویں صدی میں ہوا، برسات، بجلی وغیرہ کی پرکھ کے لیے پتنگ کی مدد لی گئی۔ موسم کا پتہ معلوم کرنے والے محکموں نے بھی پتنگ سے کام لیا۔ ایسے پتنگوں کو " باکس کائٹ" یا " صندوق پتنگ" کہتے تھے۔

کئی ملکوں میں دفاع کے کاموں میں بھی پتنگ کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ پتنگ میں باندھ کر خبریں پہنچانا، خفیہ پیغام بھیجنا، پتنگ سے باندھ کر جھنڈا اڑانا اور دو میل کی دوری تک اس قسم کے بہت سے کاموں میں پتنگ کا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ایک دو ملکوں میں تو پتنگ کے ساتھ ایک چھوٹا سا کیمرہ چسپاں کر کے دشمن کے اڈوں اور اس کی نقل و حرکت کی فوٹو تک لی گئی ہیں۔ ہمارے کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ پتنگ اڑانے اور اس کو اڑتے ہوئے دیکھنے سے بینائی بھی بڑھتی ہے اور آنکھیں دکھنے نہیں آتیں۔

ہندوستان میں پتنگ بازی کی تاریخ اور روایت بڑی پرانی ہے۔ ہمیں قدیم زمانے کی کئی ایسی قلمی تصویریں بھی ملتی ہیں جن میں کرشن کنہیا کو پتنگ اڑاتے دکھایا گیا ہے۔ اس طرح سے اس کا سلسلہ مہابھارت کے زمانے تک جا ملتا ہے۔ بعد کے زمانے میں بھی کئی مذہبی اور تاریخی کتابوں میں اس کا ذکر مل جاتا ہے۔ مغلیہ زمانے میں تو پتنگ بازی کا رواج عام تھا۔ مغل بیگمات اور شہزادیوں کو بھی پتنگ اڑانے کا شوق تھا۔ ایسی بہت سی قلمی تصویریں ہیں۔ جن میں عورتوں کو پتنگ اڑاتے دکھایا گیا ہے۔

"گزشتہ لکھنؤ" کے مصنف عبدالحلیم شرر صاحب کی یہ رائے کہ پتنگ کی روایت صرف ایک صدی پرانی ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کا آغاز شاہ عالم کے زمانے سے ہوا صحیح نہیں ہے اور کسی بھی مورخ اور عالم نے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہاری، کبیر، رحیم اور تلسی کے دوہے ان کی نظر سے نہیں گزرے جن میں پتنگ کا ذکر بار بار آتا ہے۔

پتنگ کی ساخت میں بھی ایک خاص قسم کا تال میل اور ہم آہنگی ہے۔ ظاہر میں دو نازک پتلیوں پر رنگین کا غذ مڑھے ہونے کی ایک چوکور شکل کا نام پتنگ ہے مگر اسے بنانا ہر ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس میں کافی محنت، احتیاط اور تجربے کی ضرورت ہے۔ پتنگ بنانے میں ایک دشواری یہ ہے کہ اگر اس کی کانپ، کنّی، ٹھڈّا، بالائی تکّا اور نیچے کا پتّہ درست نہیں ہوگا تو پتنگ ٹھیک نہیں اڑے گا۔ اس لیے ہندوستان میں عمدہ پتنگ بنانے والے وہی لوگ تھے جنھیں پتنگ اڑانے کا کئی سالوں کا تجربہ تھا۔ ٹھڈّوں کے لیے سخت بانس کا استعمال کیا جانا ضروری تھا اور یہ بانس مرشد آباد اور نجیب آباد سے آتے تھے۔ کانپوں کے لیے نرم بانس کلکتے سے آتے تھے۔ ٹھڈّے کے دونوں سروں کو پتلا اور درمیانی حصے کو موٹا رکھا جاتا تھا تاکہ ڈور کی جنبش کا صحیح دباؤ پڑے۔ پہلے پتنگوں کے لیے ولایتی کا غذ استعمال ہوتا تھا کیونکہ اس وقت ملک میں مشینی کاغذ تیار نہیں ہوتا تھا۔ ——— کچھ پتنگ بنانے والے کاغذ کا تاؤ کاٹ کر اس پر تیل کا پچارا لگا کر عقیق یا کوڑی سے روشن اور چمک دار لکیریں بھی ڈال دیتے تھے۔

مانجھا تیار کرنے میں بھی بڑی مہارت اور محنت درکار تھی۔ اگرچہ عمدہ مانجھا دکانوں پر بھی مل جاتا تھا مگر پتنگ اڑانے کے شوقین عموماً اپنا مانجھا خود تیار کرتے تھے۔ اگرچہ مانجھے کے بنیادی اجزا شیشہ، دار چینی، گیرو اور چاول کی پیچ ہوتے تھے مگر ہر پتنگ باز اپنی دو ایک چیزیں ایسی بھی ڈالتا تھا جن سے ڈور میں سختی اور کاٹ آجاتی، مثلاً گوکھرو، گھی گوار وغیرہ۔ نسخے کی مخصوص چیزیں صیغۂ راز میں رہتیں۔ پھر شیشے شیشے میں فرق ہوتا۔ ہر شخص کی کوشش یہی ہوتی کہ پرانی کنچے کی گولی والی لیمن کی موٹی بوتلیں مل جائیں۔ کوئی ایسی

بوتل گھر میں ٹوٹ جاتی تو اس کا کانچ کپڑے میں باندھ کر مانجھے کے لیے رکھ لیتے۔ گھر میں چھت پر، والدین سے چھپ چھپاکر، سخت دھوپ میں کوئی سائے دار کونا ڈھونڈ کر یا کسی سنسان گلی میں درخت کے سائے میں بیٹھ کر لڑکے شیشہ کوٹتے۔ لوہے کی موصلی اور حمام دستہ جو مصالحے کوٹنے کے کام آتا تھا رسوئی میں سے نکال لاتے۔ شیشے کو کوٹ پیس کر کپڑچھان کرتے اور دوسری اشیا ملاکر لگدی تیار کر لیتے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈور کو کیلوں میں باندھ کر ہاتھ سے مانجھے کو سوتتے اور سوکھنے پر ایک دفعہ اور لگدی پھیرتے۔ گھر والوں کے دوپہر کی نیند سے جاگنے سے پہلے ہی حمام دستے اور موصلی کو دھو دھاکر اور سکھاکر رسوئی میں اسی جگہ پر رکھ دیتے۔ عموماً پتنگ بازی کے شوقین لڑکے پڑھائی میں کمزور ہوتے تھے۔

دلی میں پتنگ بازی کا شوق اب زیادہ تر بچوں تک محدود ہے۔ بڑوں کے اس شوق کو زمانے کی تیز رفتاری، تگ و دو اور معاشی جد و جہد نے ڈس لیا ہے۔ نہ اب وہ پرانے مانجھے ہیں اور نہ پتنگ اور تکلیں۔ پچاس پیسے یعنی اٹھنی کا کمزور کانپ اور ٹھڈے والا ایسا پتنگ ملتا ہے جو بچوں کے ہاتھ میں ہی گھر پہنچتے پہنچتے پھٹ جاتا ہے۔ ہاں موسم بہ موسم آسمان پتنگوں سے اب بھی بھر جاتا ہے۔ گلی گلی میں اور سڑکوں اور بازاروں میں پتنگوں اور ڈور کی لوٹ کا منظر بھی وہی ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ بڑوں میں بھی یہ شوق قطعی طور پر تو معدوم نہیں ہوا اور اب بھی میلوں میں کبھی کبھی عمدہ پتنگ بازی دیکھنے میں آجاتی ہے مگر وہ پرانی سی دیوانگی نہیں ہے جس کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ایک ذرا پرانی بات بے ساختہ یاد آتی ہے۔ پھول والوں کی سیر کے میلے میں ایک باکمال پتنگ باز نے ایک پتنگ کو اس پر کاغذ کے پھولوں کا ہار ڈال کر اڑایا اور پتنگ کو ایسا جھٹکا دیا کہ ہار اس وقت کے راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن مرحوم کے گلے میں پڑ گیا۔ اس کرتب کو دیکھ کر سارے تماشائی اچنبھے میں رہ گئے تھے اور حاضرین نے خوب تالیاں بجائی تھیں مگر وہ کمال شاید اس بجھتی ہوئی شمع کی آخری بھڑک تھی!

ایک کہانی گوگورانی

ایک کہانی گوگورانی
ہم کو دُودھا تم کو پانی

دلی کی گھریلو زندگی میں کہانیوں اور پہیلیوں کی ایک مخصوص اہمیت تھی۔ گھروں میں دادی اور نانی ماں اور دوسرے بزرگ بلا ناغہ کہانیاں سناتے اور پہیلیاں بجھواتے تھے۔ کہانی ختم ہونے پر بچوں کو چھیڑنے کے لیے کہہ دیتے تھے ـــ ایک کہانی گوگورانی' ہم کو ددھا تمکو پانی۔ بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے مگر "تم کو پانی" والی بات پر سوچنے لگتے تھے کہ واہ ہم کو پانی کیوں' اور چیخ کر کہتے تھے ـــ ایک کہانی گوگورانی، ہم کو ددھا تم کو پانی۔
بات وہی تھی' جدھر مرضی آئے گھمالو مگر بچوں کو تفریح کا موقعہ مل جاتا اور بڑوں کو چھیڑ چھاڑ کا۔ بچوں کی یہ کہانیاں بڑی دل چسپ اور اکثر سبق آموز ہوتی تھیں۔

عقلمند ہاتھی

"ہاں بھئی تو سنو" دادی ماں بولیں۔ "یہ تو تم جانتے ہو کہ ہاتھی بہت عقلمند جانور ہوتا ہے۔ وہ بول نہیں سکتا لیکن سب بات سمجھ لیتا ہے۔ بچو بہت دن پہلے کی بات ہے کہ ایک مندر کے آنگن میں تہواروں پر بہت بڑا شامیانہ تانا جاتا تھا۔ اس میں ہاتھی سے مدد

بھی لی جاتی تھی۔" بچے پوچھتے۔" دادی ماں ہاتھی سے کیسے؟" دادی ماں جواب دیتیں۔ " ہاتھی اپنی سونڈ میں موٹے موٹے بھاری بھاری لکڑ اٹھا کر لاتا تھا اور آنگن میں چاروں سمت کھدے گڑھوں میں ان لکڑوں کو گاڑ دیا جاتا تھا۔ چاروں کونوں پر کھڑے لکڑوں پر لکڑیوں کا جال بنایا جاتا اور ان پر کپڑے کا شامیانہ تانا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ہاتھی کی سونڈ میں بہت بڑا لکڑ اٹکا ہوا تھا۔ وہ اسے گڑھے کے پاس لے آیا مگر اس نے گڑھے میں کچھ دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ہاتھی کے مہاوت نے بہت کوشش کی لیکن ہاتھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھا۔ مہاوت کے ساتھ کئی آدمیوں نے بھی ہاتھی کو آگے بڑھنے کے لیے مارا پچکارا، لیکن ہاتھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ جب کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تو مہاوت نے گڑھے میں جھانک کر دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ہاتھی کی عقلمندی پر بڑی حیرانی ہوئی۔ گڑھے میں کئی ننھے منے بلی کے بچے پڑے ہوئے تھے۔ اگر ہاتھی لکڑ کو گڑھے میں گاڑ دیتا تو بلی کے بچے مر جاتے۔"

یہ سنتے ہی بچے خوشی سے جھوم اٹھتے اور چلا کر بولتے۔" ہاتھی نے بلی کے بچوں کو بچا لیا۔ ابا جی ہاتھی کتنا دیالو تھا۔" لیکن بچوں کی ایک کہانی سے تسلی نہ ہوتی۔ جھٹ بولتے ——— " اچھا دادی ماں اب بونے اور راجہ کی کہانی سناؤ۔"

بونے اور راجہ کی کہانی

دادی ماں کہانی سنانے سے پہلے بچوں کو یہ گیت سناتیں۔

سرکنڈے کی دو گاڑیاں رے گاڑیاں
ان میں مینڈک جوتے جائیں
راجہ ماری پودنی ہم بیر بساون جائیں

" ہاں تو بچو، ہوا یہ کہ ایک راجہ تھا، بڑا ظالم اور بے رحم۔ وہ سب کو بہت ستاتا تھا۔ ایک دن وہ گھوڑے پر سوار اپنی فوج کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے نکلا۔ راستے میں اس نے ایک پودنے کی بیوی یعنی پودنی کو کھیت میں کام کرتے دیکھا۔ کھیت ہرا بھرا تھا

اور لہلہا رہا تھا۔ راجہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کھیت میں لگی سبزیوں کو توڑ لاؤ اور ہمارے سامنے پیش کرو۔ راجہ کے سپاہی کھیت میں گھس گئے اور ساری سبزیاں توڑنے لگے۔ پودنی بیچاری اکیلی تھی۔ پودنا کہیں کام سے گیا ہوا تھا۔ پودنی نے پہلے تو سپاہیوں کے ہاتھ پیر جوڑے لیکن انھوں نے ایک نہ سنی۔ اس پر پودنی سپاہیوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔ راجہ نے پودنی کو بڑی بہادری سے لڑتے دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر خود پودنی پر حملہ کر دیا اور اسے بری طرح مار کر چل دیا۔ جب پودنا کھیت پر پہنچا تو اپنے اجڑے ہوئے کھیت کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ پودنا حیران اور پریشان ادھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے پودنی کو گھائل پڑے دیکھا تو ماجرا پوچھا۔

پودنی بس اتنا ہی کہہ سکی کہ اسے راجہ نے مارا ہے۔ یہ سن کر پودنے نے راجہ سے لڑنے کی ٹھان لی۔ پودنا اکیلا تھا اور راجہ کے پاس بہت بڑی فوج تھی۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ جنگل کی طرف چل دیا۔ راستے میں زور کی ہوا چلنے لگی۔ ہوا کو بھی پودنے نے سارا حال سنایا تو وہ بھی اس کی مدد کے لیے تیار ہو گئی۔ پودنے نے ہوا سے کہا — آ میرے کان میں گھس جا۔ پودنا آگے بڑھا تو اسے سمندر ملا۔ اس نے سمندر کو بھی راجہ کے ہاتھوں پودنی کے مارے جانے کی داستان سنا دی۔ سمندر بھی پودنے کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ پودنے نے اسے کہا — آ میرے کان میں گھس۔ اس طرح پودنا جنگل کے جانوروں، ہوا اور سمندر کو ساتھ لے کر راجہ کے محل کی طرف جا رہا تھا تو آسمان میں چمکتے سورج نے اس سے پوچھ لیا۔ پودنے، پودنے کہاں جا رہے ہو۔ پودنے نے سورج کو اپنی رام کہانی سنائی تو سورج دیوتا بھی اپنے سنہری رتھ میں بیٹھ کر پودنے کے ساتھ ساتھ چل دئے۔

راجہ نے پودنے کے ساتھ ساتھ جنگل کے جانوروں، ہوا، سمندر اور سورج کو اپنے محل میں آتے دیکھا تو گھبرا کر بھاگا۔ لیکن ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پکڑا گیا۔ سب نے مل کر راجہ سے پودنی کے مارنے کا بدلہ لے لیا۔"

بے ایمان کوّا

بچے نانی ماں کو گھیرے بیٹھے تھے اور سر ہو رہے تھے کہ کوئی کہانی سناؤ۔ نانی ماں بولیں ــــ "ایک تھی مینا، ایک تھا کوّا"۔ بچے خوشی سے چلائے۔ تو نانی ماں پھر کیا ہوا! نانی ماں تنک کر بولیں ـــ بھئی سنو بول تو رہی ہوں۔ بیچ میں ٹوکا ٹاکی سے بات دماغ سے اتر جاتی ہے۔ ہاں تو سنو ــ

"کوے اور مینا میں بہت دوستی تھی۔ مینا کا گھر موم کا تھا اور کوے کا نون کا۔ ایک دن مینا نے کھچڑی پکائی۔ اس نے سوچا کہ کوے کا گھر نون کا ہے چلو نون اس سے لے آؤں۔ جب وہ کوے کے گھر پہنچی اور اس سے اپنی کھچڑی کے لیے ذرا سا نمک مانگا تو کوا بولا ــ چل چل بھاگ یہاں سے۔ کیا میں تیرے لیے اپنا گھر توڑ دوں؟ ــ مینا کو بہت برا لگا۔ وہ اپنے گھر لوٹ آئی اور پھیکی کھچڑی کھا کر سو گئی۔

برسات کا موسم آیا اور آسمان پر پہلے تو بادل گھر آئے اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ کوے کے گھر کی چھت ٹپکنے لگی۔ وہ ایک کوٹھڑی سے دوسری کوٹھڑی میں گیا مگر ہر جگہ پانی ٹپک رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا گھر گھلنے لگا۔ اب تو کوا گھبرایا اور سوچنے لگا کہ کدھر جاؤں۔ اسے اپنی دوست مینا کا خیال آیا کہ اس کا گھر تو موم کا ہے چلو وہیں جا کر ٹھہریں۔ اُڑا اُڑا اس کے گھر جا پہنچا۔ مینا کا گھر بند تھا۔ کوے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مینا نے آواز دی، کون ہے؟ کوا بولا۔ میں ہوں تمہارا دوست کوا، دروازہ کھولدو۔ مینا نے کہا ــ دُر موئے میری آنکھیں دُکھیں، چل بھاگ یہاں سے ــ کوے نے گڑگڑا کر کہا ــ مینا مینا میں بہت بھیگ گیا ہوں۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ جلدی دروازہ کھول۔ مینا کو ترس آگیا اور اس نے دروازہ کھولدیا۔ کوا ٹھنڈ کے مارے کانپ رہا تھا۔ مینا نے آگ جلائی تو کوے کی جان میں جان آئی۔ مینا نے کہا میرا تو چھوٹا سا گھر ہے جا اندر کوٹھار میں سو جا۔ کوا کوٹھار میں چلا گیا اور مینا نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ تھوڑی دیر میں کوٹھار میں سے مینا کو کٹر کٹر کی آواز سنائی دی۔ مینا نے پوچھا ارے کوے تو کیا کھا رہا ہے۔ کوے نے کہا کچھ نہیں اپنے بیاہ کی لونگ

سپاری ساتھ لے آیا تھا وہ کھا رہا ہوں۔ مینا چپ ہو گئی مگر کٹر کٹر کی آواز آتی رہی۔ جب کافی دیر تک آواز آتی رہی تو مینا نے پھر پوچھا' کوے تو کیا کھائے چلا جا رہا ہے۔ کوے نے پھر وہی جواب دیا۔ کچھ نہیں اپنے بیاہ کی وہی لونگ سپاری کھا رہا ہوں۔ مینا بولی' اپنے بیاہ کی لونگ سپاری تھوڑی سی مجھے بھی تو دے دے ــــ کوا بولا' وہ تو تھوڑی سی ہی تھی، اب تو ختم بھی ہو گئی۔

مینا تھکی ہوئی تھی' گہری نیند میں سو گئی۔ جب سویرے مینا کی آنکھ کھلی تو دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ مینا کو بڑا افسوس ہوا کہ اتنا دن نکل آیا' بچارا کوا بھوکا پیاسا کوٹھار میں بند پڑا ہے۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ کھولا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا کوا پھر سے اڑ گیا۔ مینا نے دیکھا کہ کوٹھار میں جتنا کھانے پینے کا سامان رکھا تھا کوا سارا کھا گیا تھا۔ بے چاری مینا بے ایمان کوے سے دوستی کر کے بڑی پچھتائی"۔

"بڑی اچھی ہے' بڑی اچھی ہے" بچوں نے تالیاں بجائیں، "نانی ماں ایک اور"۔

"بس' اب کل سنائیں گے" نانی ماں بولیں۔

اتفاق کی طاقت

نانی ماں کو بچوں نے پھر گھیرا ہوا تھا۔ نانی ماں بولیں ــ اچھا بیچ میں تو نہیں بولو گے؟ سب نے ایک ساتھ زور سے کہا ــ نہیں بولیں گے۔ نانی ماں بولیں۔ تو سنو۔ "ایک بار کبوتروں کا ایک جھنڈ دانوں کی تلاش میں آسمان میں اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ انہیں اڑتے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی لیکن کہیں اناج کا ایک بھی دانہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس جھنڈ میں ایک چھوٹا کبوتر بھی تھا جو اڑتے اڑتے بہت تھک گیا تھا۔ جب کبوتر اڑتے اڑتے ایک جنگل پر سے گزر رہے تھے تو چھوٹے کبوتر نے اپنے راجہ سے کہا ــ مہاراج اجازت ہو تو اس جنگل میں تھوڑا سا آرام کر لیں ــ کبوتروں کا راجہ بولا ــ پہلے کام' پھر آرام۔ بچے ہمت سے کام لو۔ کہیں نہ کہیں ضرور اناج ملے گا۔

چھوٹا کبوتر چپ ہوگیا۔ اس نے ہمت کی اور زور لگا کر اڑنے لگا۔ وہ تھک کر چور ہو گیا تھا مگر اس کی تھکاوٹ خوشی میں بدل گئی جب اسے ایک درخت کے نیچے اناج پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے دوسرے کبوتروں سے کہا۔ جلدی کرو اور نیچے اتر جاؤ۔ اس درخت کے نیچے اناج کے دانے پڑے ہوتے ہیں۔ کبوتروں کا جھنڈ فوراً نیچے اتر پڑا۔ ایک برگد کے درخت کے نیچے چاول کے چمکتے ہوئے دانے بکھرے پڑے تھے۔ یہ دانے ایک شکاری نے بکھیرے تھے مگر بیچارے کبوتروں کو کیا پتہ۔ اُن کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ وہ چاول کے دانوں پر ٹوٹ پڑے اور مزے لے لے کر کھانے لگے۔ یکا یک ان کے اوپر ایک جال آکر گرا اور سارا جھنڈ اس جال میں پھنس گیا۔ اسی وقت وہ شکاری جو چھپا کھڑا تھا ایک موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لیے کبوتروں کی طرف بڑھا۔ کبوتروں کے راجہ نے اسے دیکھ لیا اور بولا۔ ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ ظالم شکاری ہمیں مار ڈالے گا۔ آؤ ہم سب مل کر زور لگائیں اور جال سمیت اڑ چلیں۔ یاد رکھو ہمارا اتفاق ہی ہماری طاقت ہے۔

بچو، جونہی شکاری جال کے پاس پہنچا، کبوتروں نے جال کا ایک ایک حصہ پکڑ کر پورا زور لگایا اور جال سمیت اڑ گئے۔ شکاری حیران ہو کر وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس نے یہ منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی طرح سے اس کا جال ہی اسے واپس مل جائے اس نے کبوتروں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ کبوتر شکاری کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر پہاڑیوں اور گھاٹیوں کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر اڑنے لگے۔ آخر کار شکاری مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ جب شکاری کہیں نظر نہیں آیا تو کبوتروں کا راجہ بولا۔ شکر ہے کہ خطرہ ٹل گیا۔ چلو اب پہاڑی سے پرے مندر کی طرف چلیں۔ وہاں میرا ایک دوست چوہا رہتا ہے۔ وہ اپنے نکیلے دانتوں سے اس جال کو کاٹ کر ہمیں آزاد کر دے گا۔ سارے کبوتر شور مچاتے ہوئے مندر کے پاس چوہے کے گھر پر اتر گئے۔ ان کے شور سے چوہا ڈر کر اپنے بل کے آخری کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ کبوتروں کے راجہ نے باہر سے اسے پکار کر کہا۔ بھائی چوہے ہم تمہارے پاس مدد کے لیے آئے ہیں۔ راجہ کی آواز سن کر چوہے نے بل کے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ واقعی وہ تو اس کا دوست کبوتروں کا راجہ ہے۔ چوہا باہر آگیا اور کبوتروں کے راجہ نے اسے سارا

ماجرا سنا کر کہا۔ بھائی چوہے تم اب اس جال کو کاٹ کر ہمیں آزاد کرو۔

چوہا آگے بڑھا اور اس نے سب سے پہلے اپنے نکیلے دانتوں سے جال کے ایک حصے کو کاٹ کر راجہ کو آزاد کرنا چاہا مگر راجہ بولا۔ نہیں نہیں میرے دوست پہلے میرے دوسرے ساتھیوں کو آزاد کرو، مجھے سب سے بعد میں۔ چوہا جانتا تھا کہ راجہ کے دل میں اپنی رعایا کے لیے بڑی محبت ہوتی ہے۔ اس نے ذراسی دیر میں ایک ایک کر کے جال کے سارے پھندے کاٹ ڈالے اور تمام کبوتروں اور راجہ کو آزاد کر دیا۔ کبوتروں نے ان کی جان بچانے والے چوہے کا شکریہ ادا کیا اور اسی اتفاق سے مل کر جھنڈ میں پھڑ پھڑاتے ہوئے روانہ ہو گئے۔"

نکل دلدّر لکشمی آئی

بچے پھر نانی ماں کو گھیرے بیٹھے ہیں اور کہانی کے لیے سر ہو رہے ہیں۔ نانی ماں نے بیچ میں نہ ٹوکنے کی شرط لگا دی ہے اور بچے چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ نانی ماں بولیں: بچو آج دیوالی کی کہانی سناؤں گی۔ سناتے تو اسے دیوالی کے موقعے پر ہیں، پر تم سوچ لو آج دیوالی ہے۔ سوچ لیا، بچے چلائے اور نانی ماں نے کہانی شروع کر دی۔

"بچو، ایک تھا راجہ۔ راجہ بڑا سندر اور بلوان تھا۔ اس کا محل بڑا سندر تھا۔ اس کی بہت سی رانیاں تھیں۔ سب رانیاں بڑی سندر تھیں مگر اس کی پٹ رانی تو بہت ہی سندر تھی اور راجہ اسے بہت چاہتا تھا۔ ایک روز اس نے راجہ سے تحفے میں نولکھا ہار مانگ لیا۔ راجہ رانی کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا، نہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ اس نے شہر کے سب سے مشہور جوہری کو بلوا کر ایسا نولکھا ہار بنانے کا حکم دیا جو اس سے پہلے کبھی نہ بنا ہو۔ جوہری نے ہیروں اور جواہرات سے جڑا ہوا ایک نایاب اور نادر نولکھا ہار تیار کیا اور راجہ نے اس سے خوش ہو کر نہ صرف اس کو ہار کی قیمت ادا کی بلکہ ایک بڑی رقم انعام کے طور پر بھی دی۔

پھر راجہ نے اپنی پٹ رانی کو وہ ہار دیا اور پٹ رانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

پٹ رانی اس ہار کو ہر وقت پہنے رہتی اور سوتے ہوئے بھی گلے سے نہ اتارتی۔ ہاں

صرف نہانے کے وقت وہ اسے اتار کر پاس ہی رکھ لیتی مگر نہانے کے بعد اسے فوراً پہن لیتی۔ ایک روز وہ محل کے اندر اپنے تالاب میں نہا رہی تھی تو تالاب کے کنارے پر کوئی مور اتر آیا جس کا رانی کو پتہ نہیں لگا۔ وہ مور رانی کے کپڑوں کے پاس پہنچ گیا اور اس نے اپنی چونچ میں رانی کا نولکھا ہار اٹھا لیا اور اڑ گیا۔ مور محل سے باہر نکل گیا۔ رانی جب نہا کر نکلی تو یہ دیکھ کر حیران اور پریشان رہ گئی کہ اس کا پیارا ہار غائب تھا۔ اُسی وقت محل میں شور مچ گیا اور سارے محل میں ہار ڈھونڈا گیا مگر بے سود۔

شہر کے باہر کی طرف ایک غریب بڑھیا رہتی تھی جس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا جس میں وہ رہتی تھی۔ وہ مانگ تانگ کر گزارہ کرتی تھی لیکن جس روز اسے بھیک نہیں ملتی تھی وہ بھوکی ہی سو جاتی۔ اس کے جھونپڑے کی چھت پر دنیا بھر کا کوڑا کباڑ پڑا رہتا تھا۔ اسی کباڑ میں جانے کب سے ایک مرا ہوا سانپ بھی پڑا تھا۔ مور ہار کو چونچ میں دبائے اڑتا اڑتا ادھر آ پہنچا اور اس نے بڑھیا کی چھت پر سانپ دیکھا تو نولکھا ہار بڑھیا کے جھونپڑے کی چھت پر کوڑے میں ڈال دیا اور سانپ کو چونچ میں پکڑ کر اڑ گیا۔

اُدھر رانی کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ راجہ نے اسی طرح کا دوسرا ہار فوراً بنوانے کا وعدہ کیا مگر رانی کو صرف وہی ہار چاہیئے تھا۔ راجہ نے آخر کار سارے شہر اور آس پاس کے علاقوں میں ڈونڈی پٹوا دی کہ جو کوئی رانی کا ہار ڈھونڈ کر لائے گا اسے منھ مانگا انعام ملے گا۔ یہ ڈھنڈورا غریب بڑھیا نے بھی سنا اور اس نے سوچا کہ وہ بھی کیوں نہ ہار کی تلاش کرے، شاید اس کی قسمت پھر جائے۔ اس نے اسی وقت تلاش شروع کر دی۔ بعد میں اسے اپنے جھونپڑے کی چھت پر پڑے کوڑے کا خیال آیا کہ اسے بھی دیکھ لوں۔ وہ کسی طرح سے اوپر چڑھ گئی اور اس نے لکڑی سے اوپر پڑے ہوئے کوڑے کو خوب اِدھر اُدھر کیا تو نولکھا ہار اسے مل گیا۔

اس نے کسی کو نہیں بتایا اور ہار کو ایک پوٹلی میں باندھ کر راجہ کے محل کی طرف چل دی۔ اس نے دربانوں سے کہا کہ وہ راجہ کو خبر دیں کہ ایک بڑھیا آئی ہے اور وہ نولکھا ہار

کے بارے میں راجہ کو بتائے گی کہ کہاں ہے۔ راجہ نے فوراً اسے محل میں بلوایا اور جب بڑھیا نے اسے پوٹلی میں سے نکال کر ہار دیا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے فوراً اپنی پٹ رانی کو بلایا اور ہار اسے تھما دیا۔ راجہ نے بڑھیا سے کہا کہ جو مانگنا ہے مانگ لے، دولت، عالیشان مکان، ہیرے جواہرات جو چاہے گی ملے گا۔ بڑھیا ہاتھ جوڑ کر بولی کہ راجن میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ یہ منادی کرا دیں کہ پرسوں دیوالی کے دن سب لوگ رات کو اندھیرا رکھیں اور کوئی دیا نہ جلائے۔ سارے شہر کی روئی اور تیل میرے گھر آجائے اور میرے ہی گھر اجالا ہو۔ راجہ اس مانگ پر بڑا حیران ہوا مگر اس نے اپنے اعلان کے مطابق بڑھیا کی بات قبول کر کے یہ حکم کرا دیا کہ دیوالی والے روز بڑھیا کے سوا اور کوئی روشنی نہیں کریگا۔

دیوالی آئی مگر سارے نگر میں راجہ کے حکم کے مطابق کسی کے گھر میں روشنی نہیں ہوئی۔ صرف بڑھیا کے جھونپڑے میں روشنی تھی۔ چونکہ دیوالی والے روز لکشمی جی آتی ہیں اور وہ صرف روشنی میں آتی ہیں، اس لیے لکشمی جی صرف بڑھیا کے گھر پہنچیں اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بڑھیا سمجھ گئی کہ لکشمی جی آئی ہیں۔ اس نے پوچھا ــ لکشمی بیٹی بن کر آئی ہو یا بہو۔ لکشمی جی سمجھ گئیں کہ بڑھیا ہوشیار ہے، بولیں ــ بیٹی بن کر نہیں بہو بن کر آئی ہوں یعنی گرہ لکشمی ــ بڑھیا نے دروازہ کھولدیا اور لکشمی جی کو دیکھتے ہی بڑھیا کے گھر میں مدتوں سے بیٹھے دلدر بھاگ گئے ــ

کہانی سن کر بچے بولے ــ "تو نانی ماں کیا بڑھیا امیر ہو گئی؟"

"ہاں بچو" نانی ماں بولیں "جب لکشمی جی کا باس ہو گیا اور دلدر بھاگ گئے تو بڑھیا بھی امیر ہو گئی۔"

بچوں کا اشتیاق

کہانیاں سننے کے لیے بچوں کا اشتیاق دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ دادی اماں یا نانی اماں کے ساتھ جڑے بیٹھے ہیں اور سر ہو رہے ہیں کہ کوئی نئی کہانی سناؤ۔ کچھ بچے

پرانی کہانیوں کو پھر سنا پسند کرتے ہیں۔ کوئی نئی کہانی شروع ہوتی ہے تو بچوں کی دل چسپی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ بے تابی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بار بار بے اختیار پوچھتے ہیں۔ "تو پھر کیا ہوا؟" ایسا کوئی بیسوں بار پوچھتے ہونگے۔ بڑوں کو بھی ایسا سننے کی عادت سے ہو گئی تھی۔ وہ بھی اس کے جواب میں کہتے۔ "ہاں تو بچو ہوا پھر یہ ۔۔۔۔۔"

بچوں کی بے شمار کہانیاں بڑوں کو آتی تھیں۔ سب کی سب دلچسپ ہوتی تھیں اور ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی اچھائی کا پہلو ہوتا تھا۔ قدیم زمانے کی بچوں کی چند مقبول کہانیاں جو بچے اپنے بڑوں سے سنتے تھے، اوپر دی ہوئی مثالوں کے علاوہ یہ تھیں۔ اینٹ کا جواب پتھر، تین عالم اور ایک ان پڑھ، نیکی کر کوئیں میں ڈال، چار دوست، چاند کی جھیل، بندر اور مگرمچھ، سانپ کی بیوی، گویا گدھا اور باتونی کچھوا۔

پہیلیاں

پہیلیاں بوجھنا اور بجھوانا دلی والوں کا پرانا اور محبوب مشغلہ تھا۔ پہیلیوں میں بچے بھی دل چسپی لیتے تھے۔ آسان پہیلیاں ذہین بچے فوراً بوجھ لیتے تھے۔ پہیلیاں انسانی سماج اور روزمرہ کی زندگی میں کب داخل ہوئیں یہ وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ ہاں عالموں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ پہیلی اور محاورے بہت قدیم ہیں اور کم و بیش ایک ساتھ ہی استعمال میں آئے۔ پہیلی ذہنی تفریح کا بھی ذریعہ تھی اور ذہن کو جلا دیتی تھی۔ نئے دور میں پہیلی کا رواج بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ فارسی میں پہیلی کو 'چیستاں' کہتے ہیں۔ اس کے دوسرے لفظوں میں کسی قسم کا اتا پتہ خواہ نظم میں، خواہ نثر بنا کر یا اس میں مذکور شے یا ہستی کا نام دریافت کرنے کو چیستاں یا پہیلی کہتے ہیں۔ ایک فارسی چیستاں ملاحظہ کیجیے، جس کا بوجھنا کسی بھی مرد کے لیے مشکل نہ ہوگا۔

یک جفت کبوتران ابلق ہستند جدا جدا معلق
پرواز بہ آسماں نمائند از خانہ خود بروں نہ آئند

اپنی کچھ پہیلیاں ملاحظہ ہوں۔

چڑھ چوکی پر بیٹھی رانی | سر پر آگ بدن پر پانی
بار بار سر کاٹیں جا کا | ہے کوئی پتہ بتاوے واکا

(شمع)

سکھ کارن بنایا ایک مندر | پون نہ جائے واکے اندر
اس مندر کی ریت دوانی | بچھاویں آگ اور اوڑھیں پانی

(حمام)

نر سے پیدا ہووے نار | ہر کوئی رکھے اس سے پیار
اک زمانہ اس کو کھاوے | خسرو پیٹ میں وہ نہ جاوے

(دھوپ)

ناری کاٹ کے نر کیا سب سے رہے اکیلا | چلو سکھی ری واں چل کے دیکھیں نر ناری کا میلہ

(کنواں)

میٹھی میٹھی بات بناوے ایسا پورکھ وہ کس کو بھاوے | بوڑھا بالا جو کوئی آئے اس کے آگے سیس نوائے

(نائی)

ایک ناری کے دو بالک دونوں ایک ہی رنگ | اک پھرے اک ٹھارا ہے پھر بھی دونوں سنگ

(چکی)

یہ کچھ نئے ڈھنگ کی پہیلیاں ملاحظہ کیجئے ــــ

مالی جی کا باغ لگا، کوئی توڑ نا نہیں

(تارے)

سیتل پاٹی بچھی، کوئی سوتا نہیں

(سمندر)

ذرا موسموں پر بنی پہیلیاں بھی دیکھئے ــــ

گرمی سے وہ پیدا ہووے | دھوپ لگی لہرائے
اے سکھی وہ اتنا کومل | پون لگی مرجھائے (پسینہ)

ایک کنیانے بانک جایا وا بالک نے جگت ستایا
مارا مرے نہ کاٹا جائے وا بالک کو ناری کھائے
(جاڑا)

ان پہیلیوں میں ان کے "حل" کی طرف صاف اشارہ ہے ـــــ

۱۔ دریں، دیواریں، گوشوں میں پلی ہے
نام اس کا پوچھو پوشیدہ کلی ہے
(چھپکلی)

۲۔ ایک عجب میں دیکھی نار اچھے منہ سب اس کے یار
سر اس کا سب قلم کریں کالا منہ کر آگے دھریں
(قلم)

۳۔ راجہ کرن کے باغ میں دیکھے ایسے پھول کانٹوں میں لگتے رہیں کہیں نہ کوئی بھول
(کرن پھول)

امیر خسرو کی یہ دو پہیلیاں بھی ان کے ہی مخصوص رنگ میں ہیں ـــــ

چندر بدن، زخمی تن، پاؤں بنا وہ چلتا ہے
امیر خسرو یوں کہیں وہ ہولے ہولے چلتا ہے
(روپیہ)

ادھر چلمن، اُدھر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے
امیر خسرو یوں کہیں وہ دو دو انگل سرکے
(قینچی)

پہیلیوں کی تعداد ان گنت ہے۔ صرف چند مخصوص پہیلیاں اس بات کو آشکار کرنے کے لیے دیدی گئی ہیں کہ اصل شے یا ہستی کو پوشیدہ رکھنے کی جو فن کارانہ سعی پہیلی بنانے والا کرتا ہے وہ واقعی بڑی عمدہ ہوتی ہے۔ پہیلی کی ساخت میں کافی ذہانت کارفرما ہوتی ہے۔ پہیلی کو سنتے ہی اگر پہیلی کا جواب سوجھ گیا تو وہ پہیلی یا تو گھسی پٹی ہوگی یا پھر اصل بات کو

پوشیدہ رکھنے میں ہوشیاری نہیں دکھائی گئی ہے۔ پہیلی بنانے والے کے لیے صرف یہی لازم نہیں ہے کہ وہ اصل شے یا ہستی کو پردۂ راز میں رکھے بلکہ اسے گتھی کو سلجھانے کے لیے مناسب اشارے بھی پہیلی میں سمونے ہیں۔ دیکھئے یہ کتنی خوبصورت مگر سادہ پہیلی ہے۔

ڈال دیجئے، دیکھا کیجئے

(چِق)

اس پہیلی میں تصویر کشی ملاحظہ ہو۔

بال نوچے، کپڑے پھاڑے اور موتی لیے اتار
یہ بپتا کیسے بنی جو ننگی کر دی نار

(بھُٹّا)

دوسخنے

دلی میں پہیلیوں کے علاوہ "دوسخنے" کہنے کا رواج بھی تھا۔ دوسخنے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، دو باتوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کا جواب ایک ہی ہوتا تھا۔ دوسخنے بھی ایک ذہنی تفریح اور ذہنی ورزش مہیا کرتے تھے۔ ان میں بھی بچے اور بڑے یکساں دلچسپی لیتے تھے اور اپنے ہمجولیوں کو بار بار سناتے تھے۔ مگر دوسخنوں کو پہیلیوں جیسی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی اور اب تو یہ تقریباً ختم ہی ہو گئے ہیں۔ چند دوسخنے جو دلی میں بڑے مقبول تھے نیچے دئے جاتے ہیں۔

دہی کیوں نہ جما، نوکر کیوں نہ رکھا؟
——— ضامن نہ تھا

بامن (برہمن) پیاسا کیوں، گدھا سست کیوں؟
——— لوٹا نہ تھا

جوتا کیوں نہ پہنا، سموسہ کیوں نہ کھایا؟
——— تلا نہ تھا

گوشت کیوں نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا؟
——— گلا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھا، وزیر کیوں نہ رکھا؟
——— دانا نہ تھا

گھوڑا اڑا کیوں، پان سڑا کیوں؟
——— پھیرا نہ تھا

مُکریاں

ان میں عورتوں کی زبان سے ذومعنی بات بیان کی جاتی تھی جس میں ایک سے معشوق مراد ہوتی تھی اور دوسرے سے کچھ اور۔ انھیں بیگماتِ قلعہ کی زبان میں سکھیاں، اور مکرنیاں بھی کہتے تھے۔ کچھ مقبول مکریاں ملاحظہ کیجیے:-

اس بن مجھ کو چین نہ آوے
وہ میری تپس آن بجھاوے
ہائے وہ سب گن بارہ بانی
اے سکھی ساجن، نہ سکھی پانی

۲۔ ایک ساجن وہ کھڑا پیارا
جاسے گھر مورا بھیا اجاڑا
بھور بھئی تب بدا میں نے کیا
اے سکھی ساجن، نہ سکھی دیا

۳۔ مکھ میرا چومت دن رات
ہوٹن لگت کہے نہ بات
جاسے میری جگ میں پات
اے سکھی ساجن، نہ سکھی ہاتھ

۴۔ اتی سرنگ ہے، رنگ رنگیلو اور گنونت بہت مٹکیلو
رام بھجن بن کبھی نہ سوتا
کیوں سکھی ساجن ؟ نہ سکھی توتا
(طوطا)

بجھول

اگرچہ پہیلی کا دوسرا نام بجھول یا بجھارت بھی ہے، کئی ایسی پہیلیاں جن پر دماغ پر زیادہ زور دے کر کچھ حساب کتاب لگانا پڑتا تھا بجھول کے ذیل میں آتی تھیں۔ بجھول کے یہ دو عمدہ نمونے ملاحظہ ہوں۔

ہما[1] بیٹی تما[2] بیٹی چلو باغ کو جائیں
تین نیبو توڑ کے ساجے ساجے کھائیں

[1] ہم ماں بیٹی [2] تمہاری بیٹی یعنی نانی، بیٹی اور نواسی)

ایک آدمی ہے اور ایک عورت۔ عورت کپاس بین رہی ہے۔ آدمی عورت سے کہتا ہے۔

بینن والی بین کپاس
تیری میری ایک ہی ساس

بتاؤ اس آدمی کا عورت سے کیا رشتہ ہوا؟ (سلج اور نندوئی کا)

بے جوڑ ٹکڑے اور زبان کی ضربیں

لوگوں نے سب کو ہنسانے کے لیے ان میل اور بے جوڑ ٹکڑے گھڑ رکھے تھے مثلاً۔

۱۔ ایک اچرج میں ایسا دیکھا، بلی چابے پان
چوہا بجائے ڈھولکی، مینڈک توڑے تان

۲۔ چینٹی چڑھی پہاڑ پر، لپ لپ گولر کھائے
مارا ڈنڈا، گری گا جرین، مرد تگن کے کھیت

دادی ماں بچوں کی زبان میں طاقت پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کی ضربیں لگواتی تھیں جیسے —

چھجو کے چھورے کی چھوری نے چھجے پر چھپ سے چھچھوندر چھوڑ دی

چندو کے چاچا نے چندو کی چاچی کو چاندی کے چمچے سے چٹنی چٹائی

کچھ اونٹ اونچا کچھ پونچھ اونچی کچھ پونچھ اونچی اس اونٹ کی

بچوں سے کہا جاتا کہ ان فقروں کو جلدی جلدی سناؤ، لیکن بچے ان ضربوں کو آسانی سے نہ لگا پاتے۔ جب کسی سے کوئی غلطی ہوتی یا بولتے بولتے زبان اٹکتی تو اس کی خوب ہنسی اڑائی جاتی تھی۔

دلّی کے لوک گیت

گانا انسانی فطرت میں شامل ہے اور اِس کا عمل الفاظ اور قوتِ گویائی پر منحصر ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانوں کی کوئی نہ کوئی زبان ہمیشہ رہی ہے یعنی وہ ایک دوسرے سے بولنے کے قابل رہے ہیں اور اُسی وقت سے وہ اپنے جذبات کا اظہار گا کر بھی کرتے رہے ہیں۔ لوک گیتوں کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ بنیادی طور پر ان کا تعلق تحریر یا شاعری سے نہیں ہے جو بہت بعد میں وجود میں آئیں۔ لوک گیتوں کا جنم چھوٹی چھوٹی انسانی بستیوں اور دیہات میں ہوا۔ دراصل لوک گیت کی اصطلاح جدید ہے۔ پہلے ایسے گیتوں کو گرام گیت یا گاؤں کے گیت کہا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں لوک گیت وہ گیت سمجھے جاتے ہیں جو دیہات اور دیہاتیوں کی زندگی کے ترجمان ہوں، دیہاتی زندگی کی نمائندگی کریں اور جن پر شہری تمدن اور سماج کی چھاپ نہ ہو۔ اِن کی تاریخ اتنی پرانی ہے کہ معدودے چند لوک گیتوں کے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے کس نے لکھا اور وہ کب اور کیسے شروع ہوا۔

کچھ مصنفوں اور تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ لوک گیتوں کا تعلق دیہات سے ہی نہیں بلکہ شہروں سے بھی جڑا ہوا ہے۔ مشہور محقق اور مصنف شری کرشن داس گپت کے مطابق لوک گیتوں کو صرف دیہاتی گیت کہنا صحیح نہیں ہے۔ گزشتہ دَور

میں لوک گاتھائیں رائج ہوئیں۔ عظیم راجاؤں کی کارگزاریوں اوران کی شان وشوکت، دبدبے اور جاہ وجلال کی تعریف میں جواشعار پڑھے جاتے تھے ان کو گاتھیہ اور گانے والے کو گتھا کہا جاتا تھا۔ یہ گیت لوک گاتھا کہلانے لگے اوراسی سے لوک گیت بنے۔ رفتہ رفتہ یہ گیت عوام میں مقبول ہوگئے اور پیڑھی در پیڑھی سینہ بہ سینہ چلتے رہے۔ اس رائے سے کلّی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسے تسلیم کرنے سے لوک گاتھاؤں کو لوک گیتوں کی بنیاد ماننا پڑے گا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لوک گیت لوک گاتھا کی ماں ہے۔ اگرچہ آج لوک گیت شہروں میں بھی گائے جاتے ہیں اور ہمارے سماج کا ایک حصہ بن گئے ہیں مگر لوک گاتھاؤں کا تعلق شہروں کی مانند بہت بعد کی سماجی اورسیاسی تاریخ اور موجودہ معنوں میں ترقی یافتہ نظام سے ہے۔ انسان پہلے چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتا تھا اورشہر بہت بعد میں وجود میں آئے۔ شہروں کی تعداد دیہات کے مقابلے میں ہمیشہ نفی کے برابر رہی ہے اور لوک گیت دیہات میں جنم لیتے اور پنپتے رہے۔ ان کا تعلق براہ راست بہت پہلے کے انسان کے غم اورخوشی کے جذبات سے ہے جو بعد میں رسموں میں تبدیل ہوگئے۔ آج تو لوک گیت ہمارے تحریری ادب کا حصّہ بھی بن گئے ہیں۔

قدیم دلی کے اردگرد بھی دیہات تھے اور آج بھی ہیں۔ جہاں فصیلِ شہر سے باہر قدم رکھا، دیہات کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ دلی میں تعمیرات کا سلسلہ، جن کا تعلق جدید تاریخ سے ہے، زیادہ تر سلطانوں کے عہد سے اور بعد میں مغلیہ خاندان کی حکومت سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے کی دلی بنتی اور اجڑتی رہی اور ایک وسطی شہری آبادی اورچند تاریخی عمارتوں کے سوا دیہات پرمشتمل اوران سے گھری ہوئی تھی۔ اگرچہ دلی پر ہمیشہ آج کے اترپردیش، ہریانہ اور راجستھان کا اثر رہا ہے، اس کی اپنی مخصوص تہذیب، رہن سہن اور تمدن رہا ہے۔ دلی کے لوک گیت ایک ایسا ہی تہذیبی سرمایہ ہیں اور ہر موقعے، تیج تہوار اور تقریبات میں دلی

والوں کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں ہم عوام کی زندگی اور ان کے احساسات اور جذبات کی ایک عمدہ جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ آج کی ترقی یافتہ دلی میں بھی ان لوک گیتوں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

لوک گیتوں کا تعلق ہمارے مذہبی عقائد سے بھی رہا ہے۔ اس اعتبار سے بھی لوک گیتوں کی جڑیں دو تین ہزار سال پہلے کی زندگی سے بھی ملی ہوئی ہیں۔ ویدانت اور وشنو بھاؤ کے یُگوں میں گائے گیت بھی لوک گیت کے زُمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح رادھا کرشن کی لیلا کے گرد بہت سے لوک گیتوں کا جنم اس یگ میں بھی ہوا اور بعد میں بھی۔ گنیش پوجا اور دوسرے دیوتاؤں کی پوجا کے گیت بھی ہمارے لوک گیت ہی ہیں۔ گنیش پوجا سے ہندوؤں میں ہر شبھ کام کا آغاز ہوتا ہے۔ گنیش پوجا کا یہ گیت آج بھی گایا جاتا ہے۔

ہے گنیش گرجا سُمن
منگل مول سُبھان
تم ہی سے ہے پرارتھنا
سنوہردے دھر دھیان
پہلے مناؤں میں تمہیں
کر بار بار پرنام
کرپا کرو تم آپنی
جگ میں ہو سر نام
من میں یہ وشواس ہے
تم بن ہوت نہ کام

کرشن اور رادھا کی لیلا کے مختلف پہلو ابھی تک ہندوؤں کی سماجی زندگی اور ریت و رواج کو متاثر کیے ہوئے ہیں۔ ان کے تعلق میں لاتعداد گیتوں نے جنم لیا ہے۔ ہمارے کلاسیکی سنگیت میں بھی رادھا اور کرشن کے گیت کئی مقبول

راگ اور راگنیوں کے بول ہیں۔ ایک گیت سنیئے۔

پنگھٹ پہ ہائے پیا کینو چترائی
بہیاں پکڑ کے موری چوریاں کرکائی
گگری ڈور موری چھین لئی موے
پنیا بھرت موری بیرا رجھائی
ڈیٹھ سیاں موہے پانی بھرن نہ دیت
پنیا بھرت موری گگری ڈھرکائی

ایک اور گیت سنیئے جس میں کتنی عمدہ تصویر کشی ہے۔

کیسے بیاہوں رادھے
کنہیا تیرو کالا
کالا کالا مت کر گوالن
یہ جگ کا اجیارا
ناگ ناتھ ریتی ہیں ڈارو
مارت پھنکار بدن بھیو کالا
تیرو کنہیا ایسو کالو
جیسے رین اندھیری
میری رادھے ایسی گوری
جوں تاروں بیچ چندر کا اجالا
کیسے بیاہوں رادھے
کنہیا تیرو کالا

دلی میں تین قدیمی مندر ہیں۔ ایک کالکا جی کا مندر جہاں پانڈوؤں نے بھی پوجا کی تھی، دوسرا پرانے قلعے کی دیوار میں بھیروں جی کا مندر، اور تیسرا کرشن جی کی بہن یوگ مایا کا مندر مہرولی میں ہے۔ یہ وہی یوگ مایا کا مندر ہے جہاں

ہر سال ہندو اور مسلمان دونوں مل کر پھول والوں کی سیر کا پنکھا چڑھاتے ہیں۔
کالکاجی کے مندر میں درگا بھوانی کی یہ بھینٹیں گائی جاتی تھیں۔

۱۔ دیوا جی میں نوکر تیرا آیا
نوکر تیرا، میں چاکر تیرا
میں تیرے چرن کا چیلا
ننگے پیروں ہی اکبر آیا
سونے کا چھتر چڑھایا
دیوا جی میں نوکر تیرا آیا رے
چندن، چوکی، دیوا تہالی سجویا
کمبھ کلس بھر لایا
لمبے لمبے کیس سُکھایا
دیوا جی تیرا نوکر آیا

۲۔ سانچی دیوی کے درشن پانا
میں بھون چلی
آگے مُغلا چلے
پیچھے چلے مُغلانی
گودی کا بالک پانا
کنگر چڑھاوے دیوی، دھجا، ناریل
جھلپ دے درگے لالن مالا
میں بھون چلی
سانچی دیوی کے درشن پانا

ویدانت اور ویشنو بھاؤ پراچین بھارت کے فن اور تمدن کو ایک دلکش

حسن عطا کرتے ہیں۔ جس وقت صوفیائے کرام ہندوستان آئے تو انھوں نے ہندوستانی فکر و تمدن کے حسن کو پوری طرح اپنالیا۔ ویدانت اور تصوّف ایک دوسرے کے اتنے قریب آئے کہ بیشتر تاریخ فلسفہ لکھنے والوں کا یہی خیال ہے کہ تصوف پر ویدانت اور ویشنو بھاؤ کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ ویشنو فلسفۂ عشق میں عورت عاشق اور مرد معشوق ہے۔ اپنے مرشد یا پیشوا سے عورت کے انداز میں اظہارِ عشق دراصل ویشنو بھاؤ ہی کی ایک صورت ہے۔ اس رنگ میں ذرا خسرو کی ایک ہولی دیکھئے جس میں وہ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا سے اظہارِ عشق کر رہے ہیں۔

دیّاری موہے بھجو یاری
شاہ نجام کے رنگ میں
کپڑے رنگے سے کچھ نہ ہوت ہے
یا رنگ منے تن کو ڈبو یا ری — دیّاری

اس ہولی میں وزن گیت کے ہیں، بھاؤ ویشنو ہیں مگر پھر بھی ہندوستانی مسلمان کے طرزِ تخیّل کا رنگ موجود ہے۔ ری، موہے، بھجو یا وغیرہ کے الفاظ ہندو عورت کا انداز اور کردار ابھارنے کے لیے لائے گئے ہیں۔

تیرھویں صدی سے لے کر اکبری دَور تک، تین ساڑھے تین سو سال کے عرصے میں، دلی کی زبان اور بول چال کے لب و لہجے میں بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی ترکی اور فارسی پر برج بھاشا کا اثر ہونے لگا تھا۔ امیر خسرو نے اسی بولی اور ہندوستانی لب و لہجے میں کچھ ایسے گیت لکھے جنھیں عوام نے اپنا کر اپنے لوک گیتوں میں شامل کر لیا۔ مثلاً —

دھیرے بھو ندیا مورے پیا ہیں اترت پار
گھی کے دیا نہ بارو ہمرے گھر آئے محمد بانرا
جو میں جن تیوں بچھرت ہیں سیّاں

گھونگٹا میں آگ لگائی دے تیوں
رکھ لیو ان چرنن کی لاج مورے ساجنا

قومی یک جہتی، ہندو مسلم اتحاد اور آپسی بھائی چارے کے جذبوں کو جتنا صوفیائے کرام اور مسلم درویشوں نے فروغ دیا اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔ ان درویشوں نے اپنی خانقاہیں قائم کر کے اُخوت، مساوات اور عدل و انصاف کی تعلیم دیتے رہے۔ عرسوں پر غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوتی تھی۔ جو قوالیاں گائی جاتی تھیں ان میں رادھا کرشن اور دوسرے مذاہب کے پیغمبروں کا ذکر بھی آتا تھا۔ ہر اچھا قوال حضرت عثمان ہارونی کا جو ایک اللہ والے بزرگ اور شاعر تھے یہ فارسی کلام ایک عوامی گیت کے طور پر گاتا تھا۔

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم
تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم

دلی کے صوفیائے کرام میں حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو ایسی بزرگ اور محترم شخصیتیں تھیں جن کی بدولت عوام جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے مذہبی گیتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ حضرت نظام الدین اولیا نے رسم گاکر شروع کی اور امیر خسرو نے اس کے لیے گیت لکھے۔ ہندوستان کی دیسی بولیوں میں گیت بنانا اور گانا حضرت امیر خسرو کی دین ہے۔ ذرا یہ بول سنئے۔

چھاپ تلک سب چھینی رے
موسے نینا ملائے کے
خسرو نظام کے بل بل جاؤں
موہے سہاگن کینی رے
موسے نینا ملائے کے

دیسی بولیوں کے گیتوں کا رواج مغل خاندان میں بھی جہانگیر کی شادی کی تقریب سے شروع ہوگیا تھا۔ رخصتی کے وقت راجپوتوں کی طرف سے جو گیت گایا گیا تھا اس کے بول یہ تھے۔

تم شاہنشاہ ہم آپ کے داس
رہے کرم شاہ کا ٹوٹ نہ جائے آس

یا

سکھی رے مورا بنرا آیا سلطان
میں تو تہارے ڈیرے آئی جلاّ (جلال الدین اکبر)

یہ سن کر شہنشاہ اکبر نے جذباتی انداز میں ڈولے کو ہاتھ لگایا اور بولے:۔

ہم شاہنشاہ سہی پھر بھی آپ کے بھائی
اور راجکماری ہے محل کی آبرو اور چوکھٹ کی لاج

ہندوستانی مسلمانوں میں پیدائش سے موت تک جو رسمیں رواج پاگئیں وہ بہت کچھ اس ربط اور میل جول کا نتیجہ تھیں جو دلی سلطنت سے ہوتا ہوا مغلیہ دورِ حکومت تک پہنچا تھا۔ جب اکبر کے عہد میں مغل شاہزادوں کی شادیاں راجپوت امرا اور راجاؤں کے یہاں ہونے لگیں تو ہندوانہ رسمیں مسلمان امرا میں اور مستحکم ہوگئیں۔ ترکی اور فارسی نغموں کی بجائے رخصتی کے وقت برج بھاشا اور راجستھانی بولی میں گیت گائے جانے لگے۔ صحنک کی رسم اور بی بی فاطمہ کی نیاز کا طریقہ مہارانی جودھا بائی کی دین ہے۔ مغل خاندان میں ولی عہد شہزادے کا ختنہ نہیں ہوتا تھا۔ رکشا بندھن کی تقریب پر راکھی باندھی جاتی تھی۔ بسنت اور دیوالی قومی تہوار کے طور پر منائے جاتے تھے۔ ہمارے لوک گیتوں میں اس ربط اور میل جول کی بڑی طاقتور جھلک ملتی ہے۔

لوک گیت انفرادی نہیں اجتماعی ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی تحریری سند نہیں ملتی اور یہ صرف یادداشتوں میں محفوظ رہتے ہیں۔ یہ سازوں کے ساتھ بھی گائے

جاتے ہیں اور بغیر سازوں کے بھی ان کے الفاظ اور معنی کے مانند ان کے ساز بھی سادہ اور معمولی ہوتے ہیں مثلاً ڈھولک، مجیرا، ربانہ اور ایک تارا۔ ہمارے لوک گیت ہماری خانگی اور ہماری سماجی زندگی کے گرد بنے جاتے ہیں اور ان کو جھلکاتے ہیں۔ قدرتی چیزوں سے محبت لوک گیتوں کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ ان گیتوں کی دنیا میں کوّا یعنی کاگا، چیل اور مینا نامہ بر ہیں۔ ذرا دیکھئے ایک برہا کی ماری نوجوان عورت کیا سوچتی ہے۔

کاہے سیاں گون لئی آئے تم تو چلے پردیس
کہی کے ہاتھ چٹھی لکھ بھیجوں، کہی کے ہاتھ سندیس
کاگا ہاتھ چٹھی لکھ بھیجوں، پنچھی ہاتھ سندیس

اس پس منظر کے بعد آیئے اب دلی کے لوک گیتوں پر نظر ڈال لیں۔

بیاہ شادی کے گیت

دلی میں شادی بیاہ کے موقعے پر سہاگ گھوڑی گانے کا رواج بڑا قدیم ہے ان گیتوں کو شادیانے بھی کہا جاتا تھا۔ یہ سہاگ گھوڑیاں ضرور گائی جاتی تھیں۔

۱۔ کھائے نہ جانے پینڈیاں لاڈو میری
باندھے نہ جانے بنری میری بند
سیانی ہونے دو

۲۔ ناجوری گھونگٹ کے پٹ کھول
گھونگٹ میں تیرے چندا بست ہے
چنری تیری رنگ رنگیلی
گوٹا کناری اور لعل لگے انمول
ناجوری گھونگٹ کے پٹ کھول
دوسری ڈوڑھی، دوسرا آنگن

اور دوسرا گھر دوار
گھونگٹ کے پٹ کھول میری بنو
دیکھ نہاریں کنتھ تہار

۳۔ مورے بنّے کو مت دیکھو — نجر لگ جائے گی
بنّا پہنے جوڑا، جوڑے پہ جامہ سوہے
ٹپکے یہ نجریا لگ جائے گی — نجر لگ جائے گی
نازک ہے نادان ترے بازوبند ڈھیلے تیری
ماتھے تیرے ٹیکا سوہے لڑیاں ہیں انمول تیری
نازک ہے نادان — نجر لگ جائے گی

۴۔ میرا چھنک منک بنڑا آیا ری۔ — بڑی دوروں سے بنڑا آیا ری
بنڑے کے نثار گئی میں — ہریالے بنّے کی عمر بڑھے
پھولن جائے یہ بیل تیری — یہ لال تیرا پروان چڑھے
اس چندر کی جوت اتر دکن — سنسار میں راج رچے اس کا
ڈنکا چو دیس بجے اس کا — مہکا رہے ان پھولوں کا
میرا چھنک منک بنڑا آیا ری
بڑی دوروں سے بنڑا آیا ری

سہرے کے گیت بھی گائے جاتے تھے۔ جہاں ناچ رنگ ہوتا تھا، وہاں طوائف بھی پہلے سہرا گاتی تھی۔ گھروں میں یہ سہرا گایا جاتا تھا۔

ہمارے ہریالے بنے کے لیے گوندھ لا سہرا مالنیا
بیلے چمیلی کی کلیوں کا سہرا گوندھ لا سہرا مالنیا
آؤ میری مالن، بیٹھو میرے آنگن، کہو سہرے کا مول

سات لاکھ سہرے کا مول، بی بی عطر میں بسی کلیاں
ہمارے ہریالے بنّے کے لیے گوندھ لا سہرا مالنیا

مسلمانوں میں دولہا سے لڑکی کے گھر پر سات سلام کھلائے جاتے تھے اور بغیر ڈلی کی سات گلوریاں کٹوائی جاتی تھیں۔ ڈومنی یہ گیت گاتی تھی۔

ٹونا میرا جگت سلونا
ڈھائی پونی کچّا سوت — میں باندھوں ساس کا پوت
باندھ بوندھ کر کیا غلام — دہلی بیٹھا کرے سلام
ٹونا میرا جگت سلونا۔۔۔۔

رخصتی یا منڈھے کے گیتوں میں ماں باپ سے چھوٹنے کا غم، ساس نند سے بناہ کی باتیں، دان جہیز میں کمی رہ جانا اور بیاہ سے پہلے کی زندگی کی یادوں کا ذکر ہوتا ہے۔

میّا کے روئے مورا سب دل روئے
تو ببولا نے ماری ڑڈکار رے
ناہیں مورے بابا ان دھن تھورو
ناہیں پایوں دیہج تھورو
نا مور بابا سندر بر ناہیں
سُن پیرت ماروتی ساس رے

اس گت میں ایک انوکھی کیفیت کا اظہار ہے۔

آڑو جامن گھلے دھرے
میں نہیں کھاتی میری ماں
تتّا پانی بھرا دھرا
میں نہیں نہاتی میری ماں

دھانی جوڑا سِلا دھرا
میں نہیں پہنتی میری ماں
بھائی بھاوج ملن کھڑے
میں نہیں ملتی میری ماں
ساجن ڈولا لیے کھڑے
میں نہیں جاتی میری ماں۔۔۔

اس گیت میں کتنا درد بھرا ہے۔

اپنے باپ کی دلاری، تو میّا کی پیاری رے
اپنے بھیّا کی دلاری، کلیوا نہیں پارو رے
دوارتے آئے بیرن بھیا، انگنا جوں ٹھاڑے بہنیں رے
بہنی بھتیرتے لاؤ چیرو بجّی، پسرے جا بورے
ایسی دُلاری بہنیا، ہیں کتوں نہ دیکھوں رے
بہنی موری، بہنی اوڑھونہ رنگ برنگی چنریا ہم لٹوائے رے
اتنا سن کرنندیا رانی جھہر جھہر کریں، بھہر بھہر کریں
جُگ جُگ جیو مورو برنا، جہکی ہم دلاری بہنیا رے
بدھاوا میں پایو رے، سب کچھ میں پایو رے

شادی بیاہ کے گیتوں میں یہ گیت بڑا گایا جاتا تھا۔

پا یاری میں نے رام منایا
بنڑا رانی کا جایا
لا یاری لنکا دیس کا سونا
اُچل دیس کا روپا
حیدرآباد کے موتی
گجرات کی چُنری

ملتان کے ہیرے
آگرے کے کندن
میرٹھ کے جڑے
دلی دیس کا سہرا
ہریالی کو ٹیکہ جڑا یاری
سسر نے پیاری کو پہنایا ری
پایاری میں نے رام منایا
بنڑا رانی کا جایا

اور نئی نویلی دلہن کا اپنے سیّاں کے ساتھ مدبھری زندگی کا یہ دل آویز گیت۔

دلی شہر سے سونا منگایا نتھیا گھڑا دیں میرے پیاں
دیکھو میری گوئیاں
چور چور کہہ کے پکڑا میں نے سیاں ہاتھ جوڑ پڑیں میرے پیاں
دیکھو میری گوئیاں
کاشی شہر سے ساٹن منگائی چولی سلا دیں میرے سیاں
دیکھو میری گوئیاں
چولی پہن ہم سو دیں بیچ محلا چولی ٹٹو لن لگے سیّاں
دیکھو میری گوئیاں
چور چور کہہ کے پکڑا میں نے سیّاں ہاتھ جوڑ پڑیں میرے سیاں
دیکھو میری گوئیاں ۔۔۔

منڈھے کے موقعے پر یہ گیت ضرور گایا جاتا تھا۔

ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل
نیکا منڈھا چھوا وَ رے

پربت بانس منگا مورے بابل
پاؤں منڈھا چھواؤ رے
جیسی لاڈلی بیٹی رے بابل
ویسا ہی کاج رچاؤ رے
منڈھے اوپر کلس براجے
دیکھے راجہ راؤ رے
بھائی کو دینی اونچی اٹریا
ہم کو دینا بدیس رے
لے بابل گھر آپنا
ہم تو چلے پیا کے دیس رے
تھاری رے بیٹی جہارے محلاں کی رانی
تم صاحب سودار رے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رخصتی کے وقت یہ رقّت آمیز گیت گایا جاتا ہے۔

بیرن کو دینی بابل اونچی رے اٹریا
ہم کو چھایا بدیس رے
ہم تورے بابل ساون کی چڑیاں چگیں اڑجائیں رے
دہلیاں پربت بھئیں۔ بابل انگنا بھیّا بدیس رے
لے بابل گھر آپنا ہم چلے پیا کے دیس رے

سیٹھنے

شادی بیاہ کے موقعے پر گالیوں اور سیٹھنوں کا رواج بھی تھا جنھیں لوک گیتوں سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کئی گالیاں جو اگرچہ اپنے معنوں میں فحش ہیں ایسا رواج پاگئی تھیں کہ کوئی بھی اُن کا بُرا نہیں مناتا تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ

ان گالیوں کو عورتیں ہی استعمال کرتی تھیں۔ دراصل ان سے دل آزاری قطعی مقصود نہیں تھی اور انہیں صرف مذاق کے طور پر لطف اور خوشی کے اضافے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گالیاں نہ صرف رشتے دار عورتیں دیتی تھیں بلکہ ڈومنیاں، میراثنیں اور بھانڈ بھی دیتے تھے اور اپنا حق اور انعام پاتے تھے۔ بارات کی آمد پر کہا جاتا تھا۔

چندا سا دولہا لایا بارات　　پھلواری سی بن گئی دن رات
گھوڑے دلہا آیا سوار　　دلہا کا ابا گدھا سوار
دلہا کی اماں بڑی سیانی　　ہاتھی پہ چڑھ کے آئی مستانی

ان سیٹھنوں میں سمدھی، سمدھن کی چھیڑ چھاڑ اور ذو معنی باتوں میں بدتمیزی اور بداخلاقی ہوتی تھی لیکن خوشی کے موقعے پر اِن کا کوئی بُرا نہیں مناتا تھا۔ شاہی محلات سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک میں سیٹھنے گائے جاتے تھے۔ "نادراتِ شاہی" میں شاہ عالم ثانی کے لکھے بہت سے سیٹھنے ملتے ہیں۔ مثلاً۔

کام بھئی، ات رس مَسی، آئی سمدن پھول
بھولا بھالا دِلا ملا، دینو سمدھن پھول
سمدھن بِلک زمانی کھوے رات پکار
سمدھی بس کر، اب مجھے پھولن گیند نہ مار

لیکن آہستہ آہستہ یہ سیٹھنے صرف ایک خوش مزاجی اور عام ہنسی مذاق کا اظہار کرنے لگے، جیسے کہ ــــــ

سمدھی جی کے کوٹ نہیں ہے　　انہیں بڑھیا سا جوڑا پہناؤ ری
سمدھی جی کے قمیض نہیں ہے　　انہیں بڑھیا سی چولی پہناؤ ری
سمدھی جی کے پینٹ نہیں ہے　　انہیں بڑھیا سا لہنگا پہناؤ ری
سمدھی جی کے جوتا نہیں ہے　　انہیں بڑھیا سا بچھوا پہناؤ ری
سمدھی جی کے گھڑی نہیں ہے　　انہیں ہری ہری چوڑیاں پہناؤ ری

اب یہ سیٹھنے گائے جانے بند ہو گئے ہیں۔ کم سے کم دلی میں تو یہ رواج ختم ہی ہو گیا ہے۔

زچہ، بچہ کے گیت (زچگیریاں)

لوک گیت عوام کی زندگی کا بڑا حسین مرقع ہیں۔ چھٹی چھلّے سے لے کر دیگر رسوم تک کی ہو بہو تصویریں لوک گیتوں میں ملتی ہیں۔ کوئی عورت امید سے ہوئی اور گیت گانے شروع ہو گئے۔ خبر پاتے ہی نائینیں یہ گیت گاتی تھیں۔

بڑے بیری کے کھٹّے مٹھّے بیر
سورے جو اُن کے بڑے رنگ رسیا
باغوں میں لگا دیا پیڑ، ہمارا جیا بیروں کو
بڑے بیری کے . . .
ساسو جو ان کی بڑی لڑاکا
باغوں سے ہٹا دیا پیڑ، ہمارا جیا بیروں کو
بڑے بیری کے . . . .
جیٹھا جو اُن کے بڑے رنگ رسیا
آنگن میں لگا دیا پیڑ، ہمارا جیا بیروں کو
بڑے بیری کے . . . .
جیٹھانی جوان کی بڑی لڑاکا
آنگن سے ہٹا دیا پیڑ، ہمارا جیا بیروں کو
بڑے بیری کے . . . .

بچہ پیدا ہوا ہے، دیکھئے گھر میں ڈھولکی پر یہ گیت ابھر رہا ہے۔

آنگن بجت بدھیا، بھیتر سکھیاں گاویں، بجنے لگی سب نگر بدھیا
ڈیہری بیٹھی ساسوئیاں، سسر دروا جے

بھاوج اپنے چھوٹے دیور سے کہتی ہے کہ جاؤ بچہ پیدا ہونے کی خبر اس کے میکے میں پہنچا دو۔ دیور پس و پیش کرتا ہے تو بھاوج کہتی ہے۔

جا توں نہ جا مورے دیورا
سٹھورا تو کو نہ دونگی مورے دیورا
پنجیری تو کو نہ دونگی مورے دیورا

اس موقعے کے لوک گیتوں میں ساس، نند، دیور، دیورانی، جٹھانی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ دلی کے ہندو مسلم گھرانوں میں عورتیں گاتی ہیں۔

البیلی جچا مان کرے نند لال سے، سہاگن جچا مان کرے نندلال سے
البیلے نے مجھے درد دیا سانوریا نے مجھے درد دیا
پائیلیا نے مجھے درد دیا
جائے کھولڑکے کے نانا سے ــــ رنگ بھری کھچڑی لاویں... رے
جائے کھولڑکے کے ماموں سے ــــ ہنسلی کڑے گھڑواویں.... رے
جائے کھولڑکی کی خالہ سے ــــ کرتے ٹوپی سلواویں.... رے
جائے کھولڑکی کی نانی سے ــــ ٹھکتی تھرکتی بدھاوا لاویں... رے

جب زچہ کا سامنا شوہر سے ہوتا ہے تو شوہر میاں ایسے بنتے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ زچہ رانی بھی ایسے ہی گول مول بات کرتی ہیں، مگر آخر میں راز کھل ہی جاتا ہے۔ اس موقعے کا یہ گیت اس کیفیت کو کتنی عمدگی سے آشکار کرتا ہے۔

آیاری میرا بھولا سا راجہ، آیاری چھبیلا سا راجہ
بیوی جی کوٹھے کاہے کو چڑھی تھیں؟
اے راجہ جی میں نے چاند دیکھا تھا ــــ آیاری میرا....
بیوی جی پردے کاہے کو پڑے تھے؟
اے راجہ جی میری آنکھیں دکھی تھیں ــــ آیاری میرا....
بیوی جی دائی کاہے کو آئی تھی؟

اے راجہ جی میری ناف گئی تھی ——— آیاری میرا ۔۔۔۔

بیوی جی کیچڑ کاہے کو ہوئی تھی ؟

اے راجہ جی میرا گھڑا ٹوٹا تھا ——— آیاری میرا ۔۔۔

بیوی جی بچہ کس کا رویا تھا ؟

اے راجہ جی تیری بیل بڑھی تھی ——— آیاری میرا ۔۔۔۔

بیوی جی چھلیل کاہے کو کیے تھے ؟

اے راجہ جی میں تم سے ڈری تھی ——— آیاری میرا ۔۔۔

بچہ ہونے کی خوشی میں زچہ اپنے میکے اور پیکے کے رشتے داروں کو بلانے کی آرزومند ہے تاکہ وہ نیگ دیں۔ اس لوک گیت میں ان ہی جذبات کی گونج ہے۔

بلاؤری میری ساس بڑی کو ۔ وہ آئیں پلنگ بچھائیں ۔ پائل باجے جھنن جھنن

بلاؤری میری اماں بڑی کو ۔ وہ گھی کھچڑی لائیں ۔ پائل باجے جھنن جھنن

بلاؤری میرے ابا بڑے کو ۔ وہ آئیں بھانڈ نچائیں ۔ پائل باجے جھنن جھنن

بلاؤری میرے سسر بڑے کو ۔ وہ نوبت رکھائیں ۔ پائل باجے جھنن جھنن

بلاؤری میری نند بڑی کو ۔ وہ آئیں چھتیاں دھلائیں ۔ پائل باجے جھنن جھنن

بلاؤری میری بہن بڑی کو ۔ وہ آئیں کرتہ ٹوپی لائیں ۔ پائل باجے جھنن جھنن

مگر زچہ رانی بڑی ہوشیار ہیں۔ جہاں تک سسرال کے رشتے داروں کا تعلق ہے، سب کو بغیر نیگ دئے ٹالنا چاہتی ہیں۔ سب نیگ اپنے ہی گہنوں میں ڈلوانا چاہتی ہیں۔

راجہ میں بھولی، میرے گھر کو نہ لٹا دیجو، گھر نہ لٹائے دیجو، سارا سنگوائے دیجو

ساس جو مانگے سونٹھ گنوائی راجہ، اس کو بھی جواب دیجو

ساس کا نیگ میرے ٹیکے میں ڈلوا دیجو، راجہ میں بھولی میرا گھر نہ لٹا دیجو

نند جو مانگے چھتیاں دھلائی، راجہ اس کو بھی جواب دیجو

نند کا نیگ میرے جھمکوں میں ڈلوا دیجو، راجہ میں بھولی میرا گھر نہ لٹا دیجو

جٹھانی جو مانگے چھٹی نہلوائی، راجہ اس کو بھی جواب دیجو
جٹھانی کا نیگ میری چمپا ہیں ڈلوا دیجو، راجہ میں بھولی میرا گھر نہ لٹا دیجو

یہ خوبصورت زچگیریاں ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ میں نے چھپوا دئے اخبار للّا تیرے ہونے کے
ساس جو آئے گی چڑھوا چڑھائے گی میں نے دلوا دئے سب نیگ
نندی جو آئے گی چھاتی دھلائے گی میں نے دلوا دئے سب نیگ
جٹھانی جو آئے گی پیپل پیسے گی میں نے دلوا دئے سب نیگ

۲۔ میرے بابل کو لکھو سندیس جھنڈولا آج ہوا
بابل ہمارے راجہ کے چاکر بیرن بالے بھیس
بابل ہمارے راجہ کے چاکر چھٹی نہ پائیں گے
بالے بیرن چل نہ پائیں گے ڈگر بھول جائیں گے
میرا ماں کا کلیجہ ٹھنڈا آج ہوا
میرے بابل کو لکھو سندیس جھنڈولا آج ہوا

دلڑکی اپنے بابل کو یہ سندیس تو بھجوا رہی ہے کہ لڑکا ہوا ہے مگر اسے اندیشہ ہے کہ اس کا باپ راجہ کا نوکر ہے اور اسے چھٹی نہیں ملے گی۔ اسی طرح اس کے بھائی چھوٹے چھوٹے ہیں اور وہ چل نہیں سکیں گے اور راستہ بھول جائیں گے۔ جب تک لڑکی کے لڑکا نہیں ہوجاتا، اس کی ماں پریشان رہتی ہے۔ اب جب لڑکا ہوگیا ہے تو ماں کی فکر دور ہو جائے گی۔

نندیا چھنار کنگنا لینے آئی
کرتہ بھی لائی ٹوپی بھی لائی
درزی خصم سنگ لائی
نندیا چھنار کنگنا لینے آئی
کٹھلا بھی لائی پہنچی بھی لائی

پٹوا خصم سنگ لائی
نندیا چھنار کنگنا لینے آئی
ہنسلی بھی لائی کھڑوا بھی لائی
سنور ولد خصم سنگ لائی
نندیا چھنار کنگنا لینے آئی

(لڑکی کی نند بچے کی پیدائش کی خبر سن کر کنگنا (نیگ) لینے آتی ہے۔ نند شادی شدہ ہے اور لڑکی اسے پسند نہیں کرتی۔ جو اشیا نند لاتی ہے، وہ اس کے لیے آسان ہیں کیوں کہ اس کا شوہر اسی پیشے کا آدمی ہے۔ مگر ان چیزوں کے بدلے نہ صرف نند کنگنا مانگے گی بلکہ اپنے شوہر کو بھی ساتھ لائی ہے تاکہ اسے بھی اس کا نیگ دلوائے)

جہانگیر کی پیدائش کے وقت یہ گیت گایا گیا تھا۔

مانگے جودھا جی کا راج ۔ للا جی کا مال نہ چھوئے
تھال بھر موتی جودھا رانی لائیں ۔ وہ بھی نہ لیوے یہ دائی
شال دوشالے جودھا رانی لائیں ۔ وہ بھی نہ لیوے یہ دائی
ہاتھی گھوڑے جودھا رانی لائیں ۔ وہ بھی نہ لیوے یہ دائی
وہ تو مانگے ہے آدھا راج ۔ مہابلی مہاراج۔ وہ تو مانگے ہے آدھا راج

بھانجے کی پیدائش کی خبر سن کر بچہ کا ماما (ماموں) اچھے اچھے کپڑے، کرتہ ٹوپی لے کر بہن کے گھر آتا ہے۔ بدھاوے گانے شروع ہو جاتے ہیں۔

بدھاوا لائی نندی سنو سنوریا
کہاں سے آئی سونٹھ، کہاں سے آیا زیرا
کہاں سے آئی نندی سنو سنوریا
دِلّی سے آئی سونٹھ، آگرے سے آیا زیرا
بنارس سے آئی نندی سنو سنوریا

کہاں رکھیں سونٹھ، کہاں رکھیں زیرا
کہاں بیٹھے نندی سنو سنوریا
پلنگ بیٹھے نندی سنو سنوریا
سنٹھ کھٹی ہے زچہ زیرا کڑوا ہے زچہ
بدھاوا لائی نندی سنو سنوریا
بیرن بھیّا میں تیری ماں جائی
ہولرسن کر بدھاوے لے آئی
بیرن بھیّا میں تیری ماں جائی
چھاتی دھلائی کٹوری لوں گی
لٹ دھلائی روپیا
پاؤں دھلائی چیری لوں گی
تو خصم چڑھن کو گھوڑا
ہولرسن کر بدھاوے لے آئی
بیرن بھیّا تیری ماں جائی

ننھے منّے بچوں کو پالنوں میں لٹاکر لوریاں سنائی جاتی ہیں۔ ہاتھوں میں جھنجھنے دے کر بہلایا جاتا ہے۔

آجاری نندیا تو آکیوں نہ جائے
میرے بالے کو آکے سلا کیوں نہ جائے
آتی ہوں ابھی آتی ہوں۔ بالے کو تیرے سلاتی ہوں
آئی تھی نندیا خبر نہ ہوئی
گئی تھی نندیا جگا کر گئی
آجاری نندیا.....

لوری لے میرے ببوّا لوری لے میرے چھگن مگنوا لوری لے

دادا کے پیارے لوری لے — کہ جھولے میرا پالنا ہے بتّوا
تیری دادی جھونٹا دے گئیں — تہارانی جھونٹا دے گئیں
کوئی بچھیوں کی جھنکار — کوئی چوڑی کی جھنکار
کڑے چھڑوں کی جھنکار بتّوا — لوری لے بتّوا لوری لے

دھوبی گھاٹ پر کوئی نوجوان دھوبن لہک کر گاتی ــــ

۱۔ بھور بھئی گھر جا رے ساجن
دیکھ کہیں بدنامی ہو گی
چھی اورام ــ چھی اورام ــــ

۲۔ میں نے پہلے ہی تم سے کہی تھی سکھی
بے ایمانوں سے پیت نہ کریئے
اپنی گرج کے یار ہیں سب
ایسوں پہ کاہے کو مریئے

ساون رت آتی تو دل مچل مچل جاتے۔ چہروں پر برکھا اور بادل ایک نکھار بھی لاتے اور ایک شعلہ بھی جگا دیتے۔ پیت کی ریت، ملن کی چاہ اور برہا کے لوک گیت گائے جاتے ــــ

۱۔ پہلے ہی سے نیناں تھے چنچل
پھر اِس پہ غضب ہے یہ کاجل
دکھلا دے جھلک تو ایک پلک
ذرا اور اٹھا مکھ سے آنچل

۲۔ مورا سیّاں بلا وے آدھی رات
ندیا بیری بھئی
سن رے منا ہوں تیری چیری
ندیا لگا دے پار

ندیا گہری ناؤ پرانی

کھیوٹ متوارو سنے نہیں بات ہماری

مورا سیّاں بلاوے۔ ۔ ۔

کوئی گوری بے کلی سے کہتی۔

پیتم کی چوٹ ہے بالے پن سے

بے کل ہوں ہیں بہت دِنن سے

ڈولی، ڈولا کچھ بھی لاؤ

آجھو جا کے ملونگی سجن سے

عورتیں گاتیں۔

جُھکیا رے بدرا برس کیوں نہ جائے

اب تیری آئی بہار

کہاں توں لاؤں بدرا جو چنے

کہاں بوؤں کچنار

جنگل بوؤں بدرا جو چنے

باغوں بوؤں کچنار

جھکیا رے بدریا۔ ۔ ۔ ۔

تیج اور سندھاروں کے دن آجاتے، جھولے پڑتے اور عورتیں مل کر گاتیں۔

ہمارے دادا جی نے تنبو تانا

ریشم ڈور بٹیاں جی

کردو ہماری دادی جی

کھٹا سندھارا، متھا سندھارا

تیج نویلی آئیاں جی

کہ بی بی تیرے کھانے کو

اچھے گھیور چھانٹوں، بابر چھانٹوں
اوپر کھانڈ گنڈیریاں جی
کہ بی بی تیرے ہاتھوں کو اچھی رچنی مہندی
سر کو پچھے نارے جی

ساون کے ایک گیت میں قدیم دلی کا ذکر ہے جب رات کو شہر پناہ کے دروانے بند ہو جاتے تھے۔

اری امّاں جاؤں بہنیا کے دیس —— پپیاری بولیو باگ میں !
دلی درواجو ری موسی کھول دے
اری موسی بہن ملن بھیّا آیو —— پپیاری بولیو باگ میں !
دلی درواجو رے لالہ نا کھلے
ارے لالہ تیری بہن باگن بیچ —— پپیاری بولیو باگ میں !
باگن باگن ری موسی ہے پھر یو
اری موسی کہیں نہ پائی چمپا بہن —— پپیاری بولیو باگ میں !
چڑھ کے کوٹھے پہ رے لالہ دیکھ لے
ارے لالہ چمپا کی ہے گئی مٹھی راکھ —— پپیاری بولیو باگ میں !

برسات کی رم جھم میں برہا کی ایک اور کسک۔

رم جھم رم جھم چلیں پھواریں گھر گھر گھر گھر بدرا چھائے
ہائے سکھی میں کس کو بتاؤں مورے پیا اب لگ نہیں آئے
چھائے ری اندھیاری ہر سو، کوک رہی ہے کوئل کو کو
بول رہا ہے پپیہا پی سو، پیا بن مورا جیا گھبرائے
ناچ رہے ہیں تارے گگن میں، بیاکل ہے من مورا لگن میں
اپنے پیا کی راہ تکت ہوں، مور پیا مو ہے ترسائے

دلی باغوں کا شہر تھا۔ ذرا بارش رکتی اور لوگوں کے غول باغ بغیچوں

کا رخ کرتے۔ جھولے باغوں میں بھی پڑتے اور گھر گھر بھی کھم گڑے ہوتے۔ عورتیں رل مل کر جھولتیں اور یہ گیت گاتیں ۔

۱۔ چھا رہی کاری گھٹا جیا مورا لہرائے ہے
سن ری کوئلیا باوری توکیوں ملہار گائے ہے
آ پپیہا آ اِدھر میں بھی سراپا درد ہوں
آم پر کیوں جم رہا میں بھی تو رنگِ ذرد ہوں
فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے
چھا رہی کاری گھٹا جیا مورا لہرائے ہے . . . .

۲۔ دیکھوری مکٹ جھوکے لے رہا جمنا کے تیر
کون برن رانی رادھیکا، کون برن گھنشیام رے
گورے بدن رانی رادھیکا، کرشن بدن گھنشیام — دیکھوری . . .
کیا تو اوڑھے رانی رادھیکا، کیا تو پہنے نندلال
چنری تو اوڑھے رانی رادھیکا، مکٹ پہنے گھنشیام — دیکھوری . . . .

جھولے کا ہی ایک دل آویز گیت یہ تھا جنھیں نئی نویلی دلہنیں گاتی تھیں ۔

برسے کاری رے بدریا
میری چنریا، چنریا بھیگی جائے
چنریا بھیگی جائے راما
لال رنگ کی اوڑھی چنریا ہائے بھگودی رے
میری چنریا بھیگی جائے
پیاں پڑوں میں بانکے چھیلا
لیجو کنٹھ لگائے
چنریا بھیگی جائے . . . .

یہ دو گیت بھی عورتیں بڑا گاتی تھیں ۔

بریلی کے بازار میں جھمکا گرا رے —— ہم دونوں کی تکرار میں جھمکا گرا رے

اور — پیارے نندویا سروتہ کہاں بھول گئے

آگے آگے نندی چلے، پیچھے نندویا

جن کے پیچھے ہیں بچاری، میرے پیچھے سیاں

باغ ڈھونڈنے نندی چلے پیچھے پیچھے نندویا

گھر ڈھونڈن ہیں بچاری، پیچھے پیچھے سیاں

لڈو کھائیں نندی، برفی کھائیں سیاں

چھت پر کھڑی لڑکیاں سیڑھیوں سے بھاگتی ہوئی نیچے اتری ہیں۔ سر ہو رہی ہیں کہ ہم بھی جھولیں گی۔ بڑی عورتوں کا گانا ختم ہوا تو انہیں اتار کر خود جم بیٹھیں۔ ہنس بھی رہی ہیں اور گا بھی رہی ہیں —

ننھی ننھی بوندریاں رے ساون کا میرا جھولنا

اک جھولا ڈارا ہیں نے امبوا کی ڈار پر

لمبی لمبی پینگیں رے ساون کا میرا جھولنا

چھوٹی موٹی سُٹیاں رے ساون کا میرا جھولنا

اک جھولا ڈارا ہیں نے سیاں جی کے باغ ہیں

لمبی لمبی پینگیں رے ساون کا میرا جھولنا ۔۔۔

ننھی ننھی بوندریاں مینھا برسے — انگنا ہیں ہو رہی کیچ

تم مت نکلو رانی کے بیٹے — پاؤں بھرے تورے کیچ

تورے چڑھنے کو لے دوں گی — ترکی سا گھوڑا

کوئی جانے دلّی کا دیوان — کوئی جانے مغل پٹھان

تورے پاؤں کو لے دوں گی — لال لال کھڑاؤں

اور بھیّا ہاتھوں کو لے دوں گی تیر کمان

کوئی جانے دلّی کا دیوان — کوئی جانے مغل پٹھان

گھر کے پیچے اچھل کود رہے ہیں۔ گڑھوں میں رکے پانی میں "چھپ چھپ" کر رہے ہیں۔ کسی کا پاؤں پھسل رہا ہے تو کسی کو کوئی دھکا دے رہا ہے۔ شور مچا مچا کر چلاتے جا رہے ہیں۔

آندھی آئی مینہہ آیا
بڑی بہو کا جیٹھ آیا

جمنا بازار میں کارتک کا میلہ ہے۔ بھیڑ میں سے ایک گیت ابھرتا ہے۔

بارہ برس کی میں ہوئی ری
اب لوں میرا بیاہ کرا
دلی بھی ڈھونڈی اور آگرہ بھی ڈھونڈا
کہیں نہ پائے بھرتار
پکّا مدرسہ اس کا رے
جس میں پڑھیں بھرتار

بارہ ماسہ

برسات کے موسم میں بارہ ماسے گائے جانے کا رواج رہا ہے۔

کہوں کس سے دِل کا حال بیت گیا سال
میرے دلدار نے کچھ نہ کیا خیال
رنر موہی سانوریا گیو پردیس
ناآیا نہ بھیجا کوئی سندیس

اساڑھ سکھی رُت اساڑھ کی آئی بہے ہوا پُروائی
ہوش نہیں تن کا، بن پیا کوئی نجانے حال من کا
گھِر آئی گھٹا گھنگھور، بن میں ناچ رہے مور
دِن پہر دِن گھڑی انتظار کروں پی کے آون کا

سکھی رم جھم برسے پانی، گھر نہ آئے دل جانی
نرموہی سانوریا چلے گئے پردیس
نا گھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

ساون
سکھی لاگا ساون ماس، من کی بندھی آس
آویں پی پاس تو جی بہلاؤں، اونچی اٹریا پلنگ بچھاؤں، من بہلاؤں
آنگن میں ڈالوں جھولا، پھول خوشی کا پھولا
جو آجائے پیا گھر کو بھولا
نرموہی سانوریا چلے گئے پردیس
نہ گھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

بھادوں
بھادوں میں مینھ کا زور مور کریں شور
اُمڈے چھوں اور ندی اور نالے
دم دم دامنی رہی دمک جگنو رہے چمک
پی پی پپیہارا بولے میرا من رہ رہ ڈولے
نرموہی سانوریا چلے گئے پردیس
نا گھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

کنوار
سکھی برسے کنوار لہر رنج ہوا بہتیرا
دیکھن جائیں دسہرہ سبھی نرناری
میں دیکھوں پی کی راہ کھڑی ہوئی اٹاری
سب سکھیاں کریں سنگار میں برہن جوگنی بنی
نرموہی سانوریا چلے گئے پردیس
نا گھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

کاتک
کاتک میں سب کریں اسنان بنا جل پان
میں بیٹھی من مارے جیسے چندا کی اور چکور نہارے

گھر گھر دیپک جلے دیوالی ہوئی خوشحالی
آج دِوالی نہیں گھر پیارے سکھیاں گائیں منگل اپنے دوارے
سانوریا بسے پردیس میں بیٹھی من مارے
نرموہی سانوریا چلے گئے پردیس ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

اگہن
سکھی لاگا مہینہ اگہن کا
پڑے شیت دھڑکے ہیا
گھر نہ آئے پیا یہ کیا ہوا!
نجر نا آئے پیا کی پرچھائیں
پیو کی چوکھٹ باٹ آنکھیں پتھرائیں
اپنے رسیا کے کارن لے لیو بیراگ
نرموہی سانوریا چلے گئے پردیس
ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

پوس
سکھی لگا مہینہ پوس، برہ نے لیا چوس
تھر تھر کانپے بدن کسے اپنے انگ لگاؤں
اپنی برہ کی کتھا بیٹھ کسے سناؤں
نردئی سانوریا چلے گئے پردیس
ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

ماگھ
سکھی رے ماگھ مہینہ آیا میت نہ گھر کو آئے
بگین میں آم بورائے کویلیاں مست بول سنائے
نہیں بلم اب توں گھر آئے جان اسی میں جائے
برہن نیر بہائے اپنی بپتا کسے سنائے
نردئی سانوریا چلے گئے پردیس
ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

پھاگن سکھی ری سہاؤنا پھاگن ماس سندیسا پھگوا کھیلن کا لایا
سب سکھیاں مل مل کھیلیں ہولی سانور گوری ہاتھ میں لے پچکاری
مناویں خوشیاں جلاویں ہولی سکھیاں ہجولی رنگ رنگ کی بولیں بولی
نردئی سانوریا چلے گئے پردیس ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

چیت موہے چیت چنتا گھیرے، پی نہ گھر میرے
کھلے بن میں ٹیسو پھول پیا موہے گئے بھول
گھر میں پڑی اکیلی ناکوئی ساتھی نہ کوئی سہیلی
نردئی سانوریا چلے گئے پردیس
ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

بیساکھ بیتا چیت آیا بیساکھ بلموا کو موری یاد نہ آئی
میں تڑپوں دن رین پڑے نہیں چین
نردئی سانوریا چلے گئے پردیس
ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

جیٹھ لاگا جیٹھ مہینہ بلموا کی یاد ستائے ہوگیا مشکل جینا
سپنے میں بھی درس پیا نے نہ دینا تڑپت بتائے بارہ مہینا
نردئی سانوریا چلے گئے پردیس
ناگھر آئے نا بھیجا کوئی سندیس

ٹیسو رائے

میرا ٹیسو یہیں اڑا
کھانے کو مانگے دہی بڑا

دسہرے کے آس پاس لڑکوں کی ٹولیاں گلی محلوں میں ہاتھ میں ٹیسو لیے گھومتی پھرتی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق سیٹو کا تعلق مہا بھارت کے زمانے سے ہے۔

کہتے ہیں کہ رانی کنتی کے کنوارے پن میں ہی دو لڑکے ہوئے تھے۔ بڑے لڑکے کا نام ببّرواہن تھا جسے کنتی جنگل میں چھوڑ آئی تھی ببرواہن چند سال میں ہی اتنا بڑھ گیا کہ اس نے علاقے میں سب کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پانڈو نے پریشان ہو کر سبھدرا کے ذریعے بھگوان کرشن سے انہیں بچانے کو کہا۔ بھگوان کرشن نے اپنے سدرشن چکر سے اس کی گردن کاٹ دی لیکن ببّرواہن نے امرت پی رکھا تھا اور وہ نہیں مرا۔ کرشن نے اس کے سر کو کھجور کے پیڑ پر رکھ دیا مگر ببرواہن کو چین نہیں آیا۔ کرشن نے اپنی طاقت سے جھانجی کو پیدا کیا اور ٹیسو سے اس کا بیاہ رچایا۔ ایک اور روایت کے مطابق ببرواہن بھیم کا لڑکا تھا اور بہت بہادر اور دانی آدمی تھا۔ کرشن کو یہ ڈر تھا کہ اگر ببرواہن کورو کے ساتھ مل گیا تو پانڈو ہار جائیں گے۔ کرشن ایک دن برہمن کے بھیس میں اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ دانی ہو تو اپنا سر کاٹ کر مجھے دان میں دیدو۔ ببّرواہن نے سر کاٹ کر دیدیا مگر یہ پرارتھنا کی کہ اسے کسی ایسی جگہ پر ٹانگ دیا جائے جہاں سے میں مہا بھارت کا یدھ دیکھ سکوں۔ کرشن نے اس کا سر درخت پر ٹانگ دیا جہاں سے جنگ کا میدان صاف نظر آتا تھا۔ لیکن جب بھی پانڈووں اور کوروؤں کی فوجیں لڑنے کے لیے پاس آتیں تو ببرواہن اتنی زور سے ہنستا تھا کہ دونوں فوجیں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ جاتی تھیں اور لڑائی شروع نہ ہو سکی۔ کرشن نے یہ سوچ کر کہ اس طرح سے مہا بھارت کا یدھ کبھی نہیں شروع ہوگا، اس شاخ میں جس پر ببرواہن کا سر رکھا ہوا تھا دیمک لگا دی۔ شاخ ٹوٹ گئی اور سر نیچے گر پڑا۔ نیچے سے وہ یدھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے مہابھارت کا یدھ شروع ہو سکا۔

ٹیسو کو کمہار تین کھپچیوں کا سٹینڈ سا بنا کر اس کے اوپر رکھ دیتے ہیں نیچے دیا رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ کئی کمہار ایک چھوٹے سے ٹیسو کو ایک گھوڑے پر بٹھا کر اس کے ہاتھ میں ایک تلوار پکڑا دیتے ہیں۔ دلّی میں ایسے بھی ٹیسو دیکھنے میں آتے تھے جو کسی راکشش کی مورتی کی طرح بھیانک شکل کے ہوتے تھے کیونکہ ایک روایت

کے مطابق ٹیسو ایک راکشش بھی تھا۔ بچے ٹیسو اٹھائے گھر گھر جا کر پیسے مانگتے تھے۔
بہت چھوٹے بچے ٹیسو کا پورا گیت تو نہیں گا سکتے تھے مگر اتنا ضرور کہتے۔

میرا ٹیسو یہیں اڑا، کھانے کو مانگے دہی بڑا
دہی بڑے میں پنّی، دھر دے مائی اٹھنّی!

کئی بچے یہ چھوٹا گیت گاتے تھے۔

میرا ٹیسو یہیں اڑا، کھانے کو مانگے دہی بڑا
دہی بڑے میں مرچیں بہت، آگے دیکھو قاضی حوض
قاضی حوض پر چلی چھری، آگے دیکھو فتح پوری
فتح پوری پر اڑا چڑا، آگے دیکھو لال قلعہ
لال قلعے میں بیٹھا نائی، آگے دیکھو جمنا مائی

ٹیسو کا یہ گیت بھی گھروں میں اور گلیوں میں گایا جاتا تھا۔

ٹیسو آئے گھر کے دوار
کھولو رانی چندن کواڑ
چندن کواڑیں روڑی
گھر گھر بانٹے کوڑی
کور کور کے ٹکے بنائیں
ان گلیوں میں چھنٹے آئیں
چنتا منتا کیا سنگھار
موم کی چھاتی دھرا انگار
سمیتا کے پانچوں بھائی
مارتے مارتے خبر آئی
خبر آئی سرگا سونی
سرگا سونی بڑا تالاؤ
جس پر بیٹھے ٹیسو راؤ
ٹیسو راؤ کے سات بھوڑیا
من من پیسیں دس من کھائیں
بڑے مل سے لڑنے جائیں
بڑے مل کی پتن چھری
سو سو کمبل سو سو تیر
ایک تیر میں نے مانگ لیا
چڑھ گھوڑے پر سلام کیا
ماروں گا جی ماروں گا
جا دِلی پکاروں گا
جا دلی کے کالے کوٹ
مار سکندر پہلی چوٹ

جا رکھا چولہے کی اوٹ　　چولہا مانگے سَو سَو روٹ
ایک روٹ گھٹ گیا　　چولہا بیٹا نٹ گیا

سانجھی

دسہرے کے قریب دیواروں پر سانجھی کی گوبر، گیرو اور رنگ سے مورتی بھی بناتے تھے اور اس کی ہر روز شام کو لڑکیاں اور عورتیں پوجا کرتی تھیں اور گیت گاتی تھیں۔ سانجھی کی مورتی دیہات میں زیادہ اور شہر میں کم بنائی جاتی تھی۔ دلی میں اس موقعے پر یہ گیت گائے جاتے تھے۔

۱۔ سانجھی بی بی ری کیا اوڑھو گی کیا پہرو گی
کاہے کا سیس گوندھاؤ گی
کاہے کی مانگ بھراؤ گی
شالو اوڑھو گی، مشروع پہنو گی
سونے کا سیس گوندھاؤ گی
موتیوں کی مانگ بھراؤ گی

۲۔ میری سانجھی کی اورے دھورے
ہری ہے چولائی
میں پوچھوں سانجھی بی بی تیرے کے لکھ بھائی
میرے پانچ پچیس، میرے نو دس بھائی
میرے نو دسوں کا انڈل منڈل
سانجھا میرا بھائی

پھاگن

پھاگن رُت کا رنگ ہی اور ہے۔

کہو شیام کہاں تھے پھاگن میں
ناہیں موسے اڑاؤ باتن میں
رس بھرے نیناں کُسُم رنگ ہو گئے
رات کٹی کہیں جاگن میں

یا

چترائی سے کھیل ہوری شیام آئی ہوں چوری چوری
ساری پہ مورے دھبّہ نہ آوے، چولی ہی رنگ دے موری

شب برات

شب برات کا یہ گیت ایک انوکھی کیفیت بیان کرتا ہے۔

آئی شب برات، بہو ساس سے لڑی
کوئی لیپے کوئی پوتے، کوئی کمہار کے کھڑی
مٹکے اچھے دیجو بھیّا، آویں گے مردے
چھوٹیں گے انار اور پھول جھڑی

لاؤنی

لوک گیتوں میں لاؤنی بھی عوام میں بہت مقبول رہی ہے۔ لاؤنیاں گانے والوں کے اکھاڑے ہوتے تھے ان کی شاعری یا تُک بندیوں میں ویدانت کی باتیں بھی کہی جاتی تھیں اور حضرت یوسف زلیخا کے عشق کے چرچے اور کربلا کی دل ہلانے والی داستانیں بھی سننے کو ملتی تھیں۔

خدا اور ایشور کو ڈھونڈنے والو سنو — یہ ہمارے دلوں میں موجود ہے
یوں ہی دیر و حرم میں بھٹکتے پھرے — جہاں جانا ہے وہاں کی خبر ہی نہیں
وہ گھٹ ہی کے پٹ میں نہاں ہے میاں! — وے اندھوں کو آتا نظر ہی نہیں

عرس تقریب

عرس تقریب پر عام طور پر منّت پوری ہو جانے پر مزار پر چادر چڑھانے کا رواج تھا۔ اس موقعے پر جو گیت گائے جاتے تھے ان کی زبان اور پیرائے میں بڑی دلکشی ہوتی تھی۔ انہیں قوال اور دوسرے لوگ مل کر گاتے تھے۔

تطہیر کی اِس میں رنگت ہے ۔۔۔ یہ جانِ وفا کی چادر ہے
ہر تار ہے اس میں نورانی ۔۔۔ یہ نور وضیا کی چادر ہے
جو نامِ علی کے عاشق تھے ۔۔۔ جو اسمِ نبی کے پجاری تھے
حسنین کے تھے جو دیوانے ۔۔۔ اس مستِ وِلا کی چادر ہے
جس سے کہ سکوں کی بارش ہے ۔۔۔ جس سے کہ مرادیں ملتی ہیں
اس بحرِ عطا کی چادر ہے ۔۔۔ اس کانِ سخا کی چادر ہے
جس کی کہ سراجِ الفت سے ۔۔۔ تنویر ہے دونوں عالم میں
جو رازِ مکمل راز میں ہے ۔۔۔ اس راز نما کی چادر ہے

یہ چادر خطا پوشِ عقبیٰ بنے گی
گناہوں کا محشر میں پردا بنے گی

اس موقعے کا ایک دوسرا مقبول گیت یہ تھا۔

اوڑھو جی چادریا مورے ساجنا
میں تو لائی پھولوں کی چادریا
اوڑھو جی مورے ساجنا
میں تو رنگ برنگی رنگ کر لائی
پیت رنگ کی تم کو بھائی
پٹ کھولو گھونگٹ چھوڑو
اوڑھو جی مورے ساجنا

عرسوں کی تقریبوں پر اس رنگ شریف کی پہلی دو کڑیاں کرشن بھگت سورداس کی ہیں لیکن قوالوں نے اولیا اللہ کی مدح کے ساتھ ایسا ملا دیا ہے کہ یہ انہیں کی معلوم ہوتی ہیں۔

لالی تورے لال کی جت دیکھوں اُت لال
لالی دیکھن میں گئی سو میں بھی ہو گئی لال
آج رنگ ہے اے ماں (ایماں) رنگ ہے ۔۔۔۔ ری
میرے خواجہ پیا گھر رنگ ہے ۔۔۔۔ ری
میں نے پیر پائیو نظام الدین اولیار
نظام الدین اولیار علاؤالدین اولیار
علاؤالدین اولیار فریدالدین اولیار
فریدالدین اولیار نصیرالدین اولیار
نصیرالدین اولیار معین الدین اولیار
معین الدین اولیار محی الدین اولیار
آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ۔۔۔۔۔ ری
میرے خواجہ پیا کا رنگ ہے ۔۔۔۔۔ ری

اصلاحی لوک گیت

انیسویں صدی کے آخر میں ملک میں کئی اصلاحی تحریکیں چل رہی تھیں۔ بچپن کی شادی کے خلاف بھی آواز اٹھائی جا رہی تھی۔ اس موضوع پر دلی میں گائے جانے والا یہ گیت بڑا مقبول تھا۔

چھوٹے سے مورے بلما، انگنا میں گلی کھیلیں رے
پنیا بھرن چلی، ساتھ لگے بلما، جھورائی ماروں رسریا رے
میّا میّا کریں، دیّا دیّا کریں رے ۔۔۔۔۔

بے جوڑ شادی کے خلاف آواز اس گیت میں اٹھتی تھی۔

مایا کے لوبھی باپ نے بڈھے کو بیاہ دی رے
کوٹھے اوپر کوٹھری بڈھا بلاوے ری

میں مارے سرم کے مرگئی وہ باپ سالا گے ری چُور چُور کر دیا نُور، میرو بڈھے کے سنگ بیاہی رے
میّا، بابا، چوک گئے آنکھ مینچ کر دی سادی رے چُور چُور کر دیا نُور، میرو بڈھے کے سنگ بیاہی رے

کتابی دنیا کے علاوہ فلمی دنیا میں بھی لوک گیتوں کے بول لے کر بہت سی دُھنیں بنائی گئیں ہیں جو بے حد مقبول ہیں۔

فقیروں، سادھوؤں، دفالیوں اور مجاوروں کے گیت کے ساتھ ساتھ دلّی کے دھوبی بھی کبھی گھاٹ پر تو کبھی اپنی مجلسوں میں گیت گاتے سنائی دیتے ہیں۔

دھوبی کا البیلا چھیل
بھور ہوتے ہی لاؤ بیل
دھیان لگایا پانی سے
تیلی کا بیل کیا جانے سیل
لگا رہے نِت گھانی سے
دانہ گھاس اُسے نہیں بھاوے
رچا وے سانی سے
دھوبی کا البیلا چھیل

سیاسی نوعیت کے لوک گیت

دلی کے لوک گیتوں میں تاریخی واقعات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب کی دکن کی مہمات اس وقت کی تاریخ کا بڑا اہم حصّہ ہیں۔ لوک گیت ان عورتوں کے دکھ بھرے جذبات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں جن کے شوہر مغل فوج میں بھرتی ہو کر مہینوں کے لیے دکن چلے جاتے تھے اور ان میں سے

بہت سے کبھی نہیں لوٹتے تھے۔

دلی شہر سہاونا کنچن برسے نیر
سب کے کنت بٹور کے لے گئے عالمگیر

اور وہ انتظار کی جان لیوا گھڑیاں۔

چھپر ہو گئے پرانے اور کڑکن لاگے بانس
آون آون کہہ گئے بیت گئے بارہ مانس

ایک عورت اپنی سہیلی کا حوصلہ یہ کہہ کر بڑھاتی ہے۔

بیٹھی رہو کرار سے من موں راکھے دھیر
اب کے بچھڑے تب ملیں جب بوہریں عالمگیر
منتی کرو اس سائیں کی کہ بوہریں عالمگیر

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی

۱۸۵۷ کے ہنگامے کا دور ہے۔ میرٹھ میں فوج نے بغاوت کردی ہے۔ دلی کی گلیوں میں بھی جوشیلے نوجوان اس قسم کے گیت گاتے تھے۔

سنو سنو، میری سوگند سنو جو میں نے کھائی ہے
کارتوس کو میں کبھی اپنے دانتوں سے نہیں کاٹوں گا
ان کا پانی کبھی نہیں پیوں گا
میں برہمن ہوں یا راجپوت
شیخ ہوں یا سیّد ہوں
میں مغل ہوں یا پٹھان
ان کے کارتوس کو ہرگز نہیں کاٹوں گا
سنو سنو، میری سوگند سنو!

دلی میں گوروں اور تلنگوں سے سب خوفزدہ تھے۔

بہو جلد جلد دھان کوٹ لے
کہیں تلنگے نہ گھس پڑیں
میں بنئے کی دکان دیکھتی ہوں
دال، لہسن اور زیرا لے آؤں
کواڑ بند کرلینا کہیں ایسا نہ ہو
کہ تلنگے اور گورے گھس پڑیں

اور —

پکی پکی فصل کمپنی کے دلال کاٹ لیں گے
اور کھیتوں میں آگ لگا دیں گے
— پھر ہم بھوکوں مر جائیں گے

اس آزادی کی جنگ میں بہت سے بہادروں نے جان کی قربانی دی تھی۔ ایک بہن اپنے بھائی کی موت کے بارے میں سن کر کہتی ہے ۔

بیرن تیری لاش پر بھنیا ہوجاتی قربان
ٹیکہ، جھمکا، کنگن، پہونچی سب پر ہے دھکار
خود جو ہوتا میرے سر پر ہاتھ میں جو ہوتی تلوار
گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور پہونچتی رن بھومی میں
داؤں دکھاتی ایسے بیرن سب رہ جاتے حیران
بیرن تیری لاش پر بھنیا ہوجاتی قربان

تحریک آزادی

بعد کی آزادی کی تحریک نے بھی بہت سے دیش بھگتی کے لوک گیتوں کو جنم دیا۔ عوام تو گاندھی جی کو ایک رشی، ایک اوتار مانتے تھے ۔

گاندھی جی کا اوتار ہوا ہے بھارت بھار مٹانے کو
سنگ میں ویر جواہر ہے سیم راج چلانے کو

رام کے سنگ میں لچھمن تھے کرشن کے سنگ میں بلداؤ
گاندھی کے سنگ جواہر ہے انیائے دشٹ پچھاڑنے کو
رام کی سینا بندر تھے کرشن کی سینا گوالوں کی
گاندھی کی سینا جنتا ہے بھارت آزاد کرانے کو

پھر آزادی آئی اور دلی کے لوگوں کی زبان پر یہ گیت لہرانے لگا۔

آیا پرجا راج رے ساتھی، آیا پرجا راج
جن کھیتوں میں بھوک اُگی تھی ان میں ان اپار
جن گاووں میں کال پڑے تھے اب وہ ہیں گلزار
ہر دل میں ہے پیار
بن گئے بگڑے کاج رے ساتھی آیا پرجا راج
دل اپنا ہے، دلی اپنی، اپنا سب سنسار!

یہ گیت دلی کے مزدوروں اور کسانوں کی امنگوں اور جذبات کا آئینہ دار تھا۔

چلو چلو — بڑھو بڑھو
ناؤ میں بیٹھی راجہ کی نار — پانز ناچیں بارم بار
پائل دئے رہی جھنکار — ڈھولک بولے گڑگڑ تار
تالی باجے بولیں تار — گونج رہے دریا سنسار
رانی کی ناؤ کے کھیون ہار — دھوپ میں مہاری ناؤ منجدھار

پنڈت نہرو عوام کے محبوب نیتا تھے، مرد، عورتیں اور بچے سب انہیں پیار کرتے تھے۔ اس گیت میں ان کے لیے دلی والوں کے جذبات جھلک رہے ہیں۔

پنڈت نہرو نے چلائی جنتا ریل، بھائیلی سب سیل کریں
چمپا اور چمیلی جا رہی ہیں ہر پیاری کے سنگ
بمبئی شہر اور کلکتہ کو دکھیاوے سب ڈھنگ
اے جی کھریا کرے تو منگالے گڑ اور تیل

پنڈت نہرو نے چلائی جنتا ریل ....

اچھے اچھے ڈبے جڑ رہے ہیں بجلی لگ رہی وا میں
بہت دور کی سفر کرے ہے، پہنچا دے لمحے میں
اے جی کبھی انجن تو ہووے ناوے کا پھیل
پنڈت نہرو نے چلائی جنتا ریل ....

۲۔ کہیں گاڑھے خاں بنیادی سنو شہزادی
جگت کی دادی یہ دن دکھلایا میں ململ جان سے شادی کرکے پچھتایا

دلّی کے لوک گیت، دیس کے دوسرے علاقوں کی مانند، لاتعداد ہیں۔ ہر موضوع پر گیتوں کی اتنی تعداد ملتی ہے کہ انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی بھی گیت ایسا نہیں ہے جو عوام کے جذبات کا آئینہ دار نہ ہو۔ بہرحال چند نمائندہ گیتوں کا انتخاب صرف اس زاویے سے کر لیا گیا ہے کہ جذبات اور احساسات کی ایک عمدہ جھلک پیش کی جا سکے اور ہم دلی کے اُن سادہ اور محنت کش عوام کی روزمرہ کی زندگی، ان کے ولولے، عزائم اور مسرتوں کو محسوس کر سکیں جن کی شکلیں اور رہن سہن کے ڈھنگ اب بہت کچھ بدل گئے ہیں۔

سواریاں

سلطانوں اور مغلوں کے عہد میں عام لوگوں کا دلی سے باہر کا سفر برائے نام تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سہولتوں کی عدم موجودگی تھی۔ صرف چند شاہراہیں تھیں اور چھوٹے چھوٹے دریاؤں پر پُل نہیں ہوتے تھے۔ پھر راہ میں ٹھہرنے کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہوتا تھا۔ ان دشواریوں کے پیشِ نظر سفر صرف گروہ یا قافلے کی صورت میں بڑے سازو سامان اور حفاظتی انتظامات کے ساتھ ہی ہوتا تھا اور یہ سب کچھ ایک عام شہری کے بس کا نہیں تھا۔ ۱۶۶۶ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں مقیم ایجنٹوں نے کمپنی کو یہ رپورٹ بھیجی تھی ــــ "سڑکوں کی حالت بڑی خستہ ہے اور شاہراہوں کی مرمت نہیں ہوتی لیکن بیل گاڑیوں کے پہیئے اور اسی قسم کی دوسری سواریاں سڑکوں کو بری طرح توڑ دیتی ہیں جو سفر کو نہایت تکلیف دہ اور دشوار بنا دیتا ہے۔" شیر شاہ سوری کے زمانے میں نہ صرف چند نئی شاہراہیں بنیں بلکہ سڑکوں کی مرمت کا کام بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے بیس پچیس کوس کے بعد ایک سرائے بھی تعمیر کرائی گئی اور جہاں تک ممکن ہوا شاہراؤں کے دونوں طرف سایہ دار درخت بھی لگوائے گئے۔ مگر عام لوگوں کا سفر بہت عرصے تک دشوار ہی رہا۔ عام آدمی، سوداگر اور سیاح یہ انتظار دیکھتے رہتے کہ کوئی قافلہ روانہ ہو تو اس کے ساتھ ہولیں۔ ہزاروں لوگ اگر بادشاہ کہیں جاتا تو اس کی سواری کے ساتھ سفر کرتے۔



چند مخصوص سواریاں

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے:-

"اکبر کا پڑاؤ جب کسی شہر میں بھی ہوتا، تو ایک کیمپ کی صورت اختیار کر لیتا۔ ہزاروں لوگ جنھیں اُس سمت میں سفر کرنا ہوتا جدھر بادشاہ کی سواری آگے جائے گی، ارد گرد اکٹھے ہو جاتے اور شاہی کیمپ مسافروں کا ایک بڑا قافلہ بن جاتا۔"

بادشاہ ہمیشہ ہوادار میں سفر کرتے۔

اُن دنوں آمد و رفت کے ذرائع بہت محدود تھے۔ سڑکوں پر گھوڑوں، بیلوں اور اونٹوں سے کھینچے جانے والی پہیّے دار گاڑیاں، رتھ، بہلیاں، ہوادار، تام جھام، دریاؤں میں چلنے والی کشتیاں اور ساحلی علاقوں میں سمندر پر چلنے والے بادبانی جہاز اُن دنوں کی سواریاں تھیں۔ شہروں کے اندر رتھ، شکرم اور بوچے چلتے تھے۔ نالکی، پالکی اور ڈولی اٹھانے والے پالکی بردار تھے۔ دلی میں ہاتھیوں، گھوڑوں اور گاڑیوں کے علاوہ ڈولی، ڈولا، نیمے، میانے، پالکی، نالکی، چوبہلی، چنڈول، سکھپال اور فینس بھی ملتی تھیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے کے لیے ان ڈولیوں کا کرایہ پیسہ دو پیسے ہوتا تھا۔

بیل اور بیل گاڑی

بیل صرف دیہات میں ہی آمد و رفت کے لیے سب سے زیادہ کام میں آنے والا جانور نہیں تھا بلکہ شہروں میں بھی اسے کثرت سے سامان ڈھونے اور آنے جانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بیل کو گھوڑے کے طور پر بھی استعمال کرنے کا رواج تھا یعنی آدمی اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر چلتا تھا۔ مشہور مورخ او وِنگٹن نے لکھا ہے:-

"یہاں کے لوگ بیل پر گھوڑے کی طرح سواری کرتے ہیں۔ کاٹھی کی بجائے بیل کی پیٹھ پر ایک نرم گدّی رکھ لیتے ہیں اور اپنے ہاتھ میں نکیل کی وہ رسیاں تھامے رکھتے ہیں جو بیل کے نتھنوں میں پڑی رہتی ہے۔ اگر بیلوں

کو بیس پچیس کوس تک لے جانا ہوتا تو ان کے پاؤں میں گھوڑوں کی طرح نال بھی لگا دیتے تھے۔"

بیل گاڑی میں دس پندرہ آدمی آرام سے بیٹھ جاتے تھے۔ بیل کو گاڑی میں جوتنے سے پہلے، اس کی گردن کے گرد ایک موٹی تہہ والا کپڑا باندھ دیتے تھے اور اس کے ذرا اوپر چمڑے کی ایک پٹی ڈال دیتے تھے۔ دلی میں میلوں اور تہواروں کے موقعے پر لوگ بیل گاڑیوں میں بھر بھر کر آتے جاتے تھے۔ کئی بیل گاڑیوں میں دو بلکہ تین تین بیل جتے ہوتے تھے اور یہ بیل گاڑیاں ایک دن میں آسانی سے بیس میل کا سفر طے کر لیتی تھیں۔

بیلوں کے علاوہ دلی اور اس کے نواحی علاقوں میں لوگ گھوڑے، چھوٹے پہاڑی گھوڑے، خچر اور گدھے کی پیٹھ پر بیٹھ کر بھی سفر کرتے تھے۔ رتھ کا رواج جو ایک خوشنما بیل گاڑی ہوتی تھی اس فرق کے ساتھ کہ اس میں گھوڑے بھی جتے جاتے تھے، دلی میں نہیں تھا۔ مگر کئی مغل بادشاہوں کو رتھوں اور بگھیوں کا شوق تھا۔ اکبر دو گھوڑوں کے رتھ میں جانا پسند کرتا تھا جس میں ایک مخملی گدیلے کا وچ پر وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جہانگیر کو جو تحفے بھیجے تھے۔ ان میں ایک انگریزی بگھی بھی تھی جس نے تمام دربار میں ایک سنسنی سی پھیلا دی تھی اور جسے مقامی کاریگروں نے ایک نمونے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ جہانگیر نے اس بگھی کو ملکہ نور جہاں کو تحفے کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس کی گدیوں کے انگریزی کپڑے کو اتار کر اس میں سونے اور مخمل کا کام کیا گیا اور تمام بگھی کو مشرقی طور پر سجایا گیا۔ ہندوستان میں بادشاہوں، راجاؤں اور امرا کے لیے انگریزی طرز کی بگھی کا استعمال اس کے بعد ہی شروع ہوا۔ دلی میں کئی نوابوں اور رئیسوں کے پاس انگریزی دور میں اس قسم کی بگھیاں تھیں اور ایسی بگھیوں کو امارات اور شان و شوکت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کی بگھیوں کو دو یا چار گھوڑے کھینچتے تھے اور پیچھے پائدان پر ایک چوبدار کھڑا رہتا تھا۔

ہاتھی

خوبصورت ہودوں والے ہاتھی بادشاہوں، راجوں، شہزادوں اور نوابوں کی سواری تھے۔ شہزادیاں بھی ہاتھی پر سوار ہوتی تھیں۔ مغل شہزادی روشن آرا بیگم اپنے پیگو ہاتھی پر جس پر سنہرا ہودہ تھا، آتی جاتی تھی۔ بہترین ہاتھی پنّا سے آتے تھے۔ مورخ برنیر کے مطابق شاہجہاں کے عہد میں پیگو سے پہلی مرتبہ چند سفید ہاتھی ہندوستان لائے گئے تھے۔ اکبر کے عہد میں شاہی فیل خانے میں ۱۰۱ ہاتھی ایسے تھے جو صرف شاہی سواری کے لیے مخصوص تھے۔ انہیں "خاص ہاتھی" کہا جاتا تھا۔ جب بادشاہ کسی مخصوص ہاتھی پر سواری کرتا تھا تو اس کے مہاوت کو اس کی ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر بخشش دینے کا رواج تھا۔ آئینِ اکبری میں ہاتھی کے لیے جس سازوسامان کا ذکر ہے اس میں "دھرنا" یعنی لوہے کی ایک بڑی زنجیر (سونے اور چاندی کی بھی ہوتی تھی)، "لوہ لنگر" ایک قسم کی زنجیر جس سے ہاتھی کو بے قابو ہونے سے روکا جاتا تھا، گدیلہ، چورسی اور نیتہ وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ہاتھی کو شاہی سواری کے لیے بہت ہی خوبصورت ڈھنگ سے سجایا جاتا تھا۔ "میگھ ڈمبر" وہ چھتری نما آڑ جس سے مہوت پر بھی سایہ ہوتا تھا، شہنشاہ اکبر کی ایجاد تھی۔ سجاوٹی اشیا میں "رن پیال" "گتیلی" اور "پائے رنجن" کا استعمال بھی مغلوں کے عہد میں ہی شروع ہوا۔

گھوڑے

گھوڑے تیز رفتاری، طاقت اور موثر شکل وصورت کی بنا پر دوسرے جانوروں کے مقابلے میں، سواری کے لیے زیادہ استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ گاڑیاں بھی کھینچتے تھے۔ عوام اور خواص، دونوں کی مقبول سواری تھی۔ گھوڑوں کی نسل پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں گھوڑے عرب، ترکی، ترکستان، بدخشاں اور تبت سے آتے تھے۔ کشمیر کے گھوڑے بھی پسند کیے جاتے تھے۔ ہندوستان کے جن علاقوں کے

گھوڑے اچھے سمجھے جاتے تھے ان میں پنجاب، آگرہ اور کوچ بہار کے گھوڑے اپنی جسمانی طاقت کی بنا پر زیادہ مشہور تھے۔ اونچے نیچے راستوں پر جو پُر پیچ بھی ہوتے تھے بڑے یقین کے ساتھ قدم رکھنے میں کشمیر کے گھوڑوں کا جواب نہیں تھا۔ گھوڑے کی سواری کے سامان میں کاٹھی یا گدی، ایک یال پوش جو گردن پر پڑی تھی، زین، پاؤں اٹکانے کے لوہے کے قبضے، ایک اونی تولیہ، ایک مگس ران جو مکھیاں اڑانے کا ایک پنکھا سا تھا جسے گھوڑے کی دُم میں باندھ دیا جاتا تھا اور ایک تختہ ہوتا تھا۔

پالکیاں

دلی کے امیر اور رئیس آدمی پالکیوں میں سفر کرنا پسند کرتے تھے جو بڑی آرامدہ ہوتی تھیں۔ بہت سے یوروپین مورخوں نے پالکیوں کا ذکر بڑے دل پذیر پیرائے میں کیا ہے اور ان کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہ ایک قسم کا بڑا صندوق ہوتی تھی جس کے آگے اور پیچھے دو دو بانس نکلے رہتے تھے جنھیں کندھوں پر اٹھا کر چار یا چھ آدمی چلتے تھے۔ انہیں پالکی بردار کہا جاتا تھا اور عموماً یہ ایک ہی کنبے کے فرد ہوتے تھے۔ پالکیاں سادہ بھی ہوتی تھیں اور مزیّن بھی۔ بڑی پالکیوں میں آمنے سامنے دو یا چار افراد کے بیٹھنے کا انتظام ہوتا تھا اور پالکی کے دونوں طرف اندر آنے یا باہر نکلنے کا راستہ ہوتا تھا۔ امیروں کی ذاتی پالکیاں بڑی سجی سنجائی ہوتی تھیں جس میں مخمل کی گدیاں کشمیری پشمینے یا غالیچے پر بچھی ہوتی تھیں۔ ایک یا دو جالی دار کھڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ اگر پالکی میں کوئی خاتون یا خواتین بیٹھی ہیں تو پردے گرادیئے جاتے تھے۔ جب کوئی خاتون سوار ہوتی تو پالکی بردار منھ پھیر لیتے اور یہی عمل اُن کے اترنے پر بھی دہراتے۔ اگر پالکی کرایے کی بھی ہوتی تو بھی پالکی بردار جانے پہچانے اور بھروسے کے آدمی ہوتے اور مستورات اکیلی پالکی میں بیٹھ کر چلی جاتی اور واپس آجاتیں۔ ہندو عورتیں مسلمان عورتوں کی طرح پردہ کرتیں اور پالکی میں سفر کرتیں۔ چھوٹی سی سادہ پالکی کو جس میں زیادہ سے زیادہ دو عورتیں اور عام طور پر ایک ہی عورت بیٹھتی ڈولی بھی کہا جاتا تھا۔ اس میں

صرف ایک ہی بانس آگے پیچھے نکلا ہوتا تھا اور اس کے اٹھانے کے لیے صرف دو پالکی بردار کافی ہوتے تھے۔ اگر برسات کا موسم ہوتا تو پالکیوں پر مومی کپڑا ڈال دیا جاتا تھا۔ شہر کے اندر ایک گلی سے دوسری گلی اور ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانے کے لیے پالکیاں مردوں اور عورتوں کے لیے بڑی ہی آرامدہ سواری تھیں۔ اگر سفر خاصہ طویل ہوتا تو فالتو کہار بھی ساتھ جاتے اور تھکے ہوئے کہاروں سے کندھا بدل لیتے۔ دلہن کو ڈولی میں رخصت کرنے کا رواج ان دنوں تو شہر میں بھی تھا اور دلہن کی ڈولی پر ایک سرخ ریشمی کپڑا ڈال دیا جاتا اور ڈولی والے کہاروں کو اجرت کے علاوہ نیگ اور مٹھائی بھی ملتی۔ اگرچہ ڈولی اب دلی میں اور دوسرے شہروں میں بھی تقریباً معدوم ہو گئی ہے لیکن رخصت کا دوسرا نام ڈولی ہمیشہ کے لیے پڑ گیا۔ ڈولی اور ڈولوں کے علاوہ نیچے اور میانے بھی استعمال ہوتے تھے۔

سُکھپال

سُکھپال دو طرح کی ہوتی تھی۔ عورتوں کی معزز سواری تھی۔ یہ ایک سرخ گنبد نما ڈولی۔ ایک لمبے چوڑے کھٹولے پر ایک شاندار بُرج سا بنا دیا جاتا تھا۔ جس میں چاندی سونے کے کلوے ہوتے۔ چاروں طرف پردے لٹکے ہوتے۔ دوسری طرح کی سکھ پال نئے چاند کی شکل کی، قدرے گول اور قدرے تکونی، خاصی بڑی سواری ہوتی تھی جس کے اوپر اونٹ کی کھال کے رنگ کا یا سرخ رنگ کا کپڑا پڑا ہوتا تھا اور اس کے دونوں طرف باندھنے کے لیے مختلف دھاتوں کی خوشنما زنجیریں لٹکی ہوتی تھیں۔ ابوالفضل نے سکھ پال کو "خشکی کی کشتی" کہا ہے۔ یہ ایک آدمی کے لیے بڑی آرام دہ سواری تھی اور اس میں آرام سے بیٹھا، لیٹا یا سویا جا سکتا تھا۔ دراصل بنگال میں یہ امیر آدمیوں کی سواری تھی اور وہاں اسے "سکھاسن" کہا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں دلی اور آگرے میں سُکھپال استعمال ہونے لگی مگر بہت مقبول نہیں ہوئی۔ صرف چند نوابوں اور ہندو رئیسوں کے پاس ان کی ذاتی سُکھپال تھی۔

مہامنڈل

مہامنڈل ایک بڑا ڈولا ہوتا تھا۔ جس میں مہارانیاں، امیرزادیاں، نواب زادیاں، پالکی یا فینس کی بجائے سوار ہوا کرتی تھیں۔

ہوادار

اعلیٰ طبقے کے شہزادے اور نواب یا انہیں درجے کے امرا ہوادار اور بوچوں میں سوار ہو کر نکلتے تھے۔ ہوادار ٹمٹم کی وضع کی ایک کھلی ڈولی تھی جس کے پیچھے چمڑے کا ٹپ ہوتا اور لوہے کی کمانیوں کے ذریعے سے کھولا بند کیا جاتا تھا۔ ٹھنڈے اوقات میں جب ٹپ گرا دیا جاتا تو ہر طرف کی فضا کھلی ہوتی۔ آگے پیچھے اس میں فینس کے سے ڈنڈے لگے ہوتے چار کہار اس کو کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے اور جو شخص سوار ہوتا وہ نہایت وقار اور تمکنت سے بازار کی سیر کرتا۔ ہر طرف اور ہر چیز کو دیکھتا بھالتا اور شناساؤں سے بات چیت کرتا جاتا تھا۔ مغلوں کے آخری دور کی مقبول سواری تھی۔

بوچہ

ہوادار سے زیادہ باوقار اور رشتین سواری تھی۔ اس میں پائے ہوتے اور آگے پیچھے فینس کے سے دو ڈنڈے ہوتے اور کم سے کم آٹھ اور اکثر سولہ کہار اس کو اٹھا کر چلتے۔ اس لیے کہ وہ کہاروں کے اٹھانے کی تمام سواریوں سے زیادہ بھاری ہوتا تھا۔

فینس

زیادہ تر لوگ فینسوں پر سوار ہوتے، علما، اطبا، امرا اور خوش باش چار نوکر

رکھ لیتے جو خدمت گاری کا کام بھی دیتے. عورتوں کا فینس بڑے تکلف اور شان سے نکلتیں. فینس پر سُرخ چھلکے پڑے ہوتے. جن پر کبھی گوٹہ، لچکا بھی ٹانک دیا جاتا. کہار سُرخ بانات کا چغہ پہنے رہتے. سروں پر سُرخ پگڑیاں ہوتیں جن کے کنگروں پر چاندی کی مچھلیاں ٹکی رہتیں.

چنڈول

بادشاہوں، نوابوں اور امیروں کے لیے جو سب سے زیادہ آرامدہ اور شان وشوکت والی سواری تھی اسے چنڈول کہتے تھے. یہ سواری کیا تھی بس چاروں طرف سے بند ایک اچھا خاصہ کمرہ تھا. اس میں کھڑکیاں ہوتی تھیں جن پر چمڑے یا ریشم کے پردے پڑے رہتے تھے. چمڑے کے پردوں پر سنہرا کام کیا ہوتا تھا اور وہ بڑے منقش اور خوشنما ہوتے تھے. نیچے موٹے موٹے ریشمی گدے بچھے ہوئے ہوتے تھے. کئی چنڈولوں میں نیچے فرش پر شیر کی کھالیں بچھا دیتے تھے. چنڈولوں کی بیرونی سطح بہت سجی ہوئی ہوتی تھی. کئی چنڈولوں پر چاندی کے منقش میناکاری والے ورق چڑھے ہوتے تھے. کئی اپنی چنڈولوں پر طرح طرح کے نقش ونگار پینٹ کرواتے تھے اور بعض اس میں نادر اشیا اور سنہرے رنگ کی زنجیریں اور گھنٹیاں لٹکا دیتے تھے. کئی چنڈولوں میں ایک خوبصورت برتن میں پینے کا پانی یا شربت بھی لٹکا رہتا تھا.

اس پالکی نما سواری میں آگے اور پیچھے دو ڈنڈے لگے ہوتے تھے. ان ڈنڈوں کو بھی بڑا عمدہ سجایا جاتا تھا. چنڈول کو بارہ آدمی اٹھاتے تھے، تین تین آدمی ایک ایک ڈنڈے پر آگے کی طرف اور اتنے ہی پیچھے کے دونوں ڈنڈوں پر. ایک شاعر نے کسی راجہ یا نواب کی چنڈول کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

"اس چنڈول کے دستے سونے اور جواہرات کے بنے ہوئے تھے اور ان پر روغن صندل ملا ہوا ہوتا تھا. چنڈول کی چھت کو بڑے موٹے ریشمی پردے سے ڈھکا جاتا تھا اور اس کے چاروں طرف کی جھالرے

قیمتی ہیرے اور جواہرات لٹکے رہتے تھے۔ چنڈول کو سجانے کے لیے مور کے پروں کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ چاروں طرف سجاوٹی چیزوں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں۔ راجہ چنڈول میں ایک سمت بیٹھ جاتا تھا اور اس کی دائیں اور بائیں طرف اس کے دو خدمت گار چنور ہلاتے رہتے تھے۔"

اس شاعر کے بیان میں جہاں تک ہیرے جواہرات اور سونے کے استعمال کا سوال ہے خاصہ مبالغہ ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ چنڈول بڑی سجی سجائی سواری ہوتی تھی۔ آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ ایسی سجی سجائی چنڈولوں کو "بہل" بھی کہا جاتا تھا۔ اس میں یہ حوالہ بھی ہے کہ اکبر نے بھی ایک شاندار غیر معمولی سواری ایجاد کی تھی۔ یہ کافی بڑی اور کئی کمروں والی سواری تھی جس میں غسل خانہ بھی تھا اور اسے ایک ہاتھی کھینچتا تھا۔

ہاتھیوں کی پالکی

اِسے عماری بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ایک عام سواری نہیں تھی بلکہ اِسے خاص طور پر وقتِ ضرورت تیار کیا جاتا تھا۔ اس کا استعمال بڑے بڑے نوابوں یا شاہی افراد تک محدود تھا۔ مشہور سیاح منوچی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ پالکی دو ہاتھیوں کے درمیان لٹکا دی جاتی تھی یعنی ایک ہاتھی اس کے آگے ہوتا تھا اور دوسرا پیچھے۔ گرمیوں میں اس کے چاروں طرف خس کی ٹٹیاں باندھ دی جاتی تھیں جن میں سے چھن چھن کر ٹھنڈی ہوا اندر آتی تھی۔ آئینِ اکبری میں بھی اس سواری کا حوالہ آیا ہے۔ یہ سواری ہاتھیوں کی پیٹھ کی سطح سے ایک فٹ اونچائی پر بندھی ہوتی تھی مگر پانچ فٹ نیچے تک لٹکی رہتی تھی۔ سطحِ زمین سے یہ کافی اونچی رہتی تھی اور اس میں ہچکولے نہیں لگتے تھے۔ اس پالکی کو بھی بہت عمدہ سجایا جاتا تھا۔ اس پالکی کا مقابلہ ایک بڑے شاہی ہودے سے کیا جا سکتا ہے۔

کشتیاں

پانی میں سفر کرنے یا سیر و تفریح کے لیے کشتیوں کا رواج تھا۔ اکبر ایک مرتبہ آگرے سے الہ آباد کشتی میں گیا تھا۔ ایک اور موقعے پر اکبر نے دلی سے آگرے تک کا سفر دریائے جمنا میں بذریعہ کشتی کیا تھا۔ دلی میں اکبر کے زمانے میں بھی جمنا پر کشتیوں کا پل بنا رہتا تھا۔ کئی کشتیاں اتنی بڑی اور مضبوط ہوتی تھیں کہ وہ ہاتھی کو بھی لے جا سکتی تھیں۔ جو کشتیاں شاہی افراد کے استعمال کے لیے ہوتی تھیں وہ بڑی خوبصورت اور سجی ہوئی ہوتی تھیں جن میں بارش سے بچنے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ ابوالفضل نے ایسی کشتیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو "بڑے عمدہ طریقے سے سجی ہوئی تھیں اور ان میں کئی کمرے اور ایک چھوٹا سا باغ بھی ہوتا تھا"۔ کئی کشتیوں کا اگلا اور پچھلا حصہ جانوروں کی شکل کا بنا دیا جاتا تھا جیسے کہ مور، شیر یا گھوڑے کی شکل کا تاکہ کشتیاں اور خوبصورت لگیں۔

ہمایوں نے ایک کشتی ایجاد کی تھی جس کا نام "جسرِ رواں" تھا۔ یہ کشتی کیا تھی دریا میں تیرنے والا ایک پُل تھا۔ یہ پل اور کشتی دونوں کا کام دیتا تھا۔ اس میں کئی کشتیوں کو زنجیروں سے جوڑ کر ایک پل کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس پل کی سطح کو سخت تختوں کو کیلوں سے جوڑ کر ایسا پکا بنا دیا گیا تھا کہ مسافر اس پر چل بھی سکتے تھے اور گھڑ سواری بھی کر سکتے تھے۔ جب کبھی بادشاہ کو دریا میں سفر کرنا ہوتا تھا تو پُل کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے پانی میں لے جایا جاتا تھا اور پھر جوڑ دیا جاتا تھا۔

سفر کے اہتمام

مغلوں کے زمانے میں سفر کے اہتمام بہت بڑے پیمانے پر ہوتے تھے اور شاید ہی کوئی ایسی دستیاب سواری ہوتی جو شاہی قافلے میں شامل نہ ہوتی۔ درونِ شہر بھی یہ شاہی دستور تھا کہ جب بادشاہ اپنے تختِ رواں پر سوار ہو کر کہیں جائیں گے، تمام امراء ان کے

ہمراہ چلیں گے۔ بادشاہ کے تختِ رواں کو آٹھ آدمی اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلتے تھے۔ ہاں اگر بادشاہ کسی نجی کام سے جاتے یا مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو ان کے ہمراہ صرف وہ امرا ہوتے جو اس وقت قلعے میں تعینات ہوتے۔

شہزادیوں کی سواری

مشہور مورخ برنیئر نے شہزادی روشن آرا بیگم کے جلوس کا بڑا دل پذیر نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے لکھا ہے :۔

"میں نے ایسی پر شکوہ اور شاندار سواری اور ایسی نمود و نمائش پہلے نہیں دیکھی۔ وہ اپنے پیگو ہاتھی پر اپنی سنہری میگھ ڈمبر میں بیٹھی ہے، اس کے پیچھے پانچ یا چھ ہاتھی اور ہیں جس میں شاہی گھرانے کی دوسری عورتیں ہیں۔ ہر ایک بیگم اور شہزادی کی اپنی الگ اور اتنی ہی شاندار میگھ ڈمبر ہے۔ شہزادی کو گھیرے ہوئے خوبصورت خواجہ سرا ہیں جو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہیں اور بہت خوشنما لباس پہنے ہوئے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا ڈنڈا یا چھڑی ہے جس سے ان کے عہدے اور مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ عمدہ گھوڑوں پر ہی چڑھا ہوا شہزادی کا زنانہ حفاظتی دستہ ہے جو کشمیری اور تاتاری حسیناؤں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کچھ خواجہ سرا گھوڑوں پر سوار اور بھی ہیں اور بڑی تعداد میں پیدل سپاہی ہیں جنھوں نے ڈنڈے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے ہیں اور راستہ صاف کرتے جا رہے ہیں۔ کسی نے راستے میں آنے کی کوشش کی تو اسے ڈنڈے مار کر باہر نکال دیتے ہیں۔ شہزادیوں اور بیگمات کے بعد وہ بیگم ہیں جو قلعے میں سب سے بڑی ہیں۔ وہ بھی اسی طرح ہاتھی پر سوار ہیں اور ان کے ارد گرد بھی زنانہ حفاظتی دستے ہیں۔ شان و شوکت کا اس تمام جلوس میں وہ حال ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

شہزادی جہاں آرا ایک پالکی میں سفر کرنا پسند کرتی تھی۔ یہ پالکی ایک عمدہ کپڑے یا ایک سونے کے تاروں کے جال سے ڈھکی رہتی تھی۔ یہ پالکی کافی سجی ہوئی ہوتی تھی اور اس کے اندر آئینے بھی لگے ہوتے تھے۔ پالکی کے چاروں طرف خواجہ سرا اور ہیجڑے ہوتے تھے جن کے ہاتھوں میں بڑی عمدہ دھات کی چھڑیاں ہوتی تھیں۔ ان میں مور کے پر بھی لگے ہوتے تھے۔ پالکی بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی اور اس کے آگے آگے سقّے ہوتے تھے جو راستے کی گرد اور مٹی کو دبانے کے لیے پانی چھڑکتے رہتے تھے۔ پالکی کے اندر خوشبوئیں اور عطر بھی رکھے رہتے تھے۔ آگے آگے ایک دستہ مع خدمت گاروں کا بھی چلتا رہتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کی چھڑی ہوتی تھی اور وہ چلاتے رہتے تھے۔ "راستہ چھوڑو، ہٹو یہاں سے خبردار کوئی بیچ میں نہ آئے۔"

اِکے، تانگے، ٹم ٹم، وکٹوریا، رِگگ، لینڈو، سائیکلیں، موٹر کاریں اور ہوائی جہاز بہت بعد کی سواریاں ہیں۔

بہار کے میلے اور تہوار

دلی والے ہمیشہ سے سیلانی جیوڑے مشہور رہے ہیں۔ میلوں ٹھیلوں اور تیج تہواروں کے رسیا تھے ہفتے کے آٹھ دن اور نو میلے' دلی کی ایک پرانی کہاوت ہے۔ طرح طرح کے میلے اور تہوار سارا سال ہوتے رہتے تھے۔ قلعے میں بھی آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی تھی۔ کبھی نوروز، کبھی تورے بندی، کبھی رت جگا، کبھی سلونو اور کبھی پھول والوں کی سیر۔ دلی والوں کی طبیعت کی شگفتگی اور لاابالی پن مشہور تھا۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر مسلمانوں کو اپنی ایک آنکھ اور ہندوؤں کو دوسری سمجھتے تھے۔ انھوں نے مذہب کی بنا پر کبھی کسی سے کوئی امتیاز نہیں کیا۔ قلعے کے ملازموں میں ہندوؤں کی تعداد بھی کافی تھی اور بادشاہ اپنے ہندو ملازموں کی خوشی اور غم میں برابر شریک ہوتے تھے اور مدد کرتے تھے۔ دلی کے باشندے بھی اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتے تھے۔ ان دنوں یہ عام بات تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمان ہندو سنیاسیوں اور جوگیوں کا بڑا احترام کرتے تھے اور مغلیہ دور کی کئی ایسی تصویریں ملتی ہیں جن میں بادشاہ اور ان کے درباریوں کو ہندو سنتوں اور سادھوؤں کی صحبت میں دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے دلوں میں بھی مسلم پیروں اور صوفیوں کے لیے بے پناہ عزت تھی اور وہ ان کے مزاروں اور درگاہوں میں دعا مانگنے اور مرادیں حاصل کرنے کے لیے بڑی تعداد میں جاتے تھے۔



موسمِ گل

ہندو تہواروں کے موقعوں پر ہندو بچے مسجدوں کے مکتبوں کے استادوں کے لیے پھل اور مٹھائی وغیرہ لے کر جاتے تھے اور اپنے گھروں میں بھی بلاتے تھے۔ اسی طرح مسلمان بھی ہندوؤں کے تہواروں کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے تھے اور اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ وہ ہندو رسموں کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہدیں جس سے ان کی دل آزاری ہو۔ بادشاہ ہندوؤں کے بڑے تہواروں پر قلعے کے مثمن برج پر بیٹھ جاتے اور نیچے گزرتے ہوئے جلوس اور مجمع کو دیکھتے۔ ہر اہم تہوار خواہ وہ ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا قلعے میں بھی منایا جاتا اور بیگمات اور شہزادیاں بھی شریک ہوتیں۔
دلی کے تہوار اور میلے موسم کے اعتبار سے تین طرح کے تھے، موسمِ بہار کے، موسمِ برسات کے اور سرد موسم کے۔ موسم بہار کے مشہور تہوار اور میلے تھے ــــ بسنت، ہولی اور نوروز۔ ان کا الگ الگ رنگ اور مزہ ہوتا تھا۔ ذرا دیکھئے قدیم دلی میں یہ کیسے منائے جاتے تھے۔

بسنت

کڑاکے کا جاڑا ختم ہوا اور ہوا کی خنکی ٹوٹی کہ دلی والوں کو خمار آیا۔ کھیتوں میں سرسوں پھول رہی ہے۔ آم پر بور آنا شروع ہوگیا ہے۔ طبیعت میں شگفتگی، امنگ، ولولہ اور دل و دماغ میں تازگی پیدا ہونے لگی۔ یہ موسم بہار کی آمد ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی یہ تہوار صدیوں سے بڑی ہنسی خوشی سے منایا جاتا تھا۔ گیارھویں صدی کے شروع میں البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوستانی تیج تہواروں، ریت رسموں اور میلوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بسنت کے تہوار کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ اس موقعے پر عورتیں نفیس اور عمدہ کپڑے پہنتی ہیں اور زیورات سے لدی اپنے شوہروں سے بہترین تحفے ملنے کی انتظار کرتی رہتی ہیں۔ عظیم شاعر کالیداس، راجہ ہرش اور کوی بھان نے بھی اپنی کتابوں میں وسنت اتسو کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔ اس موقعے پر کلا کی دیوی سرسوتی اور محبت کے دیوتا مدن کا پوجن ہوتا تھا۔ ناچ گانے کی

محفلیں کی جاتی تھیں۔ دیوی دیوتاؤں کے مندروں میں ان کو رجھانے کے لیے بیز عبیر کلال اور سرسوں کے پھول کے گڑوے بنا کر گاتے بجاتے لے جاتے تھے اور بسنت کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔

پہلے اس میلے کا مسلمانوں میں دستور نہیں تھا لیکن حضرت امیر خسروؔ سے ان میں بھی اس کا رواج چل پڑا۔ ہوا یہ کہ آپ کے پیر و مرشد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کو جنھیں دلی والے سلطان جی کہتے تھے اپنے پیارے اور خوبصورت بھانجے مولانا تقی الدین نوح سے جو درحقیقت حسنِ صورت میں یکتا اور خلق و سیرت میں یگانہ تھے، حد درجے الفت اور محبت تھی۔ ساتھ ہی آپ کے بھانجے کو بھی آپ سے اس قدر انس تھا کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھ کر یہ دعا مانگتے تھے کہ الٰہی میری عمر بھی محبوب الٰہی یعنی سلطان جی کو دیدے تاکہ ان کا روحانی فیض عرصۂ دراز تک جاری رہے۔ خدا کی مرضی کہ بھانجے کی دعا قبول ہوئی اور وہ اٹھتی جوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حضرت نظام الدین اولیا کو اس قدر رنج والم ہوا کہ آپ نے یک لخت سماع کی محفل بند کر دی۔ اس بات کو چار پانچ مہینے گزر گئے۔ پھر بسنت رت آئی۔ حضرت امیر خسرو نے دیکھا کہ کھیت میں سرسوں پھول رہی ہے، ہندو گڑوے بنا بنا کر، ہنسی خوشی سے ناچتے گاتے کالکا جی کے مندر جا رہے ہیں۔ انہیں بھی خیال آیا کہ اس موقعے پر میں بھی اپنے پیر و مرشد کو خوش کروں۔ چنانچہ ان کے دل میں ایک خوشی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اسی وقت اپنی دستار کو کھول کر کچھ پیچ اِدھر اُدھر لٹکائے۔ ان میں سرسوں کے پھول الجھا کر یہ مصرعہ الاپتے ہوئے اس تالاب کی طرف چلے جدھر سلطان جی تشریف لے گئے تھے۔

اشک ریز آمدہ است ابر بہار

جہاں تک ان کے الاپ کی آواز پہنچتی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک عالم گونج رہا ہے۔ ایک تو امیر خسرو فنِ موسیقی کے استاد اور لاثانی سرود خواں تھے، دوسرے اس ذوق اور شوق نے ایک آگ بھڑکا دی تھی۔ اُدھر محبوبِ الٰہی کو خیال آیا کہ آج ہمارا ترک یعنی خسرو کہاں رہ گیا ہے۔ آپ نے دو تین جلیسوں کو انہیں لینے بھیجا مگر وہ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ عجب رنگ

سے گاتے ہوئے مستانہ چال سے جھومتے ہوئے آرہے ہیں۔ جلیسے بھی بے خود ہوکر وہیں کھڑے ہوگئے۔ ان کے لوٹ کر نہ آنے پر سلطان جی خود ہی خسرو کی خبر لانے روانہ ہوگئے۔ خسرو کو دور سے دیکھتے ہی اشکوں کے موتی نثار کر دئے۔ جس وقت خسرو کی نظران پر پڑی تو بے تاب ہوکر یہ شعر پڑھا۔

اشک ریز آمدہ ابرِ بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

دوسرے مصرعے کا سنا تھا کہ پیر و مرشد بے تاب ہوگئے۔ بس اسی وقت سے مسلمانوں نے بھی یہ میلہ اپنا لیا اور سلطان جی نے بھی محفلِ سماع پھر سے شروع کر دی۔

نواب درگاہ قلی خاں لکھتے ہیں کہ دلّی میں بسنت کا میلہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے سب میلوں سے نرالا ہوتا ہے۔ بسنت کے مہینے کی پہلی تاریخ کو تمام دلی والے قدم شریف پر گلدستے اور مٹھائی چڑھاتے ہیں۔ گلاب پاش سے عرقِ گلاب عرقِ بید مشک اور عطریات اور کیوڑہ چھڑکتے ہیں۔ جب قدم شریف پر میلہ اپنے شباب پر ہوتا ہے تو منظر میں عجیب نکھار اور دل آویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف حسینوں کے جمگھٹ، قوالوں کا شور، مطربوں کا رقص و سرود، نقالوں کی نقل بازیاں، ایک ایسا سماں ہوتا ہے جس کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔

دوسرے دن تمام دلی والے حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر حاضری دیتے تھے اور راستے میں چراغ دلی کے مزار پر چراغاں کرتے اور فاتحہ پڑھتے تھے۔ تیسرے روز حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی کی درگاہ پر مجلس سماع ہوتی تھی۔ چوتھے دن حضرت شاہ حسن رسول نما کے مزار پر بسنت ہوتی تھی۔ دن بھر سیر تفریح اور رنگ رلیاں منائی جاتیں پانچویں دن حضرت شاہ ترکمان کے مزار پر میلہ بھرتا تھا۔ یہاں بھی حسینوں اور مہ جبینوں کا ایک نظر فریب جمگھٹا ہوتا تھا۔ چھٹے روز امرا اور شہر کے معزز لوگ بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور بسنت کی مبارکباد پیش کرتے تھے۔ ساتویں دن، رات کے وقت، رنگین مزاج لوگ حضرت عزیزی کی قبر پر جاتے تھے جو احدی پورہ میں تھی۔ رات بھر شراب

کا دور چلتا تھا اور ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔ غرضیکہ دلی کے مسلمان اس دور میں ایک ہفتے تک بسنت کا میلہ اور تہوار مناتے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ بسنت کے میلے کی دھوم بڑھتی رہی۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ تہوار بن گیا تھا۔ درگاہوں پر چادریں چڑھنے لگیں۔ آج بھولو شاہ کی بسنت ہے تو کل ہرے بھرے کی۔ حضرت سرمد کے مزار پر اور سوئی والان کے محلے میں بھی بسنت کا میلہ بھرنے لگا۔ قوالوں اور گویوں نے بھی اپنے استادوں بلکہ اپنے بزرگوں کے مزاروں پر بھی بسنت چڑھانی شروع کر دی۔ سب لوگ بسنتی رنگ کے کپڑے پہن کر میلوں میں شریک ہوتے تھے۔ مندروں میں ہندو کیسر کا بھوگ لگاتے۔ بسنت راگ رنگ کا تہوار تھا اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا یہ خیال بہت مقبول تھا۔

سکل بن پھول رہی سرسوں

اور مرزا غالب کی یہ غزل تو بچے بچے کی زبان پر تھی۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

بسنت کی رت پر بہادر شاہ ظفر کے آخری جشن کی داستان بھی بے موقع نہ ہوگی موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ خنکی کم ہوگئی تھی اور دلی والے حسب دستور بسنت کے میلے زور شور سے منا رہے تھے۔ جب لوگوں نے بہادر شاہ ظفر کی سالگرہ کا ڈھنڈورا سنا تو خوشی سے اچھل پڑے۔ جمعرات کا دن تھا۔ خلقت ایسی اُمڈی کہ قلعے کے میدان میں اور جمنا کے کنارے پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مکانوں کے پردے، عورتوں کی چادریں، مردوں کی پگڑیاں، بچوں کے کپڑے سب بسنتی تھے۔ قلعے کے نیچے کھائی میں جو قندیلیں لگائی گئی تھیں وہ بھی بسنتی تھیں۔ گویا کونے کونے میں اور چپے چپے پر بسنت پھول رہی تھی۔ شہزادوں نے قلعے میں، دکانداروں نے میدان میں، تیراکوں نے راج گھاٹ پر اور قوالوں نے شاہ بڑے پر ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اندر اور باہر، دریا پر اور خشکی پر، رات بھر ناچ گانا ہوتا رہا۔ بسنتی کاغذوں کے سینکڑوں قدِ آدم غبارے روشن کر کے چھوڑے جا رہے

تھے۔ چار بجے تک سارا آسمان بھی بسنتی ہو گیا اور معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کی آنکھوں میں بھی سرسوں پھول رہی تھی۔ بادشاہ تشریف لائے۔ آگے آگے جشنیوں کا دستہ، اس کے بعد اردابیگنی، محافظ بیچ میں، بادشاہ سلامت کے پیچھے بلّم لیے ہوئے۔ حضرت تخت پر رونق افروز ہوئے۔ چوبدار نے آواز لگائی۔

"ادب' نگاہ روبرو"

نذریں پیش ہوئیں، پہلے شہزادوں نے، پھر امرا اور اس کے بعد رعیت نے نذریں گزاریں۔ گیارہ بجے رات کو دربار ختم ہوا۔

ہولی

ہولی کا تہوار ہندوؤں کا بڑا قدیم تہوار ہے۔ اس تہوار میں ذات پات کی تفریق نہیں ہوتی اور اس موقعے پر پرانی دشمنی بھی دوستی میں بدل جاتی ہے۔ عورت مرد سب مل کر اس تہوار کو مناتے آئے ہیں۔ مندروں میں بنی تصویروں اور پرانی چترکلاؤں میں عورتوں کو مردوں کے بیچ ہولی کھیلتے دکھایا گیا ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد، بادشاہ سے لے کر فقیر تک، سب نے اس متبرک تہوار کو بڑی دھوم دھام منایا اور آپس میں مل کر ہولی کھیلی۔

ہولی کیا آتی ہے، دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ ہولی کا تہوار ملن کا تہوار ہے، دوستوں کے میل ملاپ کا تہوار۔ بدلتے ہوئے موسم کی بہار، نئی امنگوں سے بھرپور مستی، سب کچھ خمار آلود سا لگتا ہے۔ ہولی کے پرانے رنگ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ موسم بدلا، ہوا کی خنکی ٹوٹی اور جاڑا بھاگا۔ بسنت پنچمی کے آتے ہی لوگوں کے ہاتھ میں گلال آجاتا اور ہولی شروع ہو جاتی۔ اِدھر دیوی دیوتاؤں پر سرسوں کے پھول چڑھتے، اُدھر بسر عبیر گلال ہوا میں اڑنے لگتا۔ ہولی کے رسیا ڈھاک اور ٹیسو کے پھولوں کو پانی سے بھرے مٹکوں میں بھر دیتے۔ ہولی کے متوالے مست قلندر بنے گلی گلی، کوچے کوچے گھومتے پھرتے تھے۔ سارنگی، دف، مجیرے اور چنگ کی تال پر بے حال ہو کر تان اڑاتے۔

تیرے بھولے نے پی لی بھنگ
کون جتن ہولی کھیلیں

کوئی اونچی رسیلی تان میں گا رہا ہے — میں کیسے ہولی کھیلوں رے سانوریا کے سنگ۔ کچھ ٹولیاں ایسی بھی ہوتیں جن کے پاس دف، منجیرے نہ ہوتے تو ٹوٹے کنستر اور پھوٹی ہنڈیاں بجا کر ہولی کے راگ الاپتے سنائی دیتے۔ شاہی قلعے میں ہولی کا تہوار بھی عید کی مانند بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ لال قلعے کے پیچھے جمنا کے کنارے میلے لگتے تھے۔ شاہ بڑے سے لے کر راج گھاٹ تک بڑی بھیڑ اکٹھی ہو جاتی۔ دف، جھانجیں اور نفیری بج رہی ہے۔ جگہ جگہ طائفے ناچ رہے ہیں۔ سوانگ بھرنے والوں کی منڈلیاں قلعے کے نیچے آتیں اور طرح طرح کی نقلیں اور تماشے دکھاتیں۔ سوانگ بھرنے والے بادشاہ اور شہزادوں شہزادیوں پر بھی چوٹ کرتے مگر کوئی برا نہیں مناتا۔ بیگمیں، شہزادیاں اور امیرزادیاں جھروکوں میں بیٹھ کر تماشہ دیکھتیں۔ بادشاہ، انعام اکرام دیتے۔ رات کو قلعے میں ہولی کا جشن منایا جاتا تھا۔ رات رات بھر گانا بجانا ہوتا تھا۔ بڑی بڑی نامی طوائفیں دور دور سے بلائی جاتی تھیں۔ ظفر کی کہی ہوئی "ہوریاں" بہت شوق سے گائی جاتیں۔

شہر میں امیروں اور رئیسوں کی حویلیوں کی ڈیوڑھیوں اور چھجوں کے نیچے لوگوں کی ٹولیاں اکٹھی ہو جاتیں۔ یہ 'کُفر کچہریاں' کہلاتی تھیں۔ جو جس کے منہ میں آتا بکتا۔ امیروں پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ کسی کے کہے کا کوئی برا نہ مانتا۔ بیچ بیچ میں بولتے رہتے— "آج ہمارے ہولی ہے، ہولی ہے بھئی ہولی ہے۔" اسی طرح دل لگی ہوتی رہتی اور سارا دن ہنسی خوشی میں گذر جاتا۔ دُلہنڈی کے دن بیگم جہاں آرا کے باغ (گاندھی گراؤنڈ) میں دھوم دھام سے میلہ لگتا۔ کیا بڑے، کیا بچے، سب ہی بڑھیا، اجلے کپڑے پہن کر جاتے، چاٹ والوں سودے والوں اور کھلونے والوں کی چاندی ہو جاتی۔

ہولی کے متوالے اپنی دھن میں سوار انوکھی سج دھج سے نکلتے اور راس کرنے والوں کی نقلیں اور ہنسی اڑاتے۔ کسی لمڈے نے کسی صاحب کی پھٹی ٹائی اور پھٹا پرانا کوٹ پہن رکھا ہے تو کوئی کالا کلوٹا لونڈا چوہیا میم بنا ہوا ہے اور "گٹ پٹ" کر رہا

ہے۔ ایک دوسرے سے چھیڑ خانی ہو رہی ہے اور ہولیاں گائی جا رہی ہیں۔ کوئی نیا آدمی اِدھر کو آنکلتا تو اس پر "ہولی کا بھڑوا ہے" کہہ کر ٹوٹ پڑتے اور چشم ذدن میں اسے اوپر سے نیچے تک گلال اور رنگ میں پوت دیتے۔ شہر کے سبھی چھوٹے بڑے لوگوں میں جوش بھرا ہوتا۔ دھوبی ہے تو گھاٹ پر پانی میں چھوا چھو کرتے ہوئے ٹھٹھولیاں کر رہا ہے۔ حلوائی بھنگ اور معجون کی مٹھائیاں اپنے لگے باندھے گاہکوں کو کھلا کر ان کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ بازار میں آنے جانے والے لوگ بھی لطف لے رہے ہیں۔ ہولی کے دن گلی کے بڑے بوڑھے بھی سینگ کٹا کر بچوں میں مل جاتے۔ بچوں کو اکٹھا کر کے انہیں نئی نئی باتیں سکھاتے اور بہکا کر ایک طرف تماشہ دیکھنے کھڑے ہو جاتے۔ ہولی کے موقعے پر لڑکوں کی تو کچھ نہ پوچھیے' چھیڑ چھاڑ کا نیا گر ہاتھ آیا نہیں اور اسے فوراً آزمایا نہیں پتیل' ٹین اور بانس کی پچکاریوں سے پورے طور پر لیس رہتے۔ رنگ اول تو ساتھ ہوتا ورنہ راستے میں جس کی دکان یا مکان پر نظر آیا بھر لیا۔ لڑکے کیا تھے آفت کے پرکالے تھے۔

گلال سے بھرے چیتھڑے یا کانچ کی گیند کی مانند قمقموں کو ایک دوسرے کو ہر وقت مارتے رہتے۔ راستہ چلنے والوں کو اچھا خاصہ بدھو بنا دیتے۔ سڑک کے بیچوں بیچ چاندی کا چمکتا سکّہ اس طرح چپکا دیتے کہ آنے جانے والوں کی نظر اس سکے پر ضرور پڑتی۔ اگر کوئی راہ چلتا بھولے سے بھی یا لالچ میں آکر اس سکّے کو اٹھانے کے لیے جھکتا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ آڑ میں چھپے لڑکے اس بے چارے کو آن گھیرتے اور بے ایمان اور چور ٹھہراتے اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتے جب تک کہ وہ انہیں حلوائی کی دکان سے حلوہ پوری کا ناشتہ نہ کرا دیتا!

کوئی صاحب انگرکھا پہنے' دوپلی سر پر جمائے گھر سے باہر نکل کر کنارے کنارے سڑک پر چل رہے ہوتے تو دھر اوپر کوئی شرارتی لڑکا مچھلی کا کانٹا لگا دیتا اور جیسے ہی وہ صاحب اس کے نیچے سے گزرتے وہ کانٹا لٹکا کر ان کی دوپلی اوپر کھینچ لیتا۔ اب وہ صاحب ہیں کہ ٹوپی پکڑنے کے لیے اچھل رہے ہیں مگر وہ لڑکا کبھی ٹوپی کو بالکل نیچے لٹکا دیتا اور یہ پکڑنا چاہتے تو کوئیں کے ڈول کی طرح اوپر کھینچ لیتا۔ جب تک بہت منت سماجت نہیں کر لی

جاتی یا بڑے بیچ میں نہ پڑتے، ٹوپی واپس نہ کی جاتی۔ اکثر اوقات کچھ کھا پی کر ہی ٹوپی واپس کی جاتی۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کا تماشہ بھی دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ بڑے کچے آلو یا موٹی گاجر کو کاٹ کر اس پر چاقو سے الٹے حروف کھود لیتے اور ان کے ٹھپّے بنا لیتے۔ پھر اس پر سیاہی لگاتے اور ہاتھوں میں چھپائے پھرتے۔ موقع ملتے ہی کسی کی پیٹھ پر مار دیتے تو اس کے کرتے پر سیدھے حروف چھپ جاتے۔ ان ٹھپوں میں سے کسی پر ۴۲۰ کھدا ہوتا، کسی پر "الّو" اور کسی پر کوئی ایک دو لفظ والی گالی۔ جس کسی کے یہ ٹھپہ لگتا تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا کیونکہ دوسرے بھی اسے وہی کہہ کر بلاتے مگر شیطان کی فوج، یہ بچے، خوب مزہ لیتے اور اس کے پیچھے چل چل کر اسے چار سو بیس یا الّو یا جو کچھ بھی کھدا ہوتا، کہتے رہتے۔

ہولی کے دن تو یوں بھی غل غپاڑے اور رنگ رلیوں میں گزر جاتے لیکن رات کو جگہ جگہ محفل لگتی۔ سیٹھ ساہوکار، امیر غریب سب چندہ جمع کرتے اور دعوتوں، محفلوں اور مشیبوں کے لیے بڑی بڑی حویلیوں کے آنگنوں کو یا دھرم شالاؤں کے صحنوں کو خوب سجایا جاتا۔ ان محفلوں میں ہندو مسلمان سب شامل ہوتے اور سب مل کر کام کرتے۔ ایسے آنگنوں اور صحنوں میں چاندنی کا فرش بچھایا جاتا اور گاؤ تکیئے قرینے سے رکھ دئے جاتے تھے۔ عطر دان، خاص دان، پاندان اور پیچواں بھی رکھے رہتے تھے۔ چھتوں پر کھانے کے لیے پنگتیں بٹھا دی جاتیں۔ پتلوں میں میوہ، مٹھائی، ساگ سبزی، پوری کچوری، حلوہ، پاپڑ اور دیگر چیزیں رکھ کر سب کو کھلایا جاتا۔ دعوت کے بعد سب پھر نیچے صحن میں آتے۔ اب حقہ تھام لیا جاتا اور گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھ جاتے۔ اب لیجئے بائی صاحبہ بھی آ پہنچیں۔ ان کا سب کو انتظار تھا۔ ساری رات محفلِ رقص و موسیقی گرم رہتی۔ خیال، ٹھمری، دادرا، اور غزلیں گائی جاتیں۔ جب 'ہوریاں' گائی جاتیں تو ایک عجیب سماں بندھ جاتا۔

گلیوں، محلوں اور چوکوں میں رنگ کھیلنے سے ایک دن پہلے ہولی بھی جلائی جاتی تھی۔ اس کے لیے بھی چندہ ہوتا تھا مگر لڑکے بالے ٹولیوں میں گھوم پھر کر اور گھر گھر جا کر پیسے، لکڑی اور اپلے بھی اکٹھے کرتے تھے۔ کچھ نہ کچھ لیے بغیر نہیں ٹلتے تھے۔ کوئی آنا کانی کرتا تھا تو اس کی

دہلیز میں پڑی لکڑی کی کوئی بھی ٹوٹی پھوٹی یا ثابت چیز اٹھا کر بھاگ لیتے۔ یہ چیزیں ہفتوں پہلے اکٹھی کرنا شروع کر دیتے تھے اور کسی کی چھت پر یا کسی دوسری محفوظ جگہ پر رکھے جاتے تھے۔

سراج الاخبار کی تیسویں جلد میں بھی ہولی کی تقریبات کا بڑا عمدہ بیان ہے۔ اس کے مطابق بادشاہ خود بھی ہندو مسلم امرا کے ساتھ جھروکوں میں بیٹھتے اور شہر میں جتنے بھی سوانگ بھرے جاتے، سب جھروکوں کے نیچے سے ہو کر گزرتے اور انعام پاتے۔ بادشاہی طائفے بھی ہولی کھیلتے۔ بادشاہ کے حضور میں پوری ہولی کھیلی جاتی تھی اور تخت کے کہاروں کو اس موقعے پر ایک ایک اشرفی انعام کے طور پر ملتی تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دلی میں ہولی قدیم زمانے میں ہندو اور مسلمان مل کر مناتے تھے۔ مغل بادشاہ اور مسلم امرا اور نواب بھی ہولی کی تقریبات میں پورا حصّہ لیتے تھے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تو اپنی رعایا کے ساتھ بڑے شوق اور جوش سے ہولی کھیلتے تھے۔ ان کا یہ ہولی کا گیت ان کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔

کیوں موپہ ماری رنگ کی پچکاری
دیکھو کنور جی دوں گی گاری
بھاج سکوں میں کیسے موسوں بھاجا نہیں جات
ٹھاڑے اب دیکھوں میں کون جو دن رات
شوخ رنگ ایسی ڈھیٹ لنگرے کون کھیلے ہوری
مکھ بندے اور ہاتھ مرورے کرکے وہ برجوری

نوروز

نوروز یا نیا دن پارسیوں کا ہزاروں سال پرانا اور متبرک تہوار ہے۔ قدیم دلی میں پارسیوں کی آبادی تو زیادہ نہیں تھی مگر دلی کے مشہور تہواروں میں اس کا شمار اس لیے ہوتا تھا کیونکہ اسے مغل بھی مناتے تھے۔ دراصل نوروز مغلوں کے عہد کا سب سے بڑا

قومی تہوار تھا۔ یہ بھی موسم بہار کا تہوار تھا اور پہلی فروردین (فارسی سال کا پہلا مہینہ۔ ۲۰ یا ۲۱ مارچ) کو پڑتا تھا۔ اس تہوار سے ہندوستان میں بہار کی آمد مقصود ہے۔ ایران کا بھی یہ سب سے بڑا قومی تہوار ہے اور وہاں بھی اسے موسم گل اور بہار کا تہوار سمجھا جاتا ہے جو دلوں میں جوش اور امنگ اور نئی امیدیں پیدا کرتا ہے۔ بسنت اور ہولی کی طرح یہ تہوار بھی خوشیوں اور مسرتوں کا تہوار ہے۔ مغل یہ تہوار اُنیس دن تک مناتے تھے (پہلی فروردین انیس فروردین تک) جب کہ ایران میں اسے بارہ دن تک مناتے تھے۔ پہلا اور آخری دن بہت مبارک سمجھے جاتے تھے اور ان دونوں دنوں پر روپے پیسے اور مختلف چیزیں تحفوں کے طور پر دی جاتی تھیں۔

نوروز خوشیوں اور مسرتوں کا تہوار ہے اور موسم بہار کی پہلی فصل کٹنے پر منایا جاتا ہے۔ اس میں ہولی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اناج کی ہری اور نرم بالیاں، ایک کٹورہ دودھ کا اور کچھ پکا کھانا الگ رکھ دیا جاتا ہے اور یہ حیات کے چار عناصر کی ترجمانی کرتے ہیں آگ کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو افرغان میں مقدس آتش کی یا تیل اور گھی کے کسی دئے میں شعلے کی ہوتی ہے۔ اس روز لوگ عبادت کرتے تھے اور گھروں میں طرح طرح کے کھانے بنتے تھے۔ اس کائنات میں ہر جاندار کے لیے دعا کی جاتی اور گائے کو تمام دھرتی کی ماں جانا جاتا۔

نوروز کی خوشی میں پارسی عورتیں، مرد اور بچے اور بوڑھے بہت سویرے سے گھر کی سجاوٹ میں مصروف ہو جاتے تھے۔ پارسی عورتیں گھر کے دروازے کو چندن اور رولی سے سجاتی تھیں۔ تازہ پھولوں اور آم کے پتّوں کی تورن سے دروازے کی چوکھٹ سجائی جاتی تھی۔ سب لوگ بڑھیا اور نفیس اجلے کپڑے پہن کر اگنی مندر یا آتش کدے جاتے تھے۔ آتش کدے کے بیچوں بیچ افرغان میں تیز آنچ کی لپٹیں اٹھتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہاں سے لوٹنے پر دوستوں اور رشتے داروں کا ایک دوسرے کے گھر جانے کا تانتا لگ جاتا تھا۔ جب وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے تو "ہمہ زور" کہتے تھے۔ بھول چوک کی معافی مانگتے تھے، گلے شکوے مٹنے کے بعد بڑی پرتکلف دعوتیں ہوتی تھیں۔ اس روز کے کھانے میں

دہی، سویاں، مچھلی، دال بھات اور روٹے کی کوئی چیز ضرور بنتی تھی۔

قلعے میں اور امرا کی حویلیوں میں جشنِ نوروز بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا پر تکلف ضیافتیں کی جاتیں اور ایک دوسرے کو قیمتی تحفے دئے جاتے۔ بادشاہ کو نذریں پیش ہوتی اور بادشاہ خود بھی بیگمات اور شہزادے شہزادیوں اور امرا، کو اس خوشی کے موقعے پر تحفے دیتے۔ قلعے میں رقص و سرود کی محفل بھی ہوتی جس میں مشہور طوائفیں اور موسیقار اپنے فن کا کمال دکھاتے۔ ہنسی خوشی کی یہ تقریبات کسی نہ کسی شکل میں کئی دنوں تک ہوتی رہتیں۔

آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ نوروز ایک عالم افروز دن ہے اور ایشیا کے ہر ملک اور قوم کے لوگ اسے عید مانتے ہیں۔ چونکہ ہندو بھی آگ اور سورج کو پوجتے ہیں اور ان کے راجاؤں کو کئی بڑی کامیابیاں نوروز کے دن ہی ہوئیں اور چونکہ اکبر کا تعلق ہندو راجاؤں سے بہت تھا اس لیے وہ بھی نوروز بڑی شان و شوکت سے مناتا تھا۔ دیوانِ عام و خاص کے گرد ۱۲۰ عالیشان ایوان تھے۔ ایک ایک ایوان ایک ایک امیر کے سپرد ہو جاتا کہ وہ اسے آراستہ کرے۔ جب یہ دیوان سج جاتے تو ان میں موسیقی کی محفلیں لگتیں۔ فرنگی بھی مبارکباد کی موسیقی پیش کرتے۔ نوروز سے لے کر اٹھارہ دن تک ہر ایک امیر اپنے ایوان میں ضیافت کرتا۔ بادشاہ حضور رونق افروز ہوتے اور امرا نذریں گزارتے۔ ہزار دو ہزار کی تعداد میں کشمیری، ایرانی، تورانی اور ہندوستانی موسیقار، طوائفیں ڈومنیاں اور کنچنیاں جمع ہو جاتیں اور جدھر دیکھو راجہ اندر کا اکھاڑا نظر آتا۔ روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت میں ایک سہاگن بی بی اپنے ہاتھ سے دال دلتی، اسے گنگا جل میں بھگوتی اور پٹھی پیس کر رکھتی۔ جشن کی ساعت قریب آتی تو بادشاہ غسل کے لیے جاتے۔ رنگین جوڑا، ساعت اور ستاروں کے موافق حاضر کیا جاتا۔ بادشاہ جامہ پہنتے، کھڑکی دار پگڑی راجپوتی انداز سے باندھتے مکٹ سر پر رکھتے، کچھ اپنا خاندانی اور کچھ ہندوانی گہنا پہنتے۔ جشن کی ساعت آتی۔ برہمن ماتھے پر ٹیکہ لگاتا اور جواہر کنگن ہاتھ میں باندھتا۔ کوئلے دہک رہے ہیں، خوشبوئیں تیار ہیں۔ ادھر ہون ہونے لگا۔ بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا اور نقارہ

دولت پر چوٹ پڑی۔ نوبت خانے میں نوبت بجنے لگی۔ خوانوں اور کشتیوں پر سونے چاندی کے روپے، بادام اور پستے وغیرہ جواہر، اشرفیاں اور پھل وغیرہ لیے امرا کھڑے ہیں اور ایسے نچھاور کر رہے ہیں جیسے اولے برس رہے ہوں۔ چاروں طرف کھنک کھنک کی آوازیں آ رہی ہیں۔

تمام دربار قدرتِ الٰہی کا مرقع تھا۔ راجاؤں کے راجہ مہاراجہ اور بڑے بڑے ٹھاکر جو فلک کے سامنے بھی سر نہ جھکائیں، ایرانی، تورانی سردار، جو رستم اور اسفند یار کو بھی خاطر میں نہ لائیں، طاقت اور شان کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ خاص شہزادوں کے سوا کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ پہلے شہزادوں نے اور پھر امرا نے کورنش بجا لا کر نذریں پیش کیں۔ ملک الشعرا نے سامنے آ کر مبارک باد کا قصیدہ پڑھا۔ خلعت اور انعام پایا۔

تلادان

برس میں دو دفعہ تلادان ہوتا تھا، ایک نوروز کے موقعے پر اور دوسرا جشن ولادت پر۔ نوروز کے موقعے پر سونے کی ترازو کھڑی ہوتی۔ بادشاہ بارہ اجناس میں تلتے تھے۔ سونا، چاندی، ابریشم، خوشبوئیات، لوہا، تانبا، جست، توتیا، گھی، دودھ، چاول اور ست نجا۔ جشن ولادت قمری حساب سے پانچ رجب کو ہوتا تھا۔ اس میں چاندی، قلعی، کپڑا، بارہ میوے، شیرینی، تلوں کا تیل اور سبزی میوہ ہوتا تھا۔ تلادان کی چیزیں برہمنوں، عام فقیروں اور غریبوں میں بانٹ دی جاتی تھیں۔



عید مبارک !

میٹھی عید، سلونی عید

عید میل ملاپ اور مسرّتوں کا بڑا ہی خوشگوار تہوار ہے۔ عید کے دن سب گلے شکوے مٹ جاتے ہیں اور پرانی دشمنی بھی دوستی میں بدل جاتی ہے۔ عید ہمیشہ بڑی شان و شوکت سے منائی جاتی رہی ہے اور دلی میں تو اس کی رونق نرالی اور قابلِ دید ہوتی تھی۔ دلی والے رمضان شریف کی تیاریاں شبِ برات سے ہی شروع کر دیتے تھے۔ یہ مہینہ عبادتوں اور برکتوں کا مہینہ ہوتا ہے۔ جہاں مسلمانوں نے رمضان کا چاند دیکھا، شریف اور پاکباز بن گئے۔ پرانے دنوں میں روزہ نہ رکھنے والے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس کے پاس بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بیشتر لوگ پورے روزے رکھتے، نماز قضا نہ کرتے اور حتی المقدور خیر خیرات کرتے۔ بہت سے لوگ رمضان کے مہینے میں داڑھی بھی نہ بنواتے۔

مسلمان رمضان کے مہینے کا احترام اس شدت سے کرتے تھے کہ بازاروں میں بھی کھانے پینے کی چیزیں تیسرے پہر سے پہلے نہ ملتیں۔ کسی گھر میں چولہا نہ جلتا۔ چھوٹے بچوں کو سحری کا ہی بچا کھچا چپکے سے کھلا دیا جاتا۔ پھیری اور خوانچے والے بھی دوپہر کے بعد ہی محلّوں اور گلیوں میں آنا شروع کرتے تھے۔

دلی کے مسلمان جاڑے کے روزوں کو تو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ انہیں مزہ گرمیوں کے روزوں میں آتا تھا۔ مئی جون کی گرمیاں یوں بھی مانی ہوئی ہے۔ دس بجے کے بعد سے ہی

آگ برسنے لگتی۔ ساری دوپہر شدت کی لو چلتی اور زمین سے بھبکے اٹھتے۔ روزے والے گرمی کی شدت کی وجہ سے اپنے کام سے جلد واپس آجاتے اور گھر پرآ کر پڑ رہتے۔ اگر خس کی کوئی ٹٹی لگی ہے تو اسے پانی انڈیل انڈیل کر تر کرتے رہتے۔ کھرّی چارپائیوں کو بھی بھگوتے اور تر بان پر پڑے رہتے۔ شاید گھڑی دو گھڑی آنکھ لگ جاتی۔ عصر کے وقت اٹھ جاتے اور غسل کر کے روزے بہلانے کے لیے چوک پر آجاتے۔ روزہ کھلنے میں جب تھوڑی دیر رہ جاتی تو لونگ چڑے، قلمی بڑے، دہی بڑے اور برف وغیرہ لے کر گھر پہنچتے۔ پیاس کے مارے سب کے ہونٹوں پر پپڑی جمی ہے اور برا حال ہے مگر مجال ہے کہ کوئی بھی شکایت زبان پر لے آئے۔ گھر پر روزہ کھولنے کے لیے دسترخوان بچھ گیا ہے۔ سب ٹھنڈی ٹھنڈی چیزیں ہیں۔ شربت سے بھرا جگ بھی دھرا ہے اور اس میں ڈھیر ساری برف ڈلی ہوئی ہے۔ اتنے میں گولہ چلا اور سب نے کھجور سے روزہ کھولا، افطاری کھائی اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز کے بعد کھانا کھایا اور سب مزے مزے کی باتیں کرنے لگے۔

روزوں کے بارے میں دلّی کی ایک کہاوت ہے کہ دس رواں، دس دواں، دس پراں۔ دنوں کے گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ الوداع کا جمعہ آگیا اور لوگ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ٹڈی دل کی طرح جامع مسجد کے اندر، باہر اور آس پاس کی خالی جگہوں پر چھاگئے۔ زیادہ تر لوگ دلی کے آس پاس کے دیہات سے آئے ہیں جو جمعۃ الوداع کو بھی عید کی ہی طرح بڑا تہوار سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ روزے سے بے خبر خوب کھا پی رہے ہیں۔ الوداع کے دن حلیم کھانا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ سخت دھوپ میں روزہ دار نہایت صبر سے بیٹھے رہتے ہیں اور گیلا کپڑا بار بار سر پر ڈالتے ہیں۔ اس دن کا روزہ سب روزوں سے سخت ہوتا ہے۔

چاند رات آگئی۔ انتیس روزے ہو چکے ہیں۔ اب پس و پیش یہ ہے کہ انتیس کا چاند ہوتا ہے یا تیس کا۔ اُدھر قلعے سے اٹھائیسویں روزے کو سحری کے بعد بیس سانڈنی سوار دہلی کے چاروں طرف روانہ کر دیے جاتے تھے جو آٹھ آٹھ نو نو منزل پر پڑاؤ کرتے تھے۔

انتیسویں روزے کی شام کو جو سانڈنی سوار چاند کے نظر آنے کی خبر پہلے لاتا اسے پانچ اشرفیاں اور ایک جوڑا انعام میں ملتا۔ چاند نظر آنے پر قلعے میں سب ایک دوسرے کو سلام کرتے۔ لاہوری دروازے سے توپیں چھوٹتیں۔ چاروں طرف خوشی کا شور مچ جاتا "چاند ہوگیا، چاند ہوگیا" آسمان پر بھی پورا ہلال اب آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ بچے مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے اور بڑے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے۔ فتح پوری کی مسجد سے دھونسا پھر بجتا۔ جامع مسجد پر گولے چھوٹتے۔ سارا شہر جان جاتا کہ چاند ہوگیا۔ قلعے میں نوبت خانے سے نگاڑا مسلسل بج رہا ہے۔ راتوں رات ڈیرے، خیمے، فرش وغیرہ قلعے سے عیدگاہ بھیج دئے جاتے۔ سواری کے لیے ہاتھی سجتے۔ صبح کو بادشاہ کا جلوس عیدگاہ کی طرف روانہ ہوتا۔ عیدگاہ میں خطبہ ختم ہونے پر توپ داغی جاتی اور بادشاہ کا جلوس قلعے میں واپس آتا۔ دربار ہوتا اور بادشاہ کو نذریں پیش کی جاتیں۔ شاعر قصیدے سناتے اور ہر امیر اور غریب کو انعام اور بخشش عطا ہوتی۔ اس تقریب میں ہندو امرا برابر شریک ہوتے۔

عید کی خوشیاں منجھلے روزے سے ہی شروع ہوجاتی تھیں۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق امیر غریب سب تیاریاں کرتے تھے۔ گھر میں سفیدی کرائی جاتی تھی۔ کمرے، انگنائیاں، دالان، دریچے دھلتے تھے۔ گھر میں سب کے کپڑے سلتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں آتی تھیں۔ بچوں کے لیے "بچگانہ" جوتے نمبروں کے حساب سے خریدے جاتے تھے۔ سویاں ٹوٹتی تھیں۔ سب بڑے چھوٹوں کے دل میں یہ بات جاگزیں تھی کہ عید مسلمانوں میں خوشی کا وہ دن ہے جس کی برابری کوئی دوسرا دن نہیں کرسکتا۔ شاید ہی کوئی ایسا منحوس گھر ہوتا ہو جہاں سے عید کے دن مسرت بھری آوازیں نہ آتی ہوں۔ بچوں کی خوشی تو ناقابل بیان ہوتی تھی۔ اپنے جوتے بغل میں لیے اچھل رہے ہیں۔ رات کو بھی انہیں اپنے بستر پر اپنے ساتھ رکھ کر سوئے ہیں۔ لڑکیاں اپنے گوٹے کناری کے کپڑے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی ہیں۔ بھوک پیاس سب کی اڑ گئی۔ بچی کا مہندی لگا ہاتھ ہے، جوں توں کرکے دو نوالے کھائے اور پھر مہندی کی رکابی اٹھا لائی۔ جو بچے سرِ شام سو جاتے تھے،

کہیں گیارہ بجے بچھونوں پر لیٹے اور سوئے۔ بچے سوئے تو عورتوں نے صبح کی اہم ضرورتوں کو پورا کرنے کی سوچی۔ پہلے بچوں کے کپڑے ٹھیک ٹھاک لگا کر رکھے، پھر بچوں کے ابا کی ضرورتوں کی طرف لگ گئیں۔ اس سے فرصت پائی تو سوّیاں، چھوہارے اور کھانڈ نکال کر رکھ لی تاکہ صبح کوئی دقّت نہ ہو۔

گھر کی عورتیں شاید ہی گھڑی دو گھڑی سوئی ہونگی کہ اذان ہوگئی۔ اٹھیں اور سویوں کا پانی چڑھا دیا۔ اُدھر نماز فجر ختم ہوئی، ادھر سویاں تیار ہوگئیں۔ پھر گھر کی جھاڑو بہاری ہوئی، ہر چیز کو صاف کر کے قرینے سے رکھا۔ پلنگوں کی چادریں بدلیں، نیا فرش بچھایا۔ بچے اور ابّا بھی عید کی خوشی میں صبح ہی اٹھ گئے تھے اور سارے گھر میں خوشی کا ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ سویوں اور شیر خرمے کا ناشتہ کر کے مردوں نے بچوں کو ساتھ لیا اور عیدگاہ کا رُخ کیا۔ یکّوں میں، تانگوں میں اور دوسری سواریوں میں چاروں کھونٹوں سے لوگ عید گاہ کی طرف جارہے ہیں۔ راستے کے دونوں طرف فقیروں اور کنگلوں کی لنگتار ہے۔ سواریوں کے پیچھے خُمریاں بھاگ رہی ہیں اور ہانپ ہانپ کر کہہ رہی ہیں۔

اللہ خیریں ہی خیریں رہیں گی
تیرے بٹوے میں پیسہ دھرا ہے
دے جا اللہ کے نام پر دے جا
اللہ تیرا بھلا کرے گا

جب تک پیسہ دو پیسہ ان کی طرف پھینکا نہ جاتا، یہ پیچھا نہ چھوڑتیں۔

عیدگاہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ عید گاہ تو کبھی کی بھر چکی۔ عید گاہ کے باہر بھی جہاں تک نظر جاتی ہے آدمی ہی آدمی ہے۔ دلی کے مسلمان تو تھے ہی مگر ہزاروں آدمی نزدیک کے علاقوں کے بھی تھے جو جمعۃ الوداع کے بعد ٹھہر گئے تھے۔ مسجد کے اندر اور باہر صفیں سیدھی ہوئیں اور مکبروں نے تکبیریں کہنی شروع کر دیں۔ نماز کا منظر بھی بڑا دل افروز ہے۔ ہزاروں لوگوں کا ایک ساتھ جھکنا، بیٹھنا، اٹھنا ایک روح پرور تنظیم اور اتحاد کی نشانی ہے۔ غریب، امیر، مالک نوکر سب ایک ہی صف میں ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ کوئی اونچ نیچ نہیں۔ ایسے ہی

موقعے کے لیے اقبال نے کہا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

مرد اور بچے عید گاہ سے لوٹتے تو مٹھائیوں، کھجوریوں، کھلونوں اور ترکاریوں سے لدے ہوئے۔ ان کے پیچھے گھر کی عورتیں تیار ہو گئی تھیں اور بنی ٹھنی بیٹھی تھیں۔ اب ناشتہ کیا جاتا۔ پھر عیدیاں شروع ہو جاتیں۔ کسی کو پانچ، کسی کو ایک، کسی کو اٹھنی اور دونی، عمر اور رشتے کے مطابق۔ یہ سلسلہ دن بھر چلتا رہتا۔ دوست، احباب اور رشتے دار آتے اور گلے لگ کر عید مبارک کہتے۔ عید کے دن سب ایک دوسرے کے گھر جاتے اور عید مبارک کہتے۔ یہ آنا جانا رات تک لگا رہتا۔ شام کے وقت بڑے بھائی چھوٹی بہنوں کے یہاں اور باپ اپنی بیٹیوں کے یہاں عیدیاں دینے آتے۔ ہندو دوست بھی گھر آتے، مبارکباد دیکر گلے ملتے اور سویاں کھا کر جاتے۔

اگلے دن دلی میں ٹڑ کا میلہ ہوتا۔ یہ میلہ دستکاروں اور کرخندوں کا ہوتا تھا مگر سیلانی جیوڑے اس میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ سبزی منڈی میں ایک بہت بڑا باغ تھا جس میں بے شمار پھل دار درخت تھے۔ یہ باغ محمد شاہ کے ایک خواجہ سرا محل دار خاں کا تھا۔ ٹڑ کا میلہ اسی باغ میں ہوتا تھا۔ بعد میں یہ میلہ اوکھلا میں ہونے لگا تھا۔ اس میلے میں بھی بڑی بھیڑ ہوتی تھی۔ عورتیں اس میلے میں نہیں جاتی تھیں۔

عید کے موقع پر چھوٹے بڑے، غریب امیر کی تفریق مٹ جاتی تھی۔ یوں بھی دلی کی قدیم سماجی زندگی میں دلی والوں کا چھوٹے چھوٹے کام کرنے والوں، ملازموں اور سودا سلف بیچنے والوں اور پھیری والوں سے ایک خاص میل جول کا رشتہ ہوتا تھا۔ گھر والے ان کی قدر کرتے تھے اور وہ گھر والوں کے خیر خواہ تھے۔ عید کے تہوار پر تو یہ جذبات خاص طور پر ابھر کر آتے۔ عید سے ایک دن پہلے گھر کی لگی بندھی منہاری آکر سب عورتوں کو چوڑیاں پہنا جاتی۔ وہ سارے گھر والوں اور گھر والیوں کے لیے بوا منہاری تھی۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی بہوئیں جھک کر آداب کرتیں، بیٹیاں سلام کرتیں۔ منہاری انہیں دعائیں دیکر گھر والی کے

پاس پہنچتی۔ گھر کی مالکن نے بیٹھے بیٹھے گردن جھکاکر سلام کیا۔ منہاری نے سر پر ہاتھ رکھا، دعا دی اور بیٹھ گئی۔ ماں اشارہ کرتی اور بیٹی یا بہو کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے سامنے لاکر رکھ دیتی۔ منہاری جی بھر کر کھاتی، کلی کرتی اور پانی پی کر پاندان کی طرف نگاہ کرتی، بیوی پٹاری کھولتی اور زردے والا پان بناکر دیتی۔ منہاری پان منھ میں رکھتی اور دعا دیتی۔

"بوڑھ سہاگن، سائیں جئیں، بچے جئیں"

پھر منہاری سب کو نئی نئی چوڑیاں اور بانکیں پہناتی۔ قیمت تو ساری چوڑیوں کی ایک آدھ روپے سے زیادہ نہ ہوتی مگر اس موقعے پر سوال قیمت کا نہیں، نیگ کا ہوتا۔ سب کی الگ الگ عیدی مانگتی اور دو ڈھائی روپے کے نیگ کو ہاتھ نہ لگاتی اور کہتی۔ "اے بیوی سال کا تہوار ہے جو تبوں کے طفیل بال بچوں کی عید ہو جاتی ہے۔ تم دینے والے زندہ رہو کہ مجھ بڑھیا کا مان رکھ لیتی ہو۔" اس طرح کی باتیں بناکر پانچ روپے لیے بغیر نہ ٹلتی۔ جاتی ہوئی بھی ڈھیر کی ڈھیر دعائیں دے جاتی۔ بیٹی سلام کرتی تو کہتی — "جیتی رہو، نصیبہ اچھا ہو، اماں باوا کی سلامتی میں اپنے گھر جاؤ۔" بہو سلام کرتی تو یہ دعا دیتی — "بوڑھ سہاگن، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔"

شبِ قدر

رمضان کے مبارک مہینے کی راتوں میں سے ایک رات 'شبِ قدر' کہلاتی ہے۔ اسے بہت برکت اور خیر کی رات مانا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں اس کو ہزار مہینوں سے افضل بتایا گیا ہے۔ گویا جس شخص کو اس رات کی عبادت نصیب ہو جائے، اسے ہزار مہینوں کی عبادت کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کے مطابق قرآن پاک بھی آسمانِ دنیا پر اسی رات میں اترا تھا۔ یہی ایک بات اس رات کی فضیلت کے لیے کافی ہے۔ ایک اور عقیدے کے مطابق اس رات کو حضرت جبرئیل فرشتوں کے ایک گروہ کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں اور جس شخص کو عبادت میں مشغول دیکھتے ہیں اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ "مظاہر حق" میں لکھا ہے کہ اسی رات میں ملائکہ کی پیدائش

ہوئی اور اسی رات میں جنت میں درخت لگائے گئے۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ اسی رات میں حضرت عیسٰی آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔

شبِ قدر کی تاریخ معیّن نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب حضرت ابوذر نے پیغمبر صاحب سے پوچھا کہ شبِ قدر رمضان کے کس حصّے میں ہوتی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ عشرۂ اوّل اور عشرۂ آخر میں تلاش کرو۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے فرمایا کہ آخری سات راتوں میں تلاش کرو۔ بعض روایات میں ۲۳ یا ۲۴ کی شب' شبِ قدر ہوتی ہے۔ گزشتہ دَور میں دلی کے پرہیز گار اور پابندِ روزہ اور نماز مسلمان رمضان کے عشرۂ آخر میں تمام شب جاگتے اور عبادت کرتے تھے کیونکہ اس عشرہ میں کوئی بھی شب' شبِ قدر ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس شب کی عبادت کا ثواب ہزار مہینوں یعنی تراسی سال اور چار مہینوں کی عبادت کے برابر تھا' اس لیے مسلمان اس نادر موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ رمضان کی آخری رات بھی ثواب کی نیت سے بڑی افضل مانی جاتی تھی۔ اس رات کو عبادت کرنے والے کو سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ رات کھلی ہوئی اور چمکدار ہوتی ہے' صاف شفاف' نہ زیادہ گرم نہ زیادہ ٹھنڈی بلکہ معتدل اس کے بعد کی صبح کو آفتاب بغیر شعاع کے طلوع ہوتا ہے' بالکل ہموار ٹکیہ کی طرح جیسا کہ چودھویں رات کا چاند۔

سلونی عید

بقر عید کے موقعے پر وہی اہتمام ہوتا تھا جو عید الفطر کے موقعے پر ہوتا تھا۔ وہی خوشیاں' وہی مبارک بادیں' وہی عیدیاں اور وہی ضیافتیں۔ وہی میل ملاپ کے خوشگوار اور روح پرور منظر' وہی رونق' وہی چہل پہل۔ اسے عید الضحٰی بھی کہتے ہیں۔ اس عید کی کئی پہلو سے زیادہ اہمیت ہے' اس لیے اسے 'عید کبیر' بھی کہا جاتا ہے۔ اس عید میں جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے۔ عرب میں اونٹ کی قربانی دینے کا رواج ہے۔ دلی میں مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی بکروں' بھیڑوں اور دنبوں کے ریوڑ آنے شروع ہو جاتے اور

کوئی چوک، نکڑ یا چوراہا ایسا نہ ہوتا جہاں سو پچاس جانور نہ کھڑے ہوتے۔ ایک روپے کی بھیڑ سے لے کر دو ہزار تک کا دنبہ ملتا۔ بھاؤ تاؤ ہوتے رہتے اور جس کی جتنی طاقت ہوتی جانور خرید لیتا۔

عید سے چند روز پہلے دکانیں سجنی شروع ہو جاتیں۔ ایک دن پہلے تھڑوں سے نکل کر پٹڑیوں تک آجاتیں۔ ہر دکان مال سے بھری پڑی ہے۔ چاندنی چوک بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ خلقت ہے کہ ٹوٹی پڑ رہی ہے اور دکانداروں کے وارے نیارے ہو رہے ہیں۔ جس دکان پر دیکھو 'عید مبارک' کا بورڈ لگ رہا ہے۔ سب سے زیادہ بکری جوتے، ٹوپی اور موزے بنیان والوں کی ہو رہی ہے۔ بچے بچے کو ان کی ضرورت ہے۔ دکان دار بڑے ہوشیار ہیں۔ جوتا اگر تنگ ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ پہن کر کھل جائے گا۔ اگر ڈھیلا ہے تو کہتے ہیں کہ موزوں پر ٹھیک آجائے گا۔ عورتوں کا سامان، چوڑیاں، سرمہ مسی، تیل پھلیل، مہندی اور چوٹیاں خوب بکتیں اور ان کے بیچنے والے تو گھر گھر آواز لگاتے۔ ان میں زیادہ تر پھیری لگانے والی عورتیں ہوتیں۔ منہاری بدستور آتی اور سب کو چوڑیاں اور لاکھ کے کنگن پہنا جاتی اور اپنی دعاؤں سے گھر بھر دیتی اور ڈھیر سارا نیگ پاتی۔ اصلی عید تو بچوں کی ہوتی تھی۔ دن بھر ابّا کے سر ہوتے رہتے تھے، یہ لیں گے، وہ لیں گے۔ ہر چکر میں انگلی پکڑے باپ کے ساتھ چلے جاتے اور کچھ نہ کچھ لے کر آتے۔

شاہی اہتمام قدرے مختلف ہوتا۔ اس موقع پر عید گاہ میں جنوب کی طرف ایک خیمہ لگا دیا جاتا۔ اس میں بادشاہ اپنے دستِ مبارک سے ایک اونٹ اور ایک دنبے کی قربانی کرتے۔ اس خیمے میں ایک بڑا چبوترہ بنا ہوتا جس پر بادشاہ کے لیے مسند لگائی جاتی۔ اس چبوترے پر دسترخوان بچھایا جاتا۔ قسم قسم کے پر تکلف لذیذ کھانے چنے جاتے بادشاہ پہلے خود تناول کرتے اور پھر ولی عہد، شہزادوں اور دوسرے امرا کو اپنے ہاتھ سے کباب اور شیرمال دیتے۔ قلعے میں بادشاہ کے واپس آنے پر بکروں اور دنبوں کی قربانی دی جاتی اور گوشت سب کے یہاں حسب حیثیت بھجوایا جاتا۔ محل میں تمام رات چہل پہل رہتی۔ بادشاہ انعام و اکرام دیتے اور مبارکبادیں اور تحفے قبول کرتے۔

عیدالضحیٰ کے دن بھی عید کی نماز پڑھی جاتی ہے اور نماز سے پہلے ناشتہ نہیں کیا جاتا۔ نماز کے بعد اور اگر گھر پر قربانی دی گئی ہو تو قربانی کے گوشت کے ساتھ ناشتہ کیا جاتا ہے۔ عیدالضحیٰ کے دن گھر میں قربانی دینی ہوتی تو بکرے اور مینڈھے کی دیدیتے۔ قربانی کے جانور کو کعبے کی طرف منہ کر کے لٹایا جاتا اور پھر ایک دعا پڑھی جاتی۔ اس کے بعد قربانی کر دی جاتی اور پھر دعا پڑھی جاتی۔ قربانی کرتے وقت دل میں یہ ارادہ کیا جاتا کہ یہ قربانی اپنے طرف سے کر رہا ہوں اور اس سے ثواب مقصود ہے قربانی کا ایک تہائی حصہ غریبوں اور بھکاریوں کو دیدیا جاتا تھا اور باقی کے حصے میں سے رشتے داروں اور دوستوں کو بانٹ دیا جاتا تھا۔

چند دیگر مسلم تہوار اور تقریبیں

دلی تہواروں کا شہر رہا ہے۔ دلی کے بارے میں کہا جاتا تھا' تیس دن اور چالیس میلے۔ دلی کے جتنے چاہے تہواروں اور تقریبوں کا ذکر کیجیے'، کچھ نہ کچھ رہ جائیں گے۔ ایک مورخ نے دلی کے عرسوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا "جتنی اکابرین کی قبریں' اتنے عرس میلے"۔ حقیقت یہ تھی کہ آہستہ آہستہ عرس کم اور میلے زیادہ ہو گئے اور لوگ ان میلوں میں سیر و تفریح اور عیش و عشرت کا سامان ڈھونڈنے لگے۔ سالار جنگ مصنف مرقعٔ دلی نے کئی عرسوں میں رنگین نظاروں اور نفس پرستی کے اہتمام اور ساز و سامان کا ذکر کیا ہے۔ عرس حضرت ناصر الدین چراغ دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" در ماہے کہ دیوالی می آید طرفہ ہجومے می شود و دریں ماہ در ہر یکشنبہ جمیع سکنۂ دہلی سعادت زیارت می روند۔ دور اطراف چشمہ خیمہ ہا ایستادہ و سرا پردہ ہا ایستادہ می کنند۔ در زیر ہر درختے و در سایۂ ہر دیوارے عالمے بترتیب فروش پرداختہ دادِ عیش و خوش دلی می دہند۔ سیر عجیبے است و تماشائے طرف در ہر جا راگ و رنگ است و در ہر کنار صدائے پکھاوج و مورچنگ "

عید الفطر اور بقرعید کے علاوہ' دلی میں منائے جانے والے چند مسلم تہوار اور تقریبیں یہ تھیں۔

شبِ برات

ہجری سن کا آٹھواں مہینہ شعبان ہے۔ اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کے بارے میں کئی عقیدے ہیں۔ ایک عقیدے کے مطابق اس دن محمدؐ صاحب کا ایک دانت شہید ہوا تھا۔ اس لیے انھوں نے حلوہ کھایا تھا۔ شب برات کے روز بھی اسی وجہ سے تقریباً سب ہی گھروں میں حلوہ بنتا تھا۔ ایک اور عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر محمدؐ کے چچا امیر حمزہ کی شہادت بھی اس روز ہوئی تھی اور یہ ان کی فاتحہ ہے۔ بہر حال اس رات نمازیں پڑھی جاتی ہیں جو پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ ہیں۔ اس تہوار پر آتش بازی بھی کی جاتی تھی اور نوجوان لڑکے چوک، چوراہوں پر لوہے کی نالیوں میں بارود بھر کر ساری رات دھوں دھاں کرتے رہتے تھے۔ گھروں میں حلوے کئی قسم کے بنتے تھے اور احباب اور رشتے داروں میں بھیجے جاتے تھے۔ غریبوں اور فقیروں کو خیرات بھی دی جاتی تھی۔ کئی گھروں میں رات بھر کی نماز خوانی کے بعد اگلے روز روزہ بھی رکھا جاتا تھا۔ یہ تہوار اس نوعیت کا ہے کہ نہ اسے مسرّت کا تہوار کہا جا سکتا ہے اور نہ غم کا۔ بہر حال یہ عبادتوں کا ایک سنجیدہ تہوار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتش بازی اس کے ساتھ بعد میں وابستہ ہو گئی تھی۔

شبِ برات کے دن مدرسوں میں چھٹی ہوتی تھی اور استادوں کو حلوہ وغیرہ بھیجا جاتا تھا۔ اس روز کوری ٹھلیاں اور آبخورے بھی لائے جاتے تھے اور انہیں گھر میں ایک چوکی پر رکھ دیا جاتا تھا۔ اس روز حضرت پیغمبر صاحب، امیر حمزہ، حضرت فاطمہ کے علاوہ اپنے مُردوں کی نیاز بھی دلوائی جاتی تھی۔ بادشاہ امام باڑے جاتے تھے اور محل میں بھی شام کو نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔

محرّم

اس تہوار کو شیعہ مسلمان مناتے ہیں۔ حضرت امام حسین کی یاد میں ماتم کرتے ہیں۔

عراق میں دریائے فرات کے کنارے کوفہ شہر میں حضرت علی کو شہید کر دیا گیا تھا۔ حضرت علی مسجد میں نماز کے لیے جا رہے تھے کہ کسی نے زہر آلود تلوار ان کے سر پر مار کر انہیں شہید کر دیا۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے حضرت امام حسن کو خلیفہ چُنا گیا تھا لیکن معاویہ نے ان کی خلافت کو قبول نہیں کیا۔ ساتھ ہی اس نے حضرت امام حسن پر حملہ بول دیا۔ حضرت امام حسن نے معاویہ کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا جس کی ایک شرط کے مطابق معاویہ کی موت کے بعد حضرت امام حسن کے قریبی رشتے دار کو خلیفہ بننا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ معاویہ یا اس کے بیٹے یزید کے کہنے پر حضرت امام حسن کو زہر دیدیا گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ معاویہ کی موت کے بعد خلافت پر معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوتے یزید نے قبضہ کر لیا۔ حضرت امام حسین کی شہادت کی داستان بڑی درد انگیز ہے۔ حضرت اور ان کے مددگاروں کی تعداد صرف بیاسی تھی اور مخالفوں کی تعداد بائیس ہزار تھی۔ اِس کے علاوہ ان لوگوں نے دریائے فرات پر بھی جو میدانِ جنگ کے قریب تھا اپنا قبضہ کر لیا تھا اور حضرت امام حسین اور ان کے ہمراہیوں میں سے کسی کو بھی پانی کا ایک قطرہ بھی پینے نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ جب حضرت امام حسین اپنے چھوٹے بیٹے علی اصغر کو جو شیر خوار تھے دشمنوں کے سامنے لا کر ان کے واسطے پانی مانگنے لگے تو دشمنوں نے پانی کا ایک گھونٹ دینے کی بجائے تیروں کی بوچھاڑ کی۔ حضرت امام حسین کے پیاس سے تڑپتے ساتھی، اور رشتے دار اور اصحاب 'العطش' کہتے ہوئے شہید ہو گئے۔ کربلا کے میدان کی جنگ حق اور باطل کے درمیان تھی۔ اس جنگ میں حضرت محمدؐ صاحب کے خاندان کے کئی افراد شہید ہوئے جن میں حضرت امام حسین اور بی بی زینب کے دونوں بیٹے بھی شامل تھے۔

محرم کا تہوار ان سب شہیدوں کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس روز تعزیے نکالے جاتے ہیں اور جلوس میں لوگ ماتم کرتے ہیں۔ مرثیہ خوانی ہوتی ہے اور ماتمی مجلسیں کی جاتی ہیں۔ دلی کے تعزیے دور دور تک مشہور تھے۔ کربلا کے پیاسے شہیدوں کی یاد میں ہندو اور مسلماں جگہ جگہ پانی کی سبیلیں لگاتے تھے۔ محرم کی پہلی کو قلعے میں بادشاہ اور

لوگوں کے گھروں میں بچے حضرت حسن حسین کے فقیر بنتے تھے۔ سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز کفنی ڈالتے۔ جھولی میں الائچی دانے، سونف اور خشخاش بھری جاتی۔ اس کے بعد یہ فقیر درگاہ میں جاکر سلام کرتے اور نیاز دلائی جاتی۔ گھروں میں صبح شام کھانا اور شربت غریبوں اور فقیروں کو دیا جاتا۔ چھٹی کو بادشاہ کے ہاتھ میں دو مرصع ڈنڈے دے دئے جاتے تھے اور کمر میں چاندی کی زنجیر ڈال دی جاتی تھی۔ دو سیّد زادے زنجیر پکڑ کر بادشاہ کو کھینچتے تھے۔ دو چار قدم چلنے کے بعد زنجیر بادشاہ کے گلے میں ڈال دی جاتی تھی۔

محرم کی ساتویں کو شاہی جلوس امام باڑے جاتا تھا۔ آگے آگے کاغذ سے مڑھی ہوئی بانس کی کھپچیاں، ابرق کے کنول میں روشن شمعیں، مہندی اور مالیدے کے خوان اور تاشے باجے روشن چوکیاں ہوتی تھیں۔ پیچھے پیچھے بادشاہ اور بیگمات، جشنیں، ترکنیں اور فوج ہوتی تھی۔ امام باڑے پہنچ کر مہندی اور مالیدے کے خوان درگاہ میں چڑھائے جاتے تھے۔

محرم کی آٹھویں کو بادشاہ حضرت عباس کے سقے بنتے اور سب بچوں کو شربت پلاتے تھے۔ محرّم کی دسویں کو کوزوں میں شربت بھرا جاتا اور تازہ حلوہ کونڈوں میں بھر دیتے۔ ظہر کے بعد بادشاہ موتی مسجد میں عاشورے کی نماز پڑھتے تھے۔ اس کے بعد کھانے پر نیاز دی جاتی تھی۔ شام کو محل میں ڈلیاں، الائچیاں، کتری ہوئی چھالیہ، خربوزے کے بیج، کترا ہوا گولا اور دھنیا تقسیم ہوتا تھا۔

دسویں روز تعزیے اٹھتے، سبیلیں لگائی جاتیں اور ڈھول اور تاشے پیٹے جاتے۔ مرثیہ خوانی ہوتی۔ بڑی دھوم دھام سے علم اٹھتے اور اکھاڑے جمتے تھے۔ بہت سے ہندو تعزیوں کے جلوس میں شریک ہوتے تھے۔ جن ہندو محلّوں میں سے تعزیے گزرتے وہاں کے ہندو سبیلیں لگاتے تھے۔ مرثیہ گوئی اس زمانے میں ایک فن کی صورت اختیار کر چکا تھا اور بہت سے آدمی اس فن کے ماہر تھے۔ اس تہوار کا سب سے اہم کام تعزیے بنانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور لنگ نے سب سے پہلے تعزیہ بنوایا۔ اس کے بعد سے یہ رواج چل پڑا۔ پتہ چلا ہے کہ عرب ممالک میں تعزیے بنانے کا رواج نہیں ہے۔ دلی کے تعزیے

بڑے مشہور ہیں اور اس زمانے میں جو تعزیے بنتے تھے ان کا کوئی جواب نہیں تھا کئی کئی منزلوں کے تعزیے بنتے تھے اور کچھ تعزیے تو اتنے اونچے ہوتے تھے کہ اونچی عمارت کو چھو لیتے تھے۔ عام طور پر تعزیے لکڑی کے بنائے جاتے تھے، جن پر رنگ برنگے چمکیلے کاغذ یا ابرق کے ٹکڑے چپکا دئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی گتے، روئی، مٹھائی، شیشے، موم وغیرہ کے تعزیے بھی بن جاتے تھے اور یہ تعزیے لوگوں کے لیے بڑی کشش کا سبب ہوتے تھے۔ سب تعزیے الگ الگ رنگ روپ اور لمبائی چوڑائی کے ہوتے تھے۔ کوئی کوئی تعزیہ اتنا چھوٹا ہوتا کہ صرف چار آدمی اسے آسانی سے اٹھا لیتے تھے اور کوئی اتنا بڑا ہوتا کہ اسے اٹھانے کے لیے بیس پچیس آدمیوں کی ضرورت ہوتی۔ الگ الگ فرقوں اور محلوں اور کوچوں کے الگ الگ تعزیے نکلتے تھے اور ان کا نام بھی ویسے ہی پڑ جاتا تھا جیسے کہ جلاہوں کا تعزیہ، منہاروں کا تعزیہ، بارہ ٹوٹی کا تعزیہ وغیرہ وغیرہ۔

محرم کا جلوس بڑا شاندار ہوتا تھا۔ تعزیوں کی خوبصورتی اور کشش دیکھنے ہی بنتی تھی۔ جلوس کے آگے باجہ بجتا، اس کے پیچھے ہرے کالے جھنڈے لیے ہوئے بہت سے لوگ ہوتے۔ تعزیے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے۔ بازاروں اور سڑکوں پر بے تحاشہ بھیڑ ہوتی۔ اوپر جھروکوں میں سے خواتین جلوس بھی دیکھتیں اور ماتم بھی کرتی رہتیں۔ تعزیوں کے پیچھے ماتم کرنے والوں کی بہت بھیڑ ہوتی جو زور زور سے "یا علی ہائے ہائے یا حسن ہائے ہائے اور یا حسین ہائے ہائے" چلاتی رہتی۔ جلوس میں کچھ لوگ مرثیہ پڑھتے جاتے ہیں اور چھاتی کو پیٹتے چلتے ہیں۔ عموماً یہ مرثیے دبیر اور انیس مرحوم کے لکھے ہوتے ہیں۔

تعزیوں کے جلوس میں شامل لوگوں میں قربانی کا بے حد جوش و خروش ہوتا تھا۔ کچھ لوگ چھروں اور زنجیروں سے ماتم کرکے ننگے بازو، پیٹھ اور چھاتی لہولہان کر لیتے تھے۔ کچھ لوگ ماتم کرتے کرتے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جلوس میں امام حسین کا گھوڑا دُلدل بھی بنا کر شامل کر لیتے تھے۔ بچے بار بار دُلدل کے نیچے سے نکلتے تھے۔ کچھ لوگ امام حسین کے نام پر گتکے بنیٹی اور تلوار کے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ اوپر جھروکوں میں سے ان پر پھول برسائے جاتے۔ جلوس مختلف سڑکوں اور بازاروں سے گزرتا اور آخر میں کربلا میں جو لودھی روڈ کے پاس ہے

تعزیے دفن کر دئے جاتے۔

محرّم کا غم امام باڑے میں ایک خاص ڈھنگ سے منایا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شیعہ گھر میں ان دنوں ایک کمرہ الگ کر کے اسے امام باڑے کی شکل دیدی جاتی تھی لیکن امام باڑے میں خاص طور پر بڑی بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی۔ امام باڑے میں دیواروں پر امام حسین کے پنجے اور پٹکے لگا دئے جاتے۔ یہ ان کے علم کے نشان سمجھے جاتے ہیں۔ لکڑی اور کاغذ کی بنی امام حسین کی قبر کی ایک نقل بھی امام باڑے میں رکھ دی جاتی جسے تعزیہ کہا جاتا۔ امام باڑے میں شام کو مجلس ہوتی۔ اس میں ایک آدمی جسے 'ذاکر' کہا جاتا' امام حسین کی زندگی، خیالات اور مقاصد کو بیان کرتا۔ وہ کربلا کی جنگ کے حالات بھی تفصیل سے بتاتا۔ بیان اتنا دردانگیز ہوتا کہ سننے والے کی آنکھوں میں آنسو نکل آتے۔ اس کے بعد مرثیہ خوانی ہوتی۔ اس موقعے پر بھی موجود لوگ ماتم کرتے۔

چونکہ امام حسین پیاس سے تڑپ کر مرے تھے اس لیے ان کے نام پر سبیلیں لگائی جاتی ہیں۔ پانی اور شربت جگہ جگہ پلایا جاتا ہے۔ اس تہوار میں پانی اور شربت پلانے کا خاص طور پر ثواب ہے۔ محرّم کے دنوں میں عورتیں سجنے دھجنے سے بھی احتراز کرتی ہیں اور کوئی خوشی نہیں منائی جاتی۔ یہ غم اور شہادت کا تہوار ہے اور لوگوں کو ان عظیم شہیدوں کی یاد دلاتا ہے۔

عید میلاد النبی

یہ حضرت محمدؐ کی پیدائش کا تہوار ہے۔ یہ حقیقت بھی کتنی انوکھی ہے کہ پیغمبر صاحب جس دن پیدا ہوئے' اسی دن آپ نے وفات پائی۔ اسی لیے اسے بارہ وفات بھی کہا جاتا ہے' کیونکہ حضرت محمدؐ کی پیدائش کی تاریخ' اور وفات کی بھی' بارہ تھی۔ بہت سے مسلم علما کے مطابق اس تہوار کی موجودہ شکل اسلامی نہیں ہے اور یہ تہوار حضرت محمدؐ کے پیرو کاروں اور خلیفاؤں نے نہیں منایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے پیغمبروں کے یوم پیدائش مناتے ہیں' اسی روایت سے ہندوستان کے

مسلمانوں نے بھی اسے منانا شروع کر دیا۔

اس دن میلاد شریف پڑھا جاتا تھا۔ میلاد شریف میں محمدؐ صاحب کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک ان کے مکمل کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محمدؐ صاحب کی پیدائش سورج نکلنے سے پہلے ہوئی تھی اس لیے یہ بھی روایت ہے کہ میلاد شریف سورج نکلنے سے پہلے پڑھا جائے۔ میلاد شریف کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور پاس ہی ایک چھوٹی چوکی پر میلاد شریف کا پڑھنے والا بیٹھتا تھا اور گلاب پاش میں گلاب کا پانی بھر کر رکھ دیا جاتا تھا جسے میلاد شریف شروع ہونے کے بعد بیچ میں بیٹھے لوگوں پر چھڑک دیا جاتا تھا۔ میلاد شریف کے پورا ہونے کے بعد کوئی میٹھی چیز بانٹی جاتی تھی۔ میلاد شریف کے موقع پر حضرت محمدؐ کی زندگی اور ان کے کردار پر تقریریں بھی کی جاتی تھیں۔ اس دن بہت سے لوگ روزہ بھی رکھتے تھے، خیرات کرتے تھے اور پیغمبر صاحب کے نام کی نیاز دلواتے تھے جس میں کھانا اور کھیر یا مٹھائی وغیرہ پر ان کے نام کی فاتحہ دلائی جاتی تھی۔ ان اشیا کو رشتے داروں، احباب اور بچوں میں بانٹ دیتے تھے۔

ربیع الاول کی پہلی تاریخ سے تقریبات شروع ہو کر بارہ روز تک رہتی تھیں۔ بادشاہ مع مشائخ قوالیوں میں شامل ہوتے تھے۔ الائچی دانے تقسیم ہوتے تھے۔ بارہویں تاریخ کو چراغاں ہوتا تھا۔ بادشاہ درگاہ میں جاتے تھے۔ مٹھائیاں بٹتی تھیں۔ اس کے بعد مشائخ کی محفل میں قوالی ہوتی تھی۔

آخری چہار شنبہ

ماہ صفر کی تیرھویں تاریخ کو منایا جاتا تھا۔ چنے کی گھگھنیاں نمک مرچ ڈال کر بنائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ گیہوں کی گھگھنیاں بنتی تھیں جن کے اوپر کھانڈ اور خشخاش ڈالی جاتی تھی۔ ان کی نیاز دلوائی جاتی تھی۔ مہینے کے آخری بدھ کو بادشاہ دو سونے کے اور دو چاندی کے چھلے پہنتے تھے۔ اسی طرح حسب مراتب ولی عہد اور شہزادے پہنتے تھے۔ یہ چھلے امرا میں بھی تقسیم کیے جاتے تھے۔ بادشاہ تیسرے پہر اپنے چھلوں کو ملکہ کو

دیدیتے تھے۔ اِس کے بعد ایک ٹھلیا میں تھوڑا پانی او کپڑے میں لپٹی ہوئی اشرفی اس میں ڈالی جاتی تھی اور وہ بادشاہ کے سر سے پیچھے کی جانب پھینک دی جاتی تھی۔ اشرفی حلال خوری لیتی تھی۔ اس کے بعد پھوس جلایا جاتا تھا۔ بادشاہ اس کو الانگتے تھے۔ اس کے بعد اسی طرح یہ رسم 'ٹھلیا پھوڑنے کی رسم' بیگمات اور شہزادے ادا کرتے تھے۔ اس رسم کے خاتمے کے بعد سبزہ روندنے باغ جاتے تھے۔

خواجہ صاحب کی چھڑیاں

جمادی الثانی کی چودھویں تاریخ کو منایا جاتا تھا۔ اس تاریخ کو قطب صاحب میں دور دور کی خلقت جمع ہوتی تھی۔ یہاں سے لوگ اکٹھے خواجہ صاحب اجمیر کے عرس میں جاتے تھے۔ ان کو میدنی کہتے تھے۔ بادشاہ ان کو چاندی کا نشان دیتے تھے اور تھوڑی دُور ان کو پہنچانے جاتے تھے۔

رجب

اس مہینے کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے جمعے کو مردوں کی نیاز دلائی جاتی تھی۔ بدھنیاں، جوڑے اور روٹیاں مسجد میں بھیج دی جاتی تھیں۔ اس مہینے میں حضرت جلال بخاری کے کونڈے بھی ہوتے تھے۔

گیارھویں حضرت غوث الاعظم

ماہ ربیع الثانی کی گیارھویں تاریخ کو منائی جاتی تھی۔ آتش بازی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ بانس اور لال کاغذ کا "بنگلہ" بنتا تھا، جسے مہندی کہتے تھے۔ رات کو اسے روشن کرتے تھے اور نیاز دی جاتی تھی۔

عرس

پچھلے زمانے میں دلی میں بڑے عرس ہوتے تھے۔ شروع شروع میں یہ عقیدت مندی کے مظہر ہوتے تھے۔ یہ پہلو تو قائم رہا مگر اس کے ساتھ ہی زنانِ بازاری' ناچنے والیوں اور

بے حساب قوالوں کے گروہ کے گروہ آنے کی وجہ سے اور عورتوں کی کثیر تعداد میں شمولیت کی بنا پر عرس تفریح اور نفس پرستی کا آلہ کار زیادہ بن گئے۔ ہفتوں پہلے سے عرس کی تیاریاں ہوتیں۔ مزاروں کے آس پاس ہر قسم کی دکانیں سجتیں اور اتنی روشنیاں ہوتیں کہ تمام خطہ بقعۂ نور بن جاتا۔ خلقت کھنچ کر وہاں پہنچ جاتی۔ امیر چھولداریاں لگواتے۔ اڑوس پڑوس کے مکان کرایے پر لے لیتے۔ بہت سے امیروں نے اس مقصد کے لیے ذاتی مکانات مہرولی اور نظام الدین میں بنوا رکھے تھے۔ غریب پیڑوں تلے اپنا ڈیرہ جماتے۔ کھانا پکانے کا سامان لے جاتے اور وہیں سارا خاندان عرس کی دل چسپیوں سے جی بھر کر واپس آتا۔ مزار پر قوالیاں ہوتیں، نذریں چڑھائی جاتیں۔ گلاب پاشی ہوتی۔ طوائفوں کے رقص ہوتے۔ یار باش اور عیاش قسم کے لوگ چنبیلی کے ہار گلے میں ڈالے، گجرا ہاتھ میں لیے اور پان چبائے رقص کا لطف بھی اٹھاتے اور عورتوں پر للچائی نظریں ڈالتے اور چھیڑ خانی کرتے اور فقرے کستے۔ وہ عرس سے زیادہ ایک میلے میں آئے تھے۔ مگر عقیدت مندوں کے لیے مزار پر یہ رونق اور میلہ روح کی بالیدگی کا سبب بنتا۔ درگاہ حضرت نظام الدین، مزار حضرت بختیار کاکی، درگاہ قدم گاہ رسول، مزار حضرت شاہ ترکمان اور درگاہ حضرت ناصر الدین چراغ دلی پر عرس ہوتے ان میں نہ صرف دلی کی خلقت ٹوٹ پڑتی بلکہ گرد و نواح کے ہزار ہا آدمی شریک ہوتے اور لوگوں کا جوش و خروش اور عقیدت مندی قابلِ دید ہوتی۔ ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد بھی ان عرسوں میں حصہ لیتی اور وہ بھی منت مانگتے اور نذریں چڑھاتے۔ صوفیائے کرام نے مذاہب کی ہم آہنگی اور بلا تفریق مذہب و ملت تمام انسانوں کے اتحاد اور آپسی بھائی چارے کے لیے جو عظیم کام کیا وہ ناقابل فراموش ہے



جھولا کن ڈارو رے امریاں

ساون بھادوں

اس خوشگوار موسم پر بھاو بھوتی کی ایک سنسکرت نظم میں یہ منظرکشی اور جذبات نگاری ملاحظہ ہو:۔

اودے اودے بادل آسمان پر گھر آئے ہیں
بجلی کبھی کبھی بڑی گرج کے ساتھ چمک رہی ہے
بادلوں کے چھاج میں سے بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں
دیکھتے ہی دیکھتے بارش اتنی تیز ہو گئی کہ ندی نالے بہنے لگے
ہوا، چیخیں مار کر چلنے لگی
دن رات کی طرح تاریک ہو گیا ہے
برکھا اور ہوا کھڑکیوں میں سے گھر کے اندر بھی آ رہی ہے
میرے پریتم بھادوں کے مہینے میں مجھے چھوڑ کر نہ جانا
کیوں کہ برہا وِش کی طرح تڑپا دیتی ہے!

یہ موسم برسات کا ایک روپ ہے جہاں ساون بھادوں کی جھڑی اور پھوئیاں پھوئیاں بارش مشہور ہے وہاں اس موسم کی دھوپ اور اُمس بڑی جان لیوا ہے۔ جب بارش کا چھینٹا بھی نہیں پڑتا اور ہوا بند ہوتی ہے اور سورج اپنی پوری آب وتاب سے چمکتا ہے تو دم گھٹا جاتا ہے۔ پرانے وقت میں جب بجلی بھی نہیں تھی تو

دلی کے لوگ پنکھوں کو پانی سے تر کر کے جھلتے رہتے۔ لُو سے بچنے کے لیے موٹے موٹے پردے ڈالتے یا اگر تہ خانے ہیں تو دن میں ان کی ٹھنڈک میں پڑے رہتے۔ ساون بھادوں سے پہلے مئی اور جون کی گرمی تو تڑپا دیتی۔ نہ کھانے پینے کا سواد اور نہ باسی پانی ٹھنڈا ہو، نہ تازہ۔ ہر وقت پسینہ جاری۔ اِدھر کپڑا پہنا، اُدھر تر ہوا۔ چٹائی کا پنکھا لیے پڑے ہانپ رہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور دل میں کسی قسم کا جوش نہیں رہتا۔ ساون کے آتے ہی سب کی آنکھیں آسمان پر لگ جاتیں۔ کبھی گھروں میں سات لڑاکی عورتوں کے نام لیے جاتے تاکہ آندھی یا جھکڑ ہی آ جائے جس سے پانی برس جائے۔ قلعے کی بیگمیں اور شہزادیاں بارہ پرندوں کے نام جو 'ب' سے شروع ہوتے ہیں، ایک سانس میں لیتی تھیں جیسے بگلا، بلبل، باز، بیا، بٹیر، بحری، باشہ، بھڑ، بھنیرا، بھنگا، بط، اور بز۔ اس زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ اگر بغیر سانس ٹوٹے ایسے بارہ پرندوں کے نام لیلو تو ہوا چلے گی اور بادل آئیں گے۔ لیکن ایک سانس میں عورتوں کے لیے جنھیں یہ سارے نام یاد بھی نہ رہتے مشکل ہو جاتا اور سانس ٹوٹ جاتا۔ مگر اس طرح بیگموں اور شہزادیوں کا جی لگ جاتا۔ اگر کوئی ان بارہ ناموں کو بغیر سانس ٹوٹے لینے میں کامیاب ہو جاتی تو سب تالیاں بجاتیں اور یقین کر لیتیں کہ اب کسی بھی وقت ٹھنڈی ہوا چلنے والی ہے اور پیڑ کی ڈالی کی طرف دیکھتی رہتیں کہ کب ہوا سے ہلتی ہے۔

مگر ساون بھادوں کا موسم ہے، تان ٹوٹے گی ہی۔ لیجیے، پیڑوں کی ڈالیاں ہلنے لگیں، پہلے آہستہ آہستہ، پھر زور سے۔ بڑی ٹھنڈی ہوا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر اودے مٹیالے بادل گھر آئے ہیں۔ ایک موٹی سی بوند پڑی، پھر بہت سی موٹی بوندیں، چاروں طرف لڑکوں بالوں کا شور مچ گیا۔ بہت ذرا سے بچے بالکل ننگے اور بڑے بچے صرف جانگھیا پہن کر گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ بارش دم بدم تیز ہو رہی ہے۔ ایلو یہ تو پرنالے دھائیں دھائیں کر کے گر رہے ہیں۔ کیسا خوبصورت اندھیرا چھا گیا ہے۔ بجلی بھی کڑک رہی ہے اور بعض دفعہ تو دل دہلا دیتی ہے۔

ذرا بارش رکی تو آنکھوں میں تراوٹ آگئی۔ واہ کیا موسم ہے' انسانوں پر' جانوروں پر' پرندوں پر' پودوں' درختوں پر' تمام کائنات پر ہی ایک عجیب نکھار آگیا ہے' جیسے سب کے قدرت نے منھ دھو دئیے ہوں۔ دلی باغوں کا شہر تھا اور چپے چپے پر باغ بغیچے تھے۔ مور جھنکار رہے ہیں' کوئلیں کوک رہی ہیں اور پپیہا پی پی کی رٹ لگا رہا ہے' ٹیٹری الاپ رہی ہے۔ جانداروں کا تو کہنا ہی کیا' نباتات پر بھی ایک نئی بہار آجاتی ہے۔ جن پیڑوں کو پت جھڑ نے ٹنڈ منڈ بنا دیا تھا' ہری ہری کونپلوں اور پتیوں سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ باغوں میں چاروں طرف ہریالی چھا گئی ہے اور کھیت لہلہانے لگے ہیں۔ جن باغوں میں خاص بہار ہوتی تھی اور لوگ سیر و تفریح کو جاتے تھے ان میں مبارک باغ' باغ محل دار خاں' باغ کڑے خاں اور شالیمار باغ خاص طور پر مشہور تھے۔ روشن آرا باغ میں بھی بڑی رونق ہوتی تھی۔ ساون میں جھولے گھروں میں پڑتے تھے اور باغوں میں بھی۔ ساون کے مہینے میں جب باغوں کے پیڑ لدے پھندے ہو جاتے تو طرح طرح کی بے شمار چڑیاں اپنا پیٹ بھرنے آجاتیں۔ ساون ختم ہوتے ہی جب اناج کٹنا شروع ہو جاتا تو یہ چڑیاں بھی پھر پھر کر کے کہیں اور چلی جاتیں۔

برسات کے موسم میں جب بیر بہوٹیاں نکل پڑتیں تو قلعے کی شہزادیوں کو ان کا لال مخملی پن بہت پسند آتا۔ ایک ایک بیر بہوٹی ایک ایک اشرفی کو مول لیجاتی اور پھر انھیں بچوں کو بانٹا جاتا۔ ایک بار ایک پانچ برس کی بھولی شہزادی نے بیر بہوٹی کو اپنی ہتھیلی پر رکھا تو اس نے ہاتھ کے ہلنے جلنے سے اپنے پنجے سمیٹ لیے اور گول مٹول ہو کر ایسے لگنے لگی جیسے مرگئی ہو۔ شہزادی روتی روتی اپنی ماں کے پاس گئی اور بولی: "امی جان بیر بہوٹی مرگئی"۔

برسات میں دلی کے سیلانیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں باہر نکل پڑتیں۔ کوئی ٹولی محل دار خاں جا رہی ہے تو کوئی جمنا کے کنارے فالنیر پر۔ کسی نے فیروز شاہ کوٹلے کی راہ لی تو کسی نے دھولے کنویں کی۔ چند ٹولیاں مدرسے جا پہنچیں تو چند ہمایوں کے

مقبرے میں جا دھمکیں۔ جو ٹولیاں ذرا سکون کی جگہ پسند کرتیں وہ حوض خاص کا رخ کرتیں۔ جنھیں مچھلی کے شکار کا شوق ہوتا یا پانی کا کنارا پسند کرتیں وہ اوکھلے میں دن گزارتیں۔ فالنبر کی سیر مردوں کی ہوتی تھی۔ اس میں گھر کی عورتوں کو شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ سیر عموماً رات کو ہوتی تھی۔ جمنا کی ٹھنڈی ریت پر دری چاندنی کا فرش ہو جاتا تھا۔ روشنی کے ہنڈے ساتھ ہوتے تھے جنھیں گیس کے ہنڈے کہا جاتا تھا۔ ہر ہنڈے کے ساتھ ایک پیپا مٹی کے تیل کا ہوتا تھا جس میں پمپ سے ہوا بھری جاتی تھی۔ کئی لوگ گیس کی لالٹین بھی لے آتے تھے۔ رات کو بہت دیر تک لوگ ٹھہرتے، کھاتے پیتے، موج مناتے اور موسم کا لطف لیتے۔ اچانک بارش ہو جانے کی صورت میں، کہاں پناہ لینی ہے اور کیا کرنا ہے، اس کے بارے میں سوچ کر رکھتے۔ دلی والے ساون کے موسم میں، اگر کھلا ہو، تو گھر نہ ٹکتے۔ یہ اکثر سننے میں آتا ــــ "بھلا اس چار دیواری میں کیا مزہ، سیر ہونی چاہیئے۔"

مہرولی کے اردگرد امریاں بھی اس موسم میں جھولا جھولتے اور سیر تفریح کے لیے بڑی مقبول تھیں۔ کنبے کے کنبے کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں پہنچ جاتے۔ جھولے پڑ جاتے، پینگیں بڑھائی جاتیں اور کڑاھیاں چڑھ جاتیں۔ دوسرے باغوں میں بھی یہی میلہ نظر آتا۔ لوگ آموں اور جامنوں کے درختوں پر ٹوٹ پڑتے۔ دونوں برسات کے میوے ہیں۔ ذرا پیڑ کو ہلایا اور جامنوں کا مینہہ برس گیا۔ کھا بھی رہے ہیں اور جھولی میں بھی بھر رہے ہیں۔ آموں کے درخت بھی دیکھتے ہی دیکھتے صاف ہو جاتے۔ چاروں طرف گٹھلیاں ہی گٹھلیاں پڑی نظر آتیں۔ لکھی باغ اپنے آموں کے جھنڈ کے لیے مشہور تھا۔ اس میں جامنوں کے بھی بہت پیڑ تھے اور جامنوں کے گچھے ہر وقت ہوا میں جھولتے رہتے۔ امریوں میں جھولے پڑتے ہیں اور گیت گائے جا رہے ہیں۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں   جھولا کن ڈارو رے امریاں

رین اندھیری، تال کنارے، مرلا جھنگارے، بادل کارے،

بوندیاں پڑیں پھُٹیاں پھُٹیاں
جھولا کِن ڈاروورے امریاں
چار مِل گیّاں بھول بھلیاں
دوسکھی جھولیں، دو ہی جھلائیں، جھولا کِن ڈارو رے امریاں

سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے
سُنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے
میں جوگن تیرے ساتھ
سنو سکھیا سیّاں جوگیا ہو گئے
جوگیا بجائے بین بانسری
جوگیا بجائے بین بانسری
جوگن گائے ہے ملہار
سُنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے
جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی
جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی
جوگن نے چھایا ہے بدیس
جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے
جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے
جوگیا کے لمبے لمبے کیس
سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے

میرے دل کی کُنجی میری جان جھولا — میری آرزو، میرے ارمان جھولا
کروں کیوں نہ آؤ بھگت اس کی دل سے — برس دن میں آیا ہے مہمان جھولا
یہ پینگوں سے مری بہلاتا ہے مجھ کو — بڑا مجھ پر کرتا ہے احسان جھولا
جو دیتی ہے جھونٹے کوئی لمبے لمبے — اڑاتا ہے کیا میرے اوسان جھولا
بلا یا ہے سمدھن کو جھولا جھلانے — بنے گا نہ کیوں کر پرستان جھولا

ہوا ختم ساون لگا آج بھادوں — جھلاؤ گی کب تک سکھی جان جھولا
ایک یہ ادا ہے ہندوستان کی — نہ کیوں جھولیں ہندو مسلمان جھولا

ساون بھادوں کے موسم میں قلعے میں اور شہر میں خوب رنگ رلیاں منائی جاتیں۔ ریشمی رسیوں کے جھولے ڈلتے تھے اور ان میں گنگا جمنی پٹڑیاں پڑی ہوتی تھیں۔ گھٹائیں ابھر کر آتیں اور لوگوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں پیدا ہو جاتیں۔ ساون میں نئی بیاہی دلہن اپنے میکے جاتی ہے۔ یہ رسم دلی کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں مشترک تھی۔ امیر خسرو کا یہ گیت صدیوں سے گایا جا رہا ہے۔

اماں میرے بابا کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بڈھا ری — کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجو ری — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری — کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو ری — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری — کہ ساون آیا

ساون میں بہو کا سندھارا بھیجا جاتا ہے۔ اس میں ایک ریشم کا رسہ اور دو چاندی کی پٹڑیاں بہو کے جھولنے کے واسطے اور ایک پتلی رسی اور دو پٹڑیاں اس کی گڑیا کے لیے بھیجی جاتی تھیں۔

ساون بھادوں کے مہینے پکوانوں کے مہینے ہوتے تھے۔ گھر گھر پکوڑے مال پوڑے اور دوسرا پکوان بنتا رہتا تھا۔ برسات میں ان چیزوں کے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا۔ بارش میں بھوک بھی اچھی لگتی اور کھانے کا بھی مزہ آتا۔ کھانے کی فرمائشیں عموماً گھر کے مرد اور بڑے بوڑھے کرتے۔ جہاں بارش کی بوندوں سے موسم ٹھنڈا ہوتا تو صلاحیں دی جانے لگتیں۔ "دیکھو جی پالک اور ہری مرچوں کے پکوڑے اور دھنیے کی چٹنی بنالو، مزا آجائے گا۔" "بہو آج تو مال پوڑے کا دن ہے

وہ جو میرٹھ سے گھی آیا ہے، اسے استعمال کرونا؟ — اور بھئی ذرا سی اجوائن بھی ڈال دینا۔"

تیج ہندو لڑکیوں کی اور سندھارے بہوؤں کے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں اور بہوؤں کو اس موقع پر تحفے تحائف اور ڈھیر سارے کپڑے زیور وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ یہ بڑا مسرت بھرا تہوار ہے اور کُنبے کی عورتوں کی فراخ دلی، وضعداری اور انصاف کی نشاندہی کرتا ہے۔

موسم برسات کے دو اور مشہور تہوار ہیں، سلونو یعنی رکشا بندھن اور جنم اشٹمی۔ سلونو کا تہوار دلی میں بڑی ہنسی خوشی سے منایا جاتا رہا ہے۔ قدیم دلی میں تو اُس کی بہار ہی کچھ اور تھی اور عورتیں بڑے جوش و خروش سے اس کا انتظار کرتی تھیں۔ بہنوں کی اپنے بھائیوں کے لیے الفت مثالی ہے اور اس کا معصوم اور پُر مسرت اظہار وہ سلونو کے دن اپنے بھائیوں کی کلائی پر راکھی باندھ کر کرتی ہیں۔ بھائی اپنی بہنوں کو روپے اور تحفے دیتے ہیں اور بہنوں کی ہر طرح سے رکشا کرنے کا عہد اپنے دل میں کرتے ہیں۔ پرانے وقت میں تو عورتیں اور لڑکیاں گھروں کی زینت تھیں اور ان کی روز مرہ کی زندگی اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں اور رشتے داروں کے اٹوٹ پیار کے گرد گھومتی تھی۔ سلونو والے دن دلی کی گلیوں اور بازاروں میں ایک نئی رونق آجاتی تھی۔ اُن دنوں جو راکھیاں ملتی تھیں وہ سفید اور سنہری پنّی، سلمے ستارے، ریشم ابرق اور موتیوں سے بنتی تھیں۔ بہت امیر گھروں میں عورتیں سچے موتیوں کی راکھیاں بھی بنواتی تھیں مگر راکھی کا سستی یا قیمتی ہونا بے معنی تھا کیوں کہ بہنوں کا پیار تو پیسے دو پیسے کی راکھی میں بھی اتنا ہی گندھا ہوتا تھا۔ وہ دَور مشترکہ کنبوں کا تھا اور عموماً چھوٹے بڑے بھائی ایک ہی گھر میں ہوتے تھے۔ بہنیں صبح سویرے ہی سج دھج کر بھائیوں کے راکھی باندھتیں۔ بھائی بہنوں کو نقدی اور تحفے دیتے اور دوپہر کا کھانا، جس میں خاص چیزیں یعنی پوری کچوری، رائتہ اور کھیر وغیرہ

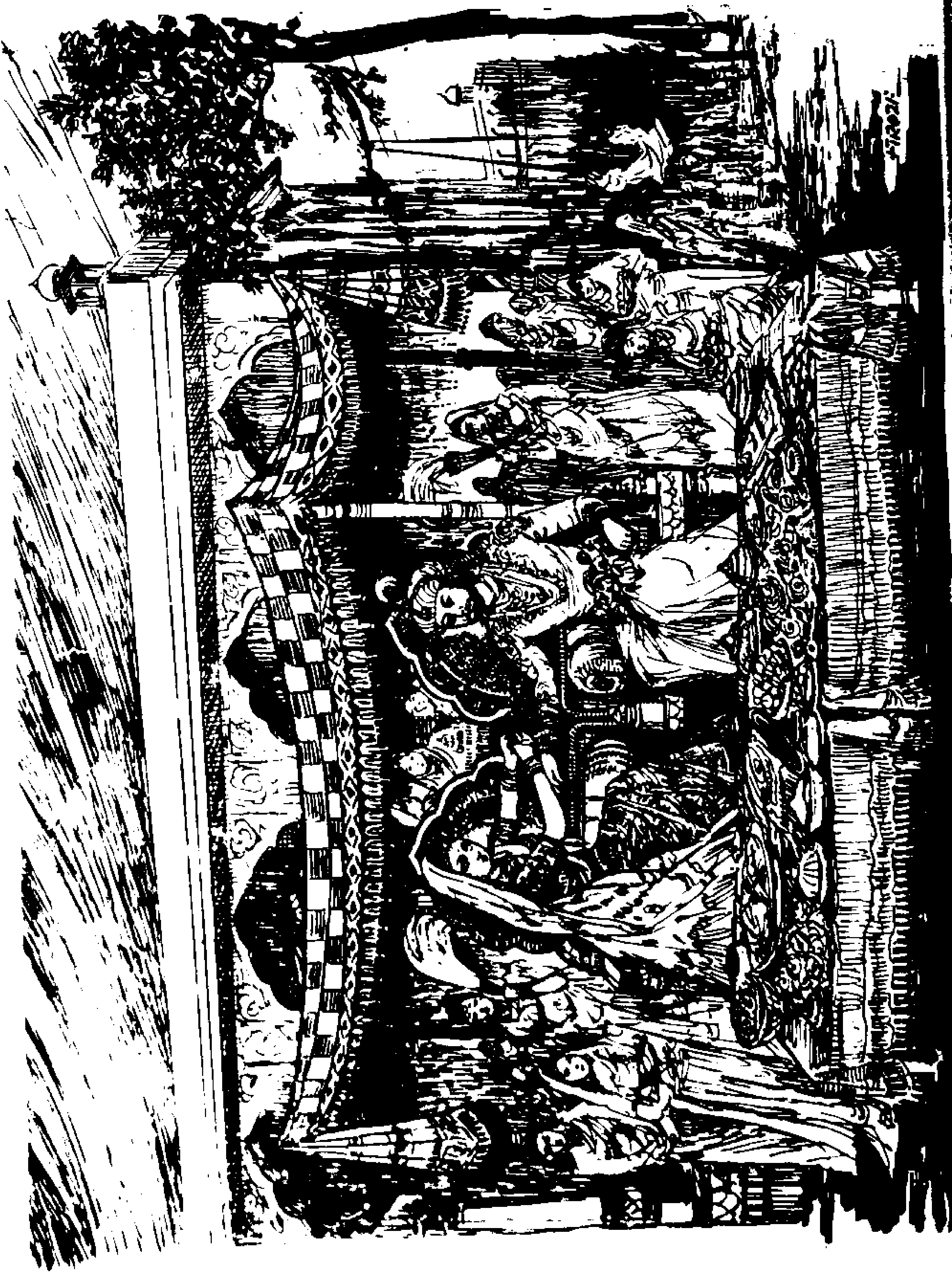
ہوتیں سب مل کر کھاتے۔ شادی شدہ بہنیں جو شہر کے ہی دوسرے حصوں میں ہوتیں بھائیوں کے یعنی اپنے مائکے جاتیں اور ان کے راکھی باندھتیں۔ دلی کے بازاروں اور سڑکوں پر ایسی سجی سجائی بہنیں مٹھائی کی تھالی یا ٹوکری ہاتھ میں لیے پیدل یا ڈولی یا تانگے میں بھائیوں کے گھر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اس روز بھی اور کئی دن پہلے سے راکھی بیچنے والوں کی دکانیں جگہ جگہ لگ جاتیں۔ ان دنوں پنڈت بھی رنگیں دھاگوں (کلاوے) کی بنی راکھی لوگوں کے باندھتے اور لوگ انہیں پیسے دیتے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ بہت سی ہندو عورتیں اپنے مسلمان بھائیوں کے جن کا گھروں میں آنا جانا تھا راکھی باندھتیں اور ان کے مسلمان بھائی انھیں اسی طرح روپے دیتے۔ راکھی بندھے اور تلک لگوائے یہ مسلمان بھائی اسی طرح بازار میں گھومتے اور اپنے گھر لوٹتے اور کسی کو خیال بھی نہ ہوتا بلکہ خوشی محسوس کرتے۔ راکھی ان کے ہاتھ پر بھی کئی کئی دن بندھی رہتی۔

ہفت تماشہ کے مصنف مرزا محمد حسن قتیل سلونو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس دن صاحب ثروت ہندو رقص و سرود سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور شام کے وقت شہر سے باہر جاکر میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ بعض لوگ کسی درخت کے سایے میں اور کچھ لوگ دریا کے کنارے فرش فروش بچھاکر بیٹھتے ہیں اور خوبصورت لڑکوں کو نچاتے ہیں۔"

قلعے میں بھی یہ تہوار منایا جاتا تھا۔ اس کے آغاز کے لیے ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو تاریخی حقیقت ہے۔ جب عالم گیر ثانی کو ان کے وزیر نے قتل کرا کے ان کی لاش کو فیروز شاہ کوٹلے کے پیچھے پھنکوا دیا تھا تو ایک برہمن عورت رام جنی گوڑ جمنا کے اشنان سے واپس آ رہی تھی۔ اس نے بادشاہ کی لاش کو پہچان کر ساری رات



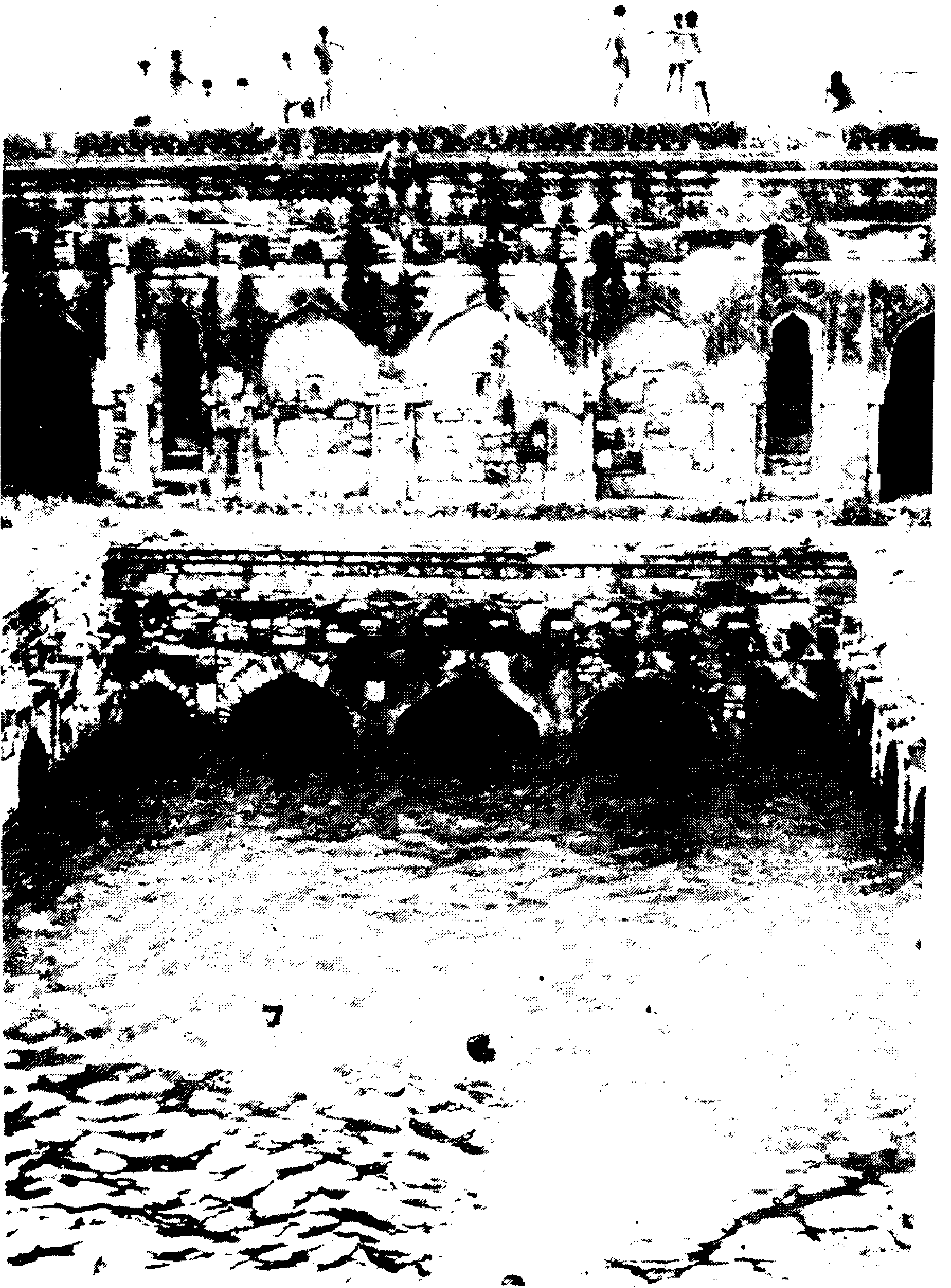
اس کی حفاظت کی تھی۔ بادشاہ شاہ عالم نے رام جنی گوڑ کو اس کی خیر خواہی کی بنا پر اپنی بہن بنالیا اور اسے بہت کچھ دیا۔ اس کے ساتھ بھی بہنوں والی ساری رسمیں برتتے رہے۔ وہ بھی سلونو کے دن بہت سی مٹھائی تھالوں میں لے کر قلعے میں آتی تھی اور بادشاہ کے ہاتھ میں سچے موتیوں کی راکھی باندھتی تھی۔ بادشاہ اس کو روپے اور اشرفیاں دیتے تھے۔

جنم اشٹمی کرشن کنہیا کے جنم دن کا تہوار ہے اور اس وقت بھی بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس روز ہندوؤں کے بازار اور دکانیں بند رہتی تھیں مگر حلوائیوں کی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ برلا مندر تو نئی دلی کے ساتھ بہت بعد میں بنا ہے مگر پرانی دلی کے سب ہی چھوٹے بڑے مندر اس موقعے پر خوب ہی سجائے جاتے تھے اور عمدہ عمدہ جھانکیاں بنائی جاتی تھیں جن میں کرشن جی کے بچپن کے مختلف منظر پیش کیے جاتے تھے۔ چاندنی چوک میں گوری شنکر کا مندر بہت سجتا تھا۔ دلی میں ان دنوں ہر گلی بازار اور کوچے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا مندر ہوتا تھا اور یہ مندر ایک سے ایک بڑھ کر سجائے جاتے تھے۔ اس سجاوٹ میں بستی اور محلے کے سب لڑکے بالے اور بڑے حصہ لیتے تھے اور سجاوٹ کی یہ تیاریاں ہفتوں پہلے شروع ہوجاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جنم اشٹمی کے موقعے پر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بھی ایک چھوٹا سا مندر بنا لیتے اور لڑکے اپنی الگ سجاوٹ کر کے گھر کے اندر یا باہر اپنا مندر بنا لیتے۔ لڑکوں کو یہ بھی لالچ ہوتا کہ جب گلی محلے کے لوگ دیکھنے آئیں گے تو ان کے مندر میں بھی ایک ایک دو دو پیسے چڑھائیں گے۔

جہاں شام ہوتی اور بتی جلتی، مندروں میں گھنٹے بجنے شروع ہوجاتے۔ [illegible] زیں اور بچے جوق در جوق' لہروں کی طرح گلیوں اور بازاروں میں نکل آتے اور سب [illegible] مندروں کی طرف ہوتا۔ زیادہ تر آدمیوں اور عورتوں اور بڑ[illegible] لڑکوں نے بھی صبح سے برت رکھا ہوا ہوتا مگر سب کے چہرے کرشن بھگتی میں سرشار ہوتے۔ ایک مندر سے نکلتے' دوسرے میں جانے اور سب کی سج دھج دیکھتے۔ جھانکیاں ایسی ایسی بنائی جاتیں کہ

دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ عموماً عورتیں اور بچے دس گیارہ بجے رات تک اپنے گھروں میں واپس لوٹ جاتے تھے مگر کرشن بھگت مرد اور بہت سی عورتیں بھی مندروں میں ہی بیٹھی رہتیں اور پوجا کرتیں۔ جب سری کرشن کے جنم کی گھڑی آتی یعنی کرشن جی کا جنم ہوتا تو لوگ خوشی کے مارے دیوانے ہو جاتے اور بھگوان کرشن جی کے نعروں سے مندر گونج اٹھتے۔ گھنٹے گھڑیال مسلسل بجتے اور لوگ مندر کے پرشاد سے ہی اپنا برت کھولتے اور گھر والوں کے لیے بھی پرشاد لے آتے۔ گھر میں عورتیں پوجا کرتیں اور پھر سب برت والے مل کر کھانا کھاتے۔ گھروں میں اس دن پوری کچوری اور طرح طرح کی پنجیری بنائی جاتی۔ عموماً گوند، مکھانے اور خربوزے کے بیجوں کی بہت لذیذ پنجیری بنتی تھی۔

ہفت تماشہ کے مصنف کے مطابق بعضے مسلمان بھی جنم اسٹمی کے دن کنس کا مجسمہ بنا کر اس کے پیٹ کو چاک کرتے تھے۔ اس میں شہد پہلے سے بھر دیتے تھے اور اسے اس کا خون سمجھ کر پیتے تھے۔ بہت سے مسلمان چلتی پھرتی جھانکیوں کو بھی بازاروں اور سڑکوں پر دیکھتے تھے اور کرشن جی اور رادھا کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔



باؤلی اگرسین

باؤڑیاں (باولیاں) اور تیراکی کے میلے

پرانے وقتوں میں پیراکی اور غوطہ خوری جان جوکھم کے کام سمجھے جاتے تھے. مگر دلی والوں کے لیے یہ کھیل ایک خاص مسرت اور جوش کے حامل بھی ہوتے تھے۔ اہل دلی کی ان گنت خصوصیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی کام میں تفریح اور دل بہلاوے کا سامان ہو تو وہ خطرہ مول لے کر بھی اسے کریں گے. پانی کے کھیل تماشے عموماً باؤلیوں یا باؤڑیوں اور مہرولی کے جھرنوں میں ہوتے تھے۔ لیکن جمنا چڑھی ہوئی ہوتی تو تیراک اور کہیں جانے کی نہ سوچتے۔ ان کے جھنڈ کے جھنڈ اس کے کناروں پر منڈلاتے رہتے اور ناک کو ہاتھ سے دبا کر غوطہ لگاتے اور مچھلی کی طرح چکر کاٹ کر باہر نکل آتے. ایسے موقعوں پر استادوں اور خلیفاؤں کی بھی بھیڑ لگی رہتی تھی جو اپنے شاگردوں کی پیٹھ ٹھونکتے رہتے اور خود بھی تیراکی کے ایسے ایسے جوہر دکھاتے کہ تماشائی دنگ رہ جاتے. وہ لڑکوں کو چھوٹی عمر سے ہی تیراکی اور غوطہ خوری سکھاتے تھے۔ یہ لڑکے اپنے استادوں کی دیکھ ریکھ میں اتنے ہوشیار ہو جاتے تھے کہ بڑی بڑی بلندیوں سے بڑے بھروسے سے چشم زدن میں پانی میں چھلانگ لگا جاتے. ایسا وہ جذبۂ شوق اور جذبۂ خود نمائی میں بھی کرتے تھے. آدمی کے پاس کوئی ہنر اور فن ہو تو اس کی نمائش ایک فطری امر ہے اور ہر فن کار داد و انعام کا خواہاں ہوتا ہے. یہ لڑکے بار بار اس لیے بھی کودتے تھے کہ تماشائی کچھ دیں گے اور تماشائی خوش ہو کر انہیں ضرور کچھ دیتے تھے چاہے وہ دو چار پیسے ہی ہوں.

جمنا میں پانی بہت ہو یا صرف ایک گدلی سی لکیر بہ رہی ہو، بچوں اور لڑکوں کے لیے اس میں بے پناہ کشش ہمیشہ رہی ہے۔ اور پھر جمنا میں کتنا بھی کم پانی ہوتا، تیرنے اور غوطہ خوری کے لیے بہت ہوتا۔ ہر صبح تیرنے والے لونڈوں کی ایک بڑی تعداد قطار باندھے ریل کے پل پر کھڑی ہو جاتی۔ ایک لنگوٹ یا جانگیے کے سوا بدن پر کچھ نہ ہوتا۔ کوئی گاڑی گزرتی تو سب کی آنکھیں اوپر اٹھ جاتیں۔ کوئی مسافر یا جمنا میّا کا بھگت گزرتی ہوئی گاڑی میں سے، کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر کوئی سکّہ اچھالتا تو یہ بچے دریا میں ایک چھپاکے سے کودتے اور اس سکّے کو نکال کر لے آتے۔ اس زمانے میں بڑی تعداد میں مسافر جمنا میں پیسے ڈالتے تھے اور اکثر سکّے جمنا کے پُل سے ٹکرا کر پانی میں گرتے اور سکّوں کے ٹکرانے کی چھن چھن کی آواز کسی ساز کی طرح اس وقت تک آتی رہتی جب تک کہ ریل پل پر سے نہیں گزر جاتی۔ سکّوں کی چھن چھن کے ساتھ لڑکوں کے پانی میں گرنے کے چھپاکوں کی صدا بھی آتی رہتی۔ ایسا شاذ ہی ہوتا کہ سکّہ پانی میں گرے اور یہ لڑکے نکال نہ پائیں۔ عموماً لڑکے اور سکّہ بیک وقت پانی میں گرتے اور لڑکوں کی نظر پانی میں ڈوبتے ہوئے سکّے پر جمی رہتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ لڑکے سکّے کو اس کے پانی کی سطح کو چھونے سے پہلے ہی فضا میں سے اچک لیتے اور یہ ان کی بے مثال پھرتی کا ثبوت ہوتا اور دیکھنے والے تالیاں بجاتے اور واہ واہ کہہ کر خوب شور مچاتے۔

مہرولی اور اس کے آس پاس بہت باؤلیاں تھیں۔ اس علاقے میں آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور پتھریلے ٹیلے ہیں اور کئی جگہوں پر ان کے درمیان پتھریلی دیواروں سے گھری ہوئی ایسی نیچی زمین ہوتی جہاں بارش کا پانی اکٹھا ہو جاتا اور اگلی بارش تک نہ سوکھتا۔ ان میں سے دو باؤلیاں تو بڑی مشہور ہیں اور بڑے عرصے سے استعمال ہوتی آئی ہیں۔ ان میں سے ایک گندھک کی باؤلی کہلاتی ہے کیونکہ اس کے پانی میں گندھک کی آمیزش ہے۔ اس باؤلی میں لوگ اپنے جلدی امراض کے انسداد کے لیے بھی نہاتے تھے اور اس کا پانی بوتلوں اور شیشیوں میں بھر کر گھر بھی لیجاتے تھے۔ یہ باؤلی ادھم خاں کے مقبرے سے تقریباً سو گز جنوب میں ہے۔ ادھم خاں مغل شہنشاہ اکبر کا اس رشتے

سے بھائی تھا کیونکہ وہ اکبر کے ساتھ ہی محل میں ہمایوں کی محافظت میں پلا تھا۔ دلی والے ادھم خاں کے مقبرے کو بھول بھلیاں کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔ گندھک کی باؤلی غلام بادشاہ التمش کے زمانے میں تیرھویں صدی کے آغاز میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ پانچ منزلوں یا چھجوں پر مشتمل ہے اور اس کے جنوبی سرے پر گول دیوار ہے۔ اس باؤلی پر ہر چھٹی کے دن دلی کے سیلانیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی اور وہ اوپر کے چھجوں سے نوجوان تیراکوں کو پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ استاد اور خلیفے بھی اپنے اپنے کمال دکھاتے اور ان کے سرپرست انہیں انعام اور بخشش سے نوازتے۔

اس کے جنوب میں تقریباً چار، سوا چار سو گز کے فاصلے پر دوسری چار چھتوں والی باؤلی ہے جس کا نام "راجوں کی بائیں" ہے۔ سید احمد کے مطابق سنسکرت ادب میں ایسے سیڑھی دار کنوؤں کا جنھیں بائیں، دائیں یا باؤلیاں کہتے تھے بڑا تذکرہ ملتا ہے۔ گجرات اور راجستھان میں بھی ایسی باؤلیاں ابھی تک ملتی ہیں۔ مسلم حکمرانوں نے باؤلیوں کو عمدہ طریقے سے بنے ہوئے تفریح گھروں کے طور پر بھی بنایا۔ ان میں اندر ہی اندر جانے والے لمبے راستے، حوض کے اوپر محرابیں اور اوپر سے نیچے اترنے والی سیڑھیاں ہوتی تھیں۔ حوض میں پانی زمین کے نیچے سے آتا تھا۔ راجوں کی باؤلی کی سب سے اونچے چھجوں کی دیواروں کے اندر سے نیچے اترنے والی سیڑھیاں اسے ایک مسجد سے ملا دیتی ہیں جہاں ایک چھتری ہے جس پر کھدا ہوا ہے کہ اس باؤلی کو سکندر لودھی کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مہرولی کے باہر کی سرحدوں پر ایک تالاب ہے جسے حوضِ شمسی کہتے ہیں۔ اسے ۱۲۳۰ میں سلطان شمس الدین التمش نے بنوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان اس تالاب کے لیے ایک مناسب جگہ تلاش کرنے کے لیے فکرمند تھا کہ ایک رات اس نے خواب میں حضرت علی کو گھوڑے پر چڑھے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے اسے کہا کہ تالاب اسی مقام پر بناؤ جہاں میں تم کو خواب میں نظر آرہا ہوں۔ اگلی صبح کو التمش نے اپنا یہ خواب خواجہ بختیار کاکی کو سنایا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچا جس کا اشارہ حضرت علی نے

خواب بن گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رض کے گھوڑے کے سموں کا ایک نشان وہاں بنا ہوا تھا اور اس میں سے پانی نکل کر بہہ رہا تھا۔ بس سلطان نے وہیں ایک حوض اور گنبد بنوانا شروع کر دیا۔

علاؤالدین خلجی کے زمانے میں یہ تالاب کبھی کبھی خشک ہو جاتا تھا۔ جب اسے اس بات کا پتہ چلا تو ۱۳۱۲ میں اس نے اس کی پوری صفائی کروا ڈالی۔ اس کی وجہ سے پانی کے آنے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ دور ہو گئیں۔ بعد میں فیروز شاہ تغلق نے (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸) میں اس کی پوری مرمت کرائی۔ جن نالیوں اور راستوں کے ذریعے پانی آتا تھا انہیں اچھی طرح کھلوایا گیا اور ایک بند تعمیر کرا کے اسے نولکھی نالے کے ساتھ جوڑ دیا گیا جو تغلق آباد کے قلعے کو پانی مہیا کرتا تھا۔ حوضِ شمسی پھر پانی سے لبالب بھر گیا اور موسمِ برسات میں تو یہ میلوں دور سے نظر آیا کرتا تھا۔

اس وقت سے یہ حوض تیراکی کے کھیلوں کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ تیراکوں اور تماشائیوں کے ہجوم ہر تعطیل کے دن یہاں اکٹھے ہوتے تھے اور میلہ سا لگ جاتا تھا۔ لیکن صرف وہی تیراک جن میں بڑی جان اور حوصلہ ہوتا اس کے گنبد تک پہنچ سکتے تھے۔ گنبد کو نیچے سے یا ذرا سے فاصلے سے دیکھنے سے یہ دھوکا ہوتا تھا کہ صرف چند گز کی اونچائی پر ہی ہے۔ حوضِ شمسی کے پاس ہی عمارتوں کا ایک جھرمٹ تھا جن کا نام جھرنا پڑ گیا تھا۔ اس میں سے برسات کے موسم میں حوض کا سارا فالتو پانی نیچے گرتا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے اپنی ایک تحریر میں اس کا مقابلہ بہشت کے ایک مقام سے کیا ہے۔

بند کا پانی ایک وسیع دالان کی کھوکھلی چھت پر سے ہو کر گزرتا تھا۔ چھت میں بے شمار سوراخ تھے جن میں سے پانی بارش کی بوندوں کی طرح برستا تھا۔ دالان کی دیواروں میں سینکڑوں آلے بنے ہوئے تھے جن میں جلتے ہوئے چراغ رکھ دئے جاتے تھے جب پانی ان چراغوں کے سامنے پڑتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ پگھلا ہوا سونا اوپر سے نیچے گر رہا ہے چھت کی چار دیواری کے نیچے تیرہ پرنالے بنے ہوئے تھے جن میں سے پانی ایک برآمدے میں سے بہہ کر ایک شور مچاتے ہوئے موٹے دھارے کی شکل میں نیچے تالاب میں گرتا تھا۔

مغل بادشاہوں نے اس جگہ پر ایک بارہ دری اور ایک آرام گاہ تعمیر کروائی تھی۔ محمد شاہ رنگیلا اور اس کے حرم کی عورتیں اس جگہ کی شیدائی تھیں۔ مغل شہزادیاں اسی حوض میں تیرنا پسند کرتی تھیں۔

بعد کے دنوں میں یہ باؤلی دلی والوں کے لیے ایک پکنک گاہ یا سیر و تفریح کا مرکز بن گئی۔ کوئی دن ہی ایسا ہوتا جب یہاں کوئی بھیڑ نہ ہوتی۔ تیراک اور غوطہ خور ہر روز ہی آتے اور پانی میں اور پانی کی سطح کے اوپر طرح طرح کی قلابازیوں کا مظاہرہ کرتے۔ دو لڑکے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے لیے غوطہ خور کے دونوں کندھوں پر دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے اور یہ غوطہ خور خود اپنے استاد کے کندھوں پر کھڑا ہوا ہوتا۔ چشم زدن میں یہ لوگ جھرنے سے حوض میں کود پڑتے۔ اور پھر تو ایک سلسلہ شروع ہو جاتا اور تیراک اوپر چڑھ چڑھ کر یکے بعد دیگرے حوض میں کودتے رہتے۔

حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے احاطے کے شمالی دروازے پر ایک اور بڑی باؤلی ہے جسے پیر و مرشد کے پیروکار بہت مقدس مانتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیا کو دلی والے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، محبت اور احترام سے محبوب الٰہی اور سلطان جی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ باؤلی جس وقت تعمیر ہو رہی تھی، اسی وقت غیاث الدین تغلق اپنا قلعہ تعمیر کروا رہا تھا۔ محبوب الٰہی اپنے پڑوسیوں کو تازہ اور صاف شفاف پانی مہیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے اس خیال سے کہ قلعہ پر کام کرنے والے مزدوروں میں سے ہی کچھ باؤلی پر کام کرنا نہ شروع کر دیں حکم دیدیا تھا کہ کوئی مزدور دن کے وقت نظام الدین اولیا کی درگاہ کی طرف نہیں جائے گا۔ اس حکم کی وجہ سے مزدوران کے لیے رات کو کام کرتے رہے۔ اس کے لیے موقعے پر تیل کی کپّیاں اور چراغ جلالیے جاتے تھے۔ جب بادشاہ کو اس کا پتہ لگا تو اس نے درگاہ اور باؤلی کے لیے تیل کی فروخت پر پابندی لگادی۔ پھر ایک معجزہ ہوا۔ کام تو روشنی نہ ہونے کے سبب رک ہی گیا تھا مگر محبوب الٰہی نے فرمایا کہ باؤلی کے پانی کو تیل کی طرح استعمال کیا جائے اور کام شروع کر دیا جائے۔ اس باؤلی کے پانی کو تیل کی جگہ کپّیوں اور چراغوں میں استعمال کیا گیا اور اس نے تیل

کا کام دیا!

اس باؤلی کی تعمیر کا کام ۱۳۲۱ء میں پورا ہو گیا تھا اور سلطان جی نے اپنے دستِ مبارک سے اسے بابرکت بنا دیا۔ یہ حوض ۱۹۰ فٹ لمبا اور ۱۲۰ فٹ چوڑا ہے۔ جنوب، مشرق اور مغرب میں اونچے پتھروں اور کنکریٹ کی دیوار ہے اور شمالی سمت سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ حوض کی دیواروں پر مختلف اوقات میں عمارتیں بنتی چلی گئیں۔ اس کے جنوبی اور مشرقی اطراف میں نیچے محراب دار راستے اور کمرے ہیں۔ ارد گرد کی عمارتوں کی چھتوں پر سے تربیت یافتہ اور تجربے کار تیراک سیدھے باؤلی میں غوطہ لگاتے ہیں اور یہ اونچائی کم سے کم ۶۰ فٹ کے قریب ہوتی ہے۔

ٹالسٹائی مارگ سے نکلتی ہوئی ایک گلی میں، کستوربا گاندھی مارگ کی متعدد منزلہ بلند عمارتوں کے پس منظر میں اگرسین کی باؤلی ہے جو اسلامی فنِ تعمیر کے نمونے پر ایک بہت خوبصورت تخلیق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ باؤلی راجہ اگرسین کی ہی بنوائی ہوئی ہے۔ اس باؤلی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا۔ پرانی دلی سے تیراک، جوان بھی اور بوڑھے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس باؤلی پر آتے رہتے ہیں۔

جمنا تو دلی والوں کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصّہ ہے۔ موسمِ برسات میں تو، جب اس میں پانی خوب بھرا ہوتا ہے بلکہ طغیانی پر ہوتی ہے، یہ تیراکوں کے جوش و خروش کا سب سے بڑا مرکز بن جاتی ہے۔ جمنا کی طوفانی، بے تاب لہروں کا اتار چڑھاؤ، کہیں کہیں گرداب کی صورت میں چکر کھانے والی تیز و تند لہریں اور شور مچا کر پُل سے ٹکراتا ہوا پانی جیالے اور باہمت تیراکوں کو للکارتا ہے اور وہ بھی ان لہروں سے کھیلنے کے لیے اپنے اندر ایک عجیب و غریب جوش پاتے ہیں۔ کھیل میں اگر خطرے کا عنصر بھی شامل ہو تو دلی والوں کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایسے میں جمنا پر جو منظر ہوتا تھا، وہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ تیراک ایسے ایسے جوہر اور کرتب دکھاتے تھے کہ منہ سے بے ساختہ واہ نکلتی تھی۔ یہ تیراکی کے میلے کہلاتے تھے اور موسمِ برسات میں لگاتار ہوتے رہتے تھے۔

مجنوں کے ٹیلے سے تیراک پانی میں کودتے۔ کھڑی لگاتے۔ میلوں نکل جاتے۔ کوئی

پانی پر سوتا چلا جا رہا ہے تو کوئی پنجرہ ہاتھ میں لیے ہے اور سر پر طوطا بٹھا رکھا ہے۔ کوئی سوئی پرو رہا ہے تو کوئی سادھو کی طرح آلتی پالتی مارے تیر رہا ہے۔ کوئی مینڈک کی طرح اچھل اچھل کر لہروں پر چلا جا رہا ہے تو کوئی بہاؤ کے خلاف شیر کی طرح تیر رہا ہے۔ کوئی چارپائی پر لیٹا ہے تو کسی نے کوئی اور جوگیا آسن لگایا ہوا ہے۔

تیراکوں کی الگ الگ ٹولیاں بنی ہوتیں اور وہ ایک دوسرے سے بازی لینے کی کوشش میں طرح طرح کے کرتب دکھاتیں۔ استاد اور ان کے شاگرد تیرتے چلے آرہے ہیں۔ ایک شاگرد سر پر انگیٹھی رکھے تیرتا چلا آرہا ہے اور دوسرا اس انگیٹھی میں سے آگ لے کر چلم بھرتا تیرتا چلا جا رہا ہے۔ تیسرا ابھری چلم اس سے لے کر استاد تک پہنچا رہا ہے۔ استاد حقے کے دم لگاتے چلے جا رہے ہیں۔

تین چار شاگرد ایک لکڑی کے تختے کو ہاتھوں سے تھام کر تیرتے چلے آرہے ہیں۔ تختے پر بیسوا ناچ رہی ہے اور سازندے سارنگی اور طبلہ بجا رہے ہیں۔ موسیقی کی دلفریب آواز کناروں تک آرہی ہے لیکن لوگوں کی آنکھیں رقص کرتی ہوئی بیسوا پر جمی ہیں اور سب اس دلفریب تماشے پر حیرت زدہ ہیں۔

کچھ تیراک الگ الگ بھی تیر رہے ہیں مگر کمال ان کی تیراکی میں بھی ہے۔ ایک تیراک سیدھا پانی میں آدھا ڈوبا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھڑا ہو کر تیر رہا ہے۔ ایک تیراک بے جان تختے کی طرح الٹا لیٹا بہا چلا جا رہا ہے۔ کسی نے اپنی پیٹھ پر گلدستے سجائے ہوئے ہیں۔ ایک تیراک نے اپنے ایک ہاتھ میں ہنومان کی مورتی پانی کی سطح سے اوپر اٹھائی ہوئی ہے اور جے بجرنگ بلی کی آواز لگاتا ہوا تیر رہا ہے۔ ایک نے اپنے دونوں کندھوں پر دائیں اور بائیں طرف ایک ایک پرندہ بٹھایا ہوا ہے اور مجال ہے کہ کوئی پرندہ چند لمحوں کے لیے بھی اڑ جائے۔

مغلوں کے آخری دنوں میں ایک مشہور تیراک میر ماہی ہو گزرا ہے۔ وہ اپنے فن کا لاثانی ماہر تھا اور پانی میں مچھلی کی سی تیزی اور آسانی سے تیرتا تھا۔ حال ہی کے زمانے میں استاد بُندو اور خلیفہ ننھے نے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی اور تمام دلی والے انہیں بڑی

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اُس گزرے ہوئے زمانے کے بارے میں سوچتے ہیں تو دل میں ایک کچوکہ سا لگتا ہے۔ جمنا وہی ہے مگر تیراکی کے وہ منظر ایسے اوجھل ہو گئے ہیں کہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں گے۔ باؤلیاں موجود ہیں ان میں پانی بھی ہے مگر اب ان کی حیثیت زندہ تفریح گاہوں کی نہیں بلکہ آثارِ قدیمہ کی ہے۔ تیراکی کا فن نہیں مٹا مگر اس کی وہ عوام کو موہ کرنے والی صورت مٹ گئی ہے۔ تیراکی کے مقابلے آج بھی ہوتے ہیں مگر بڑے بڑے سٹیڈیا یا عظیم الشان ہوٹلوں اور کلبوں میں۔ آج کے تیراک گلی کوچوں کے لڑکے اور نوجوان نہیں ہیں بلکہ اعلیٰ گھرانوں کے تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ وہ جمنا کے کنارے تیراکی کے میلے اور باؤلیوں پر تیراکوں کے جمگھٹ اور عوام کے ہجوم تو ایک خواب بن کر رہ گئے ہیں۔



پنکھا

پھول والوں کی سیر

اگر دلّی کی مشترکہ تہذیب، میل جول اور آپسی بھائی چارے کو کسی تہوار یا میلے کی صورت میں دیکھنا ہو تو ذہن میں بے ساختہ "پھول والوں کی سیر" کا میلہ ابھرتا ہے۔ ہمارے ملک میں سب ہی مذہبوں کے ماننے والے رہتے ہیں، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی بھی اور جین، بودھ اور یہودی بھی۔ یہ سب اس ملک میں سینکڑوں ہزاروں برسوں سے مل جل کر رہتے آئے ہیں۔ ہمارے آج کے جمہوری نظام میں بھی، ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے اگرچہ حکومت مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کی نیتی اپنائے ہوئے ہے۔ یہاں کے باشندوں کو اپنی مذہبی رسوم، تیج تہوار اور میلے ٹھیلے منانے کی مکمل آزادی ہے۔ دلی کے بیشتر تہوار اور میلے مذہبی اور موسمی ہیں مگر "پھول والوں کی سیر" دلی والوں کی باہمی محبت کی اُپج ہے۔

"پھول والوں کی سیر" کا میلہ، ایک ایسا میلہ ہے جس کے بارے میں صحیح طور پر بتایا جا سکتا ہے کہ کب اور کیسے شروع ہوا۔ آج سے کوئی پونے دو سو سال پہلے دلی کے لال قلعے میں اکبر شاہ ثانی کی حکومت تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے ایک چہیتے بیٹے تھے مرزا جہانگیر۔ بادشاہ کے اصل ولی عہد تو تھے بہادر شاہ ظفر مگر وہ کسی وجہ سے انھیں پسند نہیں کرتے تھے اور مرزا جہانگیر کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے اس بات کو نہیں مانا۔ اُن دنوں بادشاہ پر فرنگیوں کا دباؤ تھا۔ اگرچہ حکومت بادشاہ کی تھی مگر حکم فرنگیوں

کا چلتا تھا۔ بادشاہ مالی طور پر بھی انگریزوں کے دست نگر تھے کیونکہ ان سے دو لاکھ روپے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔ ایک انگریز ریذیڈنٹ قلعۂ معلیٰ میں رہتا تھا اور بادشاہ کوئی فرمان جاری کرتے تو اس کی منظوری لیتے۔ مرزا جہانگیر لاڈ پیار میں بگڑ گئے تھے۔ ایک دن قلعے میں مقیم ریذیڈنٹ سے ان کا سامنا ہوا تو مرزا نے کہا۔ "لُو لُو ہے بے لُو لُو ہے" ریذیڈنٹ جس کا نام سٹین تھا سمجھ تو گیا کہ شہزادے نے بے ہودگی کی ہے مگر پھر بھی اس نے مرزا کے ساتھیوں سے پوچھا کہ صاحب عالم کیا کہتا ہے۔ ساتھیوں نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "حضور صاحب عالم نے آپ کو لولو یعنی آبدار موتی کہا ہے" سٹین جو سمجھ گیا تھا کہ شہزادے نے اس کی بے عزتی کی ہے، نفرت آمیز ہنسی سے بولا۔ "ہم صاحب عالم کو لولو بنائیگا" مرزا جہاں گیر سمجھتے تھے کہ ان کے باپ کی حکومت ہے، اس فرنگی کا یہ حوصلہ کہ یہ ہمیں لولو بنائے، جھٹ سے طمنچہ نکالا اور ریذیڈنٹ پر داغ دیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ نشانہ چوک گیا۔ ریذیڈنٹ نے اس واقعے کی تفصیل کمپنی کو لکھ بھیجی اور مرزا جہانگیر کو نظر بند کرکے الہ آباد بھیج دیا اور بادشاہ کو بتایا کہ شہزادے کو تربیت کی ضرورت ہے، جب تربیت پوری ہو جائے گی، الہ آباد سے واپس بلا لیے جائیں گے۔ بادشاہ مجبور تھے، خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ مرزا جہانگیر کی والدہ نواب ممتاز محل کا برا حال ہو گیا مگر رو دھو کر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے منت مانی کہ جب مرزا جہانگیر چھٹ کر آئیں گے تو قطب صاحب میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤنگی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مرزا جہاں گیر سیٹن کے ہی حکم سے کچھ عرصے کے بعد رہا ہو گئے۔ جب وہ الہ آباد سے دلی کے لیے روانہ ہوئے تو راہ میں ہر جگہ پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔

بادشاہ بیگم نے بڑی دھوم دھام سے چادر چڑھائی اور شہر بھر کے ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ کئی دن تک میلہ بھرا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی، اس میں پھولوں کا ایک پنکھا بھی لٹکا دیا تھا۔ بادشاہ کو یہ میلہ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے تجویز کی کہ ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے اور مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں اور ہندو جوگ مایا جی کے مندر پر مگر دونوں ہی جگہوں پر ہندو اور مسلمان دونوں شریک

ہوں۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی محبت کو بھی فروغ ملے گا۔ اس طرح سے پھول والوں کی سیر کا میلہ شروع ہوگیا جو سیرِ گل فروشاں بھی کہلاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ پہلے میلے میں ہی سراج الدین ظفر نے جو اس وقت ولی عہد تھے، یہ پنکھا کہہ کر گزرانا تھا۔

نورِ الطاف و کرم کی ہے یہ سب اس کے جھلک
کہ وہ ظاہر ہے مَلَک اور ہے باطن میں مُلک
اس تماشے کی نہ کیوں دھوم ہوا افلاک تلک
آفتابی سے خجل جس کے ہے خورشید فلک

یہ بنا اس شہہ اکبر کی بدولت پنکھا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں بادیدۂ دل
واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشمِ انجم ہو نہ اس سیر پر کیوں کر مائل
سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگم والا منزل

جس کے دیواں کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک
ڈوبے ہیں انگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگین ہے رعیت سے لگا شاہ تلک
زعفران زار ہے اک بام سے درگاہ تلک

دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

بھادوں کا موسم ہے اور مینہہ برس رہا ہے۔ کبھی برس کر رک جاتا ہے اور کبھی پھر شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی ننھی بوندوں کی پھوار ہے اور کبھی چھتوں پر سے پرنالے دھائیں دھائیں نیچے گر رہے ہیں۔ جمنا چڑھی ہوئی ہے۔ ایسے موسم میں قلعے والوں کو پھول والوں کی سیر کے میلے کا خیال آتا ہے اور بادشاہ کے حضور میں درخواست کی جاتی ہے کہ مناسب

سمجھیں تو میلے کی تاریخ مقرر کردیں۔ بادشاہ تاریخ مقرر کردیتے ہیں۔ بس اسی وقت سارے شہر میں نفیری بجا کر اعلان ہوجاتا ہے اور قلعے میں زور شور سے تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔ عموماً یہ میلہ بھادوں کی پندرہ تاریخ کو شروع ہوتا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی بادشاہ، شہزادے اور شہزادیاں منھ اندھیرے ہی قطب کے لیے روانہ ہوجاتے تھے۔ بادشاہ کی سواری بڑی دھوم سے نکلتی تھی اور راستے میں پرانے قلعے، شیر شاہ کی مسجد، ہمایوں کے مقبرے، درگاہ حضرت نظام الدین اولیا ہوتی ہوئی مدرسے یعنی صفدر جنگ کے مقبرے پر ٹھہر جاتی تھی۔ بادشاہ اور ان کے سب ساتھی دو ڈھائی گھنٹے آرام کرتے اور خاصہ تناول کرنے کے بعد شام تک مہرولی پہنچ جاتے تھے۔ مہرولی میں جنگلی محل، جواب نہیں رہا، اور مرزا بابر کی کوٹھی پہلے سے آراستہ کردی جاتی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی محل میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ منھ ہاتھ دھو کر، کپڑے بدل کر پہلے سب نے نماز پڑھی اور پھر سب شہزادوں اور شہزادیوں نے درگاہ شریف پر حاضری دی۔ پھر جہاز محل پر جاکر دم لیا۔ شمسی تالاب کی سیر کی اور اولیا مسجد سے جھرنے جا پہنچے۔ اس وقت کے جھرنے کے کیا کہنے۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب پر بند باندھ کر اس کا پانی نولکھی نالے میں ڈالا تھا اور اس نالے کو تغلق آباد کے نالوں سے ملادیا تھا تاکہ قلعے میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہوگیا، نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر ۱۷۰۰ میں نواب غازی الدین فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے حوض بنوائے، نہریں نکالیں، فوارے لگوائے اور اس خطے کو جنت کا نمونہ بنادیا۔ شہزادے اور شہزادیاں خوب آزادی سے سب جگہ سیر کرتے، جھولے جھولتے اور طرح طرح کے پکوان کھاتے تھے۔

دلی والے اس "سیل" کی تیاریاں تو سال بھر سے کرتے تھے مگر پہنچتے تھے ایک رات پہلے۔ میلے والے دن، سارا دن کھاتے پیتے، پتنگ اڑاتے، مرغ اور بٹیر لڑاتے اور شام کو پنکھے کی انتظار میں چھجوں، کٹہروں، برآمدوں اور چبوتروں پر بیٹھ جاتے یا راستے میں کھڑے ہوجاتے۔ ان کے پرانی دلی سے قطب صاحب تک پہنچنے کا منظر بھی بڑا دلفریب تھا۔

یوں سمجھ لیجئے کہ دلی خالی ہو جاتی تھی اور مہرولی آباد ہو جاتی تھی۔ سواریوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ ٹھسا ٹھس بھرے تانگے، اونٹ گاڑیاں، بیل گاڑیاں اور ٹھیلے چلے جا رہے ہیں۔ مردوں، عورتوں اور بچوں نے نئے نئے کپڑے پہنے ہیں اور خوشی اور جوش سے سب کے چہرے تانبہ بنے ہوئے ہیں۔ پیدل جانے والوں کی گنتی بھی کچھ کم نہ ہوتی۔ جتنا ہجوم سواریوں پر لدا ہے، اتنا ہی دونوں طرف پیدل چل رہا ہے۔ کسی کے سر پر بڑا سا مٹکا ہے جو صندوق اور چھتری دونوں کا کام دیتا ہے۔ مٹکے میں زرق برق کپڑے ہیں۔ کسی کی بغل میں جوتیاں ہیں تو کوئی سر پر گٹھڑی لادے چلا آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر سستانے کے لیے مدرسے پر ٹھہر جاتے اور تازہ دم ہو کر پھر قافلہ روانہ ہو جاتا۔ جو ہے قطب صاحب چلا جا رہا ہے۔

مہرولی میں مہینوں پہلے سے ٹھہرنے کے بندوبست کیے ہوتے۔ مکان، کوٹھے، کوٹھریاں، باغ باغیچے سب آباد ہو جاتے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ مہرولی کے بازار کی کایا پلٹ جاتی۔ دکانیں خوب سجتیں۔ دکانوں کے اوپر کوٹھے بھی بڑے قرینے سے سجائے جاتے تھے۔ جھاڑ، فانوس، ہانڈیاں لٹکائی جاتی تھیں۔ یار لوگ نہایت نفیس کپڑے پہنے، جوئی کے کنٹھے اور موتیا کے ہار گلے میں ڈالے، عطر کے پھوئے کان میں اڑسے، پان چبائے، حقے کا دم لگاتے، سیر کا لطف اٹھاتے گھومتے پھرتے۔ بھیڑ اتنی ہو جاتی کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگتا اور گزرنا مشکل ہو جاتا۔

ہر ایک مکان سے چھم چھم کی آوازیں سنائی دیتیں۔ شہر بھر کی طوائفیں ڈیرے ڈال دیتیں اور دن رات مجرے ہوتے رہتے۔ جگہ جگہ پتنگوں کے پیچ لڑتے۔ دنگلوں میں پہلوانوں کی کشتیاں ہوتیں۔ ڈھول تو بجتا ہی رہتا مگر تماشائی ہر لمحے اتنا شور مچاتے اور چیختے چلاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ککڑ والے کی نرالی شان ہے۔ بہت بڑے پانچ چھ فٹ کے حقے میں پانچ چھ گز لمبی نے لگی ہوئی ہے۔ سارا حقہ پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ چاندی کے گھنگرو لٹکے ہوئے ہیں۔ بازار والے باری باری نے پکڑ کر کش لگا رہے ہیں۔ پھر بالا خانے سے کوئی آواز دیتا ہے کہ میاں نے اوپر کر دو تو اوپر کر دی جاتی ہے اور بالا خانوں

بن بیٹھے دو دو کش لگا لیتے ہیں۔ جگہ جگہ تندور بھی لگے ہیں اور خمیرے کی لپٹیں دور دور تک آ رہی ہیں۔ دیگ کا ڈھکن اٹھتا تو سارا بازار مہک جاتا۔ سقے جگہ جگہ مشک لیے کھڑے ہوتے اور کٹورہ بجاتے رہتے۔ ہر راہ گیر سے پوچھتے۔" میاں آبِ حیات پلاؤں ؟"
جس کا جی چاہا اس نے پانی پیا اور پیسہ دو پیسہ دے کر آگے بڑھ گیا۔

گندھک کی باؤلی پر بھی بڑا جمگھٹا لگا ہوتا۔ کودنے والے لڑکے لنگر لنگوٹ پہنے کھڑے ہیں۔ کسی نے کوئی سکّہ انہیں دکھا کر باؤلی میں پھینکا اور یہ چھلانگ لگا گئے۔ تھوڑی دیر میں ابھر کر آئیں گے تو پھینکا ہوا سکّہ ان کے دانتوں میں ہوگا۔ سکّہ پھینکنے والے کو سلام کر کے یہ لڑکے پھر باؤلی پر کھڑے ہو جائیں گے تاکہ کوئی اور تماشائی ان کا کرتب دیکھنے کے لیے سکّہ پھینکے۔

امریوں کی رونق دیدنی ہوتی تھی۔ مور جھنگار رہے اور کوئلیں کوک رہی ہیں۔ کڑاہیاں پک رہی ہیں، دیگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ طرح طرح کے پکوان اور کھانے بن رہے ہیں۔ کئی جگہوں پر لوگوں نے چوسنی آم چوس چوس کر گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دئے ہیں۔ میوہ مٹھائیاں، پھل پھلاری سبھی کچھ ہے۔ پھینیاں اور اندرسے کی گولیاں موسم کی خاص مٹھائیاں ہیں۔ جھولے پڑے ہوئے ہیں اور جامنیں گری پڑی ہیں اور ٹپ ٹپ گرتی جا رہی ہیں۔ کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ عورتیں لمبی لمبی پینگیں بڑھا کر جھولے پر بادشاہ کا گیت گا رہی ہیں ـــ

جھولا کن نے ڈالو ہے امریاں
باگ اندھیرے تال کنارے
مرلا جھنیکارے، بادر کارے
برسن لاگیں بوندیں، پھُیاں پھُیاں
جھولا کن نے ڈالو ہے آمریاں

امریوں میں ایک پر فضا جگہ پر شاہی مستورات کے لیے خیمے تن جاتے۔ ریشمی جھولوں اور خوشنما رنگین پٹریوں پر بیگمیں اور شہزادیاں جھولتیں۔ ڈومنیاں ملہار گاتیں۔ پکوان

اور مٹھائیاں کھائی جاتیں اور جنگل میں منگل ہو جاتا۔

پھول والوں کی سیر کا بیان ان اشعار میں کتنی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

خلق اللہ کیوں خروشاں ہے — آج کیا سیرِ گل فروشاں ہے
بہلیوں یکوں کا اک تانتا ہے — جس کو دیکھو وہ قطب جاتا ہے
بھائی جگو کے ہے سر پہ دکان — جا کے مہرولی میں بیچے گا پان
میاں غفور بھی اس میلے پر — لائے ہیں سارا کنبہ ٹھیلے پر
پاپیادوں کے دیکھیے بوتے — لیے ہوئے ہیں بغل میں جوتے
اب آیا قصبے کا مینا بازار — سجی سجائی دکانوں کی قطار
ہر ایک دکان میں بھرا ہے مال — مٹھائیوں کے چن رہے ہیں تھال
ناشپاتی، انار اور امرود — کہیں کڑھائے میں چڑھا ہے دودھ
بیچتا ہے کوئی بڑھیا کے بال — سیو بیسن کے اور چنے کی دال
کباب سیخ بھن رہے ہیں کہیں — لوگ قوالی سن رہے ہیں کہیں
ناچ گانے ہر اک مکان میں ہیں — عطر کے پھوئے سب کے کان میں ہیں
بام پر ہیں نواب موٹے سے — نے پکڑ لی انھوں نے کوٹھے سے
آئے بازار میں گردھاری لال — توند اتنی ہے کہ دشوار سنبھال
رئیس ہیں یہ حال ہے پتلے — خریدتے ہیں انگوٹھی چھلے
ہنسی مذاق کا عجب ہے طور — چل رہا ہے شرابِ ناب کا دور
بوتل اک اور آنے والی ہے — نواب پتلی گانے والی ہے

بادشاہی خیمے سے لے کر حضرت قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ شریف تک جہاں مستورات جا سکتی تھیں دورویہ قنات کھڑی کر کے پردہ کر دیتے تھے۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پر اور صندل دان اور عطر دان بیگم نے اپنے سر پر اور مٹھائی کے خوان شہزادوں نے اپنے سروں پر رکھ کر آستانۂ پاک کی راہ لی۔ بیگمیں اور شہزادیاں بھاری اور قیمتی جوڑے پہنے ہوئے تھیں۔ لاکھوں روپے کا جڑاؤ گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور نارنول

کی مہندی رچی تھی۔ دو دو لونڈیاں ڈھیلے پائنچوں کو اور دو دو باندیاں دوپٹے کو سنبھالے چل رہی تھیں آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والی عورتیں تھیں۔ باجے گاجے آستانے کے باہر تھما دئے گئے۔ بیگم اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک پہنچ کر رک گئیں۔ بادشاہ اور مرد مزار شریف پر گئے اور غلاف اور صندل چڑھایا۔ شیرینی تقسیم ہوئی اور نقد نذرانہ جھری میں بھر دیا گیا۔ اس کے بعد سب شاہی گھرانہ خیمے پر لوٹ آیا۔ رات کے کھانے کے بعد محلسرا میں ناچ گانا ہو۔ صحن میں کھم گڑے تھے۔ نوجوان شہزادیاں جھولوں میں بیٹھیں اور ڈومنیوں نے انہیں جھلاکر یہ غزل گائی ـــــ

میرے دل کی کنجی، میری جان جھولا
میری آرزو، میرا ارمان جھولا
کروں کیوں نہ آؤ بھگت اس کی دل سے
برس دن میں آیا ہے مہمان جھولا
یہ بہنوں سے میری ملاتا ہے مجھ کو
بڑا مجھ پر کرتا ہے احسان جھولا
جو دیتی ہے جھونٹے کوئی لمبے لمبے
اڑاتا ہے کیا میرے اوسان جھولا
بلایا ہے سمدھن کو جھولا جھلانے
بنے گا نہ کیوں کر پرستان جھولا
ہوا ختم ساون لگا آج بھادوں
جھلاؤگی کب تک پچی جان جھولا
ایک ادا ہے یہ ہندوستان کی
نہ کیوں جھولیں ہندو مسلمان جھولا !

چودھویں تاریخ کو، مغرب کے بعد، جوگ مایا مندر کے لیے پنکھا اٹھتا تھا۔ جہاں جھرنے سے نفیری کی آواز آئی، خلقت ادھر ٹوٹ پڑی۔ پنکھا جھرنے سے اٹھایا گیا

یہ پھولوں کا بڑا خوبصورت پنکھا ہے جس میں کئی رنگ کی پنیّاں لگی ہوئی ہیں۔ ہنڈوں کی روشنی میں خوب جگمگا رہا ہے۔ سب سے آگے ڈھول تاشے والے۔ ان کے پیچھے دلی کے اکھاڑے جن میں استاد اور پٹھے اپنے کرتب دکھا رہے ہیں۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے، کوئی تلوار اور خنجر کے جوہر دکھا رہا ہے۔ کہیں بانک، پٹّا اور بنوٹ کے کرتب ہو رہے ہیں۔ اکھاڑوں کی ایک لمبی قطار ہے۔ ان کے پیچھے نفیری والے ہیں۔ پھر سقوں کی ٹولیاں آتی ہیں جو اپنے کٹورے بجا بجا کر موسیقی پیدا کر رہے ہیں اور ڈھول تاشے کی آواز کے ساتھ خود بھی مٹک رہے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈے والے آتے ہیں۔ بڑے عمدہ انداز میں دائرے میں گھومتے جا رہے ہیں اور اپنے ڈنڈے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ کولھے بھی مٹکا رہے ہیں اور دیکھنے والے خوش ہو رہے ہیں۔ اکھاڑوں کی طرح ان کی بھی بہت سی ٹولیاں ہیں۔ سب سے آخر میں پنکھا ہے جس کے آگے شہنائی بج رہی ہے۔ اس کے پیچھے گل فروش بڑی تعداد میں ہیں۔ جلوس آہستہ آہستہ بازار میں سے گزرتا ہے۔ بالا خانوں پر بیٹھے لوگ پھول برسا رہے ہیں۔ کوئی گلاب چھڑک رہا ہے۔ کمال دکھانے والوں کو لوگ دوپٹے اور نقدی بھی دے رہے ہیں۔

کوئی بارہ بجے تک یہ جلوس جوگ مایا کے مندر پہنچتا ہے۔ ایک بجے تک لوگ پنکھا چڑھا کر واپس آتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں آگے آگے ہیں۔ مسلمان پرشاد لے کر کھاتے ہیں اور بڑی عقیدت ظاہر کرتے ہیں۔

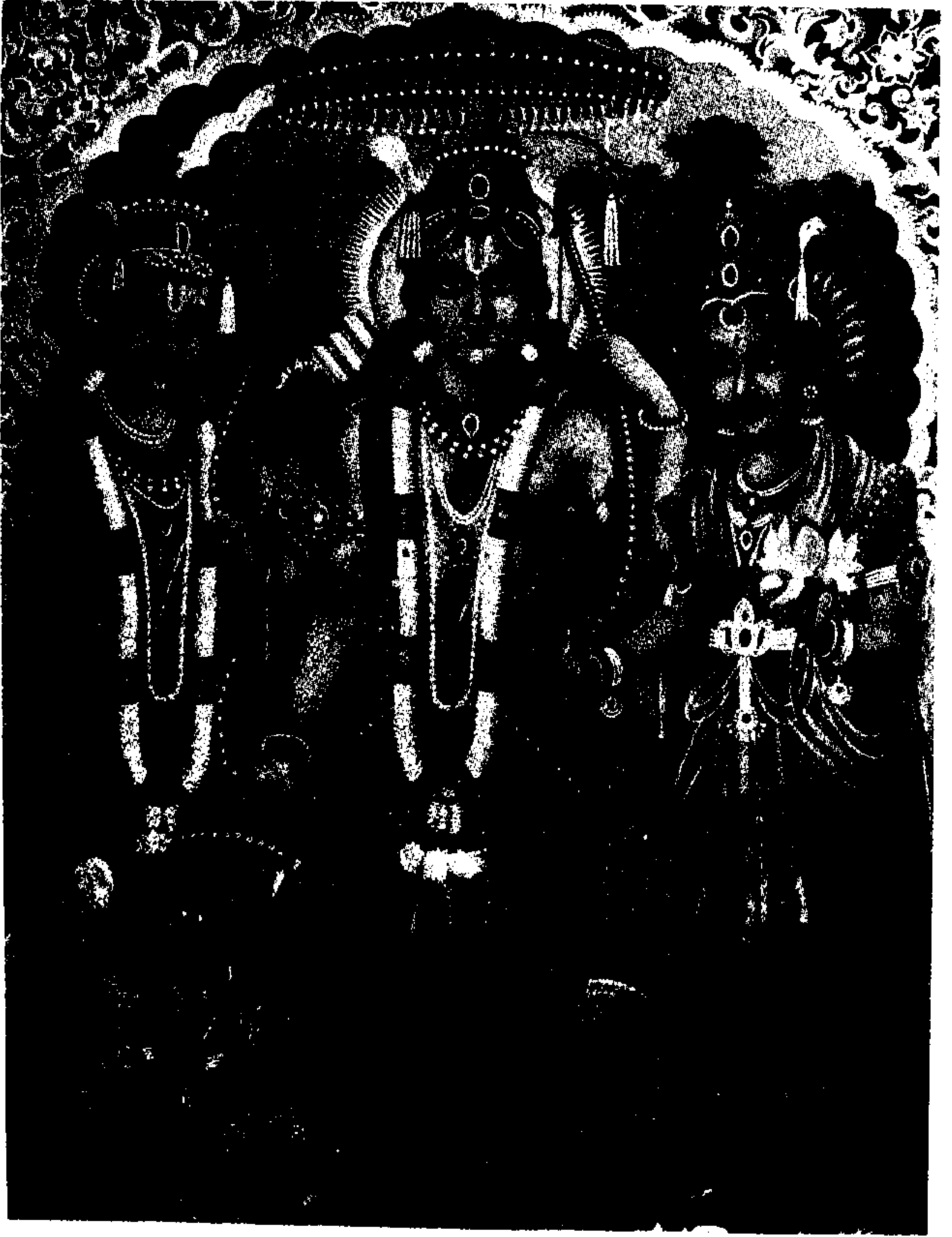
اگلے دن اسی دھوم دھام سے حضرت خواجہ بختیار کاکی کی درگاہ پر ہندو مسلمان دونوں مل کر پنکھا چڑھاتے ہیں۔ اس سے فارغ ہو کر سب شمسی تالاب پر پہنچتے ہیں اور یہاں رات کو آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا آسمان روشنیوں اور جھلمل کرتے ہوئے پھولوں اور پتیوں سے کسی نے سجا دیا ہے اور زمین پر تو چند لمحوں کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سورج نکل آیا ہے۔

بادشاہ اتنے انصاف پسند تھے کہ اگر وہ پنکھے کے ساتھ جوگ مایا مندر نہیں جاتے تھے تو اگلے دن پنکھے کے ساتھ خواجہ بختیار کاکی کی درگاہ پر بھی نہیں جاتے تھے۔ وہ

اپنی ہندو اور مسلم رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے کن خوبصورت الفاظ میں پھول والوں کی سیر کے میلے کے پیچھے باہمی محبت اور بھائی چارے کے جذبے کو بیان کیا ہے۔

" بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا، پنّی چڑھا، آئینے لگا، پھولوں سے سجا ایک لمبے رنگین لباس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش، محبت اور یگانگت کا نشان تھا جس نے چھوٹے بڑوں، ہندوؤں مسلمانوں، غربا، امرا غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقے کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعے سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا ان کے پروانے"

۱۸۵۷ کی تباہی آئی، دلی لٹی اور بادشاہ جلاوطن ہو کر رنگون پہنچے۔ وہ تعلق ٹوٹ گیا اور وہ احساسات بکھر گئے۔ میلہ جاری رہا مگر روز گھٹتا گیا۔ ۱۹۴۲ کی ہندوستان چھوڑو تحریک کے نتیجے کے طور پر اِسے بند کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد پنڈت نہرو نے نئے ماحول میں قومی ایکتا اور فرقہ وارانہ میل جول کے لیے اس میلے کی اہمیت کا احساس کیا اور اسے ۱۹۶۲ میں پھر شروع کر دیا گیا۔ پہلے یہ میلہ برسات میں ہوتا تھا مگر اب اکتوبر میں ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم تاریخ کے اس طلسماتی دور اور ماحول کو جس میں یہ میلہ پہلے ہوتا تھا دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے مگر دلی ایڈمنسٹریشن اس میلے کو پورے جوش و خروش سے منا رہی ہے اور پرانے میلے کے بنیادی خدوخال کو قائم رکھنے میں اس کی کوششیں قابلِ تعریف ہیں۔



رام لیلا

رام لیلا کی دھوم

کہتے ہیں کہ رام کتھا کا رواج مریادا پرشوتم رام کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا جب لوکُش نے اپنے پِتا کے دربار میں آکر انہیں ساری رام کتھا سنائی تھی۔

رام لیلا ہندوستان میں کب سے منائی جارہی ہے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ہماری ہزاروں برس پرانی وراثت ہے۔ شاید ہی کوئی نگر ایسا ہو جہاں ہندوؤں کی آبادی ہو اور رام لیلا نہ منائی جاتی ہو۔ رام لیلا کی تقریبات دسہرے والے روز جب راون، میگھ ناتھ اور کمبھ کرن کے پتلے جلائے جاتے ہیں، ختم ہو جاتی ہیں۔ دراصل دسہرے کا تہوار رام لیلا کا ہی حصّہ ہے

قدیم زمانے کی رام لیلا

دلی میں ہر زمانے میں رام لیلا بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی رہی ہے۔ قدیم دلی میں بھی رام لیلا بڑے جوش وخروش سے منائی جاتی تھی اور دسہرے والے دن تو اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ ساری دلی اُمڈ آئی ہے۔ دراصل دلی کا دسہرہ دور دور تک مشہور تھا اور اسے دیکھنے کے لیے جہاں دلی والے ٹوٹ پڑتے تھے وہاں باہر کے پاس کے علاقوں سے بھی ہزاروں لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ میرزا قتیل کی کتاب "ہفت تماشہ" ڈھائی سو برس پہلے فارسی میں چھپی تھی، ہندوؤں کے دوسرے تہواروں کے علاوہ دسہرے اور رام لیلا کا بھی ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ "شہر کے ہندو و مسلمان مل جل کر دسہرے کا تہوار مناتے تھے۔

دلی کے بازاروں، چوکوں اور چوراہوں پر آدمی کی لمبائی سے کچھ اونچے کاغذ اور کھپچیوں سے بنے راون کے پتلے کھڑے کیے جاتے تھے۔ راون کے پیٹ میں ایک مٹی کی ہانڈی میں شربت رکھ دیا جاتا تھا۔ دسہرے کے دن چھوٹے چھوٹے بچے رام بن کر آتے تھے اور کمانوں میں تیر لگا کر راون کا پیٹ پھوڑتے تھے۔ رام چندر جی کی راون پر فتح پانے کا تماشہ دیکھنے کے لیے جگہ جگہ لوگوں کی بھاری بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں لوگوں کو مٹی کی ہانڈیوں میں سے شربت نکال کر کلھڑوں میں پلایا جاتا تھا۔ وہ سب شربت کو راون کا خون سمجھ کر پیتے تھے۔ جمنا کے کنارے میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔"

رامائن اردو اشعار میں

ان دنوں فارسی اور اردو کا دور دورہ تھا۔ گوسوامی تلسی داس کی چوپائیوں کے ساتھ ساتھ رامائن کو اردو اشعار میں بھی پیش کیا جاتا تھا۔ لال قلعے میں ہر بڑا ہندو تہوار پورے جوش خروش سے منایا جاتا تھا۔ دسہرے کے دن بادشاہ دربار کرتے تھے۔ پہلے ایک نیل کنٹھ بادشاہ کے سامنے اڑایا جاتا۔ نیل کنٹھ فتح اور کامیابی کا نشان ہے۔ یہ لیجیے باز خانے کا داروغہ باز اور شکرا لے کر آ رہا ہے۔ بادشاہ باز کو لے کر اپنے ہاتھ پر بٹھاتے ہیں۔ چنگیزوں اور ترکوں کے لیے باز آزادی اور کامیابی کا نشان ہے۔

دسہرے کے موقعے پر بادشاہ درباریوں کو انعام واکرام دیتے تھے۔ تیسرے پہر شاہی اصطبل کا داروغہ گھوڑوں کے پاؤں کو مہندی سے رنگ کر، پیشانی پر بیل بوٹے بنوا کر اور سونے چاندی کی جھولوں اور کاٹھیوں سے سجا کر قلعے کے جھروکوں کے نیچے لے آتا۔ بادشاہ جھروکے میں سے گھوڑوں کا معائنہ کرتے اور عمدہ سجاوٹ کے لیے سائیسوں اور داروغہ کو انعام دیتے۔

کائستھوں کی گوردھن پوجا

دسہرے کی تقریب کے طور پر امیروں کی ڈیوڑھیوں پر بھی سجے سجائے ہاتھی گھوڑے لائے جاتے تھے اور لانے والوں کو انعام ملتا۔ ہندوؤں کے گھروں میں دسہرے کے دن ان کی پوجا ہوتی

تھی۔ اس پوجا کے علاوہ ہتھیاروں کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔ کائستھوں کے یہاں گوردھن پوجا اور قلم دان کی پوجا ہوتی تھی۔ کائستھوں کے لیے قلم ہی ان کا ہتھیار ہوتا تھا۔ ایک پرانی کہاوت تھی ـــ "کائستھ پڑھا بھلا یا مرا بھلا"

پہلے نوراترے پر چھوٹی چھوٹی نادوں میں جَو بوئے جاتے تھے۔ دسہرے کے دن جو کی بالیوں کو بڑے، بوڑھے اور بچے اپنی ٹوپیوں، پگڑیوں اور کانوں میں لگا لیتے تھے۔ غریب برہمن اپنے ججمانوں اور امیر گھرانوں میں جو کی بالیاں لے کر جاتے تھے۔ انہیں دان دینا پُن مانا جاتا تھا۔ آج بھی اسے شُبھ مانا جاتا ہے۔

سواری

انگریزوں کے راج میں ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے بعد تیس ہزاری کے پیڑ کاٹ دئے گئے تھے اور یہاں چاند ماری کا میدان بن گیا تھا۔ کچھ وقت کے بعد یہاں رام لیلا بھی ہونے لگی تھی۔ لیکن دلی والوں نے اس جگہ کو چھوڑ کر اجمیری دروازے اور ترکمان دروازے کے باہر رام لیلا کرنی شروع کر دی اور یہ رام لیلا میدان کہلانے لگا۔ رام لیلا کی سواری پریڈ گراؤنڈ کے پاس کے مندر سے نکل کر چاندنی چوک، نئی سڑک، چاوڑی بازار اور اجمیری دروازے سے ہوتی ہوئی رام لیلا میدان پہنچ جاتی تھی۔ رات کے وقت سواری کی دھوم اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ شہر کے پہلوان بانک، بنوٹ، بنیٹی اور دوسرے کرتب دکھاتے ہوئے سواری کے ساتھ چلتے تھے۔ ڈنڈے کھیلنے والے طبلے کی تھاپ پر ناچتے، اٹھکیلیاں کرتے۔ ساتھ ہوتے۔ نفیری اور شہنائی بھی بجتی رہتی۔ راستے میں دونوں طرف نیچے پٹڑیوں پر اور اوپر چھتوں سے لوگوں کی بڑی بھیڑ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے سواری دیکھتی۔ کئی سالوں تک رام لیلا کی سواری مشعلوں کی روشنی میں بھی نکلتی رہی۔

رام لیلا کے مہنت ان رتھوں میں سجے سجائے رام، لکشمن اور سیتا کے قدموں میں بیٹھے ہوتے تھے۔ رام چندر جی، لکشمن اور سیتا کے پیچھے کھڑے رام بھکت ہنومان کندھے پر گدا رکھے ایک ہاتھ سے مورچھل ہلاتے رہتے۔ راون کے ہوادار کو کئی کئی کہار اٹھاتے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ راون کو اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے دیکھ کر چیخنے لگتی ـــــ

"مارا جائے گا رے، مارا جائے گا۔" مگر راون پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا رہتا۔ جلوس میں ہر روز ایک نئی جھانکی بھی ہوتی۔ جس دن رام، سیتا اور لکشمن بن باس جاتے اس دن رام لیلا میدان کے پاس شاہ جی کے تالاب میں کشتی پر آکر بیٹھتے اور کھیوٹ انہیں گنگا پار لے جاتا تھا۔ آزادی کے بعد اس تالاب کو پاٹ دیا گیا اور یہاں پنجاب سے آئے شرنارتھیوں کے لیے ایک مارکیٹ بن گئی جو اب کملا مارکیٹ کہلاتی ہے۔

جوش و خروش

دسہرے اور رام لیلا کا جو جوش و خروش دلی میں ہوتا تھا اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ دلی کے گلی کوچوں میں بچے رنگ برنگی جھنڈیاں اور پنّی چڑھی تیر کمان لیے اور اپنے چہروں پر طرح طرح کے مکھوٹے لگائے یا ہنومان کی سینا بنے دن بھر گھومتے اور غل غپاڑہ کرتے رہتے تھے۔ شام کو رام لیلا کے میدان میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں سب کو ہی رام لیلا کا شوق ہوتا تھا اور ایک دفعہ بیٹھ کر کوئی ہلنے کا نام نہیں لیتا تھا اور بھیڑ تھی کہ لہر در لہر چلی آرہی ہے۔ عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام الگ ہوتا تھا مگر بھیڑ میں جس کو جہاں جگہ ملی اپنے کنبے سمیت وہیں بیٹھ جاتا تھا۔ سیوا سمتی اور مہابیر دل کے والنٹیر بڑی تعداد میں موجود ہوتے اور کوئی گڑبڑ نہ ہونے دیتے۔ مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد بھی، جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے، جلوس اور رام لیلا دیکھتے اور بڑے بچوں کو بتاتے رہتے کہ "یہ رام جی ہیں، یہ لکشمن، یہ سیتا جی اور وہ ہنومان ہیں۔" دسہرے والے دن جب راون، میگھ ناتھ اور کمبھ کرن کے پتلے جلائے جاتے، جو ہر سال پہلے سے زیادہ اونچے بنائے جاتے تو بھیڑ کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ پھر آتش بازی ہوتی اور ایسی ہوتی کہ تماشائی دنگ رہ جاتے۔ دلی کی آتش بازی یوں بھی مشہور تھی۔

پہلے دلی میں ایک ہی رام لیلا ہوتی تھی، لیکن دلی بڑھتی گئی اور نئی نئی بستیاں قائم ہوتی رہیں۔ پھر کہاں تک بھیڑ ایک ہی میدان میں سماتی۔ اب جتنی رام لیلائیں دلی میں ہوتی ہیں شاید ملک کے کسی دوسرے شہر میں نہیں ہوتیں۔ لیکن رام لیلا میدان، پیر بڈ

گراؤنڈ اور گاندھی میدان کی رام لیلائیں دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں ان کے علاوہ ایک سیٹیج پر ڈرامائی رقص کے انداز میں پیش کی جانے والی رام لیلا بھی بڑی مقبول ہے اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں اسے دیکھتے ہیں۔

ہنومان مندر پر نشانِ ہلال

یوں تو دلی کے بہت سے مندروں میں ہنومان جی کی مورتی رکھی ہے لیکن نئی دلی میں کناٹ پلیس کے پاس، بابا کھڑک سنگھ مارگ پر جو ہنومان مندر ہے وہاں ہمیشہ سے بڑی بھیڑ ہر منگلوار کو ہوتی آئی ہے اور ایک بڑا میلہ سا لگ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ مندر اتنا پرانا نہیں ہے لیکن اس میں ہنومان کی مورتی ہزاروں برس پرانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پانڈوؤں نے بھی اس مورتی کی پوجا کی تھی اور یہ مورتی اپنے آپ دھرتی سے نکلی تھی۔ جب مغل شہنشاہ اکبر کا آمیر کے راجاؤں سے میل جول بڑھا اور راجہ بہاری مل کی بیٹی کا اکبر سے بیاہ ہوا تو راجہ بہاری مل کے بیٹے راجہ بھگوان داس اکبر کے نورتنوں میں شامل کیے گئے۔ راجہ بھگوان داس کے بیٹے راجہ مان سنگھ کو صوبیداری ملی اور دلی کے کئی حصے جاگیر میں ملے۔ راجہ مان سنگھ نے اپنے نام پر راجہ بازار میں ہنومان جی کی مورتی رکھ کر مندر بنوایا۔ اکبر راجہ مان سنگھ کو بیٹا کہہ کر بلاتا تھا اور اس نے اسے مرزا راجہ کا خطاب دیا تھا۔ اس ہنومان مندر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلس کی چوٹی پر دوج کا چاند یعنی "نشانِ ہلال" ہے جو مسلمانوں کا مذہبی نشان سمجھا جاتا ہے۔ دراصل یہ نشان بھگوان شو کے مستک پر بھی ہے اور ہنومان جی کو شو کا پُتر مانا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ اکبر کو خواب میں ہنومان نظر آئے جنھوں نے اکبر کو آگاہ کیا کہ کچھ لوگ اس کی مورتی توڑنا چاہتے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو بڑی ناانصافی ہوگی۔ اس پر اکبر نے راجہ مان سنگھ سے صلاح کی جس کے نتیجے کے طور پر مندر بنوایا گیا اور ہنومان جی کی مورتی رکھی گئی۔ مندر کی چوٹی پر نشانِ ہلال بنایا گیا جس سے مراد دونوں مذاہب کی حرمت ہے۔

درگا پوجا

ان ہی دنوں درگا پوجا بھی ہوتی تھی۔ آج بھی ہوتی ہے۔ رامائن میں بھی درگا پوجا کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ درگا شکتی کی دیوی ہے اور

برائی کا ناش کرتی ہے۔ ہندو بھی درگا کو مانتے ہیں اور بنگالیوں کا تو یہ سب سے بڑا تہوار ہے۔ جب سے کلکتہ راجدھانی بنی اور اس کے بعد پھر دلی کو راجدھانی بنایا گیا، دلی میں بنگالیوں کی آبادی کافی ہو گئی تھی۔ دلی میں درگا پوجا کا تہوار منانا ۱۹۱۲ سے شروع ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کالی مندر ۱۸۴۰ میں جمنا کے نگم بودھ گھاٹ کے پاس کاغذی گلی میں قائم ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ کی لڑائی میں مندر ٹوٹ گیا تھا، لیکن کالی کی مورتی بغیر کسی دیکھ بھال کے جمنا کے کنارے پڑی رہی۔ جب دلی میں امن امان قائم ہوا تو نیل منی برہمچاری نے دلی آکر کچھ بنگالیوں اور دلی والوں کی مدد سے نئی سڑک کے پاس روشن پورہ میں مندر بنواکر مورتی اس میں رکھوادی تھی۔ ۱۸۷۹ میں کالی کی مورتی کو تیس ہزاری کے نئے مندر میں لیجایا گیا۔

وجے دشمی کے دن درگا کی خوبصورت مورتی فتح پوری کے پاس ایک دھرم شالہ سے بڑی دھوم دھام سے نکلتی تھی اور مورتی کو جمنا کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اب تو دلی کے سبھی حصوں میں درگا پوجا ہوتی ہے۔ نئی دلی کی کالی باڑی کی درگا پوجا میں تو بڑی کشش ہے۔ بھجن کیرتن اور آرتی ہوتی رہتی ہے۔ آج دلی کے سینکڑوں حصوں سے درگا کی مورتی بڑے بڑے جلوسوں کی صورت میں جمنا لائی جاتی ہے اور لوگوں کا جوش و خروش اور عقیدت قابلِ دید ہوتی ہے۔

دیوالی

رام لیلا اور وجے دشمی کی تقریبات ختم ہوتیں تو دلی والے دیوالی کی تیاریاں شروع کر دیتے۔ دراصل دیوالی کا تعلق بھی رام سے ہی ہے۔ اسے رام لیلا کا حصہ ہی سمجھ لیں تو کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ راون پر وجے پاکر رام اجودھیا لوٹ کر تخت پر بیٹھتے ہیں اور ساری اجودھیا میں چراغاں ہوتی ہے۔ دیوالی کے تہوار کی بنا یہی ہے۔ اس روز لکشمی پوجن ہوتا ہے۔

تیاری

دلی والے تہواروں کو جی کھول کر مناتے تھے۔ پیسے سے تنگ بھی ہوتے تو دوست یا بنیئے سے قرض بھی اٹھا لیتے۔ ان دنوں تہوار کے لیے پیسے ادھار

مانگنا ایک عام سی بات تھی اور ادھار دینے والے بھی اس کو معقول وجہ سمجھتے تھے۔ خوشحال گھروں میں تو دیوالی بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی۔ کئی دن تک عمدہ عمدہ پکوان، گنجیا، بیسن کی پاپڑیاں، میوے، پیڑے لڈو، سموسے وغیرہ بنتے اور کنستروں میں بھر کر رکھ لیے جاتے۔ سب کے نئے کپڑے بنتے، گھر کے لیے نئے برتن خریدے جاتے۔ گھر کی پوری صفائی اور لپائی پتائی ہوتی۔ دکانیں بھی سجتی، نئے بہی کھاتے کھولے جاتے۔ عمدہ عمدہ تصویریں، کھلونے اور آرائش کی چیزیں خریدی جاتیں۔ کھیل، کھانڈ کے کھلونے اور حلوائی کی مٹھائی اور خشک میوہ بھی خرید کر گھر لایا جاتا۔ ہندوؤں کی دیوالی کی وہی خوشی تھی جو مسلمانوں کی عید کی تھی۔ دیوالی والے روز مسلمان بھائی بھی اپنے ہندو دوستوں کو مبارکباد دیتے اور ہندو انہیں مٹھائی کھلاتے تھے۔

دیئے جلنے کا سماں

مٹی کے دیوں کا چھوٹی، لمبی قطاروں میں جلنے کا سماں کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ وہ سماں اب گاؤں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ ان دنوں سرسوں کے تیل کے دیئے جلائے جاتے تھے۔ چند آنوں کا سیر بھر سرسوں کا تیل اور ایک آنے کے پچاس مٹی کے چھوٹے دیئے مل جاتے تھے۔ موم بتی صرف امیر اور رئیس جلاتے اور اسے شان سمجھا جاتا تھا۔ مندروں میں اور جمنا کے کنارے لاتعداد دیئے ختم نہ ہونے والی قطاروں میں جگ مگ جگ مگ جلتے۔ چھوٹی اور بڑی دیوالی پر دونوں ہی دن چراغاں ہوتی، پہلے دن کچھ کم اور دوسرے دن بہت زیادہ۔ دیوالی والی رات جدھر نظر اٹھاؤ، روشنی ہی روشنی ہو رہی ہے۔ سارا شہر روشنیوں میں نہایا ہوا ہوتا ہے جیسے شہر نہیں کوئی جادو نگری ہو۔

بازاروں کا منظر

پٹڑیاں اور دکانیں سامان سے اٹی پڑی ہیں اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اُمڈے پڑ رہے ہیں۔ حلوائیوں کی چاندی ہو رہی ہے۔ دیوالی والے روز سال بھر کی کمائی ہو جاتی ہے۔ ان کی دکانوں پر اتنی بھیڑ ہے کہ اگرچہ دینے اور تولنے والے معمول سے تگنے اور چوگنے ہیں

لیکن ایک گھنٹے سے پہلے باری نہیں آتی۔ لوگ گھر کے لیے بھی خرید رہے ہیں اور رشتے داروں، دوستوں اور حکام کے گھر بھجوانے کے لیے بھی۔ خشک میوہ بھی بہت سستا ہوتا تھا۔ روپیہ سوا روپیہ سیر کا غذی بادام ہوتا تھا، یہی بھاؤ بھنے ہوئے چلغوزوں کا تھا۔ سیروں خشک میوہ گھر لایا جاتا تھا، کھانے کے لیے بھی اور بانٹنے کے لیے بھی۔ شاید ہی کوئی مفلس اور فقیر ہو جسے دیوالی والے روز مٹھائی کھانے کو نہ ملتی۔

پوجا

دیوالی والے دن گھروں میں پکّا کھانا یعنی پوری کچوری اور کھیر اور دہی بڑے وغیرہ بنتے۔ رات کو لکشمی کی تصویر پر پان کا پتہ اور ثابت سپاری لگا کر چاندی کا روپیہ یا سونے کی اشرفی آٹے سے چپکا کر لکشمی پوجن کرتے۔ اس موقعے پر گھر کے سب لوگ بیٹھتے اور عورتیں نئی نئی ساڑھیاں اور پورا زیور پہن کر پوجا کا سامان لگاتیں اور پوجا کرتیں۔ جس کمرے میں پوجا ہوتی اس میں ساری رات ایک بڑا سرسوں کا دیا روشن رکھا جاتا اور اس پر عورتیں نیا کاجل بھی بنا لیتیں۔ دیوالی والے دن گھر میں اندھیرا نہ کیا جاتا اور کوئی نہ کوئی روشنی رہتی۔ یہ بھی عقیدہ تھا کہ رات کو لکشمی کسی بھی وقت گھر میں آجائے گی۔

جُوا

دیوالی پر جُوا بھی کھیلا جاتا تھا اور عام طور پر پولیس بھی چپ رہتی۔ شہر میں ہیجڑے "چھلا دے رے مورے سائیں" گاتے پھرتے اور پیسے لیتے۔ گھوسی اور رتھ بان، بیل، گائے اور بھینس کے پاؤں میں رنگ لگاتے، سینگوں پر پیتل اور قلعی کی گوٹیں لگاتے، پیروں میں گھنگرو باندھتے، زر دوزی کی جھولیں ڈالتے اور تاشے اور ڈھول بجا بجا کر انہیں گھماتے اور انعام پاتے۔

قلعے کی دیوالی

قلعے میں بھی دیوالی بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ بادشاہ سونے، چاندی اور ست نجے میں تلتے تھے جو غریبوں میں بانٹ

دیا جاتا تھا۔ بادشاہ غسل کر کے لباس تبدیل کرتے اور نذریں قبول کرتے۔ رات کو قلعے کی برجیاں روشن کی جاتیں۔ کھیل بتاشے اور کھانڈ کے کھلونے اور ہٹڑیاں اور گنے وغیرہ امرا اور رؤسا میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ اینڈریوز لکھتے ہیں:۔

"دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ مختلف مذہب کے پڑوسیوں کے ساتھ پرامن طریقے سے رہنے کا فن بہت بلند سطح پر پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ ان معاملات میں زندگی بھر ان اصولوں پر کاربند رہے۔ وہ قلعے کے مثمن برج میں بیٹھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کی تقریبات اور تماشوں کو دیکھا کرتے تھے۔ اس طرح سے خیر سگالی کے جذبات فروغ پاتے۔"

سکھوں کے گوردوارے، پرب اور جلوس

اول اللہ نور اُپایا　　قدرت کے سب بندے
ایک نور سے سب اپجایا　　کون بھلے کون مندے

سکھ دھرم کے لوگ ہندوستان کے کونے کونے میں بسے ہوئے ہیں۔ بیرونی ملکوں میں بھی اِن کی خاصی تعداد رہتی ہے۔ یہ لوگ بڑے جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں اور اپنی اِن ہی خوبیوں کے باعث زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب ہیں۔ سکھ دھرم کے بانی بابا گورو نانک دیو جی تھے جو ۲۰ اکتوبر ۱۴۶۹ کو پورنماشی کے دن تلونڈی میں (جو اب ننکانہ صاحب کہلاتا ہے اور پاکستان میں ہے) پیدا ہوئے تھے۔ یہ بہت بڑے سنت تھے اور لوگ انہیں "سچے پادشاہ" کہا کرتے تھے۔ گورو نانک جی کے بعد سکھوں کے نو گورو اور ہوئے جن کے نام ہے۔ گورو انگد، گورو امر داس، گورو رام داس، گورو ارجن دیو، گورو ہر گوبند، گورو ہری رائے، گورو ہری کرشن، گورو تیغ بہادر اور گورو گوبند سنگھ۔ گورو گرنتھ صاحب ان کی مقدس کتاب ہے۔ دلی میں بھی سکھوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ رہی اور آج تو دلی میں ان کی آبادی چودہ پندرہ لاکھ کے قریب ہو گی۔ دلی میں سکھوں کے بہت سے تاریخی گورودوارے ہیں جنھیں دیکھنے کے لیے غیر ملکی سیّاح بھی بڑی تعداد میں آتے ہیں۔



گوردوارہ ماتا سندری کا اندرونی حصّہ

گوردوارہ نانک پیاؤ

جب سکندر لودھی تخت پر بیٹھا تو گورونانک بیس سال کے تھے۔ چونتیس سال کی عمر میں انھوں نے تمام پنجاب کا دورہ کیا۔ دو سال کے بعد ۱۵۰۵ میں وہ مردانہ اور بھائی بالا کے ساتھ مشرقی علاقوں کی طرف چل دیئے۔ بیساکھی کے موقعے پر وہ ہردوار پہنچ گئے اور کوروکیشتر ہوتے ہوئے جون ۱۵۰۵ میں دلی پہنچے۔ گورونانک پرانی سبزی منڈی کے باہر ایک باغ میں گرانڈ ٹرنک روڈ پر ٹھہرے اور لوگ بڑی تعداد میں ان کے درشنوں کے لیے آنے لگے۔ یہی باغ ان کے ٹھہرنے کی وجہ سے ایک دھارمک استھان بن گیا۔ جس آدمی کا یہ باغ تھا اس نے خوشی سے اسے ایک دھارمک استھان میں بدل دیا۔ مسافر اس استھان پر آتے اور گرمی میں انہیں کوئیں کا ٹھنڈا پانی پلایا جاتا اور لنگر سے کھانا کھلایا جاتا۔ کیوں کہ یہاں پیاسوں کی پیاس بجھتی تھی اس لیے یہ گوردوارہ نانک پیاؤ کہلایا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ مشہور ہے۔ ایک دن گورونانک جی نے دیکھا کہ کچھ لوگ سڑک پر رو رہے ہیں کہ ان کا ہاتھی مرگیا۔ گورونانک نے پڑے ہوئے ہاتھی کو دیکھ کر کہا کہ یہ مرا نہیں ہے اور ان کی کوشش سے ہاتھی اٹھ گیا۔ اس کے کچھ دن بعد سکندر شاہ کا ہاتھی مرگیا اور لوگوں کے کہنے پر اس نے گورونانک کو بلوا کر انہیں ہاتھی کو زندہ کرنے کے لیے کہا۔ ان کے انکار کرنے پر بادشاہ نے انہیں جیل خانے میں ڈال دیا۔ ۳ جولائی ۱۵۰۵ کو دلی میں اتنا زبردست زلزلہ آیا کہ سب عمارتیں بری طرح ہلنے لگیں۔ تاریخ داؤدی میں اس زلزلہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"یہ زلزلہ اتنا بھیانک تھا کہ پہاڑ اتھل پتھل ہوگئے اور اونچی عمارتیں گر کر پاش پاش ہوگئیں اور ایسا لگا جیسے دھرتی پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔"

بہت لوگوں نے سوچا کہ فقیر نانک کے قید ہونے سے دلی پر یہ قہر ٹوٹا تھا۔ بعد میں چشتی صوفیوں کے اثر میں آکر بادشاہ کا دل بھی بدل گیا اور انھوں نے گورونانک کو رہا کردیا۔

گوردوارہ مجنوں کا ٹیلہ

جمنا کے کنارے پر ایک مسلم درویش رہتے تھے جو تنہا عبادت میں زندگی گزار رہے تھے. عبادت اور روزوں کی وجہ سے وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور وہ خدا کے جلوے کے لیے اتنا تڑپتے تھے جیسے کوئی سچا عاشق اپنی محبوبہ کے لیے تڑپتا ہے. اسی وجہ سے لوگوں نے ان کا نام مجنوں رکھ دیا. جب انہیں گورونانک جی کا قرب حاصل ہوا تو انہیں وہ دیدار حاصل ہو گیا جس کے لیے وہ تڑپ رہے تھے اور وہ گورو کے بڑے پکے چیلے بن گئے ان کی کٹیا کے استھان کو مجنوں کا ٹیلہ کہنے لگے. بعد میں یہ سکھ دھرم کا ایک بڑا مرکز بن گیا. اس میں گورونانک بھی ٹھہرے اور بعد میں گورو ہر گوبند اور گورو ہری رائے کے بیٹے رام رائے بھی یہاں ٹھہرے. یہاں ہر سال سکھ بیساکھی کا تہوار مناتے ہیں.

گوردوارہ بنگلہ صاحب

گورو ہری رائے کے بعد ان کے بیٹے رام رائے گورو بننے کی کوشش میں لگ گئے جب کہ سادھ سنگت گورو ہری کرشن کو اگلا گورو مانتی تھی. رام رائے گورو بننے کے لیے اورنگ زیب کی مدد لینے کے لیے تیار تھے. اس وقت کے دہلی کے مشہور سکھوں نے جن میں لکھی رائے، کلیان چند اور بھائی گوربخش بھی شامل تھے رام رائے سے اپیل کی کہ وہ گورو ہری کرشن کی مخالفت نہ کریں. بادشاہ نے اس معاملے کو سلجھانے کے لیے راجہ جے سنگھ کی مدد لی اور راجہ جے سنگھ نے گورو ہری کرشن کو دلی بلوایا اور بادشاہ کو یقین دلایا کہ جب تک بادشاہ کی اس معاملے میں تسلی نہ ہو جائے کہ گورو کی گدی کا حقدار کون ہے گورو ہری کرشن راجہ جے سنگھ کے بنگلے میں ان کے مہمان بن کر ٹھہریں گے. گورو ہری کرشن اس بنگلے میں ایک یا دو مہینے ٹھہرے ہوں گے اور یہ ایک اہم تاریخی گوردوارہ بن گیا. یہ گوردوارہ گول ڈاکخانے کے پاس ہے

اور اس کا شمار دلی کے مشہور ترین تاریخی گوردواروں میں ہوتا ہے۔

گوردوارہ بالا صاحب

گورو ہری کرشن جی نے دلی آکر غریبوں اور دکھیوں کی بڑی مدد کی تھی۔ اگرچہ عمر میں وہ بچے تھے مگر ایک مکمل گورو تھے۔ مسلمان بھی ان کی بڑی عزت کرتے اور چونکہ وہ بچے تھے انہیں عقیدت سے "بالا پیر" کہا کرتے تھے۔ وہ غریبوں کی مدد تو کرتے ہی تھے، بیماروں کی تیمارداری اور سیوا میں بھی لگے رہتے تھے۔ وہ تمام چڑھاوے اور دان کی رقم کو مریضوں کے علاج اور بھوکے ننگوں کو روٹی اور کپڑا دینے پر خرچ کرواتے تھے۔ جب انہیں خود بعد میں پہلے بخار اور پھر چیچک ہوگئی تو اس گورو نے جن کی کرامات سے مریض شفا پاتے تھے جسم کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور اسے ایشور کی مرضی سمجھا۔ گورو ہری کرشن نے ۳۰ مارچ ۱۶۶۴ کو چولا چھوڑ دیا اور ان سمادھی پر گوردوارہ بالا صاحب بن گیا۔ اسی گوردوارے میں ماتا سندری کی سمادھی ہے۔ ایک حصے میں ماتا صاحب دیوی کی سمادھی بھی ہے۔ یوں تو پورنماشی کے دن میلہ سا لگا رہتا ہے۔ لیکن مارچ اپریل یا چیت کے مہینے کی پورنماشی کی خاص اہمیت ہے۔

گوردوارہ سیس گنج

یہ گوردوارہ دلی میں سکھوں کا مشہور ترین تاریخی گوردوارہ ہے جو چاندنی چوک میں بیچوں بیچ فوارے کے قریب قائم ہے۔ اس کے پاس ہی کوتوالی تھی جواب پورے طور پر سکھوں کو سونپ دی گئی ہے۔ گورو تیغ بہادر کی شہادت جس جگہ ہوئی تھی، اسی جگہ پر گوردوارہ سیس گنج بنا ہے۔ وہ درخت جس کے نیچے ان کی شہادت ہوئی تھی اس کا تنہ ابھی تک قائم ہے اور وہ کنواں بھی جہاں انھوں نے شہید ہونے سے پہلے غسل کیا تھا۔ متی داس اور دیال داس نے بھی اپنے گرو کے ساتھ شہادت پائی تھی۔

جو سکھ یا غیر سکھ بلکہ غیر ملکی سیاح دلی آتا ہے گوردوارہ سیس گنج کی زیارت ضرور کرتا ہے۔ اس گوردوارے میں ہر وقت پاٹھ ہوتا رہتا ہے اور عقیدت مندوں کی بہت بڑی بھیڑ جن میں ہندو بھی کثرت سے شامل ہوتے ہیں ہر وقت گوردوارے کے اندر اور باہر ہوتی ہے۔ اس گوردوارے میں ہر روز لنگر غریبوں اور امیروں کو اور ہر مذہب کے لوگوں کو بٹتا ہے۔

گوردوارہ رکاب گنج

گورو تیغ بہادر کی شہادت کے بعد لوگوں کی بہت بڑی بھیڑ روتی پیٹتی ان کی لاش کے قریب آتی گئی تاکہ وہ اپنے پیارے گورو کے آخری درشن کر سکیں۔ جو آسمان اب تک صاف رہا تھا سیاہ بادلوں سے اچانک ڈھک گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بھیڑ میں سے اچانک ایک آدمی کودا اور گورو کا سر اٹھا کر خوف زدہ بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ یہ آدمی بھائی جتیا تھا جو ایک بھنگی کے بھیس میں تھا۔ وہ اپنے گورو کا سر لے کر سیدھا آنند پور ایک تہائی کے قریب بتائی جاتی ہے۔

جب موسم صاف ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ گورو کی لاش بھی غائب تھی۔ ہر ایک آدمی نے سوچا کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ اس لاش کو لکھی شاہ کے بیٹے اپنی رہائش پر رائے سینا گاؤں لے گئے۔ یہ جگہ پارلیمنٹ ہاؤس کے پاس تھی جہاں اب مشہور رکاب گنج گوردوارہ ہے۔ اسی جگہ پر گورو کا صندل کی لکڑیوں پر داہ سنسکار ہوا اور اس کے ساتھ ہی لکھی شاہ کے بیٹوں نے اپنا سارا گھر پھونک دیا۔ آج یہ گوردوارہ بہت ہی عالی شان سنگِ مرمر کی عمارت میں ہے اور ہزاروں لاکھوں سکھ اور ہندو یہاں آکر ماتھا ٹیکتے ہیں۔

گوردوارہ موتی باغ

یہ گوردوارہ نانک پورہ، موتی باغ میں رنگ روڈ پر سڑک کے کنارے بنا ہوا ہے

پہلے اس کی عمارت معمولی اور سادہ تھی مگر حال ہی میں اس کی نئی عمارت بن گئی ہے۔
گورو گوبند سنگھ جب اورنگ زیب سے ملنے دلی آئے تھے تو موتی باغ میں اِس جگہ ٹھہرے تھے جہاں اب گوردوارہ ہے۔ موتی باغ ایک موچی موتی کا تھا اور اس کا نام موچی باغ بھی تھا۔ موتی ایک فارغ البال چمڑے کا تاجر تھا اور اس نے ایک بستی قائم کی جس میں موچی اور چمڑا رنگنے والے رہتے تھے۔ یہ بستی موتی باغ کے بالکل پاس تھی۔

آدی گرنتھ کی پہلی ستھاپنا اسی گوردوارے میں منائی جاتی ہے۔

گوردوارہ دمدمہ

جب گورو گوبند سنگھ دلی بادشاہ سے ملنے آئے تو انھوں نے اپنی آمد کی اطلاع بادشاہ بہادر شاہ اول کو لال قلعے میں ایک تیر چھوڑ کر دی۔ گورو گوبند سنگھ زبردست تیر انداز تھے۔ ان کی اور بادشاہ کی پہلی ملاقات ہمایوں کے مقبرے کے پاس ہوئی اور یہی جگہ بعد میں گوردوارہ دمدمہ بن گئی۔ یہ بھی سکھوں کا ایک اہم تاریخی گوردوارہ ہے۔

کوچہ دل والی سِنگھاں، حویلی (گوردوارہ)

ماتا سندری اور مٹیا محل

ماتا سندری اور ماتا صاحب دیوی بہت سالوں تک دلی میں ٹھہریں جب گورو گوبند سنگھ دکن گئے ہوئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق یہ دونوں گورو گوبند سنگھ کے ساتھ ہی دکن گئی تھیں مگر ان کی موت سے کچھ ہی پہلے دلی بھیج دی گئی تھیں۔ ماتا صاحب دیوی کے بارے میں مورخ ولیم اِروِن نے "چہار گلشن" کے حوالے سے لکھا ہے۔" وہ کنوارا ڈولا یعنی کنواری دلہن کے نام سے

مشہور تھیں۔ انھوں نے کسی دوسرے کو اپنا پتی بنانے سے انکار کر دیا اور وہ ایک سنیاسنی تھیں۔"

ماتا سندری اور ماتا صاحب دیوی کئی سالوں تک اجمیری دروازے کے پاس کوچہ دل والی سنگھاں میں رہیں۔ ان کے ساتھ بھائی نند لال کرپال چند، جو گورو کے ماما تھے اور ماتا صاحب دیوی کے بھائی صاحب سنگھ بھی رہے۔ ماتا سندری نے گورو گوبند سنگھ کی اجازت سے ایک ایسے لڑکے کو گود لے لیا تھا جو ان کے سب سے بڑے بیٹے اجیت سنگھ کی ہو بہو تصویر تھا۔ ماتا صاحب دیوی کو ہمیشہ کے لیے "خالصہ ماتا" بنا دیا تھا۔ ان کو "حکم ناموں" پر گورو کے مہر ثبت کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا۔

جب ماتا سندری کا گود لیا ہوا بیٹا اجیت سنگھ ایک مسلم فقیر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تو ماتا سندری نے اسے بیٹا ماننا چھوڑ دیا۔ ماتا سندری اور ماتا صاحب دیوی دو سال کے لیے متھرا چلی گئیں اور معاملے کے ٹھنڈا ہونے پر دلی لوٹ آئیں۔ دلی آکر وہ حویلی ماتا سندری میں ٹھہریں جو اب گوردوارہ ماتا سندری کہلاتا ہے۔ ماتا سندری ۱۷۴۷ میں فوت ہوگئیں اور اس کے ایک دو سال بعد ہی ماتا صاحب دیوی بھی گزر گئیں۔ دونوں کی سمادھیاں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے گوردوارہ بالا صاحب میں ہیں۔

ماتا صاحب کی موت کے بعد گوروؤں کے ہتھیاروں کو بھائی جیون سنگھ اور ان کے جانشینوں نے مٹیا محل کے محلہ چتلی قبر میں اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اسی وجہ سے یہ جگہ گوردوارے کی مقدس حیثیت اختیار کر گئی۔ بعد میں ان ہتھیاروں کو گوردوارہ رکاب گنج لے جایا گیا تھا۔

ماتا سندری گوردوارہ اب ارون ہسپتال کے عقب میں ہے۔ اس گوردوارے میں گورو گوبند سنگھ کے بیٹوں کی شہادت ہر سال منائی جاتی ہے۔

سکھوں کے پرب پر جلوسوں کی شان نرالی اور انوکھی ہوتی ہے۔ ان جلوسوں میں سکھ دھرم کے ماننے والے لاکھوں کی تعداد میں شامل ہوتے ہیں۔

فہرست کتب اور رسائل

اردو اور فارسی	(حوالہ جات)
آئینِ اکبری	ابوالفضل
مرقع دہلی	درگا قلی خاں سالار جنگ
ہفت تماشا	مرزا محمد حسن قتیل (ترجمہ)
اردوئے معلیٰ	غالب
کلیات نظیر اکبر آبادی	نظیر اکبر آبادی
اجڑا دیار	شاہد احمد دہلوی
راگ درپن	فقیر اللہ سیف خاں
دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ	ناصر نذیر فراق
نوبت پنج روزہ	راشد الخیری
قطرۂ اشک	〃
آئینہ دہلی	اما شنکر
لال قلعہ کی ایک جھلک	ناصر نذیر فراق
دلّی کی آخری بہار	راشد الخیری
بزمِ آخر	فیاض الدین
دلّی کا سنبھالا	خواجہ محمد شفیع

بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر	مرزا فرحت اللہ بیگ
غالب کی دلّی	ضمیر حسن دہلوی
سحر البیان	میر حسن دہلوی
دلّی والے	ضمیر حسن دہلوی
دلّی کا روڑا	اختر انصاری
دلّی کی آوازیں	خواجہ محمد شفیع
اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت	ڈاکٹر محمد عمر
اپنی موج میں	آوارہ
بیلے میں میلہ	راشد الخیری
میر زمانے کی دلّی	ملّا واحدی
کانا باتی	خواجہ حسن نظامی
باغ و بہار	میر امن
سیر المنازل	مرزا سنگین بیگ (فارسی متن اور ترجمہ) مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
یہ تھی دلّی	شیش چندر طالب
رنگ محل	حمیدہ سلطان احمد
سیر دہلی	خواجہ حسن نظامی
قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں	عرش تیموری
دلّی کی آخری شمع	مرزا فرحت اللہ بیگ
سیر المتاخرین	غلام حسین خاں طباطبائی
انشار ہادی النسا	سید احمد دہلوی
یہ دلّی ہے	یوسف بخاری
دلی جو ایک شہر تھا	راجندر لال ہانڈا

مرحوم دلّی کی ایک جھلک	مرتبہ شمیم احمد
رسوم دہلی	سید احمد دہلوی
ہماری رسمیں اور تقریبیں	مُظفر حسین شمیم
راجپوت اور مغل زن و شو کی معاشرت	مقبول احمد صمدنی
گذشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر
اوراق مصوّر	خلیق احمد نظامی
اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی
بہادر شاہ بادشاہ اور مولا بخش ہاتھی	باقر علی داستان گو
دلّی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی
اصلاحاتِ پیشہ وراں (آٹھ جلدیں)	ظفر الرحمٰن
اردو تھیٹر (چار جلدیں)	عبدالعلیم نامی
کلاسیکی اردو ڈراما	امتیاز علی تاج
اردو ڈراما تاریخ اور تنقید	عشرت رحمانی
خطاطی اور ہمارا رسم الخط	یوسف بخاری
ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات	ڈاکٹر سید اسد علی
تاریخ ہندوستان	مولوی ذکاءاللہ
اسرارِ اہلِ ہنود	سید احمد مہرآوری
راگ درپن (فارسی)	فقیراللہ سیف خاں
نورنگ موسیقی	اختر علی خاں، ذاکر علی خاں
دربارِ اکبری	مولوی محمد حسین آزاد
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	عبدالحسن ندوی
ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں	کنور محمد اشرف
آثار الصنادید	سید احمد خاں

اخبار الصنادید — مولوی نجم الغنی — ۱۹۱۸ء
تذکرۂ گلشنِ ہند — مرزا علی لطیف — ۱۹۰۶ء
میر حسن دہلوی اور ان کا زمانہ — وحید قریشی
نادراتِ شاہی — عالم شاہ ثانی مرتبہ امتیاز علی عرشی
وقائع سیر و سیاحت — برنیر (اردو)
واقعاتِ دار الحکومت دہلی — بشیر الدین احمد (تین جلدیں)
ہندو تہواروں کی اصلیت — رام پرشاد
ہفت قلزم — گوری شنکر
فرہنگِ زیورات — سید محمد
دہلی کے قدیم مدارس و مدرّس — امداد صابری
ساقی (چند مخصوص شمارے)
فکرِ نو — ذاکر حسین کالج
دلی کالج — قدیم دلّی کالج نمبر ۱۹۵۳ء
نقوش (چند مخصوص شمارے)

ہندی

سنگیت چنتامنی — آچاریہ برہسپتی
مسلمان اور بھارتیہ سنگیت — //
ہمارا سنگیت رتن — لکشمی نارائن گرگ
بھارتیہ مسلم تہوار اور ریتی رواج — ڈاکٹر ماجدہ اسد
برج لوک ساہتیہ کا ادھین — ڈاکٹر ستیندر
پارسی تھیٹر — سوم ناتھ گپت

ABUL FAZIL—Akbarnama, Tr. by Beveridge. Bibliothica Indica
AHMAD, SAYYID—Yadgar-i-Delhi, Delhi, 1905
ANDREWS, C.F.-Maulvi Zakaullah of Delhi, 1929
ASHRAF, K.M.-Life and Condition of the people of Hindustan, Calcutta, 1935
BERNIER, FRANCOIS—Travels in the Mughal Empire. London, 1891
BOPEGAMAGE, A.—Delhi-Study in Urban Sociology. Bombay, 1957
CHOPRA, P.N.—Social Life during the Mughal Age. Agra, 1963
CHOPRA, P.N.—Some Aspects of Society & Culture during the Mughal Age. Agra, 1963
CHANDRA, JAG PRAVESH—Delhi, A Political Study, Delhi
DELHI—Ancient & Modern; East & West Journal, February, 1912
DEHALVI, SYED AHMED—Rasoom-i-Delhi. Rampur, 1965
FOREST, G.F.—Cities of India. 1903
HEARN, G.R.—The Seven Cities of Delhi. London 1906
HUSAIN, YUSUF-Glimpses of Medieval Indian Culture; Bombay 1962
MAJUMDAR, R.C.—The History and Culture of Indian People; Volume-VI, The Delhi Sultanate, Bharatiya Vidya Bhavan. Bombay, 1960
MANUCCI, N.V.-Storia Do-Mogor; Tr. William Irvine.Vol. I-IV(1907-9)
MINHAJ-US-SIRAJ—Tabaqat-e-Nasiri, Calcutta. 1864
TAVERNIER—Travels in India, ed. V. Ball, London. 1889
Y. H. Safadi—ISLAMIC CALLIGRAPHY
M. R. Gautam—THE MUSICAL HERITAGE OF INDIA
Daniel M. Neuman—The Life of Music in North India
ABDUL HALIM SHARAR—Lucknow: The Last Phase of an Oriental Culture
NARAYANI GUPTA—Delhi Between Two Empires 1803-1931, Society, Government and Urban Growth
HARRY PRICE GHOST-HUNTER—The Dennis Wheatly
JAMILA BRIJ BHUSHAN : Indian Jewellery Ornaments etc.
BLAND : Peisian Game of Chess, L. 1850
KEAYE : Rulers of India, Oxford, 1901
SPEAR, P. : Twilight of the Mughals, Delhi, 1969
JAFAR SHARIF : Qanun-e-Islam, London 1921
JAMILA BRIJ BHUSHAN : The Costumes and Textiles of India 1958
Mrs. MIR HASAN ALI : Observations on the Musalmans of India, etc., London 1932
ROSS, SIR, E. DENISON : Hindu-Muhammadan Feasts and Festivals etc. 1914
O. P. JAGGI—Hi story of Science & Technology in India, Medicine in Mediaval India

